گول میز کانفرنس

حال ہی میں ایک انگریز اخبار نویس نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ ان
کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں بھی اور لندن میں گول میز کانفرنس کے وقت بھی
انہیں گاندھی جی سے خوب ملنے جلنے کا موقع ملا۔ اس کتاب میں یہ لکھتے ہیں کہ
جہاز پر جو لیڈر سفر کر رہے تھے وہ سب جانتے تھے کہ خود کانگریس کی مجلس عاملہ
میں مسٹر گاندھی کے خلاف ایک سازش ہے۔ یہ جانتے تھے کہ جب وقت آئے
گا تو کانگریس مسٹر گاندھی کو نکال باہر کرے گی لیکن کانگریس سے انہیں نکالنا ایسا ہی تھا
جیسا اپنے آدھے ممبروں کو بھی نکالنا ہوگا۔ اور یہی وہ نصف تھا جسے سر تیج بہادر سپرو
اور مسٹر جیکر اپنے لبرل سنگھ کا ساتھی بنانا چاہتے تھے۔ لوگ اس بات کو کبھی نہیں
چھپاتے کہ مسٹر گاندھی خود ان کے الفاظ میں "درمیانے دماغ کے آدمی ہیں لیکن جو بھی
کھوپڑی والا لیڈر اپنے ساتھ کوئی دس لاکھ اچھی کھوپڑی کے پیرو بھی لا سکے اس کو
اسی طرف ملانے کی کوشش تو بہرحال کرنے کی چیز ہے۔"[1]

---

[1] مگر دی نولٹن کی کتاب The Tragedy of Gandhi
سے "نقش" میں سے یہ اقتباس اس کتاب کی ایک تنقید سے لیا ہے۔ اصل کتاب پڑھنے
کا مجھے موقع نہیں ملا۔ مجھے امید ہے کہ اس اقتباس کو پیش کرنے میں مصنف کے ساتھ
اور ان اصحاب کے ساتھ جن کا نام اس میں آیا ہے کوئی ناانصافی نہ کر رہا ہوں گا۔ (بقیہ صفحہ دیگر)

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس اقتباس سے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر کے حالات
کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے یا نہیں یا گول میز کانفرنس کے ان اراکین کے حالات کی
جو ۱۹۳۱ء میں لندن تشریف لے جا رہے تھے البتہ مجھے اس پر حیرت ضرور ہے
کہ کوئی شخص بھی اخبار نویس ہو کر "گیدڑ" جو ہندوستانی سیاست سے ذرا بھی واقف ہو

(صفحہ ۱ کا بقیہ نوٹ) یہ لکھ چکنے کے بعد میں نے اصلی کتاب بھی پڑھ لی بہت سی باتیں جو مسٹر
ولش نے لکھی ہیں اور بہت سے قصے جو انہوں نے نقل کئے ہیں میری رائے میں واضح ہیں
یا ان اقتباسات میں بھی بہت سی غلطیاں ہیں خصوصاً اس سلسلہ میں کہ دلی کے معاہدے کی
بات چیت کے راستے میں اور اس کے بعد کانگریس کی مجلس عاملہ نے کیا کیا اور کیا
نہیں کیا ان کا ایک عجیب سا دعویٰ یہ بھی ہے کہ مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کو ۱۹۳۱ء
میں کانگریس کی صدارت اور پھر اس کی قیادت جو ملی تو وہ گاندھی جی کے مقابل
کی حیثیت سے حاصل کر کے رہے کہ پچھلے پندرہ سال میں گاندھی جی کی حیثیت کانگریس میں
اور ظاہر ہے کہ ملک میں بھی اس سے کہیں بلند رہی ہے جتنی کانگریس کے کسی صدر کی ہوئی
ممکن ہے وہ صدر رہے ہوں یا نہ رہے ہوں ان کا کہنا ہمیشہ مانا گیا ہے۔ انہوں نے جو صدارت
کرنے سے انکار کیا ہے اور اسے ترجیح دی ہے کہ ان کا کوئی دوسرا ساتھی یا چیلا صدر
ہو جائے ہیں جو کانگریس کا صدر ہوا تو تمام تر ان کی ہی وجہ سے۔ دراصل انتخاب
گاندھی جی کا ہوا تھا مگر انہوں نے اپنا نام واپس لے لیا اور میرے انتخاب پر لوگوں کو
مجبور کیا۔ ولبھ بھائی پٹیل کا انتخاب خلاف معمول تھا اس لئے ہم لوگ اس وقت
قید سے چھوٹے تھے اور کانگریس کمیٹیاں اس وقت خلاف قانون جماعتیں تھیں اور
معمولی طور پر کام نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وجہ سے مجلس عاملہ نے کراچی کانگریس کے
صدر کا انتخاب اپنے ذمے لے لیا ساری مجلس نے جس میں ولبھ بھائی پٹیل بھی تھے اتفاقیہ ہوا

وہ اس قسم کی بات کیسے کہہ سکتا ہے۔ میں تو اسے پڑھ کر ششدر رہ گیا۔ پہلے
کبھی اس کا ذکر بھی نہ سنا تھا۔ مگر اس لاعلمی کا سمجھنا تو کچھ مشکل نہیں کہ اس وقت
کے بعد سے میں زیادہ تر قید میں رہا ہوں۔
یہ سازش کرنے والے آخر تھے کون اور ان کا ارادہ آخر کیا تھا کبھی

گاندھی جی سے التجا کی کہ وہ صدارت قبول فرمائیں کہ واقعی طور پر تو وہ سردار تھے ہی اس
مشکل کے سال میں نام کے لحاظ سے بھی کانگریس کے سردار رہتے ہوں۔ لیکن وہ نہ مانے
اور اصرار کیا کہ ولبھ بھائی پٹیل صدارت قبول کریں۔ مجھے یاد ہے کہ اس موقع پر کسی نے گاندھی جی
سے کہا تھا کہ آپ خود ہمیشہ مسولینی کی طرح رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو عارضی طور پر بادشاہ
اور دکھاوے کا سردار بناتے رہتے ہیں۔

یوں تو مسٹر بولٹن کی بہتیری اور غلط فہمیوں سے اس حاشیہ میں بحث کرنی ممکن
نہیں لیکن ذرا شخصی معاملہ ہے۔ اس کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس
بات کا پورا یقین ہے کہ میرے والد صاحب کی سیاسی زندگی میں جو تغیر ہوا تھا اس کی اصل
وجہ یہ تھی کہ ایک بار ان کی کلب میں ان کا انتخاب نہ ہو سکا تھا اور اس وجہ سے وہ سیاست
ہی میں انتہا پسند نہیں ہو گئے تھے بلکہ انگریزوں کی صحبت سے بھی پرہیز کرنے لگے تھے۔
یہ قصہ بارہا بیان ہو چکا ہے مگر ہے بالکل غلط۔ اصلی واقعات کی چنداں اہمیت
نہیں لیکن میں یہاں اس کا ذکر اس لئے کئے دیتا ہوں کہ بات صاف ہو جائے۔
بیرسٹری کے ابتدائی زمانے میں سر جان ایج جو اس وقت الٰہ آباد ہائی کورٹ
کے چیف جسٹس تھے والد صاحب کو بہت چاہنے لگے تھے۔ ایک دفعہ سر جان نے
والد سے کہا کہ الٰہ آباد یورپین کلب میں شریک ہو جاؤ میں خود تمہارا نام رکھنے کے
لئے پیش کروں گا۔ والد صاحب نے ان کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا [illegible]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل ادھی مجلس عاملہ کے انتہا پسندوں میں تھے۔
اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہو نہ ہو موصوف ہی کو اس سازش کے سرغنوں میں گنا گیا
ہوگا۔ حالانکہ شاید ہی سارے ہندوستان بھر میں گاندھی جی کا کوئی اور ساتھی ولبھ بھائی
جیسا وفادار ہو۔ ولبھ بھائی اپنے کام میں ضرور مشغول اور نہ دبنے والے آدمی ہیں مگر

لیکن بتا دیا کہ اس میں لازمی طور پر بڑی دقت ہوگی بہت سے انگریز ان کے ہندوستانی
ہونے کی وجہ سے اعتراض کریں گے اور حکم سے مخالفت میں اسے دس بیس کا کوئی بھی
چھوٹا موٹا افسر اپنے پیسے کے وقت اس کی مخالفت کر سکتا ہے۔ ان حالات میں بہتر یہی ہوگا کہ وہ
اپنا نام اصحاب کے لئے پیش کریں۔ مگر لیکن سر جان نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ وائسرائے کے نام کی تائید الٰہ آباد
کے فوجی حلقے کے بریگیڈیئر جنرل سے کرائیں گے مگر آخر میں یہ معاملہ یوں ہی چھوڑ دیا گیا۔ بار بار اس
لئے پیش نہیں ہوا کہ والد نے صاف کہہ دیا کہ میں اس سلسلے میں اپنی کوئی شکایت کرانے کو تیار
نہیں ہوں۔ اس واقعہ سے ان کے دل میں انگریزوں کی طرف سے تلخی تو پیدا
ہوئی مگر یہ کہ سر جان سے ان کے تعلقات اور گہرے ہو گئے اور اس کے بعد کے
زمانے ہی میں اکثر انگریزوں سے ان کی دوستی ہوئی اور تعلقات بڑھے۔ یہ کوئی ۱۹۱۸ء
کے قریب کی بات تھی اور وہ انتہا پسند سیاسی اور ترک موالات ہوئے کوئی چوتھائی صدی
گزرنے کے بعد جا کر۔ ضرور ہے کہ یہ تبدیلی یکایک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ البتہ پنجاب کے مارشل لا
نے اس میں ذرا جلدی کرا دی اور ٹھیک ہے کہ گاندھی جی کے اثر نے بھی فرق پیدا کیا
مگر پھر بھی ان کا یہ ارادہ کبھی نہ تھا کہ وہ انگریزوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ البتہ جہاں انگریز
زیادہ تر سرکاری عہدہ دار ہی ہوں۔ ہاں ترک موالات اور سول نافرمانی سے لازمی طور
پر ان تعلقات میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔

شخصی طور پر وہ گاندھی جی کے اور ان کے خیالات اور طریقۂ کار کے دلدادہ بھی ہیں
میں اپنے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے بھی گاندھی جی کے خیالات کو انھیں کی
طرح قبول کیا ہے لیکن گاندھی جی کے ساتھ نہایت قریبی طور پر مل جل کر کام کرنے کا شرف
مجھے بھی حاصل رہا ہے اور ان کے خلاف سازش کرنے کا خیال بھی میرے لئے ہر حال میں
ناممکن اور لغو ہے اور میں کیا ساری مجلس عاملہ کا یہی حال ہے۔ یہ مجلس عملاً انھیں کی بنائی
ہوئی ہے انھیں نے چند ساتھیوں کے مشورے سے اسے نامزد کیا تھا انتخاب نو اس
ایک مصالحت کی کارروائی تھی اس مجلس کا بڑا اور بااثر حصہ تو ان اراکین پر مشتمل تھا جو
اس میں برسوں سے کام کر رہے تھے اور اب مستقل سے ممبر سمجھے جانے لگے تھے بے شک
ان میں بھی سیاسی اختلافات تھے نقطۂ نظر کے اختلاف تھے طبیعتوں کے اختلاف
تھے لیکن انھوں نے برسوں ایک ساتھ کام کیا تھا مل کر بوجھ اٹھائے تھے مل کر ہاروں
کو انگیز کیا تھا اور ان باتوں نے انھیں باہم جوڑ سا دیا تھا ان میں دوستی رفاقت اور
ایک دوسرے کی عزت کے رشتے پیدا ہو گئے تھے اور اب یہ مجلس مختلف الخیال لوگوں
کا محض ایک مجموعہ نہ تھی بلکہ ایک نامی وحدت بن گئی تھی اور یہ بات وہم و گمان میں بھی
نہیں آ سکتی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی کسی دوسرے کے خلاف سازش کرے گا گاندھی جی
اس مجلس پر پوری طرح حاوی تھے۔ اور ہر شخص ہدایت کے لئے بس انھیں کی طرف
دیکھتا تھا یہ صورت حال کئی سال سے یوں ہی تھی اور ۱۹۳۷ء کی عظیم الشان کامیابی
کے بعد ۱۹۳۸ء میں تو یہ بات اور بھی صاف دکھائی دیتی تھی۔

اچھا گاندھی جی کو نکال باہر کرنے کی کوشش سے مجلس عاملہ کے ان انتہا
پسندوں کی غرض کیا ہو سکتی تھی؟ شاید یہ سمجھا جاتا ہو گا گاندھی جی چونکہ سمجھوتہ کرنے والے
آدمی ہیں اس لئے، لوگ انھیں راہ میں حائل جانتے ہوں گے لیکن گاندھی جی کی
بغیر یہ تحریک ہی کہاں ہوتی۔ سول نافرمانی کا پتہ کہاں ہوتا، اور ستیاگرہ کا نشان

کہاں رہتا؟ وہ تو خود اس ساری تحریک کے ایک جزو تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ
تحریک ہی وہ تھے۔ جہاں تک اس تحریک کا تعلق تھا سب کچھ ان پر منحصر تھا۔ یہ صرف یہ
کہ قومی تحریک ان کی آفریدہ نہیں تھی۔ وہ کسی ایک شخص پر منحصر ہو سکتی ہے۔ اس کی
جڑیں تو اس سے کہیں زیادہ گہری تھیں۔ مگر تحریک کی یہ خاص شکل جس کا علم سول نافرمانی
بے خصوصیت کے ساتھ ان سے وابستہ تھی۔ ان سے جدا ہونے کے معنی یہ تھے
کہ اس تحریک کی ساری بساط ہی تہہ کر دی جائے۔ اور نئے سرے سے نئی بنیاد ڈال
کر کوئی نئی عمارت کھڑی کی جائے۔ یہ تجویز کسی وقت بھی کی جائے تو خاصی دشوار ہے
۱۹۳۱ء میں تو اس کا خیال بھی کسی کو نہیں آسکتا تھا۔

یہ خیال کر کے بھی ہنسی آتی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ہم میں سے چند ۱۹۳۱ء
میں گاندھی جی کو کانگریس سے نکال باہر کرنے کی سازش کر رہے تھے۔ بھلا ہمیں اس
سازش کی ضرورت ہی کیا تھی جب ایک ذرا سا اشارہ ہی کافی ہوتا۔ گاندھی جی
کی طرف سے جب بھی ذرا یہ ظاہر ہوا ہے کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہونا
چاہتے ہیں تو مجلس عاملہ اور سارے ملک میں تو ہلکہ سا مچ گیا۔ وہ تو ہمارے جہاد
کا ایسا جزو بن گئے ہیں کہ یہ خیال تک برداشت نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے الگ ہو جائیں
گے ہم تو لندن بھیجتے بھی جھجکتے تھے کہ ان کی غیر حاضری میں سارا بوجھ ہم پر آن پڑے
گا اور اس کا خیال بھی ہمیں ہلا دیتا تھا۔ ہم لوگ تو اپنے بوجھ کو ان کے کندھوں
پر منتقل کرنے کے ایسے عادی ہو گئے تھے۔ ہم میں سے بہتوں کے لئے مجلس
کے اندر اور اس کے باہر گاندھی جی سے وابستگی کے رشتے کچھ ایسے تھے کہ ہم
اسے ترجیح دیتے تھے کہ ان کے ساتھ رہ کر ہار جائیں بہ نسبت اس کے کہ ان سے
الگ ہو کر کوئی خاص کامیابی حاصل کر لیں۔

اس بات کا فیصلہ کہ گاندھی جی الجھے دماغ کے آدمی ہیں یا نہیں ہم

دستوروں ہی پر چھوڑتے ہیں۔ بے شک یہ سچ ہے کہ ان کی سیاست کبھی کبھی بہت
ہی فلسفیانہ اور حقائق سے دور ہو جاتی ہے اور اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے مگر انھوں
نے اپنے کو ایک نہایت ہی عملی آدمی ثابت کیا ہے۔ غیر معمولی ہمت اور جرأت کا
آدمی اور ایسا آدمی کہ جو کچھ کہتا ہے اسے کر بھی دکھاتا ہے۔ پھر اگر الجھے ہوئے دماغ
کے ایسے عملی نتائج نکل سکتے ہوں تو یہ الجھاؤ اس عمل سیاست سے کیا برا ہے جو
مطالعے کے کمروں اور خواص کے حلقوں میں شروع ہوتی ہے اور وہیں ختم ہو کر رہ
جاتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان کے لاکھوں پیرو بھی الجھے دماغ کے لوگ ہیں نہ سیاست
کو سمجھتے ہیں، نہ قانون دستوری سے آشنا ہیں۔ وہ سوچتے ہیں تو سیدھی انسانی ضرورتوں
کے اعتبار سے یعنی کھانے پینے، گھر در، کپڑے لتے اور زمین کے اعتبار سے۔
مجھے ہمیشہ اس پر تعجب ہوتا ہے کہ ممتاز پردیسی اخبار نویس، جنھیں فطرت انسانی
کے مشاہدے کی خوب مشق ہوتی ہے یہاں ہندوستان میں آکر کیوں غلطی کر جاتے
ہیں۔ اس کی وجہ کہیں ان کا یہ خیال تو نہیں کہ مشرق میں دنیا ہی نرالی
ہے اسے معمولی معیاروں سے جانچا ہی نہیں جا سکتا۔ یا انگریزوں کے معاملے میں کہیں یہ بات
تو نہیں ہے کہ سامراج سے ان کی نظر میں ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے اور نظارہ کو مسخ کر دیتی
ہے۔ کوئی بات ہو کیسی ہی بعید از قیاس، وہ اسے بلا تعجب کے یقین کر لیتے ہیں۔
اس لیے کہ مشرق کے اسرارستان میں ہر چیز ممکن ہے۔ وہ کتابیں شائع کرتے
ہیں جن میں بہت اچھے تبصرے اور نہایت گہرے مشاہدے بھی ملتے ہیں لیکن
بیچ بیچ میں ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں کہ بس حیرت ہو جاتی ہے۔
مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۱ء میں جب گاندھی جی یورپ جا رہے تھے تو میں نے
لندن کے ایک اخبار میں اس کے پیرس نامہ نگار کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ یہ مضمون
ہندوستان کے متعلق تھا۔ اس میں نامہ نگار نے ایک واقعہ کا ذکر کیا تھا جو

اس کے روبک سنہ ۱۹۲۱ء میں ترک موالات کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ اس وقت جب
شہزادہ ویلز ہندوستان آئے تھے لکھا تھا کہ کسی مقام پر غالباً دہلی میں جہاں گاندھی ایک
مرتبہ بلا اطلاع شہزادے کے سامنے جا پہنچے گھٹنوں پر گر پڑے شہزادے کے پیر
پکڑ لیے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور ان سے التجا کی کہ اس ملک کو
سکون ارزانی فرمائیں۔ ہم میں سے کسی نے، خود غریب گاندھی جی نے یہ قصہ نہ سنا تھا
میں نے اس مضمون نگار صاحب کو خط لکھا اور انہیں یہ بتایا کہ یہ بات بالکل غلط ہے انہوں
نے اس پر افسوس ظاہر کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ انہیں یہ قصہ ایک معتبر ذریعے سے
پہنچا تھا۔ مجھے جس بات پر تعجب ہوا وہ یہ کہ اس مضمون نگار نے ایسے قصے کو بیان کیا اور
حقیقت دریافت کرنے کی ذرا کوشش نہ کی حالانکہ قصہ بدیہی البطلان ہی نہیں بلکہ ایسا تھا
کہ کوئی شخص جو گاندھی جی کو یا کانگریس کو یا ہندوستان کو ذرا بھی جانتا ہو اسے
یقین نہ کرتا۔ بدقسمتی سے بہت سے انگریز جو ہندوستان ہی میں برسوں سے رہتے ہیں کبھی
اس ملک کے متعلق یا کانگریس کے متعلق یا گاندھی جی کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ مگر یہ
قصہ بالکل ہی ناقابل یقین اور مضحکہ خیز تھا جس کے مقابلے میں بس اس طرح کی واقعہ کی روداد
پیش کی جاسکتی ہے جیسے کینٹربری کے لاٹ پادری صاحب یکایک مسولینی کے سامنے
جا پہنچے، سجدہ کیا اور ٹانگیں اوپر اور سلام اور دعا کی جگہ لگے فضا میں اپنی دونوں
ٹانگوں کو حرکت دینے۔

حال ہی میں ایک اور اخبار میں ایک اطلاع شائع ہوئی جس میں ایک اور ہی
قسم کا قصہ پیش کیا گیا ہے کہا گیا ہے کہ گاندھی جی کے پاس بے حساب رقمیں ہیں جن
کا شمار لاکھوں پونڈ تک پہنچتا ہے۔ یہ رقمیں خفیہ طور پر دوستوں کے یہاں رکھی ہیں اور
کانگریس کی ساری سیاست اسی روپیہ پر ہے۔ اگر گاندھی جی کانگریس سے ہٹے تو ڈھیر کے خزانے
ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ یہ افسانہ بھی سراپا لغو ہے۔ اس لیے کہ گاندھی جی کبھی کسی

قسم کا فنڈ اپنی تحویل میں نہیں رکھتے۔ جو وہ اپنے پاس بچا کر کسی دوسرے کے پاس
جو کچھ جمع کرتے ہیں کسی پبلک ادارے کے سپرد کر دیتے ہیں۔ حساب کتاب ٹھیک رکھنے
کے بارے میں ان کی حالت ستھری ہے اور ان کی جمع کی ہوئی رقموں کے حسابات
کی ہمیشہ باضابطہ جانچ ہوتی رہتی ہے۔

یہ افواہ غالباً اس مشہور ایک کروڑ روپیہ والے قصہ پر مبنی ہے جو کانگریس
نے ۱۹۲۱ء میں جمع کئے تھے۔ یہ رقم حروف میں بڑی معلوم ہوتی ہے مگر سارے
ہندوستان پر پھیلائی جائے تو کچھ ایسی بڑی نہیں۔ قومی یونیورسٹیوں، مدرسوں کے لئے
استعمال ہوئی، دیہی صنعتوں خصوصاً کھدر کو فروغ دینے میں یا اچھوتوں کے کام اور
دوسری تعمیری تجاویز کے سلسلہ میں۔ اس میں سے بہت تو پہلے سے مختلف کاموں کے
لئے مخصوص تھی اور یہ فنڈز اب تک موجود ہیں اور ان مخصوص اغراض میں کام آتے ہیں
باقی حصہ مقامی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا گیا تھا اور کانگریس کے تنظیمی اور سیاسی کام پر
صرف ہوا۔ ترک موالات کی تحریک کے مصارف اس سے پہلے اور چند سال بعد تک
کانگریس کا کام بھی اسی روپیہ سے چلا۔ گاندھی جی نے اور ملک کے افلاس نے ہمیں
یہ سکھا دیا ہے کہ ایسی ساری تحریک کو بہت ہی محدود وسائل سے چلائیں۔ ہمارے کام
کا بڑا حصہ تو بلا معاوضہ رہا ہے اور جب کبھی کوئی رقم بقدر معاوضہ دی تو بس مشکل
سے پیٹ بھرنے کے قابل۔ ہمارے بہترین کام کرنے والوں کو یونیورسٹی کے
فارغ التحصیل لوگوں کو جن کے ذمے پورے خاندان کے مصارف بھی تھے ہم
نے اس سے کم دیا ہے جتنا کہ انگلستان میں ایک بے روزگار مزدور کو ڈول الاؤنس
دیا جاتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی سیاسی یا مزدوروں کی تحریک بڑے
پیمانہ پر کہیں بھی اس قدر کم خرچ میں چلی ہے جیسے کہ پچھلے پندرہ برس میں کانگریس کی تحریک
سال بہ سال کانگریس کے تمام حسابات کی باضابطہ علی الاعلان جانچ ہوتی ہے۔ ان کا

کوئی حصہ نہیں رہا ہے سوائے سول نافرمانی کے زمانے میں جب کہ کانگر
خلاف قانون جماعت قرار دیا گیا تھا۔

گاندھی جی لندن کی گول میز کانفرنس میں کانگریس کے تنہا نمائندہ کی ح
سے گئے تھے بہت کچھ بحث مباحثہ کے بعد ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کو
نمائندہ بھیجا جائے کچھ تو اس کی وجہ تھی کہ ہم اپنے بہترین آدمیوں کو اس
میں ہندوستان ہی میں رکھنا چاہتے تھے کہ اس زمانہ میں نہایت ہوشیار
ساری تحریک کو ہاتھ میں رکھنا تھا۔ ہم محسوس کرتے تھے کہ گول میز کانفرنس کے

• اصل مرکز ثقل ہندوستان ہی میں ہے۔ اور ہندوستان میں جو صورت حال
اس کا اثر لازمی طور پر لندن میں پڑے گا ہم چاہتے تھے کہ ناموافق حالات کو
ہوئے ہم رکھیں اور اپنی تنظیم کو درست حالت میں برقرار رکھیں لیکن
ایک نمائندہ بھیجنے کی اصل وجہ یہ تھی اگر ہم ضرورت سمجھتے اور رعایت
تو مزید نمائندے بھی بھیجتے مگر ہم نے قصداً ایسا نہیں کیا

ہم گول میز کانفرنس میں کچھ اس لئے تو شرکت کر نہیں رہے تھے کہ
ملک کی قسمی تفصیلات سے متعلق وہ بحثیں چھیڑیں جو کبھی ختم ہی ہوتے ہیں۔ آ
اس وقت ان تفصیلات میں ہمیں ذرا دلچسپی نہ تھی اور ان پر تو غور اس وقت
تھا کہ برطانوی حکومت سے بنیادی معاملات پر کوئی سمجھوتہ ہو جاتا۔ اصل سوال
کہ جمہوری ہند کو کتنی طاقت منتقل کرتی ہے۔ تفصیلات کو طے کرنے اور انہیں قلمبند
کا کام تو کوئی بھی قانون داں بعد کو کر سکتا تھا ان بنیادی امور میں کانگریس کا
صاف اور سیدھا تھا اور اس میں بحث اور دلیل کی زیادہ گنجائش نہ تھی ہم نے
کہ ہمارے لئے باوقار طریقہ یہی ہے کہ ہمارا بس ایک نمائندہ اور وہ خود ہمارا
ملے اور ہمارے مسلک کو پیش کرکے بتا دے کہ وہ کس قدر معقول ہے اور

حل۔ اور ہو سکے تو اس مسلک کے لئے برطانوی حکومت کی حمایت حاصل کرے۔
کام مشکل تھا، یہ ہم خوب جانتے تھے اور معاملات کی جو صورت اس وقت تھی اس میں
مشکل ہی سے اس کے کرنے کا امکان تھا مگر کیا کرتے کوئی دوسری صورت بھی
ہمارے سامنے نہ تھی۔ ہم اپنے مسلک کو، اپنے اصول کو، اپنے مطمح نظر کو تو چھوڑ نہیں
سکتے تھے ہم ان کے پابند تھے اور ان پر پکا یقین رکھتے تھے۔ اگر حسن اتفاق سے
ان بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ کی صورت نکل آتی تو پھر باقی کام بہت سہل تھا کیونکہ ہم
میں یہ طے ہو چکا تھا کہ اگر سمجھوتہ ہو گیا تو گاندھی جی فوراً مجلس عاملہ کے چند اور
اراکین کو لندن بلا لیں گے تاکہ تفصیلات پر بات چیت میں سب شریک ہو سکیں ہمیں
ہدایت تھی کہ ہم تیار رہیں اور ضرورت ہوتے ہی ہوائی جہاز سے سفر کریں یوں گویا ہفتہ
کے دس دن کے اندر ہم لوگ گاندھی جی کے پاس پہنچ سکتے تھے

لیکن اگر بنیادی باتوں پر سمجھوتہ نہ ہو تو پھر مزید گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
اور کانگریس کو ضرورت ہوتی کہ گول میز کانفرنس میں اور حصہ لینے لہٰذا فیصلہ یہ
ہوا کہ اکیلے گاندھی جی کو بھیجیں۔ مجلس عاملہ کے ایک اور رکن یعنی مسز سروجنی نائیڈو نے
بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ مگر کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں
انہیں ہندوستانی عورتوں کی نمائندے کی حیثیت سے دعوت دی گئی تھی اور
مجلس عاملہ نے انہیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

مگر برطانوی حکومت اس معاملے میں ہماری خواہشوں کو پورا کرنا نہیں چاہتی تھی
اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنیادی امور پر غور و بحث کو ٹال دیں تاکہ کانفرنس کم درجے کی
اور غیر اہم باتوں پر بحث کر کر کے تھک جائے۔ کہیں کوئی اہم معاملہ سامنے
آ ہی گیا تو حکومت ٹال مٹول کرتی رہی۔ اپنے کو کسی بات پر قطعی طور پر پابند نہ کیا۔ اور
بس یہی وعدہ کر دیا کہ مزید غور و خوض کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر کرے گی۔

ن کا ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انھوں نے خوب کھیلا ساری
کانگریس پر ایک یہی مسئلہ حاوی رہا

کانگریس کے ہندوستانی ممبروں میں سے بڑی اکثریت زیادہ تر ارادۃً کچھ بے
ارادہ اس سرکاری چال کا ساتھ دے رہی تھی، اور یہ صحیح تھا بھی کہ لالا ان میں
کون تھا جو اپنی ذات کے سوا اور کسی کا نمائندہ ہو بعض ان میں سے ضرور قابل
اور مشہور لوگ تھے اور بہت سے ایسے تھے جن کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا
سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے یہ لوگ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے سب سے
زیادہ ترقی دشمن عناصر کے نمائندے تھے اور ایسے سخت پسند اور قعر تھے کہ
ہمارے ہندوستانی لبرل تک جو یہاں اس درجہ محتاط اور معتدل لوگ سمجھے
جاتے ہیں وہاں ان کے مقابلے میں ترقی خواہ کی حیثیت سے چمکتے رہے یہ لوگ
ہمارے ملک کے ان اہل غرض گروہوں کی نمائندگی کر رہے تھے جن کا مفاد
برطانوی سامراج سے وابستہ ہے اور اپنی غرضوں کی تکمیل اور تحفظ کے لئے یہ
اسی سامراج کا منہ تکتے ہیں سب سے ممتاز نمائندگی مختلف اقلیتوں اور اکثریتوں
کی طرف سے فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق تھی ان میں اونچے طبقے کے کچھ لوگ تھے
جو کسی کی بات نہیں مانتے اور جن کے متعلق مشہور تھا کہ آپس میں بھی متفق نہیں ہو سکتے
تھے سیاسی لحاظ سے یہ سب کٹر ترقی دشمن تھے اور ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ
کچھ فرقہ داری فائدہ حاصل کر لیں چاہے اس میں ملک کی سیاسی ترقی کو کتنا ہی
سے دبا ہی کیوں نہ پڑے۔ چنانچہ انھوں نے صاف اعلان ہی کر دیا تھا کہ کسی
ایسی کارروائی پر جس سے ملک کو کچھ اور سیاسی آزادی ملے یہ اس وقت تک راضی
نہ ہوں گے جب تک ان کے فرقہ وارانہ مطالبات پورے نہ ہو جائیں کیا نرالا
تماشا تھا۔ اور کیسی تکلیف دہ وضاحت سے یہ بات روشن ہوئی تھی کہ ایک

محکوم قوم کس قدر پیچھے جا سکتی ہے اور کس طرح سے سامراجی بساط کا مہرا بنایا جا سکتا ہے۔ یہ ہنسنے کی بات ہے کہ راجوں مہاراجوں، لاٹ صاحبوں، سروں اور نائٹوں کا یہ انبوہ ہندوستانی قوم کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ گول میز کانفرنس کے اراکین کو برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا اور اپنے نقطۂ نظر سے واقعی خوب انتخاب کیا تھا یہ سب صحیح۔ مگر پھر بھی اس بات سے کہ برطانوی حکام ہمیں یوں برت سکتے اور اپنے کام میں لا سکتے ہیں ہماری قوم کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی اور یہ چلتا تھا کہ ہمیں کس آسانی سے بہکایا جا سکتا ہے۔ اور ایک سے دوسرے کی کوششوں کا کیسے کاٹ کرایا جا سکتا ہے ہمارے اونچے طبقے کے لوگ ابھی تک سامراجی حکمرانوں کی ذہنیت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور انہیں کا کام کرتے ہیں کیا انہیں اس کی حقیقت نہیں دکھائی دیتی؟ یا یہ بات ہے کہ اس کی حقیقت کو جانتے ہیں اور جان بوجھ کر اس لئے اسے قبول کرتے ہیں کہ ملک میں جمہوریت اور آزادی کے قیام سے انہیں ڈر لگتا ہے۔

بہت ہی ٹھیک بات تھی کہ اغراض کے اس ہجوم میں سامراجی منصب داری مالیاتی، صنعتی، مذہبی، فرقہ داری اغراض کے اس جمگھٹ میں برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغا خاں کے حصہ میں آئی تھی۔ اس لئے کہ اغراض کچھ کچھ سب ہی ان کی ذات میں یکجا جمع ہیں ایک نسل سے زیادہ عرصہ سے یہ برطانوی سامراج اور برطانوی حکمراں طبقے کے ساتھ وابستہ رہے ہیں رہتے سہتے بھی زیادہ تر انگلستان ہی میں ہیں یہ ہمارے حکمرانوں کے مفاد اور ان کے نقطۂ نظر کو واقعی خوب سمجھ سکتے ہیں اگر گول میز کانفرنس میں سامراجی انگلستان کی طرف سے یہ آتے تو اس کے نہایت ہی قابل نمائندے ثابت ہوتے۔ مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ ہندوستان کی نمائندگی فرما رہے تھے۔

سو سرس میں ساما مقابل یکسر سعاری تھا اور ہمیں اس سے کوئی زیادہ
توقع بھی نہ تھی ۔ پھر بھی اس کی کامیابی کو دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور عکس آتی
تھی ہم قومی اور معاشی مسائل کی بھی سطح کو کھرچے کی لہو اور صوت موٹ کی
کوششوں کو دیکھتے تھے معاہدوں اور سازشوں اور چالوں کو دیکھتے تھے۔
برطانوی کنسرویٹیو پارٹی کے ترقی پسند حصہ سے اسے بعض اہل وطن کا ساتھ
دیتے تھے چھوٹے چھوٹے معاملات پر لااقوامی کمک سے تھے دیکھتے تھے کہ ملی
معاملات کو کیسے جان بوجھ کر ٹالا جارہا ہے ۔ اور ہمارے ہی آدمی سار کس طرح اہل دوزخ
اور خصوصاً برطانوی سامراج کے ہاتھوں پر کھیل رہے ہیں آپس کی جھک جھک دیکھتے تھے
ور اسی کے ساتھ ساتھ جوش اور دعوتیں اور ماہی مدح ذم کا طوفان شروع ہے
آخر تک مدتوں کی تلاش تھی بڑی ہوں کہ چھوٹی ، ہندوؤں کے لئے مدتیں کرسیاں
مسلمانوں کے لئے مدتیں ہوں اور نشستیں سکھوں کے لئے بھی ہوں ، اینگلو انڈین جماعت
کے لئے بھی و یورپین گروہ کے لئے بھی گر ہوں سماجی طبقہ کے لئے بے چارے
عوام کو اس میں ذرا دخل نہ ہو ایسا الوکھی کا دور دورہ تھا اور مختلف گروہ کھلاڑیاں
کی طرح شکار کی گھات میں سے بس یہی فکر تھی کہ سے دستور اساسی میں کچھ لے مریں۔
خود آزادی کے تصور نے ڈسپلن پر مدت طلبی کی شکل اختیار کرلی تھی ۔۔۔
ہندیانا (Indienisation) کہتے تھے یعنی فوج میں ہندوستانیوں
کو زیادہ مدت ملیں سول سروس میں بھی زیادہ ملیں وغیرہ وغیرہ ۔ خود مختاری حتیٰ
آزادی جمہوری ہند کو طاقت اور اختیار کی منتقلی یا ہندوستانی قوم کے کسی اہم و
ضروری معاشی مسئلہ کے حل کا وہاں ذکر ہی نہ تھا ۔ کیا اسی کے لئے ہندوستان نے
یوں مردانہ وار جدوجہد کی تھی ، اور کیا ایثار و قربانی کی اس لطیف فضا کو کاغذ
کی کثیف پوتے بدلنا ضروری تھا؟

اس کمرے اور بہت موٹے بال میں گاندھی جی بیٹھے تھے کہ دتہا شیشے تھے ان
کا لباس یا بے لباسی انہیں اوروں سے ممتاز کرتی تھی۔ مگر ان میں اور ان کے خوش
لباس ہم نشینوں میں نگاہ اور نقطۂ نظر کا فرق اس سے بھی زیادہ تھا۔ اس کانفرنس
میں ان کی حیثیت بڑی ہی مشکل کی تھی اور ہم یہاں دور سے بیٹھے حیرت کرتے تھے
کہ وہ سے کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن وہ حسرت انگیز صبر کے ساتھ اپنا
کام کئے گئے اور ہم کوشش کرتے رہے کہ سمجھوتہ کی کوئی صورت پیدا ہو۔
انہوں نے ایک خاص بات کی جس نے ایک مرتبہ یہ راز فاش کر دیا کہ فرقہ پرستی
کے پردے میں درحقیقت ترقی دشمنی یہاں ہے کانفرنس کے مسلمان نمائندوں نے
جو فرقہ وارانہ مطالبات پیش کئے تھے گاندھی جی ان میں سے بہتوں کو پسند نہیں
کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اور ان کے مسلمان قوم پرور ساتھیوں کا بھی یہی خیال
تھا کہ ان مطالبات میں سے بعض آزادی اور جمہوریت کی راہ میں حائل ہوں گے
پھر بھی انہوں نے کہہ دیا کہ میں بلا پوچھے گچھے اور بے دلیل و حجت ان سب
مطالبوں کو مان لوں گا۔ اگر مسلمان نمائندے سیاسی مطالبہ یعنی خودمختاری کے
مطالبہ میں میرے ساتھ اور کانگریس کے ساتھ مل جائیں۔

یہ بات انہوں نے بالکل شخصی طور پر کہی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس وقت
تو کانگریس کو اس کا پابند نہیں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ میں
کانگریس کو اس کے تسلیم کرنے پر آمادہ کر دوں گا اور کوئی شخص جو کانگریس میں
ان کی حیثیت کو جانتا ہو شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کانگریس سے اس بات کو منوانے
میں ضرور کامیاب ہو جاتے لیکن ان کی بات کسی نے نہ مانی اور سچ بھی ہے آج ان
کو آزادی ہند کی حمایت میں کمربستہ تصور کرنا بھی ذرا مشکل ہے۔ غرض اس سے ظاہر
ہو گیا کہ جانے وہ فرقہ وارانہ مسائل (؟) کانفرنس پر چھائے ہوئے معلوم ہوں مگر اصل

تت رقہ بندی نہیں ہے اصل میں سیاسی ترقی جتنی راہ میں حائل تھی اور
فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کرتی تھی کانفرنس کے اراکین کو حمایت احتیاط
سے نامزد کرکے برطانوی حکومت نے یہ سارے ترقی دشمن عناصر ایک جگہ جمع
کردئے تھے اور معاملات کا رو وائی چونکہ خود ان کے ہاتھوں میں تھا اس لئے اس
فرقہ وارانہ مسئلہ کو کانفرنس کا اہم مسئلہ بنا دیا تھا اور ایسا مسئلہ کہ جس پر وہ لوگ جو
وہاں جمع تھے کبھی متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے۔
برطانوی حکومت کو اپنی اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور یہ ظاہر
ہوگیا کہ اس کے پاس سلطنت کے قائم رکھنے کے لئے صرف قوت ہی نہیں بلکہ
بلکہ کچھ عرصہ تک سامراجی مفادات کے برقرار رکھنے کے لئے ابھی کافی چالاکی اور
تدبر بھی باقی ہے ہندوستانی قوم ناکام ہوئی ہرچند کہ گول میز کانفرنس اس کی
نمائندہ نہ۔ اس سے اس کی قوت کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ مگر قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ
اپنی کوشش کے مقصود کو متعین کرنے کے لئے جس رہنمائی پس منظر کی ضرورت ہے
وہ اس کے پاس نہ تھا۔ اس نے انہیں بہکا کر غلط راستے پر ڈال دیا احساس
تھا قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اس نے اپنے میں آتنی قوت نہیں پائی کہ حوائل جو
اس کی ترقی میں حائل ہیں انہیں راہ سے ہٹا پھینکے۔ قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اس
میں غلط مذہب کی رہائی ہے اور اس میں فرقہ وارانہ جذبات کو حمایت کافی
سے ابھارا جا سکتا ہے مختصر یہ کہ قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ وہ ابھی اتنی آگے
بڑھی تھی اور ابھی اتنی منظم نہ تھی کہ کامیاب ہوتی۔
خود اس گول میز کانفرنس میں کامیابی اور ناکامی کا کوئی سوال نہ تھا اس
سے ایسی زیادہ امیدیں نہ تھیں مگر پھر بھی اس سے ایک فرق ضرور پیدا ہوا اس
سے پہلے جو کانفرنس ہوئی تھی ایسی قسم کی پہلی کانفرنس اس کی طرف ہندوستان

میں زیادہ توجہ کی گئی نہ اور کہیں۔ اس لئے کہ اس وقت سب کا دھیان سول نافرمانی کی تحریک میں لگا تھا۔ برطانوی حکومت کے نامزد کئے ہوئے لوگ جب ۱۹۳۰ء کی کانفرنس کو جاتے تھے تو کالی جھنڈیوں کے جلوس اور ذمت کی آوازوں کے ساتھ انہیں رخصت کیا گیا تھا لیکن ۱۹۳۱ء میں بات ہی کچھ اور تھی۔ اور یہ فرق اس لئے تھا کہ اس مرتبہ گاندھی جی کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے ایک قائد کی حیثیت سے جن کی پیروی لاکھوں آدمی کرتے تھے اس وجہ سے کانفرنس کا رنگ نرالا تھا اور ہندوستان کے لوگوں کو اسکی کارروائی سے بہت زیادہ دلچسپی ہو گئی۔ اس کی ناکامی، چاہے اس کا سبب کچھ بھی ہو ہندوستان کی مخالف پڑتی تھی۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ برطانوی حکومت کو گاندھی جی کی شرکت پر اتنا اصرار کیوں نہ تھا۔

کانفرنس خود تو اپنے سارے بار بار، ضیع الوقتی اور بے سود بے راہ روی کے باوجود، ہندوستان کے لئے ناکامی نہ تھی۔ نہ تو ساری ہی اس طرح گئی تھی کہ ناکام ہوا اور اس کی ناکامی کی ذمہ داری ہندوستانی قوم پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہاں اسے یہ کامیابی ضرور ہوئی کہ اس سے ہندوستان کے اصل مسائل کی طرف سے دنیا کی توجہ ہٹا دی۔ اور خود ہندوستان کے اندر اس سے مایوسی، ہراس اور ذلت کا احساس پیدا ہوا۔ اس سے ترقی دشمن قوتوں کو ایک سہارا ملا اور وہ اس قابل ہوئیں کہ پھر ذرا سر اٹھائیں۔

ہندوستان کے لوگوں کو کامیابی یا ناکامی تو ہندوستان کے واقعات سے حاصل ہو سکتی تھی۔ دور دراز لندن کے بازار سے قومی تحریک کچھ کھلا تو سکتی نہ تھی۔ ہندوستانی قومی تحریک یہاں کے متوسط طبقے اور یہاں کے کسانوں کی ایک حقیقی اور فوری ضرورت ہے اور نہ اس کے ذریعہ ایسے مسائل

کامل تلاش کر رہے ہیں اس نے یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تحریک کامیاب ہو کر
اپنا مقصد پورا کر دے اور اس کی جگہ کوئی دوسری ایسی تحریک لے لے
جو قوم کو ترقی اور آزادی کی جانب بڑھا کر آگے لے جائے۔ یا پھر سے کچھ
دنوں کے لئے دبایا جا سکتا ہے۔ یہ کشمکش ہندوستان میں فوراً ہی شروع
ہونے کو تھی اور اس کا نتیجہ سیاسی طور پر ہماری شکست ہونے کو تھا۔ مگر
دوسری گول میز کانفرنس کا اس کشمکش کے شتے پر جو اثر ہو سکتا تھا۔
ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے ہمارے اندر ایک خلا پیدا کر دی۔

صوبجات متحدہ کے کسانوں کی پریشانیاں

کانگریس کے جنرل سکریٹری اور مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے مجھے کام ہندوستانی سیاست سے تعلق تھا۔ کبھی دورے بھی کرنے پڑتے تھے، مگر جہاں تک بن پڑتا میں ان سے بچتا تھا۔ ذمہ داریاں بڑھیں تو مجلس عاملہ کے جلسے بھی جلدی جلدی ہونے لگے اور آخر میں تو بالعموم دو دو ہفتے کے اجلاس کی نوبت آگئی۔ بات یہ تھی کہ اب جس تقسیم قراردادیں منظور کرنے کا معاملہ تو تھا ہی ایک وسیع اور متنوع نظام کے مختلف تعمیری کاموں کو چلانا تھا اور روز ایسے مشکل مسائل سے سابقہ تھا۔ مگر یہ بات ظاہر تھی کہ عام پیمانہ پر کشمکش شروع ہو کر رہے۔

مگر میرا خاص کام صوبۂ متحدہ میں تھا یہاں کسانوں کی پریشانیوں نے کانگریس کی تمام تر توجہ کو جذب کر رکھا تھا۔ صوبہ کی کانگریس کمیٹی میں کوئی ۵۰ سے اوپر رکن تھے اور ہر دوسرے تیسرے مہینہ ان کا جلسہ ہوا کرتا تھا اس کی مجلس انتظامیہ میں کوئی ۱۵ رکن تھے۔ اس کے جلسے بھی جلد جلد ہوتے تھے اور کانگریس کا دہی شعبہ انھیں کے ہاتھ میں تھا۔

۱۹۳۱ء کے نصف آخر میں اس مجلس نے ایک خاص دیہی کمیٹی مقرر کردی تھی۔ اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس مجلس انتظامیہ اور دیہاتی کمیٹی سے برابر بہت سے زمیندار خاص طور پر وابستہ تھے۔ چنانچہ جو کچھ کہا گیا ان کی منظوری سے کیا گیا یہی نہیں بلکہ اس سال ہماری صوبہ کانگریس کمیٹی کے صدر (اور اس

عہدہ کی وجہ سے اس کی مجلس انتظامیہ اور دیہی کمیٹی کے صدر مسٹر تصدق حسین خاں شیروانی تھے جو ایک مشہور زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ہمارے جنرل سکریٹری مسٹر پرکاش جی۔ اور مجلس انتظامیہ کے بہت سے ممتاز رکن خود زمیندار تھے یا زمینداری خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی ممبر متوسط طبقہ کے پیشہ ور لوگ تھے صوبہ کی مجلس انتظامیہ میں ایک بھی آسامی یا غریب کسان نامزد نہ تھا۔ کسان ہماری ضلع کی کمیٹیوں میں ضرور ہوتے تھے لیکن صوبہ کی مجلس انتظامیہ تک پہنچنے کے لئے جو کئی انتخابات ہوتے ہیں۔ یہ غریب ان سے نکل کر آگے نہیں بڑھ پاتے تھے چنانچہ ہماری مجلس انتظامیہ میں تمام تر متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کا غلبہ تھا اور اس میں زمینداروں کی بھی کافی آمیزش تھی اس لئے کسی معنی میں بھی یہ انتہا پسند جماعت نہ تھی اور کسانوں کے مسئلہ پر تو ہرگز نہیں۔

صوبہ میں میری حیثیت بس مجلس انتظامیہ اور دیہی کمیٹی کے رکن کی تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ باہمی مشوروں اور مجلس کے دوسرے کاموں میں خوب حصہ لیتا تھا مگر میرے کام کو رہنمائی کا کام کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے صوبہ میں تو کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رہنمائی کی۔ اس لئے کہ ہم لوگوں نے عرصہ سے مل جل کر کام کرنے کا خوگر بنا لیا تھا اور ہمارے یہاں زور بیشتر نظام پر دیا جاتا ہے فرد پر نہیں سال بھر کے لئے جو صدر ہوتا وہ نامی طور پر ہمارا سردار ہوتا اور ہماری نمائندگی کرتا تھا مگر خود اس کو بھی کوئی خاص اختیار حاصل نہ تھا

میں مقامی طور پر الہ آباد ضلع کی کانگریس کمیٹی کا رکن بھی تھا۔ دیہی مسئلہ کی نشوونما میں اس کمیٹی نے اپنے صدر پرشوتم داس ٹنڈن کی قیادت میں بڑا اہم حصہ

نا تھا ۱۹۳۱ء میں اسی ٹیکس دینے کی تحریک شروع کی تھی - وجہ یہ تھی کہ الٰہ آباد کے مسائل میں زمینداروں کا اثر کچھ اور جگہ سے زیادہ تھا۔ یوں تو اودھ کے تعلقداری اضلاع کی حالت کیسی ابتر تھی۔ بات اصل یہ تھی کہ الٰہ آباد کا ضلع زیادہ منظم تھا اور یہاں سیاسی احساس زیادہ تھا اس لئے کہ الٰہ آباد شہر سیاسی کاموں کا مرکز تھا اور ممتاز کام کرنے والے اکثر آس پاس کے گاؤں میں جاتے رہتے تھے ۔

مارچ ۱۹۳۱ء میں دہلی کے سمجھوتہ کے فوراً ہی بعد ہم نے دیہات میں چھپے ہوئے اعلان بھیجے اور اپنے کام کرنے والے بھی کہ کسانوں کو بتا دیں کہ سول نافرمانی اور سیاسی تحریک روک دی گئی ہے - لہذا سیاسی وجہ سے لگان ادا کرنے میں اب کوئی چیز مانع نہیں ہے - اور انھیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ لگان ادا کر دیں ساتھ ہی یہ سرور کہہ دیا تھا کہ چونکہ قیمتوں میں بے حساب کمی ہو گئی ہے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ انھیں بہت کچھ چھوٹ ملنی چاہئے - اور یہ تحریک تھی کہ ہم سب مل کر اس چھوٹ کے حاصل کرنے کی کوشش کریں - معمولی زمانہ میں بھی لگان کا بوجھ اکثر ناقابل برداشت ہوتا تھا لیکن اب تو نرخوں کے یوں گرنے سے بالکل ناممکن ہو گیا تھا کہ پورا لگان یا اس کے کچھ بھی الگ بھگ ادا کیا جا سکے - ہم نے کسانوں کے ساتھ ان سے مل کر مشورے کئے اور آزمائشی طور پر یہ تحریک کی کہ پچاس فیصدی اور بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ کی چھوٹ لگان میں دی جائے ۔

ہماری کوشش تھی کہ کسانوں کے مسئلہ کو عام سول نافرمانی کے مسئلہ سے بالکل الگ کر دیں کم سے کم ۱۹۳۱ء میں ہماری خواہش یہ تھی کہ اس مسئلہ کو سیاست سے جدا کر کے خالص معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے - یہ بات تھی مشکل اس لئے کہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور پہلے بھی یہ دونوں پہلو باہم وابستہ رہ چکے تھے ہم لوگ خود بحیثیت کانگریس کے بالکل سیاسی جماعت

تے ۔ وقتی طور پر ہم ضرور یہ کوشش کر رہے تھے کہ کسانوں کی یونین کا کام کریں اس پر تالو غیر کسانوں تک زمینداروں تک کا تھا ، مگر ہم ۔ اب سیاسی رنگ کو چھوڑ سکتے تھے ۔ یہ چھوڑ نا ان سے تھے ادھر حکومت تو کہ ہمارے سب کاموں کو سیاسی کام گردانتی تھی ۔ آنے والی سول نافرمانی کا سایہ آگے آگے چلا دکھائی دیتا تھا اور اگر وہ وقت آئی تو اس میں کیا شک تھا کہ سیاست اور حیثیت دست در دست آگے رہیں ۔

ان تمام کھلے ہوئے موانع کے باوجود دہلی کے سمجھوتہ کے بعد سے برابر ہماری یہ کوشش رہی کہ ہم کسانوں کے مسئلہ کو سیاسی کشمکش سے الگ رکھیں اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ دہلی کے سمجھوتہ نے اس مسئلہ کو طے نہیں کیا تھا اور ہم اس بات کو حکومت اور قوم دونوں پر پوری طرح واضح کر دینا چاہتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ دہلی کی بات چیت کے وقت گاندھی جی نے لارڈ ارون کو یقین دلایا تھا اگر میں گول میز کانفرنس میں بھی گیا تو بھی کانفرنس کے دوران میں سول نافرمانی شروع نہ کروں گا اور کانگریس سے خواست کروں گا کہ کانفرنس کو پورا موقع دے اور اس کے نتیجہ کا انتظار کرے لیکن اس وقت بھی گاندھی جی نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ اس وعدہ کا اطلاق کسی ایسی مقامی کشمکش پر نہ ہوگا جس پر کہ ہم بعد کو مجبور ہوں صوبجات متحدہ کے کسانوں کا مسئلہ تو اس وقت ہم سب کے سامنے ہی تھا اس لئے کہ یہاں منظم کاروائی ہو چکی تھی ورنہ واقعہ یہ ہے کہ سارے ہندوستان میں کسانوں کی حالت یہی تھی ۔ شملہ کی گفتگو میں گاندھی جی نے اس بات کو پھر دہرایا تھا اور اس کا ذکر شائع شدہ خط و کتابت میں آچکا ہے[1] میں اس وقت کہ وہ یورپ

---

[1] دہلی کے خطوط، ۲۷ اگست والے شملہ کی مفاہمت نامہ کا جزو تھے (ملاحظہ ہو صفحہ ۲)

چاہتے تھے گاندھی جی نے یہ بات کہ گول میز کانفرنس سے ان سیاسی مسائل سے
قطع نظر کانگریس کو اس بات کی ضرورت ہو سکتی ہے کہ معاشی کشمکش میں وہ قوم
کے اور خصوصاً کسانوں کے حقوق کی حفاظت کیے۔ انہیں اس کشمکش میں پڑنے
کی خواہش نہ تھی بلکہ وہ تو اس سے بچنا چاہتے تھے۔ لیکن اگر یہ ناگزیر ہو جائے تو
پھر تو کرنا ہی چاہیے کہ ہم قوم کے عوام کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کا کہنا تھا کہ دلی کا

مسٹر گاندھی بنام مسٹر ایمرسن سیکرٹری ہوم ڈپارٹمنٹ حکومت ہند

شملہ

۲۰ اگست ۱۹۳۱ء

ڈیئر مسٹر ایمرسن،

آپ کا آج والا خط ملا جس کے ساتھ آپ نے ایک نیا مسودہ بھیجا ہے۔ اس کا
شکریہ۔ سر کاؤس جی نے بھی مجھے ان ترمیموں کی اطلاع دی تھی جو آپ نے تجویز کی ہیں
میرے ساتھیوں نے اور میں نے اس ترمیم کیے ہوئے مسودہ پر غور کر لیا ہے۔ مندرجہ
ذیل اصلاحات کے ساتھ ہم اسے قبول کرنے کو تیار ہیں۔

پیراگراف ۱۱ میں میرے لیے ممکن نہیں کہ میں کانگریس کی طرف سے اس بات کو
قبول کر لوں جو حکومت نے پیش کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیال میں اگر سمجھوتہ پر کاربند
ہونے کے سلسلہ میں کانگریس کی راستے میں کوئی شکایت پیدا ہو تو اس کی تحقیقات تو
لازم ہی ہے اس لیے کہ جب تک دلی کا سمجھوتہ نافذ ہے سول نافرمانی مسدود ہے لیکن اگر
حکومت ہند یا صوبائی حکومتیں تحقیقات کو منظور نہ کریں تو میرے ساتھی اور میں اس وجہ کے
رکھے بلا اعتراض نہ کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس ان دوسرے معاملات کے متعلق
جو اس کی طرف سے اب تک اٹھائے جا چکے ہیں تحقیقات پر تو اصرار نہ کرے گی لیکن اگر

سمجھوتہ جو عام اور سول نافرمانی سے متعلق ہے ہمیں اس سے نہیں روک سکتا
میں اس بات کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی اور اس
کے رہنماؤں کے سر اریہ الزام لگایا گیا ہے کہ ٹیکس روکنے کی مہم شروع کرکے انھوں
نے دہلی کے سمجھوتہ کو توڑ دیا ۔ الزام لگانے والوں کو الزام لگانے میں یہ

بدقسمتی سے کوئی شکایت اس قدر شدت سے پیدا ہوئی کہ سمجھوتہ ہونے کی صورت میں
کانگریس سے استدعا کی جائے کہ تلافی کی کوئی دوسری تدبیر براہ راست مدافعانہ عمل کی قسم سے تلاش کرے تو اس
وقت کانگریس اس تدبیر کے اختیار کرنے کے لئے آزاد سمجھی جائے گی ہر چند سول نافرمانی سدکی جا چکی ہو
میں حکومت کو اس بات کا نقص دعوے کی حد تک صورت نہیں سمجھا کہ کانگریس برابر کوشش
کرنے لگی کہ سوائے دست کار روائی سے بچے اور باہمی بحث وگفتگو ترغیب وغیرہ سے کام نکالے بیان
جو کانگریس کے نقطہ نظر کا اظہار کر دیا گیا وہ اس لئے کہ آئندہ غلط فہمی نہ ہو اور کانگریس پر عہد
شکنی کا الزام نہ لگایا جائے ۔ اگر اس وقت کی گفتگوئیں کامیابی کے ساتھ ختم ہوں تو میں سمجھتا
ہوں کہ سرکاری بیان یہ خط اور یہ کاجواب سب ایک ساتھ شائع کر دیئے جائیں گے آپ کا مخلص
م ک گاندھی

مسٹر ایمرسن بنام مسٹر گاندھی ؛

شملہ
۲۷ راگست ۱۹۳۱ء

ڈیر مسٹر گاندھی! آپ کے آج والے خط کا شکریہ جس میں آپ نے
سرکاری بیان کے مسودوں کو قبول فرمالیا ہے ان ملاحظات کے ساتھ جو آپ کے خط میں
درج ہیں۔ گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل نے نوٹ فرمالیا ہے کہ کانگریس کا ارادہ ان
معاملات کی تحقیقات پر اصرار کرنے کا نہیں ہے جو اب تک واقعہ ہو چکے ہیں ملاحظہ ہو

سہولت تھی کہ جس کے خلاف الزام تھا اور جو اس کا جواب دے سکتے تھے وہ سب قید خانوں میں سڑ رہے تھے اور ہر اخبار اور ہر مطبع پر سخت سرکاری نگرانی تھی۔ اس واقعہ سے بالکل قطع نظر کہ ۱۹۳۱ء میں سوائے یو۔ پی کے کانگریس نے ٹیکس نہ دینے کی کوئی مہم سرے سے شروع ہی نہیں کی۔ میں جس بات کو صاف کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ معاشی غرض کے لئے سول نافرمانی سے الگ ایسی کوئی تحریک شروع کی جاتی تو اس سے دہلی کے سمجھوتہ کی خلاف ورزی نہ ہوتی خود حالات کی بنا پر ایسا کرنا حق بجانب ہوتا یا نہ ہوتا یہ دوسری بات ہے مگر کسانوں کو اس تحریک کے شروع کرنے کا ایسا ہی حق ہے جیسا اپنی معاشی شکایات رفع کرنے کے لئے کسی کارخانے کے مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا ہوتا ہے دہلی سے کر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۲) اس کی طرف سے اٹھائے گئے ہیں جہاں آپ یہ یقین دلاتے ہیں کہ کانگریس برابر اس بات کی کوشش کرے گی کہ براہ راست کارروائی سے احتراز کرے اور باہمی بحث و مباحثہ ترغیب اور اسی قسم کی تدابیر سے مداوا کیا ہے اسی کے ساتھ آپ ان آئندہ کارروائیوں کے متعلق کانگریس کی حیثیت کو واضح کر دینا چاہتے ہیں جس کے اختیار کرنے کی کبھی آگے جا کر ضرورت پڑ سکتی ہے۔ مجھے عرض کرنا ہے کہ گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل اس امید میں آپ کے ہم نوا ہیں کہ کوئی براہ راست کارروائی نہ کی جائے گی حکومت کے عام رویہ سے متعلق حضور وائسرائے بہادر کے اس خط کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو ۱۹ اگست کو آپ کے نام ارقام فرمایا تھا۔ مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ سرکار کا بیان آپ کا آج والا خط اور اس کا یہ جواب حکومت کی طرف سے سب ساتھ ساتھ شائع کر دیئے جائیں گے۔

آپ کا مخلص

ایچ، ڈبلیو، ایمرسن

تب تک ہمارا کسان یہی تھا اور حکومت کہتی رہی ۔ سب ٹھیک ٹھاک ہی تھی ۔

۱۹۲۹ء میں اور اس کے بعد زرعی قیمتوں میں جو سخت اتار ہوا وہ گھٹتے ہوئے حالات کی آخری منزل تھی ۔ پہلے کئی سال تک تو زرعی پیداوار کی قیمت اور ہندوستانی زراعت چونکہ دنیا کی منڈی سے وابستہ ہے اس لئے اس بحران میں شریک رہی ۔ ساری دنیا میں صنعت اور زراعت کے درمیان نشوونما کا جو تناسب تھا اس نے ہر جگہ زرعی پیداوار کی قیمتوں کو چڑھا دیا تھا ۔ ہندوستان میں بھی قیمتیں چڑھیں تو سرکاری مال گذاری اور زمینداری لگان بھی بڑھا اور بڑھتے ہوتے دانوں کو قیمتوں کے اس بڑھنے سے مشکل کوئی فائدہ پہنچا لیکن خود کاشت کسانوں کو چھوڑ کر عام طور سے تو کسانوں کی حالت کچھ ابتر ہوئی ۔ صوبجات متحدہ لگان مالگزاری سے کہیں زیادہ تیزی سے بڑھا ۔ ان دونوں میں اضافہ کی ابتدا نسبت اس صدی کے پہلے ۲۰ برس (میں حافظہ سے لکھتا ہوں) پانچ اور ایک کی نسبت سے ۔ یوں اگرچہ اس سے حکومت کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوا زمیندار کی آمدنی میں اس سے سب زیادہ ہوا اور بے چارہ کسان بدستور طرح اسی مفلسوں والی سطح پر رہا ۔ کہیں قیمتیں کم بھی ہوئیں یا مقامی قدرتی مصیبت کا سامنا رہا جیسے خشک سالی، طغیانی، ٹڈی دل، اولے وغیرہ تو بھی لگان اور مالگزاری وہی رہی ۔ کہیں کچھ چھوٹ دی بھی گئی تو بہت رک رک کر اور کبھی ایک فصل کی یوں تو شروع سے اچھے زمانے میں بھی لگان ضرورت سے زیادہ تھا ۔ پھر وقت ذرا بگڑا تو مہاجن کی مدد کے بغیر یہ مطالبہ ناقابل برداشت ہو گیا اور بیاج قرض خوب بڑھا ۔

سارے زرعی طبقے، زمیندار، مالک آراضی کسان اور آسامی سب کے سب مہاجن کا شکار رہے اس لئے کہ مہاجن ان حالات میں گاؤں کی ابتدائی معیشت

میں ایک لازمی فرض انجام دے رہا تھا چنانچہ اس فرض کی انجام دہی میں اس نے
خوب خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور زمین سے تعلق رکھنے والوں پر اس کی گرفت
اور بھی مضبوط ہو گئی۔ روک ٹوک اس پر کچھ تھی نہیں قانون تھا سو اس کا مددگار۔
بس اپنے معاہدے کے لفظوں پر اڑتا اور شائلاک یہودی کی طرح بس اپنے پونڈ بھر
گوشت کا مطالبہ کرتا اور پاتا تھا۔ رفتہ رفتہ زمین بھی اس کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔
چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کسان مالکان آراضی کی زمین اور یہ مہاجن صاحب
خود ایک بڑے مالک آراضی، زمیندار اور طبقہ اشراف کے رکن کی حیثیت سے
نمودار ہوئے۔ کسان مالک آراضی جواب تک خود اپنی زمین جوتتا بوتا تھا اب اس
نئے زمیندار یا ساہوکار کا غلام بن گیا۔ اسامیوں کا حال کچھ اس سے بھی برا تھا۔ یہ
بھی یا تو ساہوکار کے غلام تھے یا نئے زمیندار کی بڑھتی ہوئی فوج میں
شامل تھے۔ اس مہاجن یا ساہوکار کو جو اب زمیندار بن بیٹھا تھا زمین سے یا
اسامیوں سے کوئی رہا تعلق نہ تھا۔ یہ عموماً شہر کا رہنے والا ہوتا تھا وہیں اپنا لین دین
کا کاروبار کرتا لگان جمع کرنے کا کام اپنے کارندوں پر چھوڑ دیتا اور یہ اس کام کو
منیموں کی سی بے دردی اور بے رحمی سے انجام دیتے۔

دیہی قرض کا اس طرح بڑھنا خود اپنی جگہ پر نظام زرعی کے غلط اور ناپائدار
ہونے کا ثبوت ہے۔ آبادی کی بڑی اکثریت کے پاس کسی قسم کا پس انداز نہیں
جسمانی نہ مادی۔ نہ اس میں مقابلے کی طاقت بس فاقہ اور بھوک کے کنارے زندگی
ہے۔ ناموافق قسم کا کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا تو نہ اس کی تاب کیسے لائیں کوئی
وبا آ جائے تو لاکھوں کو ختم کر جائے سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۳۰ء میں خود سرکار کی مقرر
کی ہوئی صوبجاتی ساہوکارہ کی تحقیقاتی کمیٹی نے تخمینہ کیا تھا کہ ہندوستان
بھر کا جس میں برما بھی شامل ہے دیہی قرضہ ۸۷۰ کروڑ روپیہ ہے۔ اس میں سارا

یہ ایک موٹا سا معیار تھا اور اس سے جانچا اس لئے بھی مشکل تھا کہ آسامیوں کی بہت سی قسمیں تھیں۔ موروثی، غیر موروثی، سکمی وغیرہ اور سب سے زیادہ حیثیت میں وہ تھے جو سب سے نیچے درجے میں تھے۔ اس کے علاوہ بس ایک معیار اور تھا اور بلاشبہ وہی سب سے زیادہ معقول معیار تھا یہ کہ کسان کے مصارف پیداوار اور اس کی اجرت کو منہا کر دینے کے بعد اس کی لگان ادا کرنے کی صلاحیت کو دیکھا جائے۔ لیکن اس دوسرے معیار سے تو ہندوستان کا امت کچھ زرعی کاروبار بالکل غیر معاشی ہو جاتا ہے۔ چاہے آپ کسان کی زندگی گزارے کے مصارف کو کتنا ہی کم کیوں نہ مانئے اور جیسا کہ ہم نے ۱۹۳۱ء میں صوبجات متحدہ کی چند مثالوں سے ظاہر کیا تھا۔ بہت سے کسان لگان ادا کرہی نہیں سکتے حتیٰ کہ اپنی املاک نہ بیچیں (اگر کچھ بیچنے کو ہو) یا بہت زیادہ شرح سود پر روپیہ ادھار نہ لیں۔

ہمارے صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے پہلی اور گویا آرائشی تجویز جو کی وہ یہ کہ موروثی آسامیوں کو عام طور پر ۵۰ فی صدی کی چھوٹ ملے اور دوسرے آسامیوں کے لئے جس کا حال ان سے بھی گیا گزرا تھا۔ اس سے بھی زیادہ جب گاندھی جی مئی ۱۹۳۱ء میں صوبجات متحدہ میں آئے اور گورنر سر میلکم ہیلی سے ملے تو اس وقت ان میں کچھ اختلاف رائے تھا اور وہ دونوں کسی ایک بات پر متفق نہ ہو پائے تھے۔ اس کے جلد ہی بعد گاندھی جی نے صوبہ کے زمینداروں اور اسامیوں کے نام اپیلیں شائع کیں آسامیوں والی اپیل میں انھوں نے کہا تھا کہ جس قدر ادا کر سکتے ہو ادا کر دو اور کچھ حساب بھی بتایا تھا جو اس عدد سے جو ہم پہلے پیش کر چکے تھے کچھ زیادہ ہوتا تھا ہمارے صوبے کی کمیٹی نے گاندھی جی والے حساب کو منظور کر لیا مگر اس سے بھی کچھ زیادہ کام نہ چلا۔ اس لئے کہ حکومت نے تو

اسے بھی۔ ۱۱

اس میں شک نہیں کہ صوبہ کی حکومت بڑی مشکل میں تھی۔ مالگذاری اس
کی آ۔ بی کا خاص جزو تھا۔ اسے جانے ہو جانے دے یا بہت گھٹ دے تو
دیوالے کا سامنا۔ دوسری طرف اسے ابھی سے عیسیٰ کا ڈر بھی تھا۔ اور جہاں تک
ہو سکتا تھا لگان میں چھوٹ دے کر کسانوں کو خوش بھی کرنا چاہتی تھی دونوں باتوں
کا ایک ساتھ کرنا سہل نہ تھا۔ حکومت اور کسان کے بیچ میں تھا زمیندار ساتھی لحاظ
سے بالکل بے سود اور غیر ضروری اسامی۔۔ ہو سکتا تھا کہ اس سے کچھ لے کر حکومت
اور کسان دونوں کا کام چل جائے لیکن برطانوی حکومت جیسی کچھ کرے اس کے
ساتھ میں ہی کتنے ملتے ۔۔۔ اپنے سیاسی مفاد کی خاطر ان کو کہا بھی اس سے لیٹے
ہوئے میں کس طرح دھکا سکتی تھی۔

آخر کار صوبہ کی حکومت نے زمینداروں اور آسامیوں دونوں کے لئے
چھوٹ کا اعلان کیا۔ اس چھوٹ کا حساب ایک پیچیدہ سے قاعدہ پر تھا۔ اور
پہلے پہل تو یہ سمجھنا بھی دشوار تھا کہ کتنی چھوٹ ملی۔ یہ بات البتہ صاف تھی کہ جتنی چھوٹ
ملی چاہئے تھی اس سے بہت کم تھی اس کے علاوہ اس چھوٹ کا تعلق بس اس
وقت کے مطالبہ سے تھا اور کسان پر جو بقایا تھا یا جو قرض تھا اس کا ذکر ہی
نہ تھا۔ بات بالکل صاف تھی کہ اگر آسامی اس ایک ششماہی کا لگان ادا نہیں
کر سکتا تو پچھلے برسوں کا بقایا اور قرضہ تو اور بھی نہ دے پائے گا اور زمیندار
کا طریقہ معمولاً یہی تھا کہ جو کچھ وصول ہوتا ہے اسے پہلے بقایا کی وصولی میں
ڈال دیتے تھے آسامی کے نقطۂ نظر سے اس میں بڑا خطرہ تھا اس لئے کہ اس
غریب پر ہر وقت مقدمہ چل سکتا تھا اور واجب الادا رقم کا کوئی حصہ بھی اگر ادا
ہونے سے رہ گیا تو اسے بے دخل کرایا جا سکتا تھا

صوبہ کانگریس مجلس انتظامیہ سخت مشکل میں پڑ گئی تھی ہمیں یقین تھا کہ اسامیوں
سے جو سلوک ہو رہا ہے نا روا ہے لیکن ہم بے بس تھے اور اب یہ ذمہ داری نہ
لینا چاہتے تھے کہ کسانوں سے کہہ دیں کہ جاؤ کچھ ادا نہ کرو۔ ہم تو بس یہی کہتے
رہے کہ جس قدر بھی ادا کر سکتے ہو کر دو۔ ہاں ان کی مصیبت میں عام طور سے
ہمدردی کرتے اور ان کی ڈھارس ضرور بندھاتے رہے کیونکہ ان کے اس خیال سے
بالکل متفق تھے کہ چھوٹ کے بعد بھی مطالبہ بہت زیادہ ہے۔

اب وہ وقت آیا کہ حکومت کی طرف سے قانونی اور غیر قانونی شکل میں اپنا کام
شروع کیا۔ ہزاروں کے خلاف بے دخلی کے مقدمات دائر ہوئے۔ گھر، میل،
تحصیل وصول کی ترقی ہونے لگی۔ زمینداروں کے آدمیوں نے ٹھکائی شروع
کی۔ نتیجہ یہ آسامیوں نے مطالبہ کا ایک حصہ بھی ادا کر دیا۔ اور ان کا کہنا تھا کہ جتنا
دے سکتے تھے سب دے دیا۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس سے زیادہ بھی
ادا کر سکتے ہوں مگر یہ بات بالکل صاف تھی کہ بڑی اکثریت کے لئے مطالبہ
بہت زیادہ تھا اور یوں تھوڑا تھوڑا لگان ادا کرکے بھی اصل حساب بقایا کا
بھاری بھرکم رولر تھا کہ بڑھا چلا جا رہا تھا اور جو راہ میں آتا اسے روندتا
چلا جاتا تھا۔ بے دخلی کے مقدمے دائر ہوئے تھے چاہے لگان کا ایک حصہ دیا
بھی جا چکا ہو۔ شخصی املاک اور مویشی کی قرقیاں اور نیلام جاری تھے۔ آسامی
اگر کچھ ادا نہ کرتے تو بھی اس سے برے حال میں تو نہ ہوتے کچھ اچھے ہی
رہتے۔ اس لئے کہ کم سے کم وہ روپیہ تو بچ رہتا جو لگان میں
ادا کر دیا۔

ہمارے پاس کسان جوق جوق آتے تھے یہ بتاتے کہ آپ کہا
تھا جو دے سکتے تھے دے دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ لگان ادا کر کے مصیبت۔

ہزاروں کسانوں پہ مقدمے وصل کیے گئے تھے اور ان کے علاوہ اور ہزاروں پر کسی کسی
قسم کی قانونی کارروائی کی گئی تھی ضلع کی کانگریس کمیٹی کا دفتر دس میں ہر ایک دیہاتیا
حال اس وقت گزار رہتا تھا خود میرا گھر بھی گزار رہتا اور اکثر یہی چاہتا تھا کہ
بھاگ جاؤں اور جہاں میں پڑے اپنے کو چھپا لوں اور اس دردناک صورت
حال سے رنج نکلوں جو کسان ہمارے پاس آتے ان میں سے بہتوں کے جسم پر
چوٹوں کے نشان ہوتے تھے۔ وہ ہمیں بتاتے تھے کہ زمیندار کے آدمیوں
نے مارا ہے۔ ہم ہسپتال میں ان کا علاج کراتے تھے۔ ہم غریب کیا کر سکتے
تھے ہماری کمیٹی نے گوبند بلبھ پنت کو نینی تال اور لکھنؤ میں صوبہ کی حکومت سے
تعلق قائم رکھنے کے لیے درمیانی افسر مقرر کر رکھا تھا۔ وہ بھی برابر حکومت کو
لکھتے رہتے تھے۔ ہمارے صوبے کے صدر تصدق احمد خاں شیروانی بھی وقتاً فوقتاً
لکھتے تھے اور میں بھی

جون جولائی میں بارش شروع ہوئی تو ایک اور دشواری پیدا ہوئی
یہ جوتے بوئے کا بار بار ہوتا ہے جو کسان بے دخل کر دیے گئے تھے۔ وہ
کیا کرتے، کیا بیٹھے سر ٹکا کرتے اور اپنے کھیتوں کو سر پر بیٹھے دیتے؟ کسان
کے لیے تو یہ بڑی مشکل بات تھی اسے ایسی چیز کا سے کاٹنا تھا اکثر صورتوں
میں بے دخلی بس قانون اور ضابطہ کی بات تھی۔ یہ کچھ زمین سے واقعی طور پر
تو ہٹ نہیں گئے تھے۔ بس عدالت کی ڈگری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اور کچھ
نہ ہوا تھا کیا یہ لوگ اپنی زمین جوت لیتے؟ اس میں مداخلت بیجا کا جرم

سرزد ہو جاتا اور جھگڑے ہونے بلوے کا ڈر تھا مگر بیٹھے بیٹھے یہ دیکھنا بھی تو دشوار
تھا کہ دوسرے اس کی پرانی زمین کو جوتیں کسان بھلا اسے کیسے برداشت

کرے، نہ چارہ ہمارے پاس مشورے کو دوڑے آتے تھے ہم کیا مشورہ دیتے۔

گرمی میں جب گاندھی جی کے ساتھ شملہ گیا تو حکومتِ ہند کے ایک اعلیٰ عہدہ دار سے میں نے یہ دشواریاں کہیں اور ان سے پوچھا کہ آپ ہماری جگہ ہوتے تو ان کسانوں کو کیا مشورہ دیتے؟ ان کے جواب سے معاملہ پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی کسان جسے بے دخل کر دیا گیا ہے مجھ سے یہ سوال کرے تو میں جواب دینے سے احتراز کروں گا یعنی یہ اعلیٰ عہدہ دار صاحب تک اس کے لئے تیار نہ تھے کہ کسان سے بس یہ کہہ دیں کہ کھیت ۔ ہو تو۔ ہر چند کہ قانوناً کسان کھیت سے بے دخل کیا جا سکتا ہے وہ شملہ کی بلندیوں پر تھے، اس کے لئے آسان تھا کہ مسئلوں پر اس طرح احکام جاری کیا کریں گویا ریاضی کے کسی مجرد مسئلہ کے متعلق کچھ تحریر فرما رہے ہیں۔ مسئلہ کے انسانی پہلو سے انہیں واسطہ تھا نہ نینی تال کے اعلیٰ حکام کو۔ ان کی آنکھوں کے سامنے انسانی تکلیف و فلاکت کی وہ تصویر آتی تھی جو معاملے کے ساتھ وابستہ تھی۔

شملہ میں ہم سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ تم کسانوں کو بس ایک مشورہ دو یعنی یہ کہ کل مطالبہ ادا کر دو یا جتنا بھی ادا کرنا ممکن ہو۔ گویا ہمیں زمینداروں کے کارندوں کا کام کرنا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے جب ان سے کہا تھا کہ جتنا دے سکتے ہو دے دو تو ہم اس فرمائش کی تعمیل پہلے ہی کر چکے تھے ہاں، ہم نے ساتھ میں اتنا اور ضرور کہا تھا کہ اپنے مویشی نہ بیچنا اور قرض نہ لینا اس کا نتیجہ جو ہوا تھا وہ ہم دیکھ چکے تھے۔

ہم سب کے لئے یہ گرمی کا موسم بڑا ہی سخت تھا اور سر پر وہ بوجھ

ٹھاکر الالال

ہندوستانی کسان میں مصیبت جھیلنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے اور
اس کے حصہ میں مصیبت آتی بھی بہت رہتی ہے قحط، طغیانی، بیماری اور مسلسل
افلاس اور ہلاکت اور جب یہ انہیں نہیں جھیل پاتا تو ہزاروں لاکھوں کی تعداد
میں چپ چاپ بے حرف شکایت زبان پر لائے بغیر پڑا رہتا ہے اور مر جاتا ہے
اس کا مصیبت سے بچنے کا طریقہ بس یہ ہے۔ ان وقتی مصیبتوں کے مقابلے
میں ۱۹۲۱ء میں گویا کچھ بات ہی نہ ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی اسے ۱۹۲۱ء
کے واقعات قدرت کے نہ ہونے والے ارادوں کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتے
تھے اور اس وجہ سے انہیں صبر کے ساتھ جھیل لیتا۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ تو
سب آدمیوں کی کارستانی ہے اور اس وجہ سے ان پر بگڑتا تھا۔ اس کی
نئی سیاسی تعلیم کا پودا پھل لا رہا تھا۔ ۱۹۲۱ء کے یہ واقعات ہمارے لئے
بھی خاص طور سے تکلیف دہ یوں تھے کہ ہم اپنے کو کچھ نہ کچھ ان کا ذمہ دار مانتے
تھے کیا یہ بات رہی کہ کسانوں نے ہماری نصیحت مانی تھی، لیکن پھر بھی مجھے
پورا یقین ہے کہ اگر ہم برابر ان کی مدد نہ کرتے تو کسانوں کی حالت اور بھی
ابتر ہوتی۔ ہم ان کا حقیقا ساتھ رہے اور اس لئے وہ ایک قوت سے
رہے جس کا نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ اور اس وجہ سے انہیں اس سے زیادہ
چھوٹ مل گئی جتنی کہ دوسرے حالات میں ملتی وہ جبر اور بدسلوکی جو ان ہی کے
حصہ میں آئی ہرچند کہ بہت رہی تھی پر ان اشاعت لوگوں کے لئے کوئی غیر معمولی
بات نہ تھی فرق تھا تو کچھ تو اس کا کہ اس زمانے میں بہت کچھ سمجھ ہوئی اور کچھ
اس بدسلوکی کی تشہیر کا معمول تو یہ ہے کہ اگر زمیندار کے آدمی نے کسان سے
بدسلوکی کی یا اسے ایذا میں پہنچائی تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا تو ہوتا ہی ہے اور

اگر اس بار تو زمیں دوبارہ مربی جائے تو اس علاقہ کے باہر کسی کو
کانوں کان خبر بھی نہ ہو لیکن اب ہمارے نظام کی وجہ سے معاملہ اور ہو گیا تھا۔
کسانوں میں ایک نیا احساس تھا جس کی وجہ سے متحد تھے اور ہر واردات
کی خبر کانگریس کے دفتر کو دیتے رہتے تھے۔

گرمیوں کا موسم ذرا اور گذرا تو خریف تحصیل وصول میں کمی ہوئی اور ظالمانہ
کارروائیاں بھی کچھ گھٹیں۔ اب جو سوال ہمیں پریشان کر رہا تھا۔ وہ یہ کہ جو کسان
بے دخل ہوئے ہیں ان کا کیا ہو؟ ان کے لئے کیا کیا جائے؟ ہم حکومت پر زور
ڈال رہے تھے کہ ان کے کھیت انہیں واپس مل جائیں کہ یہ کھیت اکثر یوں ہی
خالی پڑے تھے۔ اس سے زیادہ اہم سوال مستقبل کا تھا۔ اب تک جو صورت
تھی وہ بس پچھلی فصل کے لئے تھی آیندہ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ اکتوبر سے
اگلی تحصیل وصول کا زمانہ شروع ہونے کو تھا اس وقت کیا ہوگا؟ اس پر غور
کرنے کے لئے صوبے کی حکومت نے ایک چھوٹی سی کمیٹی مقرر کی جس میں کچھ
تو خود اس کے صوبے دار تھے اور کچھ سرکاری کونسل کے زمیندار ممبر۔ اس
کمیٹی میں کسانوں کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔ بالکل آخر وقت میں جب کہ کمیٹی اپنا
کام شروع کر چکی تھی حکومت نے گووند ولبھ پنتھ سے کہا کہ ہماری طرف سے
کمیٹی میں شریک ہو جائیں۔ اتنی دیر کے بعد جب کہ اہم معاملات پر فیصلے ہی
ہو چکے تھے۔ انھوں نے شرکت کو بے سود سمجھا۔

صوبجات متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے ایک چھوٹی سی کمیٹی اس غرض
سے مقرر کی تھی کہ اس وقت کے اور پچھلے زمانے کے مالی امور پر معلومات
جمع کرے اور موجودہ صورت حال پر رپورٹ دے۔ اس کمیٹی نے ایک لمبی
رپورٹ چھاپی جس میں صوبے کی زرعی حالت پر نہایت اچھا تبصرہ ہے اور

قیمتوں کے گرنے سے جو مصیبت نازل ہوئی تھی اسے نہایت خوبی سے کھول کر
بتایا ہے۔ ان کی سفارشیں بھی بڑی دور رس تھیں۔ اس رپورٹ پر جو کتابی شکل
میں شائع ہو چکی ہے گووند بلبھ پنتھ۔ رفیع احمد قدوائی اور وینکٹیش نرائن تواری
کے دستخط ہیں۔

اس رپورٹ کے نکلنے سے بہت پہلے جواہر لال جی گول میز کانفرنس میں
شرکت کے لئے لندن جا چکے تھے۔ وہ بہت ہی بے دلی سے وہاں گئے تھے
اور اس بے دلی کی ایک وجہ صوبجات متحدہ کے دیہاتی حالات بھی تھے
اور واقعہ یہ ہے کہ اگر گول میز کانفرنس کے لئے ولایت جانا نہ ہوتا تو وہ
فیصلہ کر چکے تھے کہ صوبجات متحدہ میں جاؤں گا اور پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے
میں لگ جاؤں گا شملہ میں حکومت سے جو آخری گفتگو ہوئی اس میں یہ مسئلہ
اور صوبجات متحدہ کا معاملہ بھی بحث میں آیا تھا۔ ان کے تشریف لے جانے کے
بعد ہم لوگ انہیں سب باتوں سے برابر مطلع کرتے رہے۔ پہلے مہینے ڈیڑھ
تک تو میں انہیں ہر ہفتہ خط لکھتا تھا۔ ہوائی ڈاک سے بھی اور معمولی ڈاک
سے بھی۔ ان کے قیام لندن کے آخری زمانے میں میں اتنا باقاعدہ نہ تھا
کیونکہ ان کے جلد لوٹنے کی امید تھی۔ انہوں نے ہمیں توقع دلائی تھی کہ اگر
دیر بھی ہوئی تو بھی وہ دو تین مہینے کے اندر اندر لوٹ آئیں گے یعنی نومبر کی
تاریخ تک اور ہمیں امید تھی کہ اس وقت تک ہندوستان میں کوئی غیر معمولی صورت
حال پیدا نہ ہوگی ان کی غیر موجودگی میں ہم حکومت سے خاص طور پر کوئی
لڑائی مول لینا نہیں چاہتے تھے لیکن جب ان کی واپسی میں دیر ہوئی اور
دیہات کے معاملات نے تیزی سے بڑھنا شروع کیا تو ہم نے انہیں ایک تار
بھیجا جس میں سب باتوں سے انہیں باخبر کر دیا اور یہ بتا دیا کہ ہمیں کس طرح

محور کیا جارہا ہے۔ انھوں نے تاکرہی سے جواب دیا کہ میں اس معاملہ میں بے بس ہوں اور یہاں سے تمھارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تم اپنی سمجھ سے کام لے کر آگے بڑھو۔

صوبہ کی مجلس انتظامیہ بڑی مجلس عاملہ کو بھی برابر اطلاع دیتا رہی ہیں جو اس مجلس میں سب باتیں بتانے کے لئے موجود تھا۔ لیکن معاملہ چونکہ ذرا بڑھتا جاتا تھا اس لئے مجلس عاملہ نے ہمارے صوبے کے صدر مصدق احمد خان شیروانی اور الہ آباد ضلع کے صدر پرشوتم داس ٹنڈن سے بھی مشورہ کیا۔

اسی اثنا میں حکومت کی دیہاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کی۔ اس میں کمیٹی نے بہت سی سفارشیں کیں، جو بیچ ہی میں ادرمبہم بھی اور جس سے معاملہ بہت کچھ مقامی حکام پر رہا تھا۔ مجموعی طور پر جو چھوٹ تجویز کی گئی تھی نا کافی تھی کے مقابلہ میں صبر، زیادہ تھی۔ مگر ہمارے خیال میں اب تو کافی نہ تھی ہمیں ان سفارشوں کے اصول پر بھی اعتراض تھا اور ان کے عمل پر بھی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ اس رپورٹ میں صرف مستقل کا ذکر تھا پچھلے بقایا، قرض اور بے دخل کئے ہوئے کسانوں کا نام۔ تھا۔ سوال یہ تھا کہ ہم کیا کریں؟ بس ہی حصے پچھلے موسم بہار اور گرمیوں میں کہا تھا کہ کسان کو مشورہ دیا جائے کہ جتنا ادا کر سکتے ہو کرو اور پھر انھیں تاریخ سے دو یا ہوں جن سے پہلے ہوئے تھے؟ مگر ہم اب یہ سمجھ گئے تھے کہ یہ مشورہ تو سراسر شرارت کا مشورہ ہے اور اسے دہرانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اب تو صورت بس یہ تھی کہ یا تو کسان بڑی کوشش کر کے لیے مطالبے کو پورا پورا چکا دے یا یہ نہ ہو سکے تو فی الحال کچھ ادا نہ کرے اور دیکھے کہ کیا ہوتا ہے۔ مطالبہ میں کچھ تھوڑا سا ادا کر دینا تو کچھ بات نہ ہوئی۔ نہ ادھر نہ اُدھر کسان نے چارہ کے ہاتھ سے جو کچھ میسر تھا

نے مجھے (اور علیحدہ ولبھ بھائی پٹیل صدر کانگریس کو بھی) ایک پیام بھیجا جس
میں ان سب ہی خبروں کی تصدیق تھی جو ہمیں ملتی رہتی تھیں اور خاص کر کے
اُن آرڈیننسوں کی تفصیل دی تھی جو صوبۂ سرحد اور صوبجات متحدہ میں
نافذ ہونے والے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بنگال کو تو اس وقت ایک نئے
آرڈیننس کا تحفہ مل ہی چکا تھا یا شاید عنقریب ملنے والا تھا۔ کئی ہفتے بعد جب
اس شان سے کہ گویا کوئی نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے نئے آرڈیننس نکلے
تو ڈاکٹر انصاری کے پیام کی پوری تصدیق تفصیلات تک میں ہوگئی۔ عام
خیال یہ تھا کہ گول میز کانفرنس میں جو خلاف توقع طوالت ہوئی اس کی وجہ
سے حکومت نے اپنی کارروائی شروع کرنے میں ذرا دیر کی۔ حکومت چاہتی
تھی کہ جب تک گول میز کانفرنس کے لوگ میٹھی میٹھی گفتگو کی کمیٹیوں میں
مبتلا ہیں بس اس وقت تک ہندوستان میں کھلم کھلا تشدد کو ٹالنے۔

چنانچہ کھینچ تان بڑھی۔ اور ہم سب کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ہماری سعی
سعی بے حقیقت ہستیوں کے باوجود واقعات بڑی تیزی سے گامزن ہیں اور ان کی
مقدار رفتار کو کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ ہمارے بس میں بس یہ تھا کہ اس سے
دوچار ہونے کے لئے اپنے کو تیار کریں اور زندگی کے اس ڈرامے میں
غالباً الم ناک ڈرامے میں اپنا رنگ اور رول کر کے اپنا حصہ لیں۔ مگر ہم پر یہ بالبداہت
صریح تھی کہ قوتوں کے تصادم کے اس ڈرامے کا پردہ اٹھنے سے پہلے گاندھی جی
لوٹ آئیں گے اور اپنے کندھوں پر ذمہ داری لے لیں گے۔ چاہے اس کی
ذمہ داری ہو، چاہے جنگ کی ان کی غیر حاضری میں اس بوجھ کو اٹھانے
کے لئے ہم میں سے کوئی تیار نہ تھا۔

صوبجات متحدہ میں حکومت نے ایک قدم اور اٹھایا جس سے سامنے

دیہات میں کھل بل مچ گئی۔ کسانوں میں چھوٹ کے متعلق پرچیاں بانٹی گئیں جن میں لکھا تھا کہ کتنی چھوٹ دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی تھی کہ اس چھوٹ کے بعد جو رقم واجب الادا ہے وہ اگر مہینہ بھر کے اندر (اور بعض حالتوں میں یہ مدت اس سے بھی کم رکھی گئی تھی) ادا نہ ہو گئی تو چھوٹ منسوخ پھر پورا مطالبہ قانونی طور پر وصول کیا جائے گا یعنی ڈگری، بے دخلی، قرقی وغیرہ معمول یہ تھا کہ آسامی دو یا تین مہینے میں تھوڑا تھوڑا کر کے لگان ادا کرتے تھے اور اب تو اتنی مہلت بھی انھیں نہیں دی گئی۔ سارے دیہات میں ایک سخت مصیبت کا سامنا تھا اور غریب آسامی ہاتھ میں پرچی لیے ادھر سے اُدھر بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ کہیں مشورے کہیں شکایت کرتے کہیں صلاح نہ کرتے۔ حکومت اور مقامی افسروں کی طرف سے یہ دھمکی بڑی حماقت کی بات تھی اور بعد میں تو ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اس پر عمل کرنا مقصود نہ تھا بس یوں ہی دھمکی دی گئی تھی لیکن اس نے اس تصفیہ کے امکانات کو رہا سہا اور کم کر کے رفتہ رفتہ مقابلہ اور کشمکش کو ناگزیر بنا دیا۔

اب موقع وہ آ گیا تھا کہ کسانوں کو اور کانگریس کو فیصلہ کرنا تھا، یا ادھر یا اُدھر۔ اور گاندھی جی کی دیسی تک معاملہ کو ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ ہاں تو کیا کیا جانا چاہیے تھا؟ کیا مشورہ دیا جانا چاہیے تھا؟ کیا ہم عام طور پر کسانوں سے یہ کہہ سکتے تھے کہ جو تھوڑا سا وقت تمھیں دیا گیا ہے اس میں مطلوبہ رقم ادا کر دو اور یہ ایسی حالت میں کہ ہم خوب جانتے تھے کہ ان میں بکثیر و اکثر کے لیے ایسا کرنا ممکن ہی نہیں اور پھر جو بقایا ہے اس کا کیا کیا جائے؟ کیا اس کا اندیشہ نہ تھا کہ اگر مطلوبہ رقم کا بڑا حصہ بھی ادا کر دیا۔ یا اس ایک فصل کا پورا مطالبہ بھی ادا کر دیا تب بھی اسے بقایا کے حساب میں ڈال کر لے لیں

نہ کرادیا جائے۔

الہ آباد ضلع کانگریس کمیٹی نے جس میں کسان بھی خاصی تعداد میں شریک
تھے معاملہ کی ٹھانی۔ اس نے طے کیا کہ وہ کسی حال میں کسانوں کو یہ مشورہ نہ
نہیں دے سکتی کہ مطالبہ ادا کردو لیکن اسے بتایا گیا کہ صوبہ کی مجلس انتظامیہ
اور کانگریس کی مجلس عاملہ کی باضابطہ اجازت کے بغیر اسے کوئی جارحانہ قدم
اٹھانے کا حق نہیں ہے چنانچہ معاملہ مجلس عاملہ کے سامنے گیا تب تصدق شروانی
اور پرشوتم داس ٹنڈن دونوں صوبے اور ضلع کی طرف سے معاملہ سلجھانے
کے لیے وہاں موجود تھے ہمارے سامنے سوال بس ایک الہ آباد ضلع کا تھا
اور معاملہ تھا خالص معاشی۔ لیکن ہم نے سوچا کہ اس وقت ملک میں جو
عام سیاسی ہیجان ہے اس میں ہماری کارروائی کے نتائج بہت دور تک
پہنچ سکتے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں الہ آباد ضلع کی کمیٹی کو یہ اجازت دے دینے میں
کچھ مضائقہ تھا کہ کسانوں کو مشورہ دے کہ فی الحال اس وقت تک لگان اور
مال گزاری روک دیں جب تک کہ بات چیت ہو کر بہتر شرائط طے نہ ہو
جائیں۔ اصلی معاملہ بس اتنا ہی تھا اور ہم چاہتے بھی تھے کہ بس اسی تک رہیں
آگے نہ بڑھیں۔ مگر ایسا ممکن بھی تھا؟ مجلس عاملہ اس بات کی ہر چند کوشش
کرنا چاہتی تھی کہ گاندھی جی کی واپسی سے پہلے حکومت سے ان بن نہ ہو اور
خاص کر ایک معاشی معاملہ پر وہ اس ان بن کو اس لئے اور بھی ٹالنا
چاہتی تھی کہ یہ مختلف طبقات معاشی کا معاملہ بن سکتا ہے۔ مجلس عاملہ
سیاسی اعتبار سے بہت آگے ہو۔ مگر معاشی اعتبار سے اتنی آگے نہ تھی
اور اسے پسند نہ تھا کہ اسامی اور زمیندار کا سوال اٹھایا جائے۔
میری طبیعت کا رجحان چونکہ اشتراکیت کی طرف تھا اس لئے معاشی

اور معاشرتی امور پر اصلاح دستور کے لئے مجھے کچھ بہت ساست آئی
میں سمجھا جاتا تھا ادھر میں جو بھی چاہتا تھا کہ مجلس عاملہ سمجھ لے کہ جو متحد
کا معاملہ ایسا ہے کہ ہمارے معتدل مزاج اراکین خود باوجود مخالف میلان
طبع کے واقعات کے ہاتھوں کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ میں بہت
خوش تھا کہ مجلس عاملہ کے جلسہ میں ہمارے صوبے سے شیروانی (ہمارے صوبے
کے صدر) اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ اس لئے کہ شیروانی کوئی شعلہ مزاج
انتہا پسند نہ تھے سیاسی اور معاشی لحاظ سے وہ کانگریس کے اعتدال پسندوں
میں تھے اور سال کے شروع شروع میں صوبہ کانگریس کمیٹی کی دیہاتی سیاست
کے خلاف رائے رکھتے تھے لیکن جب یہ خود کمیٹی کے صدر ہوئے اور ذمہ داری
کا بوجھ خود ان پر آن پڑا تو انہوں نے سمجھا کہ ہمارے لئے تو کوئی اور راہ
ہے ہی نہیں اس کے بعد سے صوبے کی کمیٹی نے جو کچھ بھی کیا اس میں ان
کی پوری پوری مدد شامل تھی۔ اور اکثر کارروائیاں تو بحیثیت صدر انہیں کی
وساطت سے ہوئیں۔

چنانچہ مسٹر شیروانی نے جب مجلس عاملہ کے سامنے ہماری وکالت
کی تو اس کا ممبروں پر بڑا اثر ہوا۔ اس سے کہیں زیادہ تھا کہ میری وکالت
سے ہوتا بہت کچھ بحث کے بعد لیکن یہ جان کر کہ انکار نہیں کیا جا سکتا مجلس عاملہ
نے صوبے کی کمیٹی نے اختیار دے دیا کہ جس علاقہ میں چاہے لگان اور مالگذاری
کا التوا کروا دے۔ مگر ساتھ ہی اس پر بھی زور دیا کہ صوبے والے جہاں تک
ہو سکے اس بات سے بچیں اور صوبے کی حکومت سے بات چیت جاری
رکھیں۔

یہ نامہ و پیام کچھ دنوں ہوا کیا مگر بے نتیجہ۔ میرا خیال ہے کہ ...

پنڈت جواہر لال نہرو اور تصدق احمد خاں شیروانی

الہ آباد ضلع میں پھوٹ کی قسمیں کچھ بہتر ہو گئیں۔ حالات معمولی ہوتے تو ممکن تھا کہ کوئی تصفیہ بھی ہو جاتا یا کم سے کم لڑائی تو ٹل ہی جاتی۔ اس لئے کہ اختلاف خیال کی خلیج تنگ ہو رہی تھی۔ لیکن حالات بہت غیر معمولی تھے اور دونوں طرف، حکومت کی طرف بھی اور کانگریس کی طرف بھی یہ گمان تھا کہ جو مقابلہ سامنے آرہا ہے وہ ٹالنے میں ٹل نہیں سکتا۔ اور یہ بات بہت سے حقیقت ہے۔ جو قدم بھی اٹھاتا تھا، ادھر سے ہو یا ادھر سے تو سمجھا یہ جاتا تھا کہ فریق مخالف اسے مورچہ کی مضبوطی کی تدبیریں کر رہا ہے۔ حکومت کی تیاریاں تو چھپے چھپے راز میں پوری ہو سکتی تھیں اور چنانچہ ہو رہیں بھی۔ ہماری قوت عام لوگوں کے حوصلوں اور امنگوں کی بلندی پر منحصر تھی اور اسے ہم کارروائیوں سے پیدا کرنا تھا۔ معلوم ہم میں سے بعض (اور ان مجرموں میں میں بھی تھا) اپنی تقریروں میں بار بار کہہ چکے تھے کہ آزادی کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے جلد ہی بہت سی آزمائشوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا ہوگا اور ہم اپنی قوم سے کہتے تھے کہ ان مصیبتوں کے لئے تیار رہے اور اس وجہ سے لوگ ہمیں جنگ جو بتاتے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے متوسط طبقے کے کانگریسی کام کرنے والے حقیقی واقعات کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے اور امید رکھتے تھے کہ جیسے بھی ہو کر مقابلہ کی نوبت نہ آئے گی۔ لوگ اخبار پڑھتے تھے ان کی توجہ کا بڑھنا جنگ کے لندن میں ہونے کی وجہ سے ادھر بٹ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی تعلیم یافتہ طبقہ کی اس بے علمی کے باوجود واقعات تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے آئے تھے خصوصاً مغربی بنگال میں، صوبہ سرحدی میں اور صوبہ متحدہ میں۔ سا تھ ہی سر پر لوہتوں کو دکھائی دینے لگا تھا کہ توڑ کا وقت آن پہنچا۔

صوبہ کی کانگریس کمیٹی نے اس ڈر سے کہ واقعات موقع و نت سے

پہلے رہے ۔ آخر میں ارجنگ شروع ہو جانے ایسے کچھ بھی امکانات تھے
کرنے تھے الہ آباد کی کمیٹی نے ایک کسان سبھا کی جس میں یہ قرارداد منظور
ہوئی کہ اگر بہتر شرائط حاصل نہ ہوا میں تو کسانوں کو یہ مشورہ دیا جانا چاہیے کہ
لگان اور مالگذاری ادا کرنا بند کر دو ۔ اس قرارداد سے صوبے کی حکومت بہت
بگڑی اور اسے وجہ جنگ قرار دے دیا انھوں نے کہہ دیا کہ بس اب ہم تم سے کوئی
معاملہ نہیں کرنا چاہتے اس طرز عمل کا اثر دوسرے صوبے کی کانگریس پر بھی ہوا انھیں
اسے آنے والے طوفان کا پیش خیمہ جانا اور جلدی جلدی اس کی تیاریاں شروع کر دیں
الہ آباد میں ایک کسان سبھا اور منعقد ہوئی اور اس میں پہلے سے زیادہ سخت
اور واضح قرارداد منظور کی گئی اس میں کسانوں سے کہا گیا تھا کہ مزید گفت و شنید
ہونے اور بہتر شرطوں کے طے پانے تک سب لوگ لگان روک دیں ۔ یہ فیصلہ
بھی ہم نے خود یہ اختیار کیا اور اس وقت کیا بالکل آخر تک ، وہ رہیں یہ
کوشش اور اسی کیا جائے بلکہ یہ تھا کہ مناسب لگان ادا کیا جائے ہم برابر
نامہ و پیام کی درخواست بھی کرتے رہے ہر چند دوسرا فریق تو بہت عرصے
ساتھ ہمیں چھوڑ کر الگ جا چکا تھا ۔ الہ آباد والی قرارداد زمینداروں اور اسامیوں
کے لئے یکساں تھی ۔ مگر ہم جانتے تھے کہ دراصل اس کا اطلاق صرف اسامیوں
اور کچھ چھوٹے زمینداروں ہی پر ہوگا ۔

نومبر کے آخر اور دسمبر ۱۹۳۱ء کے شروع میں صوبہ متحدہ میں صورت حال
یہ تھی ادھر بنگال اور صوبہ سرحد میں بھی معاملات دگرگوں تھے بنگال میں
ایک بیا اور سخت ہمہ گیر آرڈیننس جاری کر دیا گیا تھا ۔ یہ سب نشانیاں اس
یقینی جنگ کی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا جیسے کہ اس کی
حکومت نے اسے دنوں سے جس معیار کی تیاری کی تھی کیا اس کے شروع

ہونے سے پہلے گاندھی جی ہندوستان پہنچ جائیں گے ؟ یا اس وقت آئیں گے کہ اس کے ساتھی قید میں پہنچ چکے ہوں گے اور معرکہ چل رہا ہوگا معلوم ہوا کہ وہ واپس آرہے ہیں اور سال کے آخری حصّے میں بمبئی پہنچ جائیں گے ہم میں سے ایک ایک کیا صدر مقام پر کیا صوبوں میں کانگریس کا ایک ایک کس چاہتا تھا کہ ان کی واپسی تک معرکہ کو ٹالے۔ خود اس معرکہ کے حال سے یہ بہتر تھا کہ ہم ان سے مل لیتے۔ ان سے ہدایت اور مشورہ لے لیتے لیکن یہ ایک دوڑ تھی جس میں ہم بے بس تھے کہ چال برطانوی کی حکومت کے ہاتھ میں تھی۔

گاندھی جی کے لندن جانے کے کچھ عرصہ بعد دو واقعات ایسے پیش آئے کہ
سارے ہندوستان کی توجہ بنگال کے معاملات کی طرف ہو گئی۔ یہ واقعے ہجلی
اور چاٹگام میں ہوئے۔

ہجلی میں نظربندوں کے رکھنے کے لئے ایک خاص جیل تھا۔ سرکاری طور
پر اعلان ہوا کہ اس جیل میں بلوہ ہوا تھا۔ نظربندوں نے جیل کے اسٹاف پر حملہ
کیا اور اسٹاف والے گولی چلانے پر مجبور ہوئے۔ ایک نظربند گولی سے مارا
گیا اور زخمی تو بہتیرے ہوئے۔ واقعہ کے فوراً ہی بعد مقامی طور پر ایک سرکاری
تحقیقات ہوئی جس میں اسٹاف والوں کو گولی چلانے اور اس کے نتائج سے بالکل
بری الذمہ کر دیا گیا۔ لیکن اس واقعہ میں بہت سی ایسی باتیں تھیں بعض واقعات
جو روز روشن کی طرح ظاہر ہوئے تو وہ سرکاری بیان سے مطابقت نہ رکھتے تھے لہٰذا
تفصیلی تحقیقات کے لئے زور شور سے مطالبہ شروع ہوا۔ ہندوستان میں تو عام سرکاری رسم
ہے اس سے بالکل خلاف حکومت بنگال نے اعلیٰ عدالتی عہدیداروں کی ایک تحقیقاتی
کمیٹی مقرر کر دی۔ یہ کمیٹی بالکل سرکاری تھی مگر اس نے جو شہادتیں لیں اور معاملہ پر پوری
طرح غور کیا تو معاملہ کو جیل کے اسٹاف کے خلاف پایا۔ انھوں نے قرار دیا کہ
غلطی زیادہ تر اسٹاف کی تھی اور گولی کا چلانا ناواجب تھا۔ یوں گویا اس بات میں
حکومت کے جارحانہ بیانات سراسر جھوٹے پڑے۔

یوں تو ہجلی کے حادثہ میں کوئی بہت غیر معمولی بات نہ تھی۔ بدقسمتی سے
ایسے واقعات ہمارے ہندوستان میں کوئی نادر چیز نہیں ہیں۔ جیل کے بلووں
کا ذکر اکثر پڑھنے میں آتا ہے جن میں نہتے اور بے بس قیدیوں کو مسلح نگران اور دوسرے
لوگ بہادری سے مار دیتے ہیں۔ ہجلی میں جو غیر معمولی بات تھی وہ یہ کہ اس دفعہ
اس قسم کے حادثات کے متعلق سرکاری بیانات کے کاذب ہونے بلکہ جھوٹا ہونے کو

کھول کر ظاہر کر دیا۔ لطف یہ کہ سرکاری طور پر ظاہر کر دیا۔ پہلے بھی لوگ ان سرکاری بیانات
کو کچھ بہت باور نہ کرتے تھے لیکن اب تو بالکل پول ہی کھل گیا۔

ہجلی کے واقعہ کے بعد سے ہندوستان بھر میں بہت سے ایسے جیل کے
حادثات ہوئے ہیں کبھی گولی چلی ہے کبھی اور قسم کا تشدد کیا گیا ہے اور یہ عجیب بات ہے
کہ ان لوگوں میں ہمیشہ قیدی ہی ضرر اٹھاتے ہیں۔ تقریباً ہمیشہ ایک سرکاری
بیان شائع ہوا ہے کہ قیدی طرح طرح کی بدکرداریوں کے مرتکب تھے اور اسٹاف
سراسر بے قصور تھا۔ شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ اسٹاف والوں کو محکمہ کی طرف سے
کوئی سزا دی گئی ہو۔ تفصیلی تحقیقات کے سب مطالبوں کا جواب ہمیشہ انکار ہی میں ملا۔
صرف محکمہ کی طرف سے دریافت حال کو کافی سمجھا گیا۔ ظاہر ہے کہ ہجلی کا سبق
حکومت نے خوب اچھی طرح سیکھا تھا یعنی یہ کہ باضابطہ اور غیر جانبدارانہ تحقیقاتیں کرانا
ٹھیک نہیں اور یہ کہ الزام لگانے والا ہی بہترین فیصلہ کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ پھر کیا عجب
ہے کہ لوگ بھی ہجلی کے واقعہ سے یہ سبق سیکھیں کہ سرکاری بیانات میں بس وہ ہوتا ہے جو
حکومت منوانا چاہتی ہے۔ اصل اس سے کہیں کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

چاٹگام کا معاملہ اس سے بہت سخت تھا۔ کسی تشدد پسند نے ایک مسلمان پولیس
کے انسپکٹر کو گولی سے مار ڈالا تھا۔ اس پر ہندو مسلم فساد ہوا یا کم سے کم اسے ہندو مسلم فساد
بتایا گیا۔ یہ بات صحیح تھی کہ معاملہ اس سے بہت کچھ زیادہ تھا اور معمولی فرقہ وارانہ
فساد سے بالکل مختلف تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ تشدد پسند کے فعل کو فرقہ داری سے
کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ تو بس ایک پولیس کے افسر کے خلاف تھا بالکل اس سے
قطع نظر کر کے وہ افسر ہندو تھا یا مسلمان۔ پھر بھی اس قتل کے بعد کچھ ہندو مسلم فساد
ضرور ہوا تھا۔ فساد کیسے شروع ہوا اور فساد کا موقع کیا تھا، یہ بات صاف نہ
ہوئی ہرچند کہ اس بات میں ذمہ دار لوگوں نے سخت سخت الزام لگائے۔

اس فساد میں ایک اور خاص بات یہ تھی کہ بعض بعض خاص گروہوں نے مثلاً
اینگلو انڈین ملازمین ریلوے نے اور دوسرے سرکاری ملازموں نے اس میں بڑا
حصہ لیا اور کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے نہایت وسیع پیمانے پر اشتعال انگیز کارروائیاں
کیں جے ایم سین گپتا اور بنگال کے دوسرے رہنماؤں نے چاٹ گام کے واقعات
کے متعلق معین الزامات لگائے اور مطالبہ کیا کہ ان کی تحقیقات کی جائے، یا
ہمارے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلایا جائے۔ مگر حکومت ٹس سے مس نہ
ہوئی اور یہی مناسب سمجھا کہ کچھ نہ کرے۔

چاٹ گام کے ان غیر معمولی واقعات نے، خطرناک امکانات کی طرف
خاص طور پر توجہ دلائی۔ تشدد پسندی کو لوگوں کو مختلف پہلوؤں سے پرکھا جا چکا ہے
حتیٰ کہ جدید انقلابی طریقہ کار کے نزدیک بھی یہ بری قرار پا چکی ہے لیکن اس کے
امکانی نتائج میں سے ایک نے مجھے ہمیشہ متوحش رکھا ہے یعنی ہندوستان میں
غیر منظم اور فرقہ وارانہ تشدد کے پھیل جانے کے خطرے نے۔ میں کچھ ایسا دوراندیش
نہیں ہوں کہ تشدد سے اس لئے خائف ہوں کہ وہ تشدد ہے۔ مگر یہ تشدد مجھے
پسند نہیں، کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان میں ابھی انتشار کی قوتیں بہت
ہیں اور منظم تشدد سے انھیں تقویت پہنچے گی اور ایک متحدہ اور منظم قوم کی
تعمیر کا کام جو یوں ہی دشوار ہے اس سے دشوار تر ہو جائے گا جب لوگ مذہب کے نام
پر قتل کریں یا بہشت میں اپنی جگہ محفوظ کرانے کے لئے تو اکثر سیاسی تشدد پسند کا
عادی بن جانا بڑی حسرت کی بات ہے۔ سیاسی قتل بھی بری چیز ہے لیکن کبھی سیاسی
تشدد پسند کے ساتھ دلیل و حجت ممکن ہے اور اسے دوسری راہ پر ڈالا جا سکتا ہے
اس لئے کہ کم از کم یہ ہے کہ وہ جس مقصد کے لئے کوشاں ہے وہ دنیاوی مقصد ہے
شخصی نہیں بلکہ قومی مقصد ہے گو مذہبی قتل اس سے بھی بُری چیز ہے۔ اس لئے

کبھی کوئی ایسا کام اتفاق سے ہی سرزد ہوا ہو جس میں بہادری یا جرأت کا دخل
تاہم دنیا نے اسے ہمیشہ بڑی حماقت کی بات جانا ہے کہ کسی ایسے مرد یا عورت
کو جو ہر دم جان جوکھوں میں ڈالتا ہو کوئی بزدل کہے۔ اس شخص پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے
کہ وہ ایسے بودے نکتہ چینیوں کو جو خود ڈرپوک ہوتے ہیں اور جو کچھ نہیں
کر سکتے ڈر اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

کلکتہ کے قیام کے آخری دن شام کو رخصت ہو کر اسٹیشن جانے سے پہلے
دو جوان مجھ سے ملنے آئے۔ دونوں بہت کم عمر تھے۔ کوئی بیس بیس سال عمر
ہوگی۔ ذرا گھبرائے گھبرائے چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھیں رکھتے تھے۔ یہ تھی کہ لڑکوں میں
ان کے آنے کا مقصد میری سمجھ میں آگیا۔ انھوں نے سنا تھا کہ میں نے سیاسی
تشدد کے خلاف تلقین کی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ نوجوانوں پر اس کا بہت برا اثر
ہو رہا ہے اور وہ اس قسم کی مداخلت کو گوارا نہیں کر سکتے۔ اس سے کچھ بحث ہوئی
بہت جلدی جلدی میں، اس لئے کہ میری روانگی کا وقت قریب تھا۔ تاہم دوران
بحث میں ہمارا لہجہ سخت ہو گیا تھا اور مزاج میں کچھ گرمی پیدا ہوگئی تھی۔ ان میں سے
تاہم کچھ سخت باتیں بھی ان سے کہیں۔ جب ان سے رخصت ہوا تو چلتے چلتے ایک
نے مجھے تنبیہ کی اور اب آگے ہمارا خیال ہے ایسی باتیں نہ ہوں ورنہ تمہارے ساتھ بھی
وہی کیا جائے گا جو اوروں کے ساتھ کیا گیا ہے۔

میں یوں کلکتہ سے رخصت ہوا۔ رات کو جب ریل گاڑی میں لیٹا تو دیر تک
ان دونوں لڑکوں کے گھبرائے گھبرائے چہرے نظر کے سامنے رہے۔ وہ زندگی سے
بھرپور اور عصبی قوت سے بھرے ہوئے تھے۔ کیا ہی اچھا سامان تھا اگر انھیں کوئی
نیک راہ پر لگا دے۔ مجھے افسوس تھا کہ میں نے ان سے اس قدر جلد بحث کی اور
اور تیزی سے مباحثہ کیا اور جی چاہتا تھا کہ ان سے دیر تک بات چیت کا موقع ملا ہوتا

تا دہی انھیں سمجھا سکتا کہ ایسی ہولناک زندگیوں کو کسی ا۔ رراور دالیس ہندستان اور
آدمی کی خدمت کی کسی راہ پر کر ان راہوں میں جرأت اور قربانی کے مواقع کی کیا
کمی ہے۔ پچھلے برسوں میں مجھے اکثر ان دیوانوں کا خیال آیا ہے۔ مجھے کبھی ان کے
ناموں کا علم نہ ہوا۔ پھر کبھی ان کا کوئی اتہ پتہ چلا۔ اور کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا ہے
کہ کیا معلوم یہ مر گئے کہ کالے پانی میں جیل کی کسی کوٹھری میں جیتے ہیں۔

دسمبر کا مہینہ تھا ۱۹۲۳ء میں۔ دوسری کانگریس کا جلسہ ہوا اور میں عملاً طلبہ
حیثیت کرناٹک پہنچا۔ اپنے پرانے ساتھی ہندستانی سیوا دل کے ڈاکٹر ہ۔
ہرڈیکر نے ایک پرانا ارادہ اسے پورا کیا تھا سیوا دل قومی تحریک کے
رضاکاروں کا حصہ ہے اس کا انتظام بالکل الگ تھا مگر یہ برابر کانگریس کے
ساتھ رہا تھا ۱۹۲۳ء کے موسم گرما میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے اسے کانگریس کے
نظام میں بالکل ملا لیا اور اسے کانگریس کا شعبہ رضاکاراں مان لینے کا فیصلہ کیا
چنانچہ یہ ہو گیا اور ہرڈیکر اور میرے سپرد اس کا کام کیا گیا۔ دل کا صدر مقام ہبلی تھا
کرناٹک میں ہبلی رہا اور ہرڈیکر نے مجھے آمادہ کیا کہ دل جا کر دل کے مختلف تقریبوں
میں شریک ہوں۔ پھر وہ مجھے کچھ دن کے لئے کرناٹک کے دورے پر لے گئے اور
مجھے ہر جگہ لوگوں کا جوش دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ واپسی میں سولاپور گیا
جو مارشل لا کے فساد کی وجہ سے مشہور ہو چکا تھا۔

کرناٹک کے اس دورے کی حیثیت ایک الوداعی رسم کی سی ہو گئی۔ میری
تقریریں گویا بس کا آخری گیت تھیں۔ اگرچہ تھیں ذرا تیز۔ تند اور میں تو سمجھتا
ہوں کہ ان میں ایسی کوئی بات بھی نہ تھی۔ صوبہ متحدہ سے جو خبریں آئی تھیں وہ بالکل
قطعی اور واضح تھیں حکومت نے وار کر دیا تھا اور وہ اچھی کارروائی۔ الہ آباد سے کرناٹک
جانے سے مہینے میں کملا کے ساتھ مسوری بھی گیا تھا۔ وہ پھر بیمار تھی۔ میں نے سوچا میں

ان کے ساتھ کا انتظام کیا۔ الہ آباد سے بمبئی پہنچنے کے بعد ہی ہمیں خبر ملی تھی کہ حکومت
ہند نے صوبجات متحدہ کے لئے ایک خاص آرڈیننس جاری کر دیا ہے گاندھی جی
جہاز میں تھے اور عنقریب بمبئی پہنچنے والے تھے، مگر حکومت نے یہی فیصلہ کیا کہ
ان کی واپسی کا انتظار نہ کرے۔ آرڈیننس کی غرض تو یہی شورش کو دبانا بتائی
گئی تھی مگر اس کا جال اتنی دور تک پھیلا گیا تھا کہ ہر قسم کی سیاسی زندگی ٹھپ
ہوگئی تھی۔ حد یہ ہے کہ قدیم اصل والی رسم کو پلٹ کر اس نے اولاد کے گناہوں پہ
والدین اور سرپرستوں کو سزا دینے کا اہتمام تک کیا تھا۔

اسی زمانے میں گاندھی جی کے اس انٹرویو کی خبر چھپنے میں آئی جس کے
متعلق کہا جاتا تھا کہ انھوں نے روما کے اخبار جیورنال دی اطالیہ کو دیا ہے۔ اس پر
بڑی حیرت یوں ہوئی کہ یوں سرسری طور پر روما میں کوئی انٹرویو دے دینا
گاندھی جی کی عادت کے بالکل خلاف بات تھی۔ پھر جو اس بیان کو غور سے پڑھا
تو اس میں بہت سے لفظ اور فقرے ایسے ملے جو گاندھی جی کے منہ ہی نہ سکتے تھے۔ چنانچہ قبل
اس کے کہ ان کی طرف سے کوئی انکار ہوتا ہم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ انٹرویو جس شکل میں
شائع ہوا ہے اس میں تو ہرگز نہیں دیا گیا ہوگا۔ ہم سمجھتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ فرمایا
ہوگا اسے بہت توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا ہے۔ اتنے میں گاندھی جی کی طرف سے اس
کی تردید بھی اور ایسا بیان شائع ہوا کہ انھوں نے روما میں سرے سے کوئی انٹرویو
دیا ہی نہیں۔ اس وقت یہ بات صاف ہو گئی کہ کسی نے گاندھی جی کے ساتھ چال
چلی ہے لیکن حیرت تو اس پر ہوئی کہ برطانوی اخباروں اور سیاسی کارکنوں نے
گاندھی جی کی تردید کو باور نہیں کیا اور حقارت کے ساتھ انھیں جھوٹا کہہ کر پکارا۔
اس سے بڑا ہی دکھ ہوا اور بہت غصہ آیا۔

میرا جی بہت چاہتا تھا کہ کرناٹک کا دورہ چھوڑ دوں اور الہ آباد پہنچوں۔

معمولی کام کرتا رہوں گا۔ اور اسی کام کے سلسلے میں میرا ارادہ ہے کہ حلقہ میں واپس جاؤں کہ وہاں گاندھی جی سے ملوں اور مجلس عاملہ کے جلسے میں شریک ہوں جس کا میں سکریٹری ہوں۔

اب ایک نئے مسئلہ کا سامنا تھا۔ صوبے کی کانفرنس کا جلسہ اسی ہفتہ اٹاوہ میں ہونا مقرر تھا۔ میں بمبئی سے اس ارادے سے آیا تھا کہ جلسہ کو ملتوی کرنے کی رائے دوں گا۔ اس لئے کہ اس کی مارکس گاندھی جی کے سمجھے کی ماہرین سے ٹکراتی تھی اور اس لئے بھی کہ میں حکومت سے مقابلہ کرنے کو بچانا چاہتا تھا۔ لیکن میرے الہ آباد واپس آنے سے پہلے ہمارے صدر مسٹر ودالی کے نام صوبہ کی حکومت کا ایک تاکیدی پیام پہنچ چکا تھا۔ ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ کانفرنس میں وہی مسئلہ پر بحث ہوگی یا نہیں۔ اس لئے کہ اگر بحث ہونے والی ہو تو حکومت کانفرنس ہی کو روک دے۔ یہ بات تو سب جانتے تھے کہ کانفرنس کا خاص مقصد ہی اسی مسئلہ پر بحث کرنا تھا کہ اس سے سارے صوبے میں ہلچل تھی۔ جلسہ کرنا اور اس مسئلہ پر بحث نہ کرنا تو حماقت اور اسے کو معطل کر دینے کی انتہا ہوتی۔ اور ہر حال ہمارے صدر کو یا کسی شخص کو یہ اختیار تھا ہی نہیں کہ کانفرنس کو یوں پہلے سے پابند کر دے۔ حکومت کی دھمکی سے بالکل قطع نظر ہم میں سے بعض کا ارادہ خود کانفرنس کو ملتوی کرا دینے کا تھا مگر اب خود دھمکی ملی تو بات اور ہی ہوگئی۔ ایسے معاملوں میں ہم میں سے اکثر دراصل ہی واقع ہوئے ہیں اور۔ خیال کہ حکومت تو چاہتی ہے کروائی ہے۔ کچھ جوش آمدہ تھا مگر سب کچھ دلیل و بحث کے بعد ہم نے فیصلہ یہی کیا کہ اپنے تجزیہ کو باجائیں اور کڑوا گھونٹ پی ہی لیں۔ کانفرنس کو ملتوی کر دیں۔ اس لئے کیا کہ ہم سب جانتے تھے کہ جس وقت بھی ممکن ہو گا گاندھی جی کے آنے تک اس جھگڑے کو شروع تو ہونا ہی تھا رہے

دل کہتا تھا کہ میری گرفتاری ہونے والی ہے۔ اپنے ساتھیوں کے درمیان، میں یہ جب
گھر میں یہ کچھ ہو رہا ہے تو خود دور رہنا بڑی تکلیف دہ احساس تھی لیکن میں نے
فیصلہ یہی کیا کہ کرناٹک کے پروگرام کو پاس ہی کر دوں۔ جب میں واپس آیا تو بعض دوستوں
نے صلاح دی کہ گاندھی جی ٹھیک ہفتہ بھر میں آنے والے تھے ان کے پہنچنے تک
بمبئی ہی میں ٹھہروں لیکن یہ تو ناممکن تھا۔ الہ آباد سے پرشوتم داس ٹنڈن اور
دوسرے لوگوں کی گرفتاریوں کی خبر آئی تھی۔ اس کے علاوہ ہماری مجلس عاملہ کی
کانفرنس کا اجلاس اسی ہفتہ الہ آباد میں ہونا قرار پایا تھا۔ چنانچہ میں نے الہ آباد کی
واپسی کا فیصلہ کیا کہ اگر آزاد رہا تو جب وہ بمبئی لوٹ آئیں گے گاندھی جی سے
مل لوں گا اور مجلس عاملہ کے جلسے میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔ کملا کو بھی وہیں
بمبئی میں بستر علالت پر چھوڑا۔

ابھی الہ آباد پہنچا بھی نہ تھا کہ چھیوکی کے اسٹیشن پر ہی آرڈیننس کے ماتحت
ایک حکم کی تعمیل مجھ پر کی گئی۔ الہ آباد کے اسٹیشن پر پھر اسی حکم کے متن کی تعمیل کی گئی
اور گھر پہنچا تو ایک تیسرے صاحب نے تیسری مرتبہ کوشش فرمائی بات صاف تھی
کہ غلط فہمی کا احتمال بھی نہیں رکھا گیا۔ اس حکم نے مجھے الہ آباد میونسپلٹی کے حدود
میں محدود کر دیا تھا۔ مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں کسی عام جلسے میں یا تقریب
میں شریک نہ ہوں۔ نہ کسی جلسے میں تقریر کروں نہ کسی اخبار یا پرچے میں کچھ لکھوں
اس کے علاوہ اور بھی بہت سی پابندیاں تھیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ایسا ہی حکم
بہت سے ساتھیوں کو ملا تھا جس میں تصدق شروانی بھی تھے۔ دوسرے دن
صبح میں نے مجسٹریٹ ضلع کو جس نے یہ حکم جاری کیا تھا خط لکھا جس میں اس کے
حکم کی رسید دی اور ان کو اطلاع دی کہ میں ان سے اس بات کی ہدایات
لینے کا قصد نہیں رکھتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ میں اپنے معمولی طریق پر اپنا

معمولی کام کرتا رہوں گا اور اسی کام کے سلسلے میں میرا ارادہ ہے کہ جلد لکھنؤ واپس جاؤں کہ وہاں گاندھی جی سے ملوں اور مجلس عاملہ کے جلسے میں شریک ہوں جس کا میں سکریٹری ہوں۔

اب ایک نئے مسئلہ کا سامنا تھا۔ صوبے کی کانفرنس کا جلسہ اسی ہفتہ اٹاوہ میں ہونا مقرر تھا۔ میں بمبئی سے اس ارادے سے آیا تھا کہ جلسہ کو ملتوی کرنے کی رائے دوں گا اس لئے کہ اس کی تاریخیں گاندھی جی کے پہنچنے کی تاریخوں سے ٹکراتی تھیں اور اس لئے بھی کہ میں حکومت سے مقابلہ کرنے کو بیجا خیال کرتا تھا۔ لیکن میرے الٰہ آباد واپس آنے سے پہلے ہمارے صدر تصدق شروانی کے نام صوبہ کی حکومت کا ایک تاکیدی پیغام پہنچ چکا تھا۔ ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ کانفرنس میں وہی مسئلہ پر بحث ہوگی یا نہیں۔ اس لئے کہ اگر بحث ہونے والی ہو تو حکومت کانفرنس ہی کو روک دے۔ یہ بات تو سب جانتے تھے کہ کانفرنس کا خاص مقصد ہی وہی مسئلہ پر بحث کرنا تھا کہ اس سے سارے صوبے میں ہلچل تھی۔ جلسہ کرنا اور اس مسئلہ پر بحث نہ کرنا تو حماقت اور اسے کو معطل کر دینے کی انتہا ہوتی۔ اور بہرحال ہمارے صدر کو یا کسی شخص کو یہ اختیار تھا ہی نہیں کہ کانفرنس کو یوں پہلے سے ملتوی کر دے۔ حکومت کی دھمکی سے بالکل قطع نظر ہم میں سے بعض کا ارادہ خود کانفرنس کو ملتوی کرانے کا تھا مگر اب جو دھمکی ملی تو بات اور ہی ہوگئی ایسے معاملوں میں ہم میں سے اکثر راسخ ہی واقع ہوئے ہیں اور یہ خیال کہ حکومت جو چاہتی ہے کروالیتی ہے کچھ خوش آئند نہ تھا۔ مگر سب کچھ دلیل و بحث کے بعد ہم نے فیصلہ یہی کیا کہ اپنے سر زور کو دبا جائیں اور کڑوا گھونٹ پی ہی لیں۔ کانفرنس کو ملتوی کر دیں۔ یہ اس لئے کیا کہ ہم سب جانتے تھے کہ جن داموں بھی ممکن ہو گاندھی جی کے آنے تک اس جھگڑے کو جو شروع تو ہو ہی گیا تھا ٹالتے

دیں ہم یہ چاہتے تھے کہ جب وہ آئیں تو انھیں ایک ایسی صورت حال
کا سامنا ہو جس میں وہ رہنمائی کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لے سکیں۔ ہماری طرف
سے کانگریس کے ملتوی کیے جانے کے باوجود اٹاوہ میں پولیس اور فوج کا
ڈرامائی مظاہرہ ہوا۔ کچھ اکّے دکّے مارے بھی گرفتار کیے گئے اور فوج نے
سودیشی نمائش پر قبضہ کر لیا۔

شیروانی نے اور میں نے ۲۶ نومبر کی صبح کو الہ آباد سے بمبئی جانے کا
فیصلہ کیا۔ شیروانی کو مجلس عاملہ نے خاص طور پر بلایا تھا کہ صوبہ متحدہ کے حالات
پر مشورہ کرے۔ ہم دونوں کو آرڈیننس کے ماتحت حکم مل چکا تھا کہ الہ آباد شہر سے
باہر نہ جائیں۔ کہا جاتا تھا کہ آرڈیننس الہ آباد اور صوبہ متحدہ کے بعض اضلاع
کے دیہات میں لگان روکنے کے کام کے علاج کے لئے نافذ کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ
بات تو آسانی سے سمجھ میں آ سکتی تھی کہ حکومت ہمیں ان دیہی علاقوں میں نہ جانے
دے لیکن یہ بات تو صاف تھی کہ ہم بمبئی شہر میں یہ شورش برپا کر سکتے اور اگر
آرڈیننس کا مقصد اصلی دیہات کی شورش سے متعلق تھا تو ہمارے صوبے سے
باہر جانے پر تو اور خوش ہونا چاہیے تھا۔ جب سے آرڈیننس نافذ ہوا تھا ہم لوگوں
کا طرز عمل بالکل مدافعت کا تھا اور اگرچہ کہیں کہیں انفرادی طور پر احکام کی نافرمانی
ہوئی تھی مگر بالکلیہ ہم نے اس نئے قانون سے قوت آزمائی کو ٹالا تھا۔ جہاں
تک صوبے کی کانگریس کا تعلق تھا یہ بات بالکل صاف تھی کہ یہ کم سے کم
اس وقت حکومت سے لڑائی کرنے سے بچنا یا اس کو ملتوی کرنا چاہتی تھی۔
شیروانی اور میں بمبئی اس لئے جا رہے تھے کہ وہاں گاندھی جی اور مجلس عاملہ
ان معاملات پر غور کریں گے اور کسی کو خبر نہ تھی۔ کم سے کم مجھے تو ہرگز یقین
نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا ہوگا؟

ان سب باتوں سے تو یہ گمان ہوتا تھا کہ ہمیں بمبئی جانے دیا جائے گا
اور لارڈ ولنگڈن کے حکم کی محض ضابطہ کی نافرمانی کو کم سے کم اس وقت حکومت گوارا
کرلے گی مگر دل کچھ اور ہی گواہی دیتا تھا۔
ریل گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ صبح کے اخبارات میں صوبہ سرحد کے نئے
آرڈیننس کا ذکر اور عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب کی گرفتاری کی خبر
پڑھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہماری گاڑی ممبئی میل یکایک بیچ کے ایک اسٹیشن
ارادت گنج پر کھڑی ہوگئی جہاں معمولاً یہ گاڑی نہیں ٹھہرا کرتی تھی اور پولیس
کے افسر ہمیں گرفتار کرنے کے لئے گاڑی میں چڑھ آئے۔ جیل خانے کی ایک
گاڑی لائن کے پاس کھڑی تھی۔ شیروانی اور میں قیدیوں کی اس بند گاڑی
میں سوار ہوئے اور ہچکولے کھاتے نینی پہنچے انگریز پولیس کپتان جس نے
ہمیں ۲۶ دسمبر کی صبح کو کہ تحفہ تحائف دینے کا دن ہوتا ہے گرفتار کیا تھا کچھ گم سم
اور افسردہ افسردہ سا تھا۔ شاید ہم نے اس غریب کا بڑا دن خراب کیا۔
غرض ہم یوں قید خانے کو چلے۔ بقول شاعر

"راحت رسانی سے اب ذرا منہ موڑو
اور کچھ دن کرب و الم کے ساتھ کھیلو"

گرفتاریاں تعزیری قوانین اور ضبطیاں

تمام گرفتاریوں کے وقت گاندھی جی یورپ سے نہیں پہنچے۔ اس وقت
انہیں تازہ واقعات کا علم ہوا۔ لندن میں انہوں نے یہ توقع کیا تھا کہ بنگال
میں تعزیری قانون رد ہو گیا ہے اور اس سے انہیں سخت تشویش تھی لیکن
یہاں پہنچ کر انہیں علم ہوا کہ صوبۂ متحدہ اور صوبہ سرحد کے تعزیری قوانین
کی شکل میں ان کے لیے بڑے دل کے چند تھے اور موجود ہیں اور ان دونوں
صوبوں میں ان کے سربرآوردہ رفقا گرفتار کر لیے گئے ہیں معاملہ حد سے
گزر چکا تھا اور صلح کی تمام امیدیں ختم ہو گئی تھیں پھر بھی انہوں نے اس گتھی کو
سلجھانے کی آخری کوشش کی۔ لارڈ ولنگڈن وائسرائے سے درخواست کی
کہ مجھے ملاقات کا موقع دیا جائے۔ نئی دہلی سے ان کے پاس یہ جواب پہنچا کہ چند
شرائط کے ماتحت ملاقات ممکن ہے میرے پاس وائسرائے کے جواب کی نقل
موجود نہیں ہے لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے شرائط یہ تھیں کہ بنگال صوبۂ متحدہ
اور صوبہ سرحد کے تازہ واقعات تعزیری قوانین اور ان کے ماتحت گرفتاریوں
کا اگر آپ کوئی ذکر نہ کریں تو تشریف لا سکتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
گاندھی جی یا کسی کانگریسی رہنما کے لیے ان ممنوعہ مسائل کو چھوڑ کر جن سے
سارے ملک میں ایک ہیجان برپا تھا وائسرائے سے با ضابطہ گفتگو
کرنے کا اور کون سا موضوع باقی رہ جاتا ہے۔ اب یہ صاف ظاہر تھا کہ

حکومت ہند کانگریس کو کچل ڈالنے پر تلی ہوئی ہے اور اس سے کوئی معاملہ
کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ورکنگ کمیٹی کو اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ سول
نافرمانی پھر شروع کر دے۔ اس کے ممبر جانتے تھے کہ ان کے لئے ہر وقت
گرفتاری کا خطرہ ہے اس لئے قدرتاً ان کی خواہش تھی کہ جیل میں جانے سے
پہلے قوم کے سامنے ایک صحیح راہ عمل پیش کر دیں۔ پھر بھی سول نافرمانی کی قرارداد
محض عارضی طور پر منظور کی گئی اور گاندھی جی نے وائسرائے سے ملنے کی ایک
اور کوشش کی۔ انھوں نے وائسرائے کو دوسرا تار بھیجا کہ غیر مشروط ملاقات کا
شرف بخشا جائے۔ اس کے جواب میں حکومت نے گاندھی جی اور کانگریس کے صدر
دونوں کو گرفتار کر لیا اور وہ بٹن دبا دیا جس سے سارے ملک میں تشدد کی باتیں
عام ہونے لگیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے سے اور کوئی لڑائی کا خواہشمند
ہو یا نہ ہو لیکن حکومت لڑنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔

ہم جیل میں تھے اور یہ تمام خبریں مبہم اور بے ربط شکل میں ہمارے پاس
پہنچتی تھیں۔ ہمارا مقدمہ یا سال شروع ہونے تک ملتوی ہو گیا تھا اس لئے
زیر سماعت حوالاتی کی حیثیت سے ہم عام قیدیوں کے مقابلے میں باہر والوں سے
زیادہ مل سکتے تھے۔ ہم نے سنا کہ ملک میں یہ اہم بحث چھڑی ہوئی ہے کہ آیا
وائسرائے نے ملاقات سے انکار کر کے غلطی کی یا نہیں، گو ان کے ملاقات کرنے
یا نہ کرنے پر بہت سی باتوں کا دارومدار تھا۔ اس وقت ملاقات کا مسئلہ تمام دوسرے
مسائل پر چھا گیا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اگر لارڈ ارون یہاں موجود ہوتے تو ہرگز
انکار نہ کرتے اور اگر وہ اور گاندھی جی مل بیٹھتے تو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک
ہو جاتا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حسرت ہوئی کہ ہندوستانی اخبارات کتنی سطحی
نظر سے اس مسئلہ کو دیکھ رہے ہیں اور اصل حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں

ہندوستانی قوم پرستی اور برطانوی سامراج دراصل دو متضاد چیزیں ہیں۔ اس لئے ان دونوں کا ٹکرانا ضروری ہے تو کیا یہ جنگ چند افراد کے ذاتی رویہ پر منحصر ہے، کیا ان دونوں تاریخی قوتوں کی ٹکر باہمی اخلاق اور دل آویز مسکراہٹ سے رک سکتی ہے، گاندھی جی نے ایک خاص طرز عمل اس وجہ سے اختیار کیا کہ ہندوستان کی قومی تحریک خودکشی نہیں کر سکتی تھی۔ یعنی زندگی اور موت کے معاملہ میں لٹیروں کے احکام کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھی اسی طرح ہندوستان کے برطانوی وائسرائے نے ایک دوسرا رویہ اس لئے اختیار کیا کہ قومی تحریک کا مقابلہ اور برطانوی مفاد کی حفاظت کی کوشش کرے پھر اس کا کیا سوال ہے کہ اس وقت کون وائسرائے تھا کون نہیں تھا۔ اگر لارڈ ارون وائسرائے ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے جو لارڈ ولنگڈن نے کیا کیونکہ دونوں برطانوی سامراج کے آلۂ کار تھے۔ اور ذاتی طور پر مقررہ پالیسی میں محض جزوی ترمیم کر سکتے تھے لارڈ ارون جو اس وقت حکومت برطانیہ کے ایک رکن تھے اس لئے ہندوستان میں حکومت نے جو قدم اٹھایا اس میں وہ بھی شریک تھے ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کے معاملہ میں کسی وائسرائے کو ذاتی حیثیت سے اچھا یا برا کہنا بالکل لغویات ہے اور ہمارا ان خصوصیات کو اہمیت دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو ہم حقیقت حال کو سمجھتے ہی نہیں یا جان بوجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔

۴ جنوری ۱۹۳۲ء ایک یادگار تاریخ تھی۔ اس روز دلیل اور بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ صبح تڑکے گاندھی جی اور کانگریس کے صدر ولبھ بھائی پٹیل گرفتار کر لئے گئے اور شاہی قیدی کی حیثیت سے بغیر عدالتی تحقیقات کے نظر بند کر دئے گئے۔ چار نئے تعزیری قانون یا قانون کی رو سے

• مجسٹریٹوں اور پولیس افسروں کو نہایت وسیع اختیارات مل گئے۔ بی آزادی
کا خاتمہ ہوگیا۔ کیونکہ حکام اپنی مرضی سے افراد کو قید اور املاک کو ضبط کرسکتے
تھے۔ گویا سارے ہندوستان میں ایک طرح فوجی محاصرے کا اعلان ہوگیا
رہی اس محاصرے کی وسعت و شدت، وہ مقامی حکام کے اختیار تمیزی
پر چھوڑ دی گئی تھی لہ

اسی روز صوبۂ متحدہ کے ضابطہ اختیارات ہنگامی کے ماتحت نینی جیل
میں ہمارے مقدمے کی پیشی ہوئی شیروانی کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور
ڈیڑھ سو روپے جرمانے کی سزا ملی اور مجھے دو سال کی قید بامشقت اور
پانچسو روپے جرمانہ (بصورت عدم ادائیگی مزید چھ ماہ) کی سزا ہوئی۔

ہم دونوں کا جرم ایک تھا دونوں کو حکم دیا گیا کہ الہ آباد شہر سے
باہر نہ نکلیں۔ ایک ساتھ بمبئی جانے کی کوشش کرکے دونوں نے یکساں
ان کی خلاف ورزی کی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ گرفتار کیے گئے تھے اور
ایک ہی دفعہ کے ماتحت مجرم قرار دے دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود ہمیں
سزائیں مختلف ملیں۔ البتہ ایک فرق ضرور تھا۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو
یہ تحریری اطلاع دے دی تھی کہ میں اس حکم کے باوجود بمبئی جانے والا
ہوں۔ شیروانی نے اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی لیکن اس کی
روانگی کا بھی سب کو علم تھا اور اخباروں میں بھی یہ خبر شائع ہوگئی۔ سزا کا حکم مجھے

لہ وزیر ہند سر سیموئل ہور نے ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ کو دارالعوام میں اقرار کیا تھا "مجھے تسلیم ہے کہ ہم
نے جو تعزیری قوانین نافذ کیے ہیں وہ نہایت سخت ہیں اور ہندوستانیوں کی زندگی کے
قریب قریب ہر شعبہ پر حاوی ہیں"

کے بعد ہی شیروانی نے مجسٹریٹ سے ایک نہایت ہی دل چسپ سوال کیا کہ
جس سے سارا مجمع کھل کھلا کر ہنس پڑا اور بے چارہ مجسٹریٹ گھبرا گیا۔ انھوں نے
پوچھا کہ کیا مجھے کم سزا دینے میں فرقہ وارانہ تناسب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔
اس تاریخی دن یعنی ۲۶ جنوری کو سارے ملک میں بہت سے اہم واقعات
پیش آئے ہم سے تھوڑی دور پر یعنی الہ آباد شہر میں بہت بڑے مجمع کا پولیس
اور فوج سے مقابلہ ہو گیا جس میں لاٹھی چارج ہوا جس سے بہت سے
لوگ ہلاک و زخمی ہوئے۔ سول نافرمانی کے قیدیوں سے جیل پھر بھرنے شروع
ہو گئے۔ پہلے وہ ڈسٹرکٹ جیلوں میں اور پھر سنٹرل جیل میں بھیجے گئے۔
اور جب وہاں گنجائش نہیں رہی تو دوسری سنٹرل جیلوں کی باری آئی۔
آخر جیل بھر گئے اور بڑے بڑے جیل کیمپ کھولنا پڑے۔
نینی میں ہمارے چھوٹے سے احاطہ میں بہت کم لوگ آئے البتہ
میرے پرانے ساتھی سید ارشاد، رنجیت پنڈت اور میرے بھتیجے کے بھائی
موہن لال نہرو۔ چند روز کے بعد بارک نمبر ۶ کی اس چھوٹی سی برادری
میں ایک اور مہمان کا اضافہ ہوا۔ جن کے آنے سے ہم سب کو بہت تعجب
ہوا۔ ہمارے سیلوں کے نوجوان دوست ریڈ الیو دارے تھے جو حال ہی
میں انگلستان سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے۔ میری بہن نے انھیں خوب
سمجھا دیا تھا کہ تم مظاہروں میں نہ پڑنا۔ لیکن جوش میں آکر وہ کانگریس کے
جلوس میں شریک ہو گئے اور قیدیوں کی گاڑی نے انھیں جیل جانے پہنچا دیا
کانگریس خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ فہرست میں سب سے اوپر ورکنگ
کمیٹی کا نام تھا اس کے بعد صوبہ کی کمیٹیاں اور بے شمار مقامی کمیٹیاں تھیں
کانگریس کے ساتھ ساتھ ۱۰۰ تمام ادارے بھی خلاف قانون ٹھہرائے گئے

جوں سے کسی قسم کا تعلق رکھتے تھے یا محض اس لئے کہ ہم ہمدرد تھے یا انتہا پسند سمجھے جاتے
تھے کسان سبھائیں، کاشتکاروں کی انجمنیں، نوجوانوں کی انجمنیں، طلبا کی ایسوسی ایشن
ترقی پسند سیاسی ادارے، قومی یونیورسٹیاں اور اسکول، قومی اسپتال، سودیشی
ادارے، غرض سارے ہی کچھ اس کی لپیٹ میں آگئے۔ فہرست بہت طویل تھی اور
سرکاری صوبے کے ذیل میں سینکڑوں نام درج تھے۔ سارے ہندوستان کی میزان
کئی ہزار تک پہنچی۔ خلاف قانون اداروں کی اتنی بڑی تعداد
کانگریس اور قومی تحریک کی کامیابی کی ایک روشن دلیل تھی۔

میری بیوی لکھنؤ میں بیمار پڑی تھیں اور سول نافرمانی میں حصہ لینے کے لئے
رہ رہی تھیں میری والدہ اور دونوں بہنیں بہت جلد ایک ایک سال کی سزا
پاکر جیل پہنچ گئیں۔ جیل میں آنے والوں کے ذریعے باہر کی تھوڑی سی خبریں
ملاقات میں یا کچھ حال ایک سرکاری ہفتہ وار پرچے سے جو ہمیں پڑھنے کو
ملتا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن باہر کے واقعات کا پورا اندازہ کرنے کے لئے
ہمیں قیاس سے کام لینا پڑتا تھا۔ کیونکہ ہم جانتے تھے کہ خبروں کا انتخاب
بڑی سختی سے ہوتا ہے اور اخباروں اور خبر رساں ایجنسیوں کو ہمیشہ بھاری
سزاؤں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ بعض صوبوں میں تو گرفتار ہونے والوں یا سزا پانے
والوں کا نام لکھنا بھی جرم تھا۔

غرض ہم دہرہ دون جیل میں باہر کی جنگ سے دور تھے۔ پھر بھی ہمارا دل اسی
میں پڑا تھا۔ ہم وقت گزارنے کے لئے چرخہ کاتتے، کتابیں پڑھتے، دوسرے شغل
میں مصروف رہتے ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور دل میں ہر وقت یہی سوچتے
رہتے کہ جیل خانے کی دیواروں کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ غرض ہم اس تحریک
سے جدا ہونے کے باوجود اس میں شریک تھے۔ کبھی اتنی کی حالت

دل کو بے چین کرتی کسی غلطی پر غصہ آجاتا، کمزوری یا کمینے پن کی حرکت سے نفرت ہوتی اور کبھی ہم جذبات سے الگ ہوکر نہایت سکون اور غیر جانبداری سے تمام حالات پر غور کرتے اور یہ سمجھ لیتے کہ جب بڑی بڑی قوتیں کام کر رہی ہوں اور قہر و غضب کی چکیاں چل رہی ہوں تو چھوٹی چھوٹی (انفرادی) غلطیاں اور کمزوریاں لازمی ہیں ہم سوچتے تھے کہ دیکھیں اس جنگ و جدل، اس شور شغب، اس دلیرانہ جوش و خروش، اس ظالمانہ حسد و تشدد اور نفرت انگیز بزدلی کا کیا رنگ رہتا ہے اور ان سب چیزوں کا کیا انجام ہونے والا ہے مستقبل ہم سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ اور یہی اچھا تھا۔ ہم قیدیوں کو تو حال کی بھی خبر نہ تھی لیکن تاہم ضرور جانتے تھے کہ ہمیں جنگ بے چینی اور تباہی کا آج بھی سامنا ہے اور کل بھی رہے گا۔

میتھو آرنلڈ نے کیا خوب کہا ہے

"لوگ کل میدان میں نکل کھڑے ہوں گے اور جنگ از سر نو شروع ہو جائے گی!

"ویتھس[1] کا سارا میدان خون سے سرخ نظر آئے گا"

"ہکٹر اور اکلیس[1] پھر میدان میں اتریں گے"

"اور ہیلن پھر دیوار پر کھڑے ہو کر اس خون چکاں منظر کا تماشا دیکھے گی"

---

[1] یونان کے شاعر ہومر نے یتھس اور ٹرائے کی جنگ کا نقشہ لکھا ہے۔ اس میں ویتھس میدان جنگ کا نام ہے۔ ہکٹر اور اکلیس ٹرائے کے سورما ہیں اور ہیلن وہ عورت ہے جس کی خاطر جنگ ہوئی تھی۔

پھر یا تو ہم امن کا گوشہ ڈھونڈیں گے یا میدان جنگ میں جا نکلیں گے۔
کبھی اندھی امیدوں سے ابھریں گے کبھی اندھی مایوسیوں میں ڈوبیں
گے۔

دل و دماغ سے سعی و عمل میں مصروف ہو جائیں گے مگر یہ پتہ نہ چلے
گا کہ ہماری روح کا کیا حشر ہوتا ہے۔

بازاری پروپیگنڈا

سنہ ۱۹۴۲ء کے ابتدائی مہینوں میں۔ اور بہت سی عجیب باتوں کے ساتھ
ایک یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت دل کھول کر بازاری طرز کے پروپیگنڈے
سے کام لے رہی تھی۔ چھوٹے بڑے تمام بڑی بلند آہنگی سے دعوے کرتے تھے
کہ ہم بڑے نیک اور امن پسند ہیں اور کانگریس بڑی پاپی اور جھگڑالو ہے۔
ہم جمہوریت کے حامی ہیں اور کانگریس ڈکٹیٹری کی مؤید ہے۔ اس تقدس
کے جوش میں شاید انہیں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد نہیں رہیں جیسے
تعزیری قوانین کا نفاذ، ہر طرح کی آزادی کا سلب کر لینا، اخباروں اور مشینوں
کا گلا گھونٹنا، بلا مقدمہ چلائے لوگوں کو قید میں ڈال دینا۔ جائداد اور روپیے
کی ضبطی یا اسی طرح کی اور بہت سی باتیں جو آئے دن دیکھنے میں آتی تھیں اور
شاید وہ یہ بھی بھول گئے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کن اصولوں پر
قائم ہے۔ سرکاری وزراء جو ہمارے ہی ہم وطن تھے جوش خطابت میں یہ فرماتے
تھے کہ کانگریس والے تو اپنے ذاتی اغراض حاصل کرتے ہیں (جیل میں!) اور
ہم چند ہزار ماہوار کی حقیر تنخواہ پر رات دن قوم کی خدمت کیا کرتے ہیں۔ ماتحت
عدالتیں نہ صرف ہمیں بھاری بھاری سزائیں دیتی تھیں بلکہ اس موقع پر وعظ و
نصیحت بھی فرماتی تھیں اور کبھی کبھی کانگریس اور اس کے کارکنوں کو جی بھر
کے گالیاں بھی دیتی تھیں۔ مسٹر سموئل ہور نے بھی وزارت ہند کی کرسی پر بیٹھ کر یہ

شکل اشتعال انگیزی کر کے بھڑکا کرتے ہیں اور فساد بڑھتا چلا جاتا ہے۔
شاید وہ اس وقت یہ بھول گئے تھے کہ سب کے سب تو جیل میں بند تھے اور
وہاں آسانی سے پھونک نہیں سکتے تھے اور جو باہر تھے ان کے سر پر کس کر
چھینکا چڑھا دیا گیا تھا۔

سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ کانپور کے فساد کا الزام کانگریس کے
سر تھوپا گیا۔ اس خوفناک فساد کی تباہ کاریوں کو بیان کر کے بار بار کہا گیا کہ
کانگریس اس کی ذمہ دار ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر صرف
کانگریس ہی نے شرافت اور ہمدردی سے کام لیا۔ اس کے ایک لائق ترین
فرزند نے امن قائم کرنے کی کوشش میں اپنی جان دے دی اور کانپور
کی ہر جماعت اور ہر فرقے نے اس کا ماتم کیا۔ کانگریس کے کراچی کے اجلاس
میں جب یہ خبر پہنچی تو فوراً ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے
بہت تفصیلی تحقیقات کی، مہینوں کی محنت کے بعد ایک ضخیم رپورٹ شائع
کی جسے حکومت نے فوراً ممنوع قرار دیا۔ اس کے تمام مطبوعہ نسخے ضبط
کر لئے اور شاید انہیں ضائع کر دیا۔ ہماری تحقیقات کے نتائج کو اس طرح
دبا دینے کے باوجود سرکاری متعصب اور انگریزوں کے اخبارات یہی
رٹ لگائے گئے کہ فساد کانگریس کی وجہ سے ہوا۔

ایک دن اس معاملہ اور دوسرے معاملات کی حقیقت آشکار
ہو کر رہے گی۔

لیکن بعض اوقات جھوٹ بہت دن تک سچ سے آگے آگے
رہتا ہے۔

جھوٹ اپنا کام کر کے رٹ جائے گا۔

سچ بہت بڑا ہے اور اسی کا بول بالا رہے گا۔
مگر اس وقت جب اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اس وقت جنگ کی سی حالت تھی۔ اس لیے شاید جذبات کا یہ
ہیجان ایک قدرتی چیز تھی اور یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ حکومت ہیجانی
یا ضبط سے کام لے گی۔ مگر پھر بھی ہیجان کی یہ شدت حیرت انگیز تھی اس سے
اندازہ ہوتا تھا کہ ہندوستان کی حکمراں جماعت کے اعصاب کی کیا حالت تھی
اور اس نے کس طرح اپنے جذبات کو ایک مدت سے دبا رکھا تھا حالانکہ اس کے
اس غیظ و غضب کا سبب ہمارا کوئی قول یا فعل نہیں تھا۔ بلکہ خود اس کا
یہ خوف کہ سلطنت ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے جن حکمرانوں کو اپنی قوت پر
اعتماد ہوتا ہے وہ اس طرح بدحواس نہیں ہو جایا کرتے۔ تصویر کا دوسرا
رخ اس رخ سے بہت مختلف تھا دوسری طرف جو کیفیت طاری تھی۔
یہ کوئی اختیاری اور پُر وقار خاموشی نہیں تھی بلکہ قید خانے کے خوف
کی اور عالمگیر احساس کی خاموشی تھی۔ اگر اس طرح ہر وقت تشدد نہ کیا جاتا تو ممکن
ہے دوسری طرف بھی یہی ہیجان نظر آتا اور اسی طرح گالیاں اور بدزبانی سے
کام لیا جاتا۔ البتہ کچھ جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ ضرور تھا یعنی وہ خلاف
قانون خبر کے پرچے جو مختلف شہروں سے کبھی شائع ہوتے تھے۔

انگریزوں کے جو اخبار ہندوستان میں ہیں وہ بھی اس بار اس بربریت
میں بڑے شوق سے شریک ہو گئے اور ان خیالات کو علی الاعلان ظاہر کرنا
شروع کر دیا جو شاید مدت سے اپنے سینوں میں دبائے بیٹھے تھے عموماً انہیں
اپنی تحریروں میں ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ ناظرین یا خریداروں
کی تعداد بہت کافی ہے لیکن اس طوفان میں یہ احتیاط بھی بہہ گئی۔ اور انہیں

انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے دلوں کی گہرائی کی ایک جھلک نظر آگئی۔ ہندوستان میں ایک ایک کرکے بیشتر انگلو انڈین اخبار ختم ہوچکے ہیں۔ صرف تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن جو باقی ہیں۔ وہ نہایت اعلیٰ معیار کے اخبار ہیں۔ ان کا خبروں کا انتظام بھی نہایت معقول ہے اور ترتیب اور طباعت بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ دنیا کی سیاست کے متعلق ان میں جو افتتاحیہ مقالے شائع ہوتے ہیں گو ان کا نقطۂ نظر رجعت پسندانہ ہوتا ہے لیکن بڑی قابلیت سے لکھے جاتے ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والے کو اپنے موضوع پر پورا عبور حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اخباری حیثیت سے وہ ہندوستان میں سب سے ممتاز ہیں۔ لیکن ہندوستان کے سیاسی مسائل میں وہ اپنی سطح سے بہت نیچے گر جاتے ہیں اور ایسی یکطرفہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور جب قومی تحریک کا زور ہوتا ہے تو یہ جانب داری وحشت اور سوقیانہ پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ حکومت ہند کی آواز کو دہرانے لگتے ہیں اور اس سلسلہ پروپیگنڈے میں ضبط اور احتیاط کے تمام پردے اٹھا دیتے ہیں۔

ان چند منتخب اینگلو انڈین اخباروں کے مقابلہ میں ہندوستانی اخبار عموماً ادنیٰ قسم کے ہیں۔ ان کی مالی حالت خراب ہے اور ان کے مالک اسے سنبھالنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ ان کا روز کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے اور بے چارے ادارتی عملے کو بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں ان کی طباعت وغیرہ خراب ہوتی ہے اور اشتہارات بھی نامناسب قسم کے ہوتے ہیں۔ زندگی کے عام مسائل اور سیاسیات میں یہ وا لہانہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ہماری قوم جذبات پرست واقع ہوئی

ے کچھ یہ کہ (جہاں تک انگریزی اخباروں کا تعلق ہے) انگریزی ان کے لئے
پالیسی زبان ہے اور اس میں ایسا طرزِ بیان اختیار کرنا کہ سادگی کے ساتھ زور
بھی ہو آسان نہیں ہے لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ ایک مدت تک محکوم رہتے رہتے
اور جبر و تشدد سہتے سہتے ہمارے جذبات گھٹ کر اور دب کر رہ گئے ہیں اور جب
ذرا سا موقع ملتا ہے ابل پڑتے ہیں۔

ہندوستانیوں کے انگریزی اخباروں میں طباعت ترتیب وغیرہ کے
لحاظ سے ، اس کا لیڈر سب سے بہتر ہے۔ اس کی دوستان سے جو ایک
تند اور تقدس مآب بوڑھی سن رسیدہ عورت کی ہوتی ہے کہ جہاں کسی نے کوئی
ایسا ویسا لفظ زبان سے نکالا اور وہ حیا اور غصہ کے مارے آپے سے باہر
ہوگئی۔ مسٹر چنتامنی پرواہ متوسط طبقہ کے شہریوں کا پرچہ ہے اور اس کا کاروبار خوب
چلا ہوا ہے۔ زندگی کے تاریک پہلو، حیات کی کشمکش اور ترتیب و تزئین سے اسے
کوئی تعلق نہیں۔ بہت سے اعتدال پسند اخباروں کا معیار بھی یہی ثقاہت اور
تقدس مآبی ہے۔ یہ رنگ تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن ہند۔ کی خصوصیت اور خصوصیات
نہیں پیدا کر سکتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے روکھے پھیکے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ حکومت نے اس حملہ کے لئے مدت سے تیاری کی تھی اور وہ
چاہتی تھی کہ پہلی ہی ضرب نہایت شدید اور مؤثر ہو۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی ہمیشہ یہ
کوشش رہی کہ نئے نئے تحریری ضابطوں سے تحریک کی بڑھتی ہوئی رفتار
کو روکے۔ گویا اس وقت پیش قدمی کانگریس کی طرف سے ہوئی تھی اور حکومت
مدافعت کرتی تھی ۱۹۳۲ء کا طریقہ اس کے بالکل برعکس تھا یعنی اب حکومت نے
چاروں طرف سے حملہ شروع کر دیا۔ سارے ملک کے لئے اور اس کے علاوہ
علیحدہ علیحدہ تمام صوبوں کے لئے طرح طرح کے تحریری ضابطے جاری کئے

ان کی رو سے حکام کو دنیا بھر کے اختیارات دے دیئے۔ اداریے خلاف قانون قرار دیئے گئے۔ عمارتیں، جائداد، موٹریں اور بنک کی رقمیں ضبط کر لی گئیں۔ جلسہ اور جلوس کی ممانعت کر دی گئی اور اخبار اور مطبعے پوری طرح جکڑ دیئے گئے۔ دوسری طرف، خلاف ۱۹۳۰ء کے گاندھی جی کی قطعی رائے تھی کہ سول نافرمانی کی بحالی شروع نہ کی جائے۔ اور ورکنگ کمیٹی کے اراکین بھی زیادہ تر ان کے ہم خیال تھے۔ بعض لوگوں کا اور میرا بھی یہی خیال تھا کہ چاہے ہم جنگ کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں مگر جنگ یقینی ہے۔ اس لئے ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد میں کشمکش برابر بڑھ رہی تھی اس لئے لوگوں کا ذہن آنے والی جنگ کی طرف خود بخود منتقل ہونے لگا تھا لیکن بحیثیت مجموعی تعلیم یافتہ اور ماہا ملتہ اس وقت جنگ کے خیال میں نہ تھا گو وہ اس کو بالکل ناممکن نہیں سمجھتا تھا۔ نہ جانے کیوں لوگوں کو یہ امید بندھ گئی تھی کہ گاندھی جی کی واپسی پر جنگ ٹل جائے گی۔ ظاہر ہے کہ خود اس کی خواہش نے خیال کی صورت اختیار کر لی تھی۔

مگر جس ۱۹۳۲ء کے شروع میں حکومت نے سراسر پیش قدمی کی اور کانگریس ابل سے آخر تک مدافعت کرتی رہی۔ تعزیری ضوابط کے یکایک نافذ ہو جانے اور سول نافرمانی کے شروع ہو جانے سے اکثر مقامی کارکن بیکار ہو گئے پھر بھی کانگریس کی دعوت پر چاروں طرف سے لبیک کی آواز بلند ہو گئی۔ اور ہر طرف سے سول نافرمانی کرنے والے امڈ آئے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ۱۹۳۲ء میں حکومت برطانیہ کا ۱۹۳۰ء سے کہیں زیادہ مضبوطی سے مقابلہ کیا گیا۔ کیونکہ ۱۹۳۰ء میں عموماً سب کہیں اور خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں مظاہرے زیادہ تھے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اگر ۱۹۳۲ء میں لوگوں نے پہلے سے زیادہ استقلال

کا ثبوت دیا اور غیر معمولی طور پر پر امن رہے لیکن سنہ ۴۲ء کے مقابلہ
میں جوش بہت کم تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کو مجبوراً جنگ میں
شریک ہونا پڑا سنہ ۴۲ء کی جنگ میں ایک عجیب شان تھی جو اب
باقی نہیں رہی تھی حکومت نے اپنی پوری طاقت سے کانگریس کا مقابلہ
کیا سارے ہندوستان میں گویا مارشل لا جاری تھا اس کے بعد کانگریس
کو آزادی عمل یا پیش قدمی کا کوئی موقع نہیں ملا۔ پہلے ہی وار نے مسلے اور
اس کے اوسط طبقہ کے حامیوں کو جو اس کے حامی ہم درد تھے بے کار
کر دیا اس کی چوٹ ان کی جیبوں پر پڑی اور بعض یقین ہو گیا کہ جو کوئی
سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہوگا یا کسی طرح اس کی مدد کرے گا
اسے نہ صرف اپنی آزادی سے بلکہ شاید تمام املاک سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا
صوبۂ متحدہ میں ہم پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا۔ کیونکہ یہاں تو کانگریس
غریبوں کی جماعت ہے الہ آباد جیسے بڑے بڑے شہروں میں املاک کی ضبطی
کے خوف نے بڑا اثر ڈالا۔ کیونکہ اس سے تاجروں کا طبقہ تو بالکل برباد
ہو جاتا اور ان کے پیشوں کے لوگوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا محض اس
دھمکی نے جو کبھی کبھی عمل میں بھی لائی گئی شہر کے تمام کھاتے پیتے لوگوں کو سُن
کر دیا چنانچہ بعد میں مجھے ایک سیدھے سادے لیکن خوش حال تاجر کا ایک
عجیب واقعہ معلوم ہوا اس بے چارے کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا
بجز اس کے کہ شاید وہ کبھی کبھی چندہ دے دیتا تھا مگر پولیس نے اسے دھمکی دی
کہ تم پر پانچ لاکھ روپیہ جرمانہ کیا جائے گا اور لمبی سزا الگ ہوگی اس قسم کی دھمکیاں
بہت عام تھیں اور یہ خالی خولی دھمکیاں نہ تھیں کیونکہ اس وقت پولیس کا راج
تھا اور آئے دن دیکھنے میں آتا تھا کہ وہ گرحتی میں بلکہ برستی کمی ہے۔

میرے نزدیک حکومت کے اس رویّہ پر کسی کانگریسی کو اعتراض کرنے کا
کوئی حق نہیں ہے گو اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت نے اس انتہائی پر امن
تحریک کے خلاف جو جو تشدد اختیار کیا وہ تہذیب کے ہر معیار سے گرا ہوا
اور سخت قابل اعتراض تھا۔ اگر ہم عملی جد و جہد اور انقلابی طریقے اختیار کریں گے
تو چاہے وہ کتنے ہی پر امن کیوں نہ ہوں ان کا مقابلہ ضرور ہوگا۔ ڈرائنگ
روم میں بیٹھ کر انقلاب کا کھیل نہیں کھیلا جا سکتا۔ لیکن بعض حضرات انقلاب
بھی چاہتے ہیں اور مقابلہ سے بھی بچتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے جو شخص
انقلابی جد و جہد کی راہ میں قدم رکھنا چاہتا ہے اسے اپنا سب کچھ قربان کرنے
کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ کھاتے پیتے خوش حال لوگ بہت کم
انقلاب پسند ہوتے ہیں۔ گو ان میں سے ایک آدھ ایسے بھی نکل آتے ہیں
وہ حضرات جو بنیادی عقل رکھتے ہیں انہیں بے وقوف سمجھتے ہیں اور ان پر اپنے
طبقے سے غداری کا الزام لگاتے ہیں۔

عام لوگوں کو جن پر قومی تحریک اصل میں منحصر تھی دبانے کے لئے حکومت
کو اور تدبیروں سے کام لینا پڑا اس لئے کہ ان کے پاس۔ موٹریں تھیں نہ
بینکوں میں رقم تھی نہ کوئی اور ایسی املاک تھیں جس پر قبضہ کیا جا سکتا۔ تحریک کو
دبانے کے لئے حکومت نے طرح طرح کی سختیاں شروع کیں اور ان کا ایک
دلچسپ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حضرات بھی جو بقول ایک مصنف کے جس کی
کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے، "سرکاری آدمی کہلاتے ہیں، خوب
جھنجھوڑے گئے" ان میں سے بعض نے یہ سمجھ کر۔ جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے
پھر دل سے کانگریس سے لگاوٹ کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ بھلا حکومت
اسے کب برداشت کرنے والی تھی۔ اس کے لئے محض وفاداری کافی نہ تھ

کیا جائے گا اور انہیں معمولی سزائیں ملیں گی برعکس اس کے حال تھا۔ وہاں میں
کوئی بھی ایسی عورتوں کو جیل میں بھیجنا نہیں چاہتا عموماً عورتوں نے اپنے
والد، خاوند، یا بھائیوں کی مرضی کے خلاف، یا کم سے کم بغیر ان کی خوشی کے
اس تحریک میں حصہ لیا۔ بہرحال حکومت نے عورتوں کو لمبی لمبی سزائیں دے کر
اور جیل جانے میں ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کر کے اس کی انتہائی کوشش
کی کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں۔ میری بہنوں کی گرفتاری اور سزایابی کے بعد ہی
چند پندرہ سولہ برس کی لڑکیاں الہ آباد میں غور کرنے کے لئے جمع ہوئیں کہ
اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ انہیں دنیا کا کوئی تجربہ نہ تھا لیکن وہ جوش سے
سرشار تھیں اور انہیں مشورہ کی ضرورت تھی۔ وہ ایک نجی مکان میں جمع تھیں کہ
انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ہر ایک کو دو سال قید سخت کی سزا دے دی گئی۔
تو بہت ہی معمولی سا واقعہ تھا۔ اس قسم کے متعدد واقعات ہندوستان کے
کونے کونے میں آئے دن ہوتے تھے۔ جن عورتوں اور لڑکیوں کو تحریک کے
سلسلہ میں سزا ہوئی انہیں جیل جانے میں مردوں سے زیادہ مصیبتیں جھیلنی پڑیں
میں نے بہت سے تکلیف دہ واقعات سنے ہیں لیکن سب سے عجب سرگزشت
میری نظر سے گذری مسز اسن (مس میڈلین سلیڈ) کی ترتیب دی ہوئی تھی۔ جس
میں انھوں نے اپنے اور سول نافرمانی کی دوسری قیدی عورتوں کے
بعض جیل کے تجربے درج کئے تھے۔

صوبۂ متحدہ میں ہماری تحریک کا رخ دو رویہ دیہاتی علاقہ میں تھا
کسانوں کی طرف سے کانگریس حکومت پر برابر زور ڈالتی رہی تھی اس
لئے حکومت نے خاص رقم کی چھوٹ کا وعدہ کر لیا تھا۔ اگرچہ ہمارے
نزدیک وہ کافی نہ تھی۔ ہماری گرفتاری کے بعد ہی اور چھوٹ کا اعلان کیا گیا

کیسی عجیب بات ہے کہ یہی اعلان ذرا پہلے نہ کیا گیا۔ ورنہ حالات میں بہت بڑا
فرق پڑ جاتا ہم ہرگز نہ سوچتے تھے اس کو دور نہ کر سکتے لیکن در اصل حکومت کو
تو یہ فکر تھی کہ اس چھوٹ کا سہرا کانگریس کے سر نہ ہو۔ اس لئے کہ ایک طرف
تو اس نے کانگریس کو کچلنے کی کوشش کی اور دوسری طرف کسانوں کو خاموش
کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ چھوٹ دی۔ ہمارا یہ بھی اندازہ ہے کہ جہاں کہیں
کانگریس کا سب سے زیادہ زور پڑا تھا۔ وہیں سب سے زیادہ چھوٹ ملی۔
اگرچہ بہت معقول چھوٹ دی گئی تھیں لیکن اس سے کسانوں کی مشکلات
کا حل نہیں ہوا۔ البتہ انہیں کچھ سہولت ضرور ہو گئی گویا حکومت نے کسانوں
کی مخالفت کی شدت میں کمی کر دی جس سے ملک کی عام تحریک وقتی طور پر
کچھ کمزور پڑ گئی اس تحریک کی وجہ سے یوپی کے ہزاروں کسانوں پر طرح طرح کی
آفتیں نازل ہوئی تھیں جن سے بہت سے غریب بالکل تباہ ہو گئے تھے۔
لیکن اس تحریک کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو اس وقت جو زیادہ سے
زیادہ چھوٹ مل سکتی تھی مل گئی اور ہول بافرالی کے شدائد سے (قطع نظر) وہ
زبردست پریشانیوں سے بچ گئے۔ ان چھوٹے چھوٹے وقتی فائدوں سے کسانوں
کا کچھ زیادہ کام نہیں چلا۔ لیکن اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ جو کچھ بھی فائدہ اس
کوششوں کا نتیجہ تھا جو کسانوں کی حمایت میں صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی برابر کام
کر رہی تھی۔ عارضی طور پر کسانوں کو اس سے فائدہ پہنچا۔ لیکن ان میں جو سب سے
زیادہ بہادر تھے وہ جنگ میں کام آ گئے۔
دسمبر ۱۹۳۱ء میں جب صوبہ متحدہ میں عارضی تحریری ضابطہ نافذ ہوا تو اس
کے ساتھ ایک چھپی بیان بھی شائع ہوا۔ اس بیان میں اس کے علاوہ اور
[illegible] تحریری ضوابط کے [illegible]

بہت کچھ جھوٹ سچ درج تھا۔ جس سے پروپاگنڈے کا کام لینا مقصود تھا۔
یہ بھی اس ابتدائی اداری پروپاگنڈے کا ایک حربہ تھا۔ اور اصل اس کا
موقع بھی حاصل نہ تھا کہ ہم اس کا جواب دیں یا اس سفید جھوٹ کی تردید
کر سکیں۔ البتہ ایک مرتبہ تیرا ڈائی پر اس طرح کا جھوٹ تراشا گیا تھا تو احرار نے اپنی
گرفتاری سے پہلے اس کی تردید کر دی تھی۔ حکومت کے ان مصنف بیانوں اور
مصدرتوں کا مطالعہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ حکومت کتنی
بوکھلائی ہوئی تھی اور اس کے حواس کس حد تک جواب دے چکے تھے۔ کل
اتفاق سے میں شاہ اسپین یونہی چارلس سوم کا ایک فرمان پڑھ رہا تھا جس کی
رو سے انھوں نے جیسوٹ فرقے کو اپنی سلطنت سے نکالنے کا حکم صادر فرمایا تھا
اسے پڑھ کر مجھے خواہ مخواہ حکومت ہند کے تحریری ضوابط اور ان وجوہ کا خیال
آگیا جو ان کی تائید میں پیش کی گئی تھیں۔ شاہ چارلس نے ۱۷۶۷ء میں یہ
فرمان جاری کیا تھا اور اس میں اپنے فعل کو اس طرح حق بجانب ٹھہرایا تھا کہ "رعایا
میں فرماں برداری، امن و امان اور عدل و انصاف برقرار رکھنے کے سلسلے میں
اس جناب پر جو فرض عاید ہوتا ہے، اس کی وجہ سے، نیز اور دوسری نوع کی
عاجلانہ اور ضروری وجوہ کی بنا پر جو اپنے شاہی سینے میں محفوظ ہیں ایجاب
یہ فرمان نافذ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں"۔

اسی طرح تحریری ضوابط کی اصل وجوہ وائسرائے کے سینے میں یا ان کے
مشیروں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ اگرچہ ہر شخص انھیں جانتا تھا۔ سرکاری طور پر
جو وجوہ بیان کی گئیں ان سے ہمیں پروپگنڈے کی اس نوعیت کا پتہ چلا
جو حکومت برطانیہ ہندوستان میں شروع کرنے والی تھی۔ چند ماہ بعد ہمیں
معلوم ہوا کہ ہم سرکاری وسائل سے اشتہارات بہت بڑی تعداد میں تمام دنیا

علاقوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ اس طرح طرح کی بے سر پا باتیں وسیع تفصیل
خصوصاً کانگریس پر یہ اتہام لگایا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے زرعی پیداوار کا بھاؤ
گر گیا جس سے کسانوں کو بہت نقصان پہنچا۔ یہ تو کانگریس کی انتہائی تعریف
تھی کیونکہ اگر وہ ساری دنیا میں کساد بازاری پیدا کر سکتی ہے تو اس کی قوتوں
کا کیا ٹھکانا ہے۔ لیکن اس جھوٹ کی بڑے اہتمام کے ساتھ متواتر اشاعت کی
گئی تا کہ کانگریس کے وقار کو صدمہ پہنچے۔

ان سب باتوں کے باوجود صوبۂ متحدہ کے خاص خاص اضلاع کے
کسانوں نے سول نافرمانی کی دعوت کا جو بعض جگہ لازمی طور پر ٹیکسوں وغیرہ
کے مقامی جھگڑوں کے ساتھ گڈمڈ ہو گئی تھی شاید جوش سے خیر مقدم کیا ۱۹۳۰ء کے
مقابلہ میں اس مرتبہ کسان زیادہ منظم طریقہ سے اور زیادہ بڑی تعداد میں تحریک
میں شریک ہوئے۔ شروع شروع میں تو اس میں خاصا خوش دلی کا رنگ تھا۔
میں نے اس قسم کا ایک بہت دل چسپ قصہ سنا ہے۔ ضلع رائے بریلی کے
موضع کولہ میں پولیس کے کچھ لوگ عدم ادائیگی لگان کی وجہ سے قرقی کے لیے
گئے۔ یہ گاؤں بہت خوش حال تھا اور اس کے باشندے بڑے دل والے
تھے۔ وہ پولیس اور مال کے افسروں سے بڑے اخلاق سے پیش آئے
اور اپنے گھروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر حقہ پانی سے
ان سے کہا کہ جہاں آپ کا جی چاہے تشریف لے جائیے۔ ان لوگوں نے
چند مویشی وغیرہ قرق کر لیے۔ اس کے بعد گاؤں والوں نے ان افسروں
کی پان تمباکو سے خاطر کی اور بے چارے بہت خفیف اور شرمسار ہو کر
واپس گئے۔ لیکن یہ تو ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ رفتہ رفتہ رواداری کی خوش
دلی اور انسانی شرافت کا یہ جذبہ بہت کم ہو گیا۔ بے چارہ موضع بکولیا ہی

ہوس دلی کی وجہ سے سزا سے بچ نہ سکا اور اسے اپنی دلیری کی سزا بھگتنی پڑی۔

ان اضلاع میں بہیوں لوگوں نے لگان ادا نہیں کیا۔ غالباً گرمیوں کے شروع میں تھوڑا بہت لگان پہنچانا شروع ہوا۔ یہاں بڑی تعداد میں گرفتاریاں بھی ہوئیں لیکن یہ حکومت کی عام پالیسی کے خلاف تھا کیونکہ اس وقت وہ عموماً خاص خاص کارکنوں اور دیہات کے لیڈروں کو گرفتار کرتی تھی۔ باقی لوگ صرف مارپیٹ کرکے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ جیل بھیجنے اور گولی چلانے سے مارپیٹ زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کا حسب ضرورت بار بار اعادہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ دوردست دیہاتی علاقوں میں ہوتی تھی۔ اس لئے باہر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ بہرحال یہ بھی تھا کہ اس طرح جیل خانوں میں قیدیوں کی تعداد بھی زیادہ بڑھنے نہیں پاتی تھی۔ مارپیٹ کے علاوہ لاتعداد بے دخلیاں اور قرقیاں بھی ہوئیں اور املاک و مویشی بھی کثرت سے فروخت کئے گئے۔ کسان اپنے کلیجہ پر پتھر رکھ کر یہ دیکھتے تھے کہ ان کے پاس جو تھوڑا بہت اثاثہ ہے وہ بھی ان سے چھین رہا ہے اور ان کی آنکھ کے سامنے کوڑیوں کے مول بک رہا ہے۔

حکومت نے ہندوستان بھر کی بے شمار عمارتوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی سلسلہ میں اس نے سوراج بھون بھی ضبط کر لیا۔ اس عمارت میں کانگریس کا اسپتال قائم تھا۔ چنانچہ اس کے تمام قیمتی ساز و سامان پر بھی حکومت کا قبضہ ہو گیا۔ چند روز تک تو یہ اسپتال بالکل بند رہا۔ پھر قریب ہی کے ایک صحن میں کھلے میدان میں دوبارہ جاری کر دیا گیا۔ چند روز بعد وہ سوراج بھون کے متصل ایک چھوٹی سی عمارت میں منتقل ہو گیا اور وہاں کوئی ڈھائی سال

تک جاری رہا
یہ افواہ بھی تھی کہ ہمارا سکونتی مکان آئندہ کو بھی ضبط ہو جائے
گا کیونکہ میں نے انکم ٹیکس کا بقیہ حصہ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا یہ رقم
۱۹۱۳ء میں والد کی آمدنی پر تشخیص ہوئی تھی لیکن انھوں نے سوال اٹھانے
کی وجہ سے ادا نہیں کی تھی ۱۹۳۱ء میں دہلی کے صلح نامہ کے بعد انکم ٹیکس
افسروں سے میری کچھ بحث ہوئی آخرکار میں اسے ادا کرنے کو تیار ہو گیا
تاکہ ایک حصہ ادا بھی کر دی تھی اس کے بعد ہی تحریری مراسلت نامہ ہوئے
اور میں نے طے کیا کہ اب کوئی رقم ادا نہیں کروں گا مجھے یہ بالکل نامناسب
نا جائز معلوم ہوتا تھا کہ کسانوں کو تو میں لگان ادا نہ کرنے کی سفارش کروں اور
خود انکم ٹیکس ادا کر دوں غرض مجھے توقع تھی کہ حکومت ہمارا مکان بھی
قرق کرے گی اس خیال ہی سے میرا دل دکھتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس
طرح میری والدہ کو گھر چھوڑنا پڑے گا ہماری کتابیں، کاغذات اور دوسرا
سامان جو بعض دالی وجوہ کی بنا پر بہت عزیز تھا غیروں کے ہاتھ میں
چلا جائے گا اور ممکن ہے سب برباد ہو جائے۔ پھر قومی جھنڈا اتار کر پھینک
دیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی اس کے گھر سے نکل جانے میں مجھے ایک خوشی بھی
معلوم ہوئی میں نے سمجھا کہ اس طرح میں کسانوں سے جو بے چارے اپنے
گھر سے محروم کئے جا رہے ہیں نزدیک تر ہو جاؤں گا اور ان کے دل
پر اور ان کی تحریک پر یقیناً اس کا بہت اچھا اثر پڑتا لیکن حکومت نے
یہ مناسب نہ سمجھا اور ہمارے گھر کو ہاتھ نہیں لگایا شاید اس نے میری ماں
کا کچھ خیال کیا ہو یا شاید صحیح اندازہ کر لیا ہو کہ اس سے سول نافرمانی
کو تقویت پہنچے گی کئی مہینے بعد حکومت کو میرے ریلوے کے چند

حیثیتوں کا پتہ چلا اور وہ اس سے انکم ٹیکس کے حساب میں فرق
کرسکے۔ میری اور میرے ساتھی کی موٹریں تو پہلے ہی قرق کرکے
فروخت ہو چکی تھیں۔

اس زمانہ میں ایک چیز سے مجھے بڑی کوفت ہوئی یعنی مختلف
میونسپلٹیوں اور پبلک اداروں نے خصوصاً کلکتہ کارپوریشن نے جس میں
کانگریسی اراکین کی اکثریت بیان کی جاتی تھی اپنی عمارتوں پر سے قومی جھنڈا
اتار دیا۔ انھوں نے یہ حرکت حکومت اور پولیس کے دباؤ سے کی کیونکہ
انھیں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو تمھیں توڑ دیا جائے
گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ ہوتا کہ میونسپلٹی کو معطل کر دیا جاتا
یا ممبروں کو سزا ہوتی۔ لیکن جو ادارے مستقل حقوق رکھتے ہیں عموماً بزدل ہوتے
ہیں اس لئے انھیں وہی کرنا چاہئے تھا جو انھوں نے کیا پھر بھی مجھے اس سے
سخت تکلیف ہوئی۔ یہ جھنڈا ہمارے لئے ان چیزوں کا نشان بن گیا ہے جو
ہمیں بہت عزیز ہیں۔ اور اس کے سایہ کے نیچے ہم نے بارہا ان کی عزت
وقار کو برقرار رکھنے کی قسمیں کھائی ہیں اس لئے اسے اپنے ہاتھ سے اتارنا
یا اپنی رضامندی سے اتروا دینا صرف عہد شکنی بلکہ ہتک حرمت ہے۔ یہ گویا
روح کی ذلت اور حق کا انکار اور زبردست کی قدرت باطل کا اقرار ہے جن لوگوں
نے اس طرح حکومت کے آگے سر جھکا دیا انھوں نے قوم کو ذلیل کیا اور اس کی
خودداری کو صدمہ پہنچایا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ انھیں سورما بن کر آگ میں کود پڑنا چاہئے تھا۔ دوسروں
کو اس بنا پر الزام دینا بالکل غلط بلکہ حماقت ہے کہ وہ صف اول میں کیوں
نہیں آئے۔ جیل کیوں نہیں گئے مصیبتیں اور نقصان کیوں نہیں اٹھائے۔

ہر شخص پر بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں کا بار ہوتا ہے۔ اور ہر ایک اپنے حالات کو خود بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ حکم بن کر اس کا فیصلہ کرے۔ لیکن میدان میں نہ آنا اور جی چرانا اور حق سے آنکھیں پھیرنا جسے انسان حق سمجھتا ہو منہ موڑنا اور بات ہے۔ کونسل کے ممبروں کو اگر قومی عزت کے خلاف کوئی حکم دیا جاتا اور اس کی خلاف ورزی کی ان میں جرأت نہ ہوتی تو انہیں ممبریت سے استعفیٰ دے دینا چاہئے تھا لیکن عام طور پر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی نشستوں پر بیٹھے رہے۔

تھامس مور نے کہا ہے "جس طرح شہد کی مکھیاں پھولوں پر
بیٹھ کر بھنبھنانا بند کر دیتی ہیں
اسی طرح دعوک جماعت والے جب وزارت کی
کرسی پر بیٹھتے ہیں تو ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔"

بہرحال ایسے ناگہانی نازک موقع پر جہاں انسان بدحواس ہو جاتا ہے کسی کے رویہ پر اعتراض کرنا بے انصافی ہے۔ کبھی کبھی بڑے بہادروں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں جیسا کہ گزشتہ جنگ عظیم میں بارہا دیکھنے میں آیا ہے اس سے پہلے ۱۹۱۲ء میں جب ٹائٹانک جہاز تباہ ہوا تو بڑے بڑے مشہور لوگوں نے جن کے متعلق خواب میں بھی بزدلی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا جہازرانوں کو رشوت دے دے کر بچنے کی کوشش کی۔ اور دوسروں کو ڈوبنے کے لئے چھوڑ دیا۔ حال ہی میں جب مورو کاسل جہاز میں آگ لگی اس وقت بھی بڑے خطرناک حالات دیکھنے میں آئے۔ کون جانتا ہے کہ ایسے ناگہانی موقع پر جب حواس و عقل پر حیوانی جبلت غالب آ جاتی ہے خود ہمارا کیا

عمل ہوا۔ اس لئے ہمیں دوسروں کو برا نہیں کہنا چاہئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم صحیح راستے سے بھٹکنے پر خاموش رہیں اور ایسی احتیاط نہ کریں کہ قوم کی کشتی کو کھینے کا کام ایسے ہاتھوں میں نہ دیا جائے جو تھرتھراتے ہوں اور ضرورت کے وقت جواب دے دیں اور اپنی ناکامی کی تاویلیں کریں اور اسے صحیح قرار دینا اس سے بھی برا ہے۔ عذر گناہ بدتر از گناہ۔

دو قوموں کی جنگ زیادہ تر اخلاقی نظم اور ہمت پر مبنی ہوتی ہے۔ سخت سے سخت لڑائی کا دارومدار انہیں چیزوں پر ہے۔ مارشل فوش فرماتے ہیں "آخرکار جنگ میں اسی کو فتح ہوتی ہے جس کی ہمت بندھی رہے" اس جنگ میں تو اخلاقی نظم اور ہمت کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے جو شخص اپنے عمل سے اس اخلاقی نظم کو نقصان پہنچاتا ہے یا قوم کی ہمت کو پست کرتا ہے وہ اپنے ملک کے ساتھ غداری کرتا ہے۔

مہینے گزرتے گئے اور روز کی اچھی بری خبریں ہمارے پاس پہنچتی رہیں یہاں تک کہ ہم اپنی اپنی جیلوں میں وہاں کے گندہ اور بے مزہ زندگی کے عادی ہو گئے۔ اس کے بعد قومی ہفتہ کا زمانہ (۶ اپریل تا ۱۳ اپریل) آیا ہم جانتے تھے کہ اس زمانہ میں بہت سے غیر معمولی واقعات ہوں گے اور یہی ہوا لیکن میرے لئے تو ایک حادثہ کے سامنے سب کچھ ماند پڑ گیا۔ الہ آباد میں میری والدہ ایک جلوس میں شامل تھیں۔ پولیس نے اس جلوس کو راستے میں روکا اور لاٹھی چارج کیا۔ جب جلوس روکا گیا تو کسی نے میری والدہ کے لئے ایک کرسی لا کر ڈال دی۔ وہ سڑک پر جلوس کے آگے بیٹھی تھیں۔ چند لوگ خاص طور پر ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ جن میں میرا سکریٹری بھی شامل تھا۔ ان سب کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی اس کے بعد حملہ شروع

ہوا میری والدہ کرسی پر سے گر پڑیں اور پے در پے ان کے سر پر کئی بید
پڑے۔ ان کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ جس کی وجہ سے وہ بیہوش
ہو گئیں۔ اسی حالت میں وہ سڑک پر پڑی ہوئی تھیں جو اب پبلک اور
جلوس والوں سے صاف ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ایک پولیس انسپکٹر انہیں
وہاں سے اٹھایا اور اپنی موٹر میں آنند بھون پہنچا دیا۔

اسی رات کو الہ آباد میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ان کا انتقال ہو گیا چنانچہ
فوراً غصہ سے بپھرے ہوئے لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے امن اور عدم تشدد
کو پس پشت ڈال کر پولیس پر حملہ کر دیا۔ پولیس نے گولی چلائی جس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔

ہمیں صرف ایک ہفتہ بعد اخبار پڑھنے کو ملتا تھا جب اس حادثہ کے چند روز
بعد میں یہ خبر ملی تو میرے دل پر یہ تصویر کر کے ایک چوٹ سی لگی کہ میری
ضعیف بوڑھی ماں سڑک کے گرد و غبار میں خون میں لت پت پڑی
تھیں۔ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو نہ جانے خود میرا کیا رد عمل ہوتا۔ معلوم
نہیں خود میں عدم تشدد پر کہاں تک قائم رہتا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ
پچھلے بارہ برس میں میں نے جو سبق سیکھنے کی کوشش کی تھی یہ دردناک
منظر دیکھ کر میں وہ سب کچھ بھول جاتا۔ اور شاید مجھے ذاتی یا قومی
مصلحت کا بھی کوئی خیال نہ رہتا۔

رفتہ رفتہ وہ اچھی ہو گئیں لیکن اگلے مہینے میں جب وہ مجھ سے
بریلی جیل میں ملنے آئی تھیں اس وقت تک ان کے پٹی بندھی ہوئی تھی
بہر حال وہ بہت خوش تھیں اور اس پر فخر کرتی تھیں کہ اپنے لڑکوں اور
لڑکیوں کے ساتھ انہیں بھی ڈنڈا اور لاٹھیاں کھانے کا موقع ملا۔ لیکن

سروپ رانی نہرو

ان کی یہ صحت یابی حقیقی نہیں بلکہ محض ظاہری تھی اور اس ضعیف العمری
میں انھیں جو شدید صدمہ پہنچا اس نے ان کے سارے نظام کو ہلا ڈالا
اور ان پرانی شکایات کو ابھار دیا جنھوں نے ایک سال پیشتر نہایت
خطرناک صورت اختیار کر لی۔

بریلی اور دہرہ دون کی جیلوں میں

چھ ہفتے نینی جیل میں رہنے کے بعد میں بریلی کی ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا
میری صحت پھر خراب ہو گئی تھی اور روز حرارت ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے
طبیعت پریشان تھی۔ چار مہینے کے بعد جب کہ شدید گرمی بڑھ رہی تھی میں بریلی جیل
سے منتقل کر دیا گیا اور اب کی بار ایک ٹھنڈی جگہ بھیج دیا گیا یعنی دہرہ دون کی جیل میں
جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں میں مسلسل ساڑھے چودہ مہینے
قریب قریب رہا۔ دو سال کی میعاد کے ختم تک رہا۔ ملاقاتوں، خطوں اور منتخب
اخباروں کے ذریعے سے مجھے باہر کی تھوڑی بہت خبر مل تو پہنچ جاتی تھیں مگر مجھ
میں مجھے بہت سی باتوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ صرف خاص خاص واقعات کا ایک
دھندلا سا نقشہ ذہن میں تھا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں اپنے ذاتی معاملات اور اس وقت کے
سیاسی حالات میں الجھا رہا۔ کوئی ساڑھے پانچ مہینے کے بعد پھر قید ہو کر جیل میں پہنچ
گیا اور اب بھی یہیں ہوں۔ اسی طرح پچھلے ساڑھے تین برس میرا زیادہ تر وقت
جیل میں گزرا اور میں واقعات سے بے خبر رہا۔ مجھ کو اس کا موقع ہی کب
ملا کہ جو کچھ ملک میں ہوا ہے اس سے تفصیلی واقفیت حاصل کرتا۔ اب تک
اچھی طرح نہیں معلوم ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس میں جس میں گاندھی جی نے
شرکت کی تھی پردے کے پیچھے کیا کیا ہوا۔ میں وہاں سے اس کے بارے میں گفتگو کر سکا۔ اور

واقعات پر اس عرصہ میں پیش آئے

مجھے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے حالات کا اتنا علم نہیں ہے کہ اس رسالہ میں
قومی تحریک کے نشوونما دکھا سکوں مگر چونکہ میں اس کی بنیاد سے واقف تھا اور
کام کرنے والوں کو بھی جانتا تھا اس لیے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات کی
حقیقی اہمیت کو سمجھ سکتا تھا۔ اسی طرح مجھے تحریک کی عام رفتار کا اندازہ
تھا پہلے چار پانچ مہینے سول نافرمانی بڑے زور شور سے چلتی رہی۔ اس کے بعد
رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی۔ البتہ بیچ میں کبھی کبھی بھڑک اٹھتی تھی یعنی جدوجہد کی انقلابی
شدت تھوڑے ہی دن رہ سکتی ہے اس کا ایک حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے یا بڑھتی
ہے یا گھٹتی ہے چنانچہ سول نافرمانی بھی پہلے جلسے میں آہستہ آہستہ
گھٹنے لگی مگر اس دھیمی رفتار سے وہ بہت مدت تک جاری رہ سکتی تھی۔ خلاف قانون
قرار دیے جانے کے باوجود کانگریس کا نظام ناقص کامیابی سے چلتا رہا وہ صوبوں
کے کارکنوں کے کام سے باخبر رہتی تھی۔ انہیں ہدایتیں بھیجتی تھی ان سے رپورٹیں
منگاتی تھی اور کبھی کبھی انہیں مالی امداد بھی دیتی تھی۔

صوبوں کی کانگریس کمیٹیاں بھی کم و بیش کامیابی سے چلتی رہیں اس سارے
عرصے میں جب میں جیل میں رکھا گیا دوسرے صوبوں کے کچھ زیادہ حالات معلوم
نہیں ہو سکے مگر رہائی کے دنوں میں صوبہ متحدہ کی جدوجہد کے متعلق کچھ معلومات
حاصل ہوئیں۔ آگرہ صوبہ کی کانگریس ۱۹۳۲ء میں تمام سال اور ۱۹۳۳ء کے وسط
تک باقاعدہ کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ کانگریس کے قائم مقام پریزیڈنٹ نے
گاندھی جی کے مشورے سے سول نافرمانی ملتوی کر دی۔ اس عرصہ میں اکثر
اضلاع کو ہدایتیں بھیجی جاتی تھیں چھپے ہوئے یا سائکلو سٹائل کئے
ہوئے۔ ہر ماہ اطلاعات شائع کئے ہوتے تھے۔ اضلاع کے کام رفتہ رفتہ

معائنہ کیا جاتا تھا اور قومی کارکنوں کو "ڈوس" تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ کام زیادہ تر
خفیہ طور پر کرنا پڑتا تھا۔ مگر صوبہ کی کانگریس کمیٹی کا ہر سکریٹری جو دفتر وغیرہ کا نگراں
ہوتا تھا کھلم کھلا کام کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ گرفتار ہو جاتا تھا۔ اور اس کی جگہ
دوسرا شخص آ جاتا تھا۔

سنہ ۱۹۳۲ء اور سنہ ۱۹۳۳ء کے تجربے سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہم تمام ہندوستان
میں خبر رسانی کا سلسلہ آسانی سے قائم کر سکتے ہیں۔ اگرچہ بہت زیادہ کوششیں
کی گئیں اور برابر مزاحمت ہوتی رہی پھر بھی ہمیں کافی کامیابی حاصل ہوئی مگر ہم
میں سے بہت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ خفیہ طور پر کام کرنا سول نافرمانی کے اصول
کے ساتھ نہیں کھپتا اور اس سے عام لوگوں میں بیداری پیدا نہیں ہوتی بلکہ افسردگی
سی چھا جاتی ہے۔ اگر عام تحریک بڑے پیمانہ پر جاری ہو تو اس کے ساتھ تھوڑی
بہت خفیہ کارروائی بھی مفید ہو سکتی ہے۔ مگر اس میں ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے خصوصاً
اس وقت جب تحریک کا زور گھٹ رہا ہو، کہ کہیں یہ کم و بیش بے اثر خفیہ کارروائیاں
عام تحریک کی جگہ نہ لے لیں۔ گاندھی جی نے جولائی سنہ ۱۹۳۳ء میں خفیہ کارروائیوں کو
ناپسندیدہ قرار دیا۔

صوبہ متحدہ کے علاوہ گجرات اور کرناٹک میں بھی کچھ دن تک لگان کی
محصول نہ دینے کی تحریک چلتی رہی۔ گجرات اور کرناٹک دونوں جگہ کاشتکار
اپنی زمین کے مالک ہیں۔ انھوں نے حکومت کی مالگذاری ادا کرنے سے انکار
کیا اور اس کی وجہ سے انھیں بہت سخت نقصان پہنچا۔ کانگریس کی طرف سے
تھوڑی بہت کوشش کی گئی کہ مصیبت زدوں کی مدد کی جائے اور ضبطیوں
اور املاک کی ضبطی کی وجہ سے جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی کی جائے لیکن ظاہر ہے
کہ کوشش بہت محدود تھی۔ صوبہ متحدہ میں کانگریس کمیٹی نے ذیل کی طور

کی مدد کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہاں مسئلہ بہت بڑا تھا۔ اس صوبے میں
آسامیوں کی تعداد دوسرے زمینداروں کے کاشتکاروں سے بہت زیادہ تھی اور رقبہ بھی بہت
وسیع تھا اور کانگریس کمیٹی کے پاس روپیہ بہت کم تھا۔ یہاں دسیوں ہزاروں آدمیوں
کو اس تحریک کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا۔ ان سب کی مدد کرنا ناممکن تھا اور
ان میں اور دوسرے کاشتکاروں میں جو خود فاقے کر رہے تھے تمیز کرنا بھی
مشکل تھا۔ اگر دو چار ہزار آدمیوں کی مدد بھی کی جاتی تو اس سے جھگڑے پیدا ہو جاتے
اور بد دلی پھیل جاتی۔ اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم کوئی مالی امداد نہیں دیں گے
یہ بات کاشتکاروں کو پہلے ہی سے سمجھا دی گئی اور انھوں نے ہماری مشکلات کو تسلیم
کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ انھوں نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں اور
اُف تک نہ کی۔ البتہ جہاں تک ممکن تھا ہم نے بعض افراد کی خصوصاً جیل جانے
والے کارکنوں کے بال بچوں کی مدد کی۔ اس بدنصیب ملک کے افلاس کا عالم
ہے کہ ایک روپیہ ماہانہ بھی ان کے لئے بڑی نعمت تھی۔

اس سارے عرصہ میں صوبۂ متحدہ کی کانگریس کمیٹی، جو خلاف قانون
قرار دے دی گئی تھی، اپنے اجرت پر کام کرنے والے کارکنوں کو تنخواہ و الاؤنس
دیا کرتی اور جب وہ باری باری سے جیل جاتے تو ان کے خاندان کی خبرگیری
کی جاتی تھی۔ یہ خرچ کی سب سے بڑی مد تھی۔ اس کے بعد اشتہاروں وغیرہ کی
چھپائی کا نمبر تھا۔ یہ بھی خاصی رقم ہو جاتی تھی۔ ایک اور بڑی مد خرچ کی تھی
اور اس کے علاوہ صوبے کی ضلع کمیٹیوں کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، انھیں کچھ
امداد دی جاتی تھی۔ ان سب مصارف کے باوجود صوبۂ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے
[illegible] میں جنوری ۱۹۳۲ء سے اگست ۱۹۳۳ء تک جب [illegible] ایک طاقتور حکومت
کے ساتھ زبردست لڑائی لڑی جا رہی تھی کل ترسٹھ ہزار روپیہ یعنی تین [illegible]

ہوئی حالانکہ ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جنہیں فوری کامیابی کی امید ہو۔ ایک خفیف سا احتمال ضرور تھا کہ اگر عام لوگ پورے جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں تو شاید کوئی فوری نتیجہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ مگر اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے ہم لوگوں کو یہی توقع تھی کہ لڑائی بہت طول کھینچے گی۔ بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھنے پڑیں گے۔ صدہا مشکلات کا سامنا ہوگا۔ تب کہیں آہستہ آہستہ عام لوگوں میں انضباط، اتحادِ عمل اور اتحادِ خیال پیدا ہوگا۔ ۱۹۴۲ء کے شروع میں کبھی کبھی اس خیال سے ایک خوف سا ہوتا تھا کہ کہیں ہمیں بہت جلد ظاہری کامیابی۔ حاصل ہو جائے کیونکہ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا کہ کانگریس مصالحت کر لیتی اور اس سے گورنمنٹ کے آدمیوں اور مطلب پرستوں کی بن آتی۔ ۱۹۴۲ء کے تجربے نے ہماری آنکھیں کھول دی تھیں۔ کامیابی اسی حالت میں مفید ہو سکتی ہے جب عام لوگوں میں اتنی قوت اور ان کے خیال میں اتنی وضاحت ہو کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ورنہ یہی ہوگا کہ عام لوگ تو لڑیں گے اور قربانیاں کریں گے اور عین وقت پر دوسرے لوگ آکر مرے مرائے میدان پر قبضہ کر لیں گے۔ اس کا بہت سخت اندیشہ تھا۔ اس لئے کہ خود کانگریس کے اندر لوگوں کے خیالات بہت الجھے ہوئے تھے۔ اور ان کے سامنے کوئی واضح تصور نہ تھا کہ وہ کس قسم کی حکومت یا سماج چاہتے ہیں۔ بعض کانگریسی تو اس خیال کے تھے کہ موجودہ نظامِ حکومت میں کچھ زیادہ تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس برطانوی حکام کو ہٹا کر ان کی جگہ ہندوستانی جماعت کے لوگوں کو مقرر کر دینا کافی ہے۔

خاص قسم کے حکومت پرستوں سے کچھ زیادہ اندیشہ نہیں تھا کیونکہ ان کا ایمان تو یہ ہے کہ جو حکومت بھی ہو اس کی اطاعت کی جائے۔ ان کے

علاوہ لبرل پارٹی اور تعاونی پارٹی بھی تقریباً پورے طور پر سرکاری حکومت کی
ہم خیال تھی۔ اور ان کی طرف سے جو حرکت بھی ہوتی رہی تھی اس کا کوئی اثر تھا
نہ کوئی قدر و قیمت۔ سب جانتے تھے کہ یہ لوگ تو ہر حال میں حاکموں کے بندے
ہیں۔ اور اس لئے ان سے یہ توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ سول نافرمانی کو پسند
کریں گے مگر انھوں نے صرف ناپسندیدگی کے اظہار پر اکتفا نہیں کی بلکہ کم و بیش
حکومت کے دست و بازو بن گئے۔ ہر قسم کی قانونی آزادی چھینی جا رہی تھی اور وہ
بیٹھے ہوئے چپ چاپ تماشا دیکھ رہے تھے۔ حکومت صرف سول نافرمانی کو توڑنا
اور دبانا نہیں چاہتی تھی بلکہ ہر قسم کی سیاسی زندگی اور پبلک جدوجہد کو روکنا
چاہتی تھی مگر اس کی مخالفت میں ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ جو لوگ قانونی آزادی
کی حمایت کیا کرتے تھے وہ سب لڑائی میں شریک تھے۔ اور حکومت کے تشدد
کے آگے سر جھکانے کی سرابگت رہے تھے دوسرے لوگوں نے ڈر کے مارے
ذلت سے سر تسلیم خم کر دیا اور نکتہ چینی کی جرأت نہیں کی۔ اگر کبھی کچھ ہلکی سی نکتہ چینی
ہوتی بھی تھی تو بہت بیزار مندانہ طور میں اور اس کے ساتھ کانگریس کو اور تحریک
میں شریک ہونے والوں کو دل کھول کر برا بھلا بھی کہا جاتا تھا۔

مغربی ملکوں میں سارے جمہوریت کی قوت سے قانونی آزادی کی حمایت
کرتی ہے اور اگر اس میں مداخلت کی جائے تو بیزاری اور مخالفت کا طوفان
برپا ہو جاتا ہے۔ تو شاید اب یہ بات ایک قصۂ پارینہ ہو گئی ہے۔ بہت سے ایسے
لوگ ہیں کہ خود عملی جدوجہد میں شریک ہونا نہیں چاہتے مگر وہ تقریر و تحریر کی
آزادی، جلسوں اور انجمنوں کی آزادی، اشاعت اور اخبارات کی آزادی
کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ ہمیشہ اس کے لئے احتجاج کرتے رہتے ہیں اور حکومت
کے ستم اور کو روکنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہندوستان کی لبرل جماعت کا یہ عالم ہے

دعویٰ ہے کہ وہ کس حد تک انگلستان کی لبرل پارٹی کی روایات کی حامل ہے۔
حالانکہ اصل میں ان دونوں میں نام کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں۔ اس سے یہ توقع
ہو سکتی تھی کہ وہ قانونی آزادی کی پامالی کی کم سے کم اصولی مخالفت کرے گی کیونکہ خود
اسے بھی اس سے نقصان پہنچا ہے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کو یہ توفیق نہیں
ہوئی کہ والٹیر کی ہم زبان ہو کر کہتی "تم جو کچھ کہتے ہو اس کا میں قطعاً مخالف ہوں
مگر میں مرتے دم تک تمہارے اس حق کی حمایت کروں گا جو کہ کہنا چاہتے ہو وہ کہو"
شاید یہ الزام بے انصافی ہے۔ کیونکہ انھوں نے کبھی آزادی اور
جمہوریت کا حامی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور موقع ایسا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی
بات ان کی زبان سے نکل جاتی تو بے چارے مصیبت میں پڑ جاتے۔ البتہ یہ کہنا
چاہیے کہ آزادی کے قدیم علمبردار برطانوی لبرل اور لبرل پارٹی کے سے اشتراکی
ہندوستان میں حکومت کے جبر و تشدد سے کس حد تک متاثر ہوئے۔ وہ اس دردناک
منظر کو خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہے اور کبھی کبھی اس پالیسی کے متعلق جسے
ناتجربہ کاروں کا شاہکار "جبر و تشدد کا سائنٹفک استعمال" کہتا ہے پسندیدگی کا اظہار
ہی کرتے رہے۔ حال میں انگلستان کی نیشنل گورنمنٹ نے "قانون بغاوت" کا مسودہ
پاس کرنے کی کوشش کی تھی اور اس پر لبرل پارٹی اور لیبر پارٹی کی طرف سے
بڑی لے دے ہوئی تھی۔ اس پر جو اعتراضات کیے گئے ایک اعتراض یہ بھی
تھا کہ یہ تقریر کی آزادی میں مداخلت کرتا ہے اور مجسٹریٹوں کو تلاشی کا وارنٹ
جاری کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ میں جب ان اعتراضات کو پڑھتا تھا تو دل
سے ان کی تائید کرتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ میری آنکھوں میں ہندوستان کی تصویر
پھرنے لگتی تھی جہاں برطانیہ کے مجوزہ قانون بغاوت سے ہزار درجہ بدتر قانون نافذ ہیں
مجھے حیرت تھی کہ اہل برطانیہ انگلستان میں پستی کو دیکھ کر آنکھوں پر ہاتھ ملتے تھے

اور ہندوستان میں اوس کا ا ست گھل جاتے ہیں اور ان کی تیوری کی پرکھ تک
نہیں آتا ہیں تو اس کے اس کمال کا قائل ہوں کہ وہ اپنے اخلاقی اصول کو اپنے
مادی اغراض کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور ہر تعبیر جو ان کے سیاسی مصالح
میں مدد دے انہیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ سچے دل سے اخلاقی جوش کے ساتھ
ہٹلر اور مسولینی کو برا کہتے ہیں کہ وہ آزادی اور جمہوریت کے دشمن ہیں۔ اور
اسی سچے دل سے ہندوستان میں آزادی اور جمہوریت کی پامالی کی حمایت
کرتے ہیں اور اسے ضروری سمجھتے ہیں اعلیٰ درجہ کے اخلاقی دلائل سے وہ ثابت
کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا یہ فعل خالص بے غرضی پر مبنی ہے۔

ادھر ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی اور ہمارے مرد اور عورتوں کی
جان پر بن رہی تھی۔ ادھر لندن میں حاکمان حکومت ہندوستان کے لئے دستور
اساسی بنا رہے تھے ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس اور اس کی متعلقہ کمیٹی
کمیٹیاں ہو رہی تھیں اور اسمبلی کے ممبران کمیشنوں کی ممبری کی کوشش کر رہے تھے
تاکہ قوم کی خدمت بھی کریں اور سیر و سفر کا لطف بھی اٹھائیں۔ اس کے بعد
۱۹۳۳ء میں پارلیمنٹ کے جوائنٹ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا اور اس میں
ہندوستانی اسیر بلائے گئے پھر ہماری دیانتدار حکومت کی طرف سے ان لوگوں
کو جو شہادت دینے جا رہے تھے جہاز کے ٹکٹ مفت دئے گئے۔ بہت سے لوگ
دوبارہ ہندوستان کی خدمت کے جوش میں پبلک کے خرچ پر سمندر پار گئے
اور سنا ہے کہ بعض نے تو کرایہ کی رقم پر قناعت بھی کی۔

کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ ارباب غرض کی یہ جماعت ہندوستان کی
عام تحریک سے خوف زدہ ہو کر برطانوی شہنشاہی کے زیر سایہ لندن میں جمع
ہوئے مگر ہمارے حد نہ تو سیت کو یہ دیکھ کر سخت صدمہ پہنچا کہ ہمارے ہندوستانی

بھائیوں نے یہ حرکت میں اس وقت کی جب مادر وطن موت اور زندگی کی
کشمکش میں گرفتار تھی۔ مگر ہم میں سے بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ ایک لحاظ
سے یہ اچھا ہوا۔ کیونکہ ہمارا یہ خیال تھا جو آگے چل کر غلط ثابت ہوا کہ اس
سے صاف صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان میں کون لوگ رجعت پسند
ہیں اور کون ترقی پسند اس ترکیب سے عام لوگوں کو سیاسی تربیت میں
مدد ملے گی۔ اور سب پر ظاہر ہو جائے گا کہ بغیر کامل آزادی کے ہمارے سماجی
مسائل حل نہیں ہو سکتے اور عام لوگوں کی مصیبت دور نہیں ہو سکتی۔

یہ حضرات نہ صرف روزمرہ کی زندگی کے لحاظ سے بلکہ اخلاقی اور ذہنی
اعتبار سے بھی عام ہندوستانیوں سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ ان کے اور
ان کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ انھیں مطلق احساس نہیں کہ عام لوگوں
کے کیا خیالات ہیں اور وہ کون سا جذبہ ہے جو انھیں قربانیاں کرنے اور
تکلیفیں سہنے پر ابھار رہا ہے۔ ان نامور مدبروں کی صرف ایک ہی حقیقت
نظر آتی ہے یعنی برطانوی شہنشاہی اس کے نزدیک ان کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے
اس لئے چارو ناچار اس کی اطاعت کرلی چاہئے وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ عام لوگوں
کی مرضی کے بغیر ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور کوئی حقیقی اور عملی دستور
نہیں بنایا جا سکتا مسٹر فرانسس ہیکٹ نے اپنی کتاب "ہمارے زمانے کا مختصر
تاریخ میں آئرلینڈ کی مشترکہ کانفرنس کی ناکامی کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۱۷ء میں
دستور کی کشمکش کو ختم کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ جو سیاسی لیڈر
اس نازک وقت میں دستور بنانے کی فکر میں تھے ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی
مکان کا نقشہ اس وقت کھینچے جب اس میں آگ لگی ہو آئرلینڈ میں ۱۹۱۷ء میں جو
آگ لگی تھی اس سے بہت بڑی آگ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں ہندوستان میں لگی

اتنے اختیارات دے دیے گئے تھے۔ اور کسی قسم کی روک نہیں تھی تو اس کا
ناجائز استعمال کرنا ایک لازمی امر تھا۔ قانون اور انصاف کی پامالی اور بے انصافی
کی عجیب و غریب مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

بنگال کے بعض حصوں میں بہت افسوسناک منظر نظر آتا تھا۔ حکومت
وہاں کی ساری آبادی کو (یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ساری ہندو آبادی کو)
دشمن سمجھتی تھی۔ بارہ اور پچیس سال کے درمیان عمر رکھنے والے ہر ہندو
لڑکے لڑکی کو ایک کارڈ رکھنا پڑتا تھا جس میں اس کا نام نشان درج ہوتا تھا
چھاپے، ضبط کر دیے جاتے تھے، یا انہیں کسی علاقہ میں داخل ہونے کی ممانعت
کر دی جاتی تھی۔ لباس پر بندشیں عاید کی گئی تھیں۔ مدرسوں کی نگرانی ہوتی تھی
یا وہ بند کر دیے جاتے تھے۔ لوگوں کو بائیسکل رکھنے کی اجازت نہیں تھی انہیں
اپنی نقل و حرکت کی اطلاع پولیس کو دینی پڑتی تھی۔ غروب آفتاب کے بعد
گھر سے نکلنے کی ممانعت، نوجوانوں کا گشت، تعزیری پولیس، اجتماعی جرمانے، غرض طرح
طرح کے قاعدوں اور ضابطوں کی زنجیروں سے لوگوں کو جکڑ رکھا تھا۔ علاقے کے
علاقے گویا محاصرے کی حالت میں تھے۔ اور ان کے سارے باشندوں کی
حیثیت ان قیدیوں کی سی تھی جو عارضی طور پر رہا کئے جاتے ہیں اور ہر وقت
پولیس کی سخت نگرانی میں رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ برطانوی حکومت کے نقطۂ نظر
سے یہ عجیب و غریب قاعدے یا ضابطے ضروری تھے یا نہیں تھے۔ اگر ان کی ضرورت
نہیں تھی تو حکومت پر بہت سخت الزام آتا ہے کہ اس نے پورے پورے علاقوں
کے باشندوں کو خواہ مخواہ ستایا۔ ذلیل کیا اور شدید نقصان پہنچایا۔ اور اگر
ان کی ضرورت تھی تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں
برطانوی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

تھا اور تیس روز کا فاقہ کیا تھا۔ اس وقت مجھے اس وحشیانہ سزا سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اب بھی مجھے صدمہ ہوتا تھا اور دل دکھتا تھا۔ مگر اس کا کبھی خیال بھی نہ آیا کہ مجھے احتجاج اور فاقہ کرنا چاہئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب میں بالکل بے حس ہوں۔ انسان کا احساس دہشت اور بہیمیت کا مسلسل تجربہ کرنے سے کند ہو جاتا ہے۔ کتنی ہی بری چیز کیوں نہ ہو ایک مدت کے بعد دنیا کو اس کی عادت ہو جاتی ہے۔

ہمارے آدمیوں سے جیل میں سخت ترین مشقت کے کام لئے جاتے تھے۔ مثلاً چکی پیسنا، کولھو چلانا وغیرہ اور انہیں ہر قسم کی تکلیفیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ عاجز آکر معافی مانگ لیں اور اقرار نامے پر دستخط کرکے رہا ہو جائیں۔ یہ جیل کے افسروں کی بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔

جیل کی اکثر سزائیں لڑکوں اور نوجوانوں کے حصہ میں آتی تھیں اس لئے کہ وہ سیاسی تحریکوں میں پہلے رواداری کا اظہار کرتے تھے۔ بڑے اچھے خاندان کے لڑکے تھے جن میں خودداری، تیز طراری، جیالا پن کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اگر یہ انگلستان کے پبلک اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں ہوتے تو ان کی بڑی قدر اور ہمت افزائی کی جاتی مگر ہندوستان میں ان کی نوجوانانہ تصور پرستی اور خودداری کا صلہ یہ ملتا تھا کہ ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی جاتی تھیں۔ کال کوٹھری میں بند کئے جاتے تھے اور کوڑوں سے پیٹے جاتے تھے۔

ہماری عورتوں کی حالت جیل میں اور بھی زیادہ افسوسناک تھی یہ عموماً اوسط طبقے کی عورتیں تھیں جو گھروں کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں اور اس سماج نے جس میں مردوں کی خودغرضانہ حکومت

سے ہمیں طرح طرح کی سدتوں اور رسموں میں جکڑ رکھا تھا آزادی کی تحریک ما
کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی جس حد تک وہ اس سے دو اس تحریک میں
شریک ہوئیں اس کی تہہ میں غالباً یہ خواہش تھی کہ انہیں گھر کی غلامی سے
بھی نجات مل جائے۔ یہ خواہش مبہم اور غیر محسوس سہی مگر شدت سے ان کے
دلوں میں موجود تھی جیل میں بہت سی چند کے سوا ان خواتین کے ساتھ معمولی
قیدیوں کا سا برتاؤ ہوتا تھا وہ بدترین قسم کی عورتوں کے ساتھ رکھی جاتی تھیں اور
اکثر انہیں سخت تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ ایک دفعہ میں اس بارک میں رکھا گیا
جو عورتوں کے احاطے سے متصل تھی صرف ایک دیوار بیچ میں تھی اس احاطے میں اور
عورتوں کے ساتھ چند سیاسی قیدی عورتیں بھی تھیں جن میں سے ایک میری ماں کے
گھر میں ایک زمانہ تک رہ چکی تھی۔ ایک اونچی دیوار حائل ہونے کے باوجود
نگران قیدی عورتوں کی ڈانٹ ڈپٹ کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ اور
مجھے صدمہ ہوتا تھا کہ میری دوستوں کو ایسی بیہودہ اور نامعقول باتیں
سننی پڑتی ہیں۔

یہ بات مجھے خاص طور پر نظر آئی تھی کہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں دو برس پہلے
یعنی ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ اور بھی برا برتاؤ ہوتا تھا۔
یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ چند افسر اپنی مرضی سے ایسا کرتے ہوں سوا اس
کے اور کوئی وجہ عقل میں نہیں آسکتی تھی کہ حکومت نے قصداً یہ پالیسی مقرر
کی ہے۔ کچھ سیاسی قیدیوں پر موقوف نہیں بلکہ یوں بھی صوبہ متحدہ کا جیل کا
محکمہ اس زمانہ میں اس کے لئے بدنام تھا کہ وہ ہر قسم کی ہمدردی اور انسانیت
سے محروم ہے۔ ہمیں نہایت معتبر ذریعہ سے اس کی ایک دلچسپ مثال
معلوم ہوئی۔ ایک بار جیل کے ایک معزز وزیٹر جو ہماری طرح [illegible]

تو حکومت کے مقربین میں سے تھے اور سر کا خطاب رکھتے تھے ہم سب کے
لئے آئے۔ انھوں نے بیان کیا کہ جیسا پہلے وہ ایک اور جیل کے معائنہ
کے لئے گئے تھے اور انھوں نے اپنی رپورٹ میں جیلر کے متعلق یہ الفاظ لکھے
تھے کہ وہ ہمدردی کے ساتھ ضابطے کی پابندی کرتے ہیں۔ جیلر نے ان سے
درخواست کی کہ آپ میری ہمدردی کا ذکر نہ کیجئے اس لئے کہ سرکاری حلقوں
میں یہ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ مگر ڈپٹی صاحب ایسا مانے اور انھیں یہ
آیا کہ اس رپورٹ سے جیلر کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی
دن کے بعد جیلر وہاں سے دور کسی اور مقام پر بدل دیا گیا جو اس کے
لئے ایک قسم کی سزا تھی۔

بعض جیلروں کو جو عام طور سے سخت اور بے باک سمجھے جاتے تھے
ترقیاں ملیں اور خطابات دئے گئے۔ رشوت کی جیل میں اس قدر گرم بازاری
ہے کہ شاید ہی کوئی شخص اس سے بچتا ہو۔ میرا اور میرے ہمسایوں
کا تجربہ ہے کہ جیل کے افسروں میں وہی سب سے زیادہ رشوت لیتے ہیں
جو بڑے سخت گیر ہوتے ہیں۔

خوش قسمتی سے میرے ساتھ جیل میں اور جیل کے باہر بھی لوگوں کا
رویہ بہت اچھا رہا اور ہر شخص جس سے مجھے سابقہ پڑا میرے ساتھ اخلاق
اور مہربانی سے پیش آیا۔ ان موقعوں پر بھی جب میں اس سلوک کا مستحق
نہیں تھا۔ البتہ جیل میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے مجھے اور میرے
عزیزوں کو بڑا دکھ پہنچا۔ ایک بار میری والدہ، کملا اور میری بیٹی اندو الہ آباد
کے ڈسٹرکٹ جیل میں میرے بہنوئی رنجیت پنڈت سے ملنے کے لئے گئیں
جیلر نے انہیں بے قصور برا بھلا کہا اور باہر نکال دیا۔ مجھے اس سے سب

بیچ ہوا۔ اور صوبے کی حکومت نے اس معاملہ میں جو طریقہ اختیار کیا اس
سے اور بھی زیادہ صدمہ پہنچا۔ اس خیال سے کہ کہیں پھر جیل کے ملازموں کے
ہاتھ میری والدہ کی توہین نہ ہو۔ میں نے سب سے ملاقات کرنا ترک کر دیا
دہرہ دون کی جیل میں سات مہینے تک ایک شخص سے بھی ملاقات نہیں کی۔

رادوں، عورتوں اور بچوں سے ملتی ہے - جس کے سینے میں دل ہے اور اس میں محبت
مروت اور تکلیف کا احساس موجود ہے۔ اگرچہ اگر صاف گوئی سے کام لیں تو وہ کہیں
گے کہ انھوں نے ہندوستانیوں میں بعض معقول آدمی بھی دیکھے ہیں مگر وہ مستثنیٰ
کا حکم رکھتے ہیں ورنہ عموماً ہندوستانی سخت قابل نفرت ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی
بھی یہ کہیں گے کہ وہ چند ایسے انگریزوں کو جانتے ہیں جو بالکل تعریف ہیں
لیکن انھیں چھوڑ کر باقی سب کے سب مغرور، ظالم اور بدتریں۔ عجیب بات ہے
کہ ہر شخص دوسری قوم کا اندازہ ان افراد سے نہیں لگاتا جن سے اسے اس سال
کی حیثیت سے سابقہ پڑا ہے بلکہ دوسرے لاکھوں سے جن سے وہ بالکل ناواقف
ہوتا ہے یا بہت کم واقفیت رکھتا ہے۔

میں ذاتی طور پر اس معاملے میں بڑا خوش نصیب ہوں۔ کیونکہ میرے
ہم وطن اور انگریز دونوں بلا استثنا ہمیشہ مجھ سے بڑے اخلاق سے پیش آئے یہاں تک
کہ وہ پولیس والے جنھوں نے مجھے گرفتار کیا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے
اور جیلر وغیرہ بھی مجھ سے بڑی مہربانی سے پیش آتے رہے اور ان کی اس انسانیت
کی وجہ سے لڑائی کی تلخیوں اور جیل کی زندگی کی سختیوں میں بہت کچھ کمی ہوگئی میرے
ہم وطنوں کا مجھ سے اچھا سلوک کرنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ ان میں تو
مجھے کچھ نہ کچھ مقبولیت اور شہرت حاصل تھی لیکن انگریز بھی مجھے محض ایک جماعت
کے رکن نہیں بلکہ ایک فرد کی حیثیت دیتے رہے۔ میں نے انگلستان میں تعلیم
پائی ہے اور وہاں کے ایک پبلک اسکول میں رہا ہوں شاید اس وجہ سے وہ
مجھے اپنے سے قریب تر سمجھتے ہیں۔ اور چاہے میری قومی سرگرمیاں انھیں کیسی ہی
نامعقول معلوم ہوں لیکن اپنے معیار کے مطابق مجھے کم و بیش مہذب سمجھ رہے
ہیں۔ میرے ساتھ جو خاص مراعات کی جاتی تھیں جب میں ان کا مقابلہ اپنے ساتھیوں

کی حالت سے گزرتا تھا تو اکثر مجھے اس سے تکلیف ہوتی تھی اور ترحم آتی تھی۔

لیکن ان تمام رعایتوں کے باوجود بھی جیل جیل ہے۔ اور وہاں تکلیف دہ اور کبھی کبھی ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ وہاں کی ساری فضا تنگ، کینہ، بغض، جھوٹا اور جھوٹ سے ناپاک تھی جیل کے ملازم یا تو انتہائی خوشامد کرتے تھے یا گالی سے بات کرتے تھے۔ جو شخص حساس طبیعت رکھتا ہو وہ ہمیشہ بے چین رہتا تھا ذرا ذرا سی بات پر طبیعت جھلاتی تھی کسی خط یا اخبار میں کوئی بری خبر دیکھ کر کچھ دیر کے لئے پریشانی یا غصے سے دل بے قابو ہو جاتا تھا باہر تو کام میں لگے رہنے سے فکر رہتی تھی اور مختلف دلچسپیاں اور سرگرمیاں دماغ اور جسم کا توازن قائم رکھتی تھیں لیکن جیل میں گھٹے ہوئے جذبات کے نکاس کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا اور آدمی اندر ہی اندر گھلتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی رائے ہر معاملے کے متعلق یک طرفہ اور غلط ہوتی تھی اور بیماری تو جیل میں بڑی سخت مصیبت تھی۔

چونکہ میں نے جیل کے معمولات کا اپنے آپ کو عادی بنا لیا اور کافی جسمانی ورزش اور دماغی محنت کے ذریعے سے اپنی صحت کو قائم رکھا۔ ورزش اور محنت کی باہر کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن جیل میں یہ بہت ضروری چیز ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر صحت بالکل برباد ہو جاتی ہے۔ میں اوقات کی پابندی سختی سے پابندی کرتا تھا۔ اور جہاں تک ممکن تھا اپنے پرانے معمولات کو قائم رکھتا تھا تاکہ طبیعت سست نہ ہونے پائے مثلاً میں پابندی سے داڑھی مونڈتا تھا (جیل میں مجھے سیفٹی ریزر رکھنے کی اجازت تھی) میں نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ لوگ عموماً ان کی پروا نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اور کاموں میں بھی سست پڑ جاتے ہیں۔ دن بھر سخت محنت کرنے کے بعد شام کی تھکن بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اور رات کو بڑے مزے کی نیند آتی تھی۔

اس طرح دن، ہفتے اور مہینے گذرتے گئے لیکن کبھی کبھی کوئی بھیدلیا طاری ہو جاتا تھا کہ کھٹنے رکتا تھا۔ اور بعض اوقات میں دنیا کی ہر چیز اور ہر شخص سے بیزار ہو جاتا تھا۔ اپنے جیل کے ساتھیوں سے، محل کے عملہ سے باہر والوں سے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں، کیا سلطنت برطانیہ سے اگر اس سے تو میں بہت سے بیزار تھا اور سب سے زیادہ بیزار آپ سے میں سخت اعصابی بے چینی میں مبتلا رہتا تھا اور یہی کیفیتیں جو ایک قیدی پر گزرتی ہیں مجھ پر بڑی شدت سے طاری ہوتی تھیں لیکن خوش قسمتی سے مجھے اس قسم کے دوروں سے بہت جلد افاقہ ہو جاتا تھا۔

جیل میں ملاقات کا دن ہمارے لئے عید کا دن ہوتا تھا ہر شخص اس کے انتظار میں دن گنا کرتا تھا۔ لیکن ملاقات کا جوش ختم ہونے کے بعد فوراً اس کا رد عمل شروع ہوتا تھا یعنی ہمیں بڑی تنہائی اور اداسی محسوس ہوتی تھی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ملاقاتیں خوش گوار نہیں ہوتی تھیں یعنی کوئی پریشان کن خبر سننے میں آتی تھی۔ یا کوئی اور بات ایسی ہوتی تھی جس کی وجہ سے میں رنجیدہ ہو جاتا تھا۔ ملاقاتوں کے موقعوں پر جیل کے افسر تو موجود رہتے ہی تھے لیکن بریلی میں دو تین مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ خفیہ پولیس والے بھی کاغذ پنسل لئے بیٹھے تھے اور جو لفظ ہماری زبان سے نکلتا تھا اسے بڑے شوق سے لکھتے جاتے مجھے اس پر بڑا غصہ آتا تھا اور ان ملاقاتوں کا سارا لطف جاتا رہتا تھا۔

اس کے بعد جب الہ آباد جیل میں ایک ملاقات کے موقع پر میری ماں اور بیوی کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا گیا اور حکومت نے بھی اس کا کوئی تدارک نہیں کیا تو میں نے احتجاج کے طور پر ان ملاقاتوں کو جو بیش قیمت تھیں ترک کر دیا۔ تقریب قریب سات مہینے تک میں کسی شخص سے نہیں ملا۔

میرے لئے بڑے سخت دن تھے۔ اس کے بعد جب میں نے دوبارہ ملاقات
کا سلسلہ شروع کیا اور میرے عزیز پہلے پہل مجھ سے ملنے آئے تو مجھے دیکھئے کہ کس قدر
خوشی ہوئی۔ میری بہن کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ان کے ساتھ آئے تھے ان
میں سے ایک ننھا سا بچہ حسب عادت میرے کاندھے پر چڑھ گیا تو مجھے ایسے
جذبات کا ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ اتنے دن تک انسانوں کی صحبت کے لئے
ترسنے کے بعد گھر کی زندگی کے ماحول نے مجھے بے چین کردیا۔

جس زمانہ میں ملاقات کا سلسلہ بند تھا مجھے گھر کے یا دوسری جیلوں
کے خطوں کا (کیونکہ میری دونوں بہنیں جیل میں تھیں) اور زیادہ بے چینی سے
انتظار رہنے لگا۔ اور یہ چیز میرے لئے اور بھی قیمتی ہوگئی۔ اگر مقررہ وقت پر
خط نہ پہنچتا تو مجھے سخت پریشانی ہوتی۔ لیکن جب آجاتا تو مجھے اس کے کھولنے
میں ایک قسم کی ہچکچاہٹ سی ہوتی تھی اس سے اس طرح کھیلتا رہتا جیسے کوئی اپنی
محبوب چیز سے کھیلتا ہے جو اپنے قابو میں ہو۔ اور میرے دل کی تہ میں خیال بھی
کھٹکتا رہتا کہ کہیں اس میں کوئی ایسی خبر یا بات نہ ہو جس سے مجھے تکلیف پہنچے
خط بھیجنے اور خط پانے دونوں سے پرسکون زندگی میں خلل واقع ہوتا ہے
اس سے جذبات میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے جس سے تکلیف ہوتی ہے ایک دو
روز تک خیالات پریشان رہتے ہیں اور روزمرہ کے کام پر پوری توجہ کرنا مشکل
ہو جاتا ہے۔

نینی اور بریلی کی جیلوں میں ہمارے ساتھ بہت سے لوگ تھے لیکن ڈیرہ دون
میں شروع شروع میں صرف ہم تین آدمی تھے یعنی گووند بلبھ پنت کاشی پور کے کنور
آنند سنگھ اور میں۔ دو ایک مہینے بعد پنت جی اپنی چھ مہینے کی میعاد کاٹ کر چلے گئے
لیکن دو صاحب اور تشریف لے آئے۔ جنوری ۱۹۳۳ء تک سب ساتھی مجھے چھوڑ کر

چلے گئے۔ اور میں اکیلا رہ گیا تا آنکہ اگست میں مجھے رہائی ملی۔ اس عرصہ میں یعنی
پورے آٹھ مہینے ۲۴۰ دن جیل میں میں نے بالکل تنہائی کی زندگی گزاری یہاں
تک کہ کوئی بات کرنے کو بھی نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی جیل کا کوئی اہلکار چند منٹ کے
لئے آ سکتا تھا۔ اگرچہ اصطلاحی طور پر مجھے قید تنہائی کی سزا نہیں دی گئی تھی
لیکن یہ صورت قریب قریب وہی تھی۔ میرے لئے یہ بڑا صبر آزما زمانہ تھا۔ اچھا ہوا
گوریں سے ملاقات کا سلسلہ پھر شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ اس سے مجھے کچھ نہ کچھ سکون
حاصل ہو جاتا تھا۔ میرے ساتھ ایک خاص رعایت یہ تھی کہ مجھے باہر سے تار پھول
منگانے اور چند تصویر رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی ان سے میرا جی بہت کچھ
بہل جاتا تھا عموماً جیل میں پھولوں اور تصویروں کے رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی
اکثر لوگوں نے میرے لئے پھول بھیجے لیکن مجھے ان کے لینے کی اجازت نہیں ملی
بات یہ ہے کہ جیل کی کوٹھری میں خوشنمائی پیدا کرنا پسند نہیں کیا جاتا مجھے یاد ہے
کہ ایک مرتبہ جیل کے ایک سپرنٹنڈنٹ نے میرے ایک ساتھی کو جو میرے برابر کی
کوٹھری میں رہتے تھے اس بات پر تنبیہ کی کہ انہوں نے اپنے منہ ہاتھ دھونے
کا سامان سلیقے سے سجا کر رکھا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کو کوٹھری کو اس طرح
مت سجانا کہ اس سے آرائش اور عیش پسندی ظاہر ہو۔ اب ذرا اس سامان عیش
کی فہرست بھی ملاحظہ کیجئے۔ ایک دانت صاف کرنے کا برش، صابن کی کشتی، [illegible]
کی روشنائی، سر میں ڈالنے کے تیل کی ایک بوتل، ایک برش، ایک کنگھا اور
شاید دو ایک اور چھوٹی چھوٹی چیزیں۔

جیل میں انسان کو روزمرہ کی معمولی معمولی چیزوں کی بڑی قدر ہوتی ہے
وہاں اپنا ذاتی سامان بہت کم ہوتا ہے اس میں آسانی سے اضافہ نہیں ہو سکتا
اگر کوئی چیز کھو جائے تو دوبارہ منگانا بہت مشکل ہے اس لئے ہر شخص انہیں بہت

عزیز رکھتا ہے وہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں جمع کرتا ہے جو باہر عموماً ردی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی ہیں۔ ملکیت کا جذبہ وہاں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا جہاں کوئی چیز جوڑ رکھنے کے قابل ہو میسر نہیں آتی۔

کبھی کبھی زندگی کی خوشگوار چیزوں کے لئے دل چاہتا ہے مثلاً جسمانی آرام و آسائش، خوشگوار ماحول، دوستوں کی صحبت، دلچسپ گفتگو، بچوں کے ساتھ کھیلنا۔ کسی اخبار میں کوئی تصویر یا فوٹو دیکھ کر پرانے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور حوالات کی بے کیفی کمروں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے گھر کی یاد کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتی ہے اور سارا دن بے چینی سے کٹتا ہے۔

میں روز تھوڑی دیر چرخہ کاتتا تھا کیونکہ ذہنی کام کرنے کے بعد جسمانی محنت سے سکون حاصل ہوتا تھا لیکن میرا اہم شغل لکھنا پڑھنا تھا جو کتابیں میں چاہتا تھا وہ سب مجھے نہیں مل سکتی تھیں۔ کیونکہ اس معاملہ میں بڑی پابندیاں تھیں اور بھی سے احتساب ہوتا تھا احتساب کرنے والے بعض اوقات نااہل ہوتے تھے مثلاً ایک مرتبہ اسپنگلر کی کتاب زوال مغرب اس لئے روک دی گئی کہ کتاب کا نام خطرناک اور باغیانہ معلوم ہوتا ہے لیکن مجھے شکایت کا موقع نہیں ہے۔ اس لئے کہ پھر بھی مجھے بہت سی مختلف کتابیں پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ اس معاملہ میں بھی میرے ساتھ خاص رعایت تھی۔ کیونکہ میرے بہت سے ساتھیوں کو (جو درجہ اول کے قیدی تھے) مسائل حاضرہ کے متعلق کتابیں ملنے میں بڑی دقت ہوتی تھی مجھے معلوم ہوا کہ بنارس جیل میں وہائٹ پیپر تک (جس میں حکومت برطانیہ کی دستوری تجاویز درج تھیں) منگانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کیونکہ اس میں سیاسی معاملات کی بحث تھی۔ برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں مذہبی کتابیں یا

بڑی بے تعصبی سے ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

جب ہندوستان میں معمولی سے معمولی ملکی حقوق بھی حاصل نہیں ہیں تو قیدیوں کے حقوق کا تذکرہ کرنا فضول ہے۔ پھر بھی یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ اگر ایک عدالت کسی شخص کو قید کی سزا دیتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جسم کے ساتھ دماغ کو بھی سزا دی جائے۔ قیدی کا جسم پابند ہے لیکن دماغ کیوں نہ آزاد ہو؟ ہندوستان کے جیلوں کے ارباب حل وعقد یقیناً اس سوال پر برافروختہ ہوں گے کیونکہ ان میں جدید خیالات کو سمجھنے کی صلاحیت اور غور و فکر کی عادت عموماً بہت کم ہوتی ہے۔ احتساب یوں بھی بے انصافی اور حماقت کا فعل ہے۔ ہندوستان میں تو ہم اس کی بدولت بہت سی مفید مطبوعات اور ترقی پذیر رسائل اور اخبارات سے محروم رہتے ہیں۔ ممنوعہ کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ قیدیوں کو وہ کتابیں بھی نہیں ملتیں جن کی جیل کے باہر چھاپنے اور پڑھنے کی قانوناً اجازت ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ سوال اٹھا تھا۔ وہاں نیویارک کے مشہور و معروف سنگ سنگ جیل میں جب اشتمالی رسائل کی ممانعت کی گئی تو امریکہ کے حکمران طبقے کو اشتمالیوں سے خاص کد ہے لیکن اس کے باوجود جیل کے حکام نے یہ تسلیم کیا کہ قیدیوں کو ہر طرح کی مطبوعات حتیٰ کہ اشتمالی رسائل اور اخبار بھی منگانے کا حق ہے۔ جیل کے وارڈن نے اس میں صرف اتنا استثنا کیا تھا یعنی ان کارٹونوں کی ممانعت کر دی تھی جنہیں وہ اشتعال انگیز سمجھتا تھا۔

ہندوستان کی جیلوں کے متعلق ذہنی آزادی کے مسئلہ پر بحث کرنا بالکل فضول ہے۔ کیونکہ عام قیدیوں کو نہ تو کوئی اخبار ملتا ہے اور نہ لکھنے کا سامان۔ احتساب کیا کیا جائے یہاں تو ان سب چیزوں کی ایک سرے سے ممانعت ہے۔

صرف درجہ اول کے قیدیوں کو لکھنے کا سامان ملتا ہے لیکن رسالہ اخبار ان میں
سے بھی بہت سوں کو نہیں دئے جاتے اور جنہیں ملتے بھی ہیں تو وہی اخبار جنہیں حکومت
پسند کرتی ہے۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے سیاسی اور غیر سیاسی قیدیوں
ان کے لئے اصولاً لکھنے کا سامان ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بعض سیاسی قیدیوں کے
ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ انہیں لکھنے کا سامان دے دیا جاتا ہے لیکن اکثر یہ
رعایت ممنوع ہوتی رہتی ہے۔ درجہ اول کے قیدی ہزار میں ایک سے زیادہ نہیں
ہوں گے اس لئے ہندوستانی قیدیوں کی عام حالت پر غور کرتے وقت ہم انہیں
نظرانداز کر سکتے ہیں۔ مگر یہ یاد رہے جہاں تک کتابوں اور اخباروں کا تعلق ہے،
درجہ اول کے ان خوش نصیب قیدیوں کو بھی وہ مراعات حاصل نہیں ہیں جو اکثر
مہذب ممالک کے عام قیدیوں کو حاصل ہیں۔

بقیہ قیدیوں یعنی ہزار میں نو سو ننانوے کو ایک وقت میں دو تین کتابیں رکھنے
کی اجازت ہے۔ لیکن پابندیاں اتنی سخت ہیں کہ عام طور پر وہ اس رعایت سے
فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لکھنا یا کتابوں کے نوٹ لینا بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے اور
اس کی سخت ممانعت ہے۔ ذہنی تربیت کو جان بوجھ کر اس طرح روکنا بہت عجیب
اور بے معنی چیز ہے۔ قیدیوں کی اصلاح کے نقطۂ نظر سے نہایت ضروری ہے کہ ان
کے دماغ کی تربیت کی جائے۔ اور اس کا رخ بدلا جائے۔ انہیں لکھنا پڑھنا اور
کوئی کارآمد ہنر سکھایا جائے۔ لیکن ہندوستان میں جیل کے حکام کو تو یہ بات
نہیں سوجھی۔ کم سے کم صوبۂ متحدہ میں تو اس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ابھی کچھ
عرصے سے لڑکوں اور نوجوان قیدیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی کوشش شروع
ہوئی ہے لیکن یہ بالکل ناکافی ہے اور جن لوگوں کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے
وہ قطعاً نااہل ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیدی پڑھنے لکھنے کو پسند نہیں کرتے

لیکن میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرے پاس بہت سے قیدی ایسی عمر
سے آتے تھے۔ دور میں دیکھا کہ انھیں لکھنے پڑھنے کا دل سے شوق تھا جنھیں پہلے
سے ملنے کا پہلی موقع ملا تھا ہم انھیں پڑھاتے تھے اور وہ بڑی محنت سے کام
کرتے تھے۔ اکثر جب آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیرت میں رہ
گیا کہ دو ایک قیدی بارک کے اندر دھندلی سی لالٹین کے پاس بیٹھے اپنا سبق
یاد کر رہے تھے۔

عرصہ میں کتب بینی میں مصروف رہتا تھا۔ میں اپنے مطالعہ کا موضوع بدلتا
رہتا تھا۔ مگر عموماً ٹھوس کتابیں پڑھتا تھا۔ ناولوں سے ذہن شکست ہو جاتا ہے
اس لئے میں نے زیادہ ناولیں نہیں پڑھیں۔ جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو
لکھنے لگتا تھا۔ تاریخ عالم کے موضوع پر میں نے اپنی لڑکی کے نام خطوط کا جو
سلسلہ لکھا ہے اس میں میں اپنی سزا کے پورے دو سال مصروف رہا اور اس سے
میرے ذہن کی چستی اور تندرستی قائم رہی۔ ایک حد تک مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ
میں اسی دور ہی میں رہتا ہوں جس کی تاریخ میں لکھ رہا ہوں۔ اس لئے میں اپنے
جیل کے احول کو قریب قریب بھول گیا تھا۔

سفرنامے پڑھنے کا مجھے بڑا شوق تھا مثلاً ہیون سانگ، مارکوپولو، ابن بطوطہ
وغیرہ پرانے سیاحوں کے تذکرے اور زمانہ حال کے لوگوں مثلاً ہیڈن (جس نے
وسطی ایشیا کے ریگستانوں میں سفر کیا ہے) اور وَیج (جس نے تبت کے عجیب
واقعات لکھے ہیں) وغیرہ کی کتابیں، تصویروں کی کتابیں خصوصاً پہاڑوں
برف کے تودوں اور ریگستانوں کی تصویریں دیکھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔
کیونکہ جیل میں ہر شخص وسیع فضاؤں، سمندروں اور پہاڑوں کے لئے ترستا
ہے۔ میرے پاس موں بلاں، کوہ آلپس اور ہمالیہ کی تصویروں کے چند خوبصورت

صرف درجہ اول کے قیدیوں کو لکھنے کا سامان ملتا ہے۔ لیکن دراصل اخبار اس میں
سے بھی سب کو نہیں دیے جاتے اور جنھیں ملتے بھی ہیں تو وہی اخبار جنھیں حکومت
پسند کرتی ہے۔ رہے دوسرے اور تیسرے درجے کے سیاسی اور غیر سیاسی قیدی،
ان کے لیے اصولاً لکھنے کا سامان ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بعض سیاسی قیدیوں کے
ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ انھیں لکھنے کا سامان دے دیا جاتا ہے لیکن اکثر یہ
رعایت منسوخ ہوتی رہتی ہے۔ درجہ اول کے قیدی ہزار میں ایک سے زیادہ نہ ہوتے
ہوں گے اس لیے ہندوستانی قیدیوں کی عام حالت پر غور کرتے وقت ہم انھیں
نظرانداز کر سکتے ہیں۔ مگر یہ یاد رہے جہاں تک کتابوں اور اخباروں کا تعلق ہے،
درجہ اول کے ان خوش نصیب قیدیوں کو بھی وہ مراعات حاصل نہیں ہیں جو اکثر
مہذب ممالک کے عام قیدیوں کو حاصل ہیں۔

بقیہ قیدیوں یعنی ہزار میں نو سو ننانوے کو ایک وقت میں دو تین کتابیں رکھنے
کی اجازت ہے۔ لیکن پابندیاں اتنی سخت ہیں کہ عام طور پر وہ اس رعایت سے
فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لکھنا یا کتابوں کے نوٹ لینا بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے اور
اس کی سخت ممانعت ہے۔ ذہنی تربیت کو جان بوجھ کر اس طرح روکنا کتنا بیجا
اور بے معنی چیز ہے۔ قیدیوں کی اصلاح کے نقطۂ نظر سے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ان
کے دماغ کی تربیت کی جائے۔ اور اس کا رخ بدلا جائے۔ انھیں لکھنا پڑھنا اور
کوئی کارآمد ہنر سکھایا جائے۔ لیکن ہندوستان میں جیل کے حکام کو شاید یہ بات
نہیں سوجھی۔ کم سے کم صوبۂ متحدہ میں تو اس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ابھی کچھ
عرصے سے لڑکوں اور نوجوان قیدیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی کوشش شروع
ہوئی ہے لیکن یہ بالکل ناکافی ہے اور جن لوگوں کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے
وہ قطعاً نااہل ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیدی پڑھنے لکھنے کو پسند نہیں کرتے

لیکن سراتھر یہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرے پاس بہت سے قیدی اسکول
سے آتے تھے اور میں دیکھا کہ انھیں لکھنے پڑھنے کا دل سے شوق تھا جس قدر
سے ملنے کا انھیں موقع ملا تھا ہم انھیں پڑھاتے تھے اور وہ بڑی محنت سے
کرتے تھے۔ اکثر جب آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیرت میں
گیا کہ وہ ایک قیدی بارک کے اندر دھندلی سی لالٹین کے پاس بیٹھے اپنا سبق
یاد کر رہے تھے۔

عرصہ میں کتب بینی میں مصروف رہتا تھا۔ میں اپنے مطالعہ کا موضوع بدلتا
رہتا تھا۔ مگر عموماً ٹھوس کتابیں پڑھتا تھا۔ ناولوں سے ذہن سست ہو جاتا
اس لئے میں نے زیادہ ناولیں نہیں پڑھیں۔ جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو
لکھنے لگتا تھا۔ تاریخ عالم کے موضوع پر میں نے اپنی لڑکی کے نام خطوط کا جو
سلسلہ لکھا ہے اس میں میں اپنی سزا کے پورے دو سال مصروف رہا اور اس سے
میرے ذہن کی چستی اور تندرستی قائم رہی۔ ایک حد تک مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ
میں اسی دور ماضی میں رہتا ہوں جس کی تاریخ میں لکھ رہا ہوں۔ اس لئے میں اپنے
جیل کے ماحول کو قریب قریب بھول گیا تھا۔

سفرنامے پڑھنے کا مجھے بڑا شوق تھا مثلاً ہیون سانگ، مارکو پولو، ابن بطوطہ
وغیرہ پرانے سیاحوں کے تذکرے اور زمانہ حال کے لوگوں مثلاً ہیڈن (جس نے
وسطی ایشیا کے ریگستانوں میں سفر کیا ہے) اور ینگ (جس نے تبت کے عجیب
واقعات لکھے ہیں) وغیرہ کی کتابیں، تصویروں کی کتابیں خصوصاً پہاڑوں
برف کے تودوں اور ریگستانوں کی تصویریں دیکھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔
کیونکہ جیل میں ہر شخص وسیع فضاؤں، سمندروں اور پہاڑوں کے لئے ترستا
ہے میرے پاس مونٹ بلانک، کوہ آلپس اور ہمالیہ کی تصویروں کے چند خوبصورت

کتابچوں میں اکثر انھیں دیکھا کرتا تھا۔ اور جب میری کوٹھری یا بارک کا درجۂ
حرارت ۱۱۰ ڈگری یا اس سے زیادہ ہوتا تھا۔ تو میں برف کے ان تودوں کو حسرت
سے تکا کرتا تھا۔ اٹلس کو دیکھ کر طبیعت میں ہیجان پیدا ہوتا تھا۔ اس سے
ان جگہوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جنھیں ہم دیکھ چکے تھے اور ان مقامات کا
تصور تازہ ہو جاتا تھا جنھیں دیکھنے کا ارمان تھا۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ان
سارے منظروں کا لطف اٹھائیں ان قلعوں اور نشانوں کی سیر کریں جو بڑے
بڑے شہروں کو ظاہر کرتے ہیں ان گہری موٹی لکیروں پر سے گذریں جو پہاڑوں
کی سلاسل ہیں اور ان نیلے دھبوں کو عبور کریں جو سمندر کی نشانی ہے۔
روئے دنیا کے تمام دلکش منظر دیکھیں اور بدلتی ہوئی انسانی زندگی کی کش مکش
کا مطالعہ کریں۔ یہ آرزوئیں ہمیں بے حس کر دیتی تھیں اور جلد ہی ہم حسرت
افسوس کے ساتھ اٹلس کو اٹھا کر رکھ دیتے تھے اور پھر اسی چار دیواری میں
لوٹ آتے تھے جو ہمیں گھیرے ہوئے تھی اور انھی کیف معمولات میں مصروف
ہو جاتے تھے جو ہماری قسمت میں لکھے تھے۔

قید خانے کے جانور

ایک سال اور ڈھائی مہینے میں نے دہرہ دون جیل میں ایک چھوٹی
سی کوٹھری یا کمرے میں گذارے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں اس کا
ایک جزو بن گیا ہوں۔ میں اس کے ہر حصے سے واقف تھا۔ سفیدی سے پتی
ہوئی دیواروں، ناہموار فرش اور کرم خوردہ چھت کی کڑیوں کے ایک ایک
نشان اور ایک ایک داغ سے واقف تھا۔ باہر صحن میں گھاس کے
چھوٹے چھوٹے تختے میرے پرانے دوست بن گئے تھے۔ میں اس کوٹھری میں
تنہا نہیں تھا اس لئے کہ یہاں ہر قسم کے زہریلے کیڑے مکوڑوں اور بھڑوں نے
اپنی نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ کڑیوں کے پیچھے چھپکلیوں کا مسکن تھا جو شام
کو اپنے شکار کی تلاش میں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ انسان کے خیالات
جذبات کا کوئی نقش اس کے گرد و پیش میں باقی رہ جاتا ہے تو یقین ہے
کہ اس کوٹھری کی تنگ فضا بھی طرح طرح کے خیالات سے معمور ہو گی اور وہ
ہر چیز میں بسے ہوئے ہوں گے۔

دوسرے قید خانوں میں، میں اچھی اچھی کوٹھریوں میں رہا ہوں لیکن دہرہ دون
جیل میں مجھے ایک ایسی رعایت حاصل تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔
یہاں کا اصل جیل خانہ نہایت مختصر ہے اور ہم جیل کے احاطہ ہی میں مگر اس کی
دیواروں سے باہر ایک پرانی حوالات میں رہتے تھے۔ یہ جگہ جیسے چھوٹی

تھی اس قدر چھوٹی مگر اس میں ٹہلنے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ لہذا جیل امارت
بھی کرائی کوٹھری سے باہر جیل کے پھاٹک کے سامنے جو تقریباً سو گز کے فاصلہ
پر تھا صبح شام ٹہل سکیں۔ گویا احاطہ جیل میں رہنے کے باوجود ہم اس کی دیواروں
سے باہر نکل کر پہاڑ اور کھیتوں کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ پاس ہی آمد و رفت
کے لئے ایک سڑک بھی تھی۔ لیکن اس رعایت سے جس کا میں نے ذکر کیا
ہے صرف میں ہی نہیں بلکہ وارڈ الف اور ب کے تمام قیدی فائدہ اٹھا سکتے
ہیں۔ جیل کی دیواروں سے باہر مگر اس کے احاطہ کے اندر ہی ایک اور
چھوٹی سی حوالات بھی تھی جو یورپین حوالات کہلاتی تھی۔ اس کے ارد گرد
کوئی دیوار نہ تھی۔ لہذا اس میں بیٹھے ہی بیٹھے کوہستان کے دل موہ منظر اور
بیرونی زندگی کا نظارہ ممکن تھا۔ یورپین مجرم اور دوسرے قیدی جو یہاں
رکھے گئے تھے انہیں بھی صبح و شام جیل خانے کے پھاٹک کے سامنے چہل قدمی
کی اجازت تھی۔

صرف وہی قیدی جو ایک مدت تک جیل کی اونچی اونچی دیواروں کے
اندر رہے ہیں اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی حدود سے باہر نکل لینا یا
بیرونی دنیا کے وسیع اور کشادہ منظر سے لطف اندوز ہونا نفسیاتی اعتبار
سے کیسی عجیب و غریب نعمت ہے۔ مجھے جیل سے باہر نکلنے کا اس قدر شوق تھا
کہ برسات کے موسم میں بھی جب موسلا دھار بارش کا سلسلہ کئی روز تک جاری
رہتا اور مجھے ٹخنوں ٹخنوں پانی میں چلنا پڑتا میں نے نکل کر ٹہلنا ترک نہیں کیا۔
اس قسم کی چہل قدمی یوں تو ہر جگہ اچھی معلوم ہوتی مگر قریب ہی سر بفلک
ہمالیہ کا منظر میرے لئے مزید خوشی کا باعث ہوتا تھا۔ جس سے دم بھر کے
لئے قید خانے کی پریشانی اور کلفت بڑی حد تک رفع ہو جاتی یہ بھی

خوش قسمتی تھی کہ اس طویل عرصہ میں جب ملاقاتوں کا سلسلہ بالکل مسدود ہو جاتا اور مجھے کئی مہینے لگاتار تنہا رہنا پڑتا۔ مغموم پہاڑ میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ کوٹھری کے اندر سے اگرچہ میرے لئے ان کا لطف اٹھانا ناممکن تھا مگر ان کا تصور میرے دل میں اس طرح سما گیا تھا کہ مجھے ان کے قرب کا ہر وقت احساس رہتا۔ معلوم ہوتا تھا میرے ان کے درمیان ایک پر اسرار رابطہ قائم ہو گیا۔

پرندوں کے جھنڈ اڑتے اڑتے نظر سے غائب ہو گئے
اور وہ بادل کا اکیلا ٹکڑا بھی تیرتا ہوا دور چلا گیا۔
میں تنہا بیٹھا ہوں اور میرے آگے بہت دور چنگ ٹنگ
کی بلند چوٹی کھڑی ہے۔
ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں اکتاتے۔ پہاڑ اور میں

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ شاعر لی تے پو کی طرح مجھے پہاڑوں سے کبھی وحشت نہیں ہوئی لیکن یہ بہت کم ہوتا تھا۔ عموماً مجھے ان کے قرب سے ایک طرح کی تسکین محسوس ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پہاڑوں کا وقار اور ثبات، لاکھوں کروڑوں برس کی حکمت و دانائی سے مالامال مجھے چشم نمائی کرتا ہے۔ میرے تلون پر ہنستا ہے اور میرے بے چین دل کو سکون اور تقویت بخشتا ہے۔

ہندوستان کے نشیبی میدانوں کی نسبت دہرہ دون میں بہار کا موسم طویل بھی ہوتا ہے اور خوشگوار بھی۔ جاڑے میں درختوں کے پتے گر گئے تھے اور وہ ننگے ہو کر رہ گئے تھے تعجب ہوا کہ پیپل کے وہ چار بڑے بڑے درخت بھی جو جیل کے سامنے کھڑے تھے بالکل بے پتہ

ہو گئے تھے۔ اور ان پر ایک افسردگی سی چھا گئی تھی۔ مگر پہاڑ کی ہواؤں نے انھیں پھر گرما دیا اور ان کے رگ و ریشہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دفعتاً ان بیلوں کے پیڑوں اور تمام درختوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور ایک طلسمات کا عالم نظر آنے لگا۔ جیسے پردے کے پیچھے پر اسرار قوتیں کام کر رہی ہوں میں ان کی شاخوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹتے دیکھ کر چونک پڑتا تھا۔ یہ منظر نہایت ہی خوش گوار اور مسرت خیز تھا۔ دفعتہً لاکھوں کروڑوں پتے بڑی سرعت کے ساتھ شاخوں پر نمودار ہو کر آفتاب کی روشنی میں چمک اٹھے۔ اور پھر ہوا کی تال پر رقص کرنے لگے۔ کونپلوں کا دیکھتے ہی دیکھتے پتوں میں بدلنا کس قدر عجیب و غریب منظر ہے۔

اس سے پہلے میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا تھا کہ آم کے نئے پتوں کا رنگ سرخی مائل بھورا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے موسم خزاں میں کشمیر کے پہاڑوں پر ہلکا گلابی رنگ چھا جاتا ہے۔ لیکن یہ آم کے پتے بہت جلد اپنا رنگ بدل کر پھر سبز ہو جاتے ہیں۔

برسات کی بارشیں ہمیشہ خوش گوار ہوتی ہیں اس لئے کہ وہ گرمی کی تپش بجھا دیتی ہیں۔ مگر کبھی نعمت کی فراوانی زحمت بھی بن جاتی ہے اور دہرہ دون تو بارش کے دیوتا کا استھان ہے۔ برسات کی ابتدا میں شروع ہی کے پانچ چھ ہفتوں میں یہاں تقریباً پچاس ساٹھ انچ بارش ہو جاتی ہے اس وقت جس کے ایک منگ گرتے میں دیکھ کر بیٹھ جانا اور یہ کوشش کرنا کہ آدمی بھیگتی ہوئی چھت کے پانی یا کھڑکیوں میں سے آنے والی بوچھار سے بچا رہے کچھ تماشا نہیں ہوتا۔

برسات کے بعد خزاں کا موسم نہایت خوش گوار ہوتا تھا اور جاڑا بھی

نشر لیکہ بارش نہ ہو، پانی کی بوچھار، بجلی کی کڑک، تیز و تند ہواؤں کے چلنے
سے دم الجھتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ایک اچھا مکان، کسی قدر گرمی یا تپش
اور گرمی میسر ہو۔ بعض اوقات اولے گرتے تھے اور ایک ایک اولا کھیلے کی گولی
سے بڑا ہوتا تھا۔ جب یہ اولے اس اوار آہنی چھت پر گرتے تو ان سے کچھ اس قسم کا
زبردست شور پیدا ہوتا تھا جیسے توپیں چل رہی ہوں۔

ایک دن مجھے خاص طور سے یاد ہے۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کی چوبیسویں تاریخ
تھی۔ دن بھر رعد و باراں کا زور رہا سردی نہایت سخت تھی جسمانی تکلیف
کے لحاظ سے یہ سب سے برا دن تھا۔ تو میں نے محل میں گذارا لیکن شام کو دفعۃً
مطلع صاف ہو گیا۔ ارد گرد کے تمام پہاڑ اور پہاڑیاں برف سے ڈھکی ہوئی
تھیں۔ یہ دیکھ کر میری تمام افسردگی اور کلفت دور ہو گئی۔ اگلے روز بڑا دن
تھا۔ صاف اور خوشگوار، اور برف آلود پہاڑوں کا منظر نہایت دل فریب
معلوم ہوتا تھا۔

روز مرہ کے مشاغل سے محروم ہونے کی وجہ سے میں فطرت کے
مشاہدے کا شوق ہو گیا۔ مختلف قسم کے جانوروں اور کیڑوں کو جو وہاں موجود
تھے ہم بہت غور سے دیکھنے لگے۔ جب سردی ستانے کی قوت بڑھ گئی تو
میں نے دیکھا کہ میری کوٹھری اور باہر صحن میں ہر قسم کے کیڑے مکوڑے موجود
ہیں۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں تنہائی کی شکایت کرتا تھا اور سمجھ
رہا تھا کہ یہ احاطہ جو بظاہر خالی اور ویران معلوم ہوتا تھا زندگی سے معمور ہے
ان رینگنے اور اڑنے والے کیڑوں نے مجھے کبھی نہیں ستایا۔ اس لئے میں نے بھی
انہیں بے چھیڑا۔ البتہ کھٹملوں اور مچھروں اور ایک حد تک مکھیوں سے میری لڑائی
مسلسل جاری رہی۔ کنکھجوروں اور زہریلے کیڑوں سے جو گنگوروں کی تعداد میں میری

کوٹھری میں موجود تھے میں نے کبھی تعرض نہیں کیا۔ مجھ میں اور ان میں صرف ایک دفعہ ذرا سا جھگڑا ہوا تھا۔ شاید ایک کھٹمل نے نادانستہ طور پر مجھے کاٹا اور مجھے اس قدر طیش آیا کہ میں نے اس کو نیست نابود کرنے کی ٹھان لی لیکن انھوں نے اپنے بچوں کو بچانے کے لئے جس میں غالباً ان کے انڈے تھے شرمناک حد تک بے پرواہی سے کام لیا مجبوراً مجھے ہاتھ روکنا پڑا۔ اور میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اب انھوں نے مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں دی تو میں بھی ان کو اپنے حال پر چھوڑ دوں گا۔ اس واقعہ کے بعد میں ایک سال سے کچھ اوپر ہی اس کوٹھری میں رہا ہوں لیکن ان کھٹملوں یا بڑے کیڑوں نے کبھی مجھے تنگ نہیں کیا اور ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے۔

چمگادڑوں سے مجھے نفرت تھی۔ لیکن مجبوراً انھیں بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ شام کے دھندلکے میں وہ نہایت خاموشی کے ساتھ پرواز کرتے اور ایک لحظہ کے لئے آسمان کی تاریک فضا کے مقابل نظر آجاتے ان بھیانک جانوروں سے مجھے ڈر لگتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے چہرے کے برابر سے گزر جاتے ہیں اور یہ خوف تھا کہ کہیں ہم ایک دوسرے سے ٹکرا نہ جائیں۔ بڑے بڑے چمگادڑ فضا میں سست اور بے پرواہ پرواز کرتے تھے۔

میں گھنٹوں چیونٹی، دیمک اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ اور چھپکلیوں کا جب وہ شام کو رینگتی ہوئی چپکے چپکے اپنے شکار کو تاکتی رہتیں یا کبھی نہایت ہی مضحکہ انداز سے دم ہلا ہلا کر ایک دوسرے کا پیچھا کرتیں عام طور پر یہ بھڑوں کی طرف سے بچتی تھیں۔ لیکن دو مرتبہ میں نے دیکھا کہ انھوں نے نہایت احتیاط سے بھڑوں کا پیچھا کیا اور پھر دفعتہً ہی ان کو ٹھیک دبوچ لیا۔ میں نہیں جانتا کہ انھوں نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو ڈنک سے

کیا یہ محض اتفاقی بات تھی۔

ان کے علاوہ گلہریاں قریب کے درختوں پر بے شمار تھیں کبھی کبھی انھیں
یہاں تک جرأت ہوتی کہ ہمارے پاس چلی آتیں۔ لکھنؤ جیل میں میں کئی کئی گھنٹے
قریب قریب بے حس و حرکت بیٹھا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس اثنا میں اکثر ایسا ہوتا
تھا کہ ایک گلہری میری ٹانگ سے ہوتی ہوئی گھٹنے پر آ بیٹھتی اور ادھر ادھر
دیکھنے لگتی۔ دفعتہً میری آنکھیں اس سے چار ہوتیں اور وہ محسوس کرتی کہ
میں کوئی درخت وغیرہ نہیں ہوں جو اس نے مجھے سمجھ رکھا تھا۔ ایک لمحے کے
لئے وہ خوف سے ٹھٹکتی اور پھر نہایت تیزی کے ساتھ بھاگ جاتی۔ بعض اوقات
گلہریوں کے چھوٹے چھوٹے بچے درختوں پر سے گر پڑتے۔ اس کی ماں گلہری
بھی ان کے پیچھے ہی آ جاتی اور ایک چھوٹی سی گیند کی طرح اس کا گچھا سا
سا کر انھیں کسی محفوظ گوشے میں لے جاتی۔ کبھی بچے گم بھی ہو جاتے تھے۔ ایک
بار ایک رفیق کو اس قسم کی تین گلہریاں مل گئیں جن کی ہم بہت دیر تک دیکھ بھال
کرتے رہے۔ یہ گلہریاں اتنی چھوٹی تھیں کہ ان کو کھلانا پلانا ناممکن سا معلوم
ہوتا تھا۔ آخر یہ مسئلہ ایک اچھی ترکیب سے حل کیا گیا یعنی ہم نے فونٹین پین میں
روشنائی ڈالنے کی نلکی کی نوک پر ذرا سی روئی لگا دی اور اس سے دودھ
پلانے کی بوتل کا کام لیا۔

کبوتروں سے میں نے کوئی جیل خالی نہیں پایا سوائے الموڑہ کے
کوہستانی قید خانے کے۔ دہرہ دون جیل میں سینکڑوں ہزاروں کبوتر تھے
شام کو ان کے جھنڈ کے جھنڈ سطح آسمان پر چھا جاتے۔ بعض اوقات جیل کے
عہدہ دار ان کا شکار کرلیتے اور کھا جاتے۔ یہاں مینائیں بھی بکثرت ہوا
کرتی ہیں۔ ان کے ایک جوڑے نے میری کوٹھڑی کے دروازے کے باہر

اوپر اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اور ان کی خوراک کا انتظام میرے ذمہ تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئیں کہ اگر صبح یا شام ان کے کھانے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ میرے پاس چلی آتیں اور شور مچا مچا کر اپنی غذا طلب کرتیں۔ ان کی حرکات و سکنات کو دیکھ دیکھ کر اور ان کی چہچہاہٹ کو سن کر مجھے بے حد لطف آتا تھا۔

یکی میں بہت سے طوطوں نے میری بارک کی دیواروں میں درزوں کے اندر اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ان کا ایک دوسرے سے اختلاط اور اظہار محبت کرنا نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دو نر طوطوں میں کسی مادہ کی بدولت جنگ بھی ہو جاتی تھی۔ اس موقع پر مادہ نہایت اطمینان سے بیٹھی تماشا دیکھتی اور جس کی فتح ہوتی اسے اپنا مورد عنایت بناتی۔

دہرہ دون میں طرح طرح کے پرند موجود تھے۔ ان کے چہچہوں سے ایک شور برپا ہو جاتا تھا۔ مگر کوئل کی دردناک کوک ان سب پر غالب آ جاتی تھی۔ برسات اور برسات سے کچھ پہلے "پی کہاں" کا پرند آ جاتا اور مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کا یہ نام کیوں رکھا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ دن ہو یا رات، دھوپ ہو یا بارش یہ پرند لگاتار ایک ہی نعرہ لگاتا رہتا ہے۔ لیکن اکثر یہ پرندے نظر نہیں آتے تھے۔ ہم صرف ان کی آواز سنتے تھے۔ ہمارے مختصر سے صحن میں کوئی درخت نہیں تھا البتہ میں عقابوں اور چیلوں کو دیکھا کرتا تھا جو بہت اوپر ہوا میں نہایت خوبصورتی سے منڈلایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ تیر کی طرح نیچے گرتیں اور پھر ہوا کے جھونکے میں اوپر اٹھ جاتیں۔ مرغابیوں کا جھنڈ البتہ ہمارے سر پر سے گزر جاتا تھا۔

بنی جیل میں مدتوں سے ایک [illegible] کام کر گئی تھی۔

ان کی حرکتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے
ایک بندر کا بچہ کسی طرح ہمارے بارک کے احاطہ میں آگیا اور باوجود کوشش
کے دیوار کو نہیں پھاند سکا۔ یہ دیکھ کر جیل کے محافظوں، قیدیوں اور قیدی
نگرانوں نے پکڑ کر اس کی گردن میں رسی ڈال دی۔ اس کے ماں باپ ایک
اونچی سی دیوار پر بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ان کا غصہ لحظہ لحظہ بڑھ
رہا تھا۔ دفعتہً ان میں سے ایک جا اتری مدد بچے کو دبڑا اور اس ہجوم پر جس نے
بندر کے بچے کو گھیر رکھا تھا حملہ کر دیا۔ یہ فعل غیر معمولی جرأت اور دلیری کا
کام تھا۔ اس لئے کہ محافظ اور قیدی نگراں ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ڈنڈے
لئے اس کو دھمکا رہے تھے۔ اور ان کی تعداد بھی بڑی تھی آخر بندر کی دلیرانہ
جرأت کی فتح ہوئی اور انسانوں کا ہجوم لاٹھیاں اور ڈنڈے سب کچھ چھوڑ
کر ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ یوں بندروں نے اپنے بچے کو انسانوں کے ہاتھ
سے بچا لیا

بعض اوقات جیل میں ایسے جانور بھی چلے آتے تھے جن کا آنا کچھ بہت
زیادہ خوش گوار نہ تھا۔ بچھوؤں کو میں اکثر اپنی کوٹھری میں دیکھتا تھا خصوصاً
رعد و باراں کے طوفان کے بعد عجیب بات ہے کہ مجھے کبھی کسی بچھو نے
نہیں کاٹا۔ حالانکہ مجھے ان سے اسی ایسی جگہوں پر سابقہ پڑا جہاں ان کی
موجودگی کا وہم بھی نہ ہوتا تھا۔ مثلاً بستر پر۔ اکثر اب کبھی ہوا کہ میں نے
کوئی کتاب پڑھنے کے لئے اٹھائی اور اس میں بچھو موجود تھا میں نے ایک
نہایت سیاہ بچھو کو جو شکل سے زیادہ زہریلا معلوم ہوتا تھا بوتل میں بند
کر کے [illegible] اور اسے مکھیاں [illegible]
ڈوروں [illegible]

کو میں خطرناک سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی کوٹھری کا کونا کونا چھان مارا لیکن کچھ پتا نہ چلا۔

جیل میں میری کوٹھری میں یا اس کے قریب ہی تین چار سانپ نکل پائے گئے۔ ان میں سے ایک کی خبر کسی نہ کسی طرح ماہر جا پہنچی اور اخباروں نے اسے موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اس سے تکلف نہیں ہوئی بلکہ لطف آیا۔ قید خانے کی زندگی بڑی بے کیف ہوتی ہے۔ اور اس کی یکسانی کو جو چیز بھی توڑ دے وہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے سانپ اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر مجھے ان سے وحشت نہیں ہوتی جتنی بعض اور لوگوں کو۔ ان کے ڈسنے سے بے شک ڈر معلوم ہوتا ہے اور جب کبھی اس کا سامنا ہو جائے یقیناً اس سے اپنی حفاظت کی فکر کرتا ہوں۔ میرے دل میں کراہیت یا غیر معمولی خوف کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ کنکھوروں سے ڈر لگتا ہے بلکہ ڈر سے زیادہ گھن آتی ہے۔ ایک مرتبہ علی پور جیل کلکتہ میں آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی چیز میرے پاؤں پر رینگ رہی ہے۔ میں نے چور مشعل کو جلایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کنکھورا بستر پر موجود ہے۔ میں گھبرا کر بستر سے کودا اور کوٹھری کی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا۔ یہ موقع تھا جب میں نے صحیح طور پر محسوس کیا کہ پاولاف کی اضطراری حرکات کیا ہوں گی۔

دہرہ دون میں میں نے ایک نیا جانور دیکھا یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ جانور میرے لئے نیا تھا۔ میں جیل کے پھاٹک میں کھڑا جیلر سے باتیں کر رہا تھا کہ ہمیں ایک شخص نظر آیا جو ایک عجیب و غریب جانور کو اٹھائے لئے جا رہا تھا جیلر نے اسے بلا بھیجا تو میں نے دیکھا کہ یہ جانور چھپکلی اور مگر مچھ کے بیچ کی سی صورت کا تھا۔ یہ تقریباً دو فٹ لمبا تھا۔ اس کے پنجے اور کھال پر چھلکے (اردو)

یہ بہ کم جانور کو جو ابھی تک زندہ تھا ایک عجیب و غریب طریقے سے مردہ کر کے بیچے کرہ
لگائی جاتی ہے۔ شکاری اسے بانس میں لٹکائے حوض حوض گھر لئے جا رہا تھا۔ ہم
نے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اس جانور کو 'لو' کہتے ہیں۔ جب میں نے اس سوال
سے کہ وہ اسے کیا کرے گا۔ اس شخص کی باچھیں کھل گئیں اور وہ کہنے لگا کہ میں
اس کی بھجیا بناؤں گا۔ یہ شخص جنگل کا رہنے والا تھا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں کے
بعد جب میں ایف۔ ڈبلیو۔ چیمپئن کی کتاب "جنگل اندھیرے اور روشنی میں" کا
مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس جانور کو پنگولین کہتے ہیں۔

قیدیوں اور بالخصوص ان مجرموں کے لئے جن کی سزا بہت طویل ہو
سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ ان کے جذبات افسردہ ہو جاتے ہیں۔
بعض اوقات وہ جانوروں کو پال کر اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ عام قیدیوں
کو اس کی اجازت نہیں ہوتی مگر قیدی نگراں جن کو تھوڑی بہت آزادی حاصل
ہوتی ہے ایسا کریں تو حکام جیل کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ عام طور پر گلہریاں
اور عجیب بات یہ ہے کہ بیولے پالے جاتے ہیں۔ کتوں کو تو جیل میں آنے کی
اجازت ہی نہیں ہوتی۔ البتہ بلیوں پر کوئی قید نہیں۔ ایک مرتبہ بلی کا ایک
چھوٹا سا بچہ مجھ سے مانوس ہو گیا۔ جس کو درحقیقت جیل کے ایک افسر نے پالا تھا۔
جب اس کی تبدیلی ہو گئی تو مجھے اس بچے کی جدائی کا واقعی افسوس ہوا۔ کتے
اگرچہ جیل میں نہیں آسکتے لیکن دہرہ دون میں مجھے بالکل اتفاقی طور پر اس
سے سابقہ پڑ گیا۔ ہمارے جیل کے افسروں میں سے ایک صاحب اپنے ساتھ
ایک کتیا لے آئے۔ جب ان کی تبدیلی ہو گئی تو انھوں نے اسے وہیں چھوڑ
دیا۔ اس پر یہ کتیا ادھر ادھر ماری ماری پھرنے لگی۔ کبھی موریوں میں پڑی رہتی
اور کبھی محافظین جیل کے یہاں سے اسے چند ٹکڑے مل جاتے۔ لیکن زیادہ تر

اسے بھوکا ہی رہنا پڑتا۔ چونکہ میں قید خانے کے باہر حوالات میں رہتا تھا اس لئے کبھی کبھی یہ کتیا خوراک کی تلاش میں میرے پاس بھی آ نکلتی۔ میں نے اسے باقاعدہ کھانا پلانا شروع کیا۔ کچھ دن گذر گئے تو اس نے ایک نالی میں سات بچے دیئے۔ جن میں سے اکثر لوگ اٹھالے گئے۔ مگر تین بچ گئے۔ ان کی خوراک کا اہتمام میرے ذمہ تھا۔ مگر ایک مرتبہ جب ان میں سے ایک پلا بہت زیادہ بیمار ہو گیا تو مجھے اس کی وجہ سے بہت زیادہ تکلیف اٹھانی پڑی۔ بعض اوقات مجھے رات کو بار بار اٹھنا پڑتا تاکہ اس کی نگہداشت کر سکوں جب یہ پلا بچ گیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میری تیمارداری رائگاں نہیں گئی۔

جیل سے باہر مجھے کبھی جانوروں سے اتنا سابقہ نہیں پڑا جتنا جیل کے اندر۔ یہ صحیح ہے کہ کتوں کا مجھے ہمیشہ شوق رہا ہے اور میں نے کئی بار ان کو پالا بھی۔ لیکن اپنے دوسرے مشاغل کی وجہ سے کبھی پوری طرح ان کی دیکھ بھال نہیں کر سکا۔ قید خانے میں میں کتوں کی رفاقت سے خوش تھا۔ عام طور سے ہم ہندوستانی جانوروں کو پیار سے نہیں پالتے اور عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اہنسا کے تمام فلسفہ کے ان سے اکثر لاپرواہی بلکہ سختی کا سلوک کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گائے ہی کو لے لیجئے۔ ہندوؤں کو یہ جانور کس قدر محبوب ہے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کیا پرستش تک کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے لئے بلوے بھی ہو جاتے ہیں۔ با ایں ہمہ گائے سے کچھ بہت اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کے ساتھ شفقت کا ہونا ضروری نہیں۔

مختلف ممالک نے مختلف قسم کے جانوروں کو اپنے مقاصد یا سیرت کے اظہار کے لئے علامت کے طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ

اور جرمنی نے عقاب، انگلستان نے شیر اور بل ڈاگ اور فرانس نے
لڑتا ہوا مرغا، قدیم روس کا نشان ریچھ تھا۔ کیا جانوروں کو قومی نشان
بنانے سے قوموں کی سیرت پر کچھ اثر پڑتا ہے؟ ان میں سے اکثر لڑنے
والے جانور بلکہ درندے ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جن قوموں نے
اس قسم کی مثالوں کو سامنے رکھ کر نشوونما پائی ہے۔ انھوں نے خود بھی [illegible]
اسی قسم کی عادات و خصائل اختیار کر لئے ہیں وہ دوسروں پر جھپٹتے، غراتے
ہیں اور موقع پاکر دبوچ لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہندوؤں کے دل میں حلم
اور عدم تشدد کا غلبہ ہے تو اس پر بھی کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ان
کا قومی نشان گائے ہے۔

جدّوجہد

جیل سے باہر جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور ہمارے بہادر مرد اور
عورتیں پرامن طریقہ سے ایک مسوّدا یعنی مستحکم حکومت کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ گو
انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اس وقت یا مستقبل قریب میں انکی کامیابی
ناممکن ہے دوسری جانب حکومت کے مسلسل اور ہر لحظہ بڑھتے ہوئے تشدد سے
یہ حقیقت آشکارا ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں ان کی ناکس حیثیت پر قایم ہو
ہمیں کم سے کم اس خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ اس کا پردہ ریا چاک ہو گیا۔
بالآخر سنگینوں کو فتح ہوئی لیکن ایک بہت بڑے جنگ جو کا قول ہے کہ
سنگینوں سے اور کام لے سکتے ہیں مگر ان پر بیٹھ نہیں سکتے" ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا
اس طرح محکوم رہنا زیادہ اچھا ہے بجائے اس کے کہ ہم اپنے ضمیر کو بیچ ڈالیں
اور روحانی اعتبار سے دب جائیں قید خانوں میں اگرچہ ہمارے جسم بالکل بے
بس تھے مگر ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم یہاں بھی اپنا کام کر رہے ہیں بلکہ شاید ان
لوگوں سے بہتر کر رہے ہیں جو جیل سے باہر ہیں۔۔ اگر ہم کر دیں مگر یہ بات
کہاں تک ٹھیک ہے کہ ہم اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہندوستان کا مستقبل
قربان کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی قوتیں اور اس کی طاقت محدود
ہے اور ہمارے بہت سے ساتھی معذور ہو گئے یا مر گئے بعض نے علیحدگی اختیار کر لی
اور بعض نے ہمارے ساتھ غداری کی پھر بھی ہماری جد و جہد کا سلسلہ جاری رہا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنے مقصد کو فراموش نہ کرے اور اپنی ہمت کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھے تو اس کے لئے ناکامی کا کوئی امکان نہیں حقیقی ناکامی یہ ہے کہ ہم اپنے اصولوں کو ترک کر دیں یعنی اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں اور ظلم کے آگے ذلت سے سر جھکا دیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اپنوں کے لگائے ہوئے زخم دشمن کے لگائے ہوئے زخموں سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔

اسی کمزوری اور حالات کی ناساعدت کو دیکھ کر اکثر طبیعت افسردہ ہو جاتی تھی مگر اس کے باوجود ہمیں اپنی کامیابی پر فخر تھا کیونکہ ہماری قوم نے واقعی بڑی بہادری سے کام لیا تھا اور ہمیں یہ محسوس کر کے خوشی ہوتی تھی کہ ہم ایک صحیح اور باہمت جماعت کے فرد ہیں۔

سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں دو مرتبہ یہ کوشش کی گئی کہ کانگریس کا عام اجلاس منعقد کیا جائے۔ ایک مرتبہ دہلی میں اور دوسری مرتبہ کلکتہ میں ظاہر تھا کہ ایک خلاف قانون جماعت اس زمانہ میں اپنا اجلاس کس طرح منعقد کر سکتی ہے جب کبھی ایسا ہوتا پولیس سے اس کا تصادم ضروری تھا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان جلسوں کو پولیس ہمیشہ لاٹھیوں کے زور سے منتشر کرتی رہی اور بہت سے لوگوں کو گرفتار بھی کیا۔ لیکن یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان غیر قانونی اجتماعات میں سینکڑوں نمائندے ہندوستان کے ہر حصے سے آئے اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ صوبجات متحدہ کا حصہ ان میں بہت نمایاں تھا مارچ ۱۹۳۳ء کے آخر میں جب اجلاس کلکتہ کی نوبت آئی تو میری ماں نے بھی اس میں شرکت پر اصرار کیا۔ مگر پنڈت مالویہ اور ان کے رفقاء کی طرح وہ بھی گرفتار ہو گئیں۔ اور انہیں بھی کلکتہ جاتے ہوئے چند دن آسنسول کی جیل میں گزارنا پڑے۔ اس موقع پر انہوں نے جس ہمت اور قوت کا اظہار

جدّ و جہد

جیل سے باہر جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور ہمارے بہادر مرد اور
عورتیں پرامن طریقہ سے ایک منضبط اور مستحکم حکومت کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ گو
انھیں اس بات کا یقین تھا کہ اس وقت یا مستقبل قریب میں ان کی کامیابی
ناممکن ہے دوسری جانب حکومت کے مسلسل اور ہر لحظہ بڑھتے ہوئے تشدد سے
یہ حقیقت آشکارا ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں ان کی ساکھ جبر پر قائم ہے
ہمیں کچھ کم اس خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ اس کا پردہ یوں چاک ہو گیا۔
بالآخر سنگینوں کو فتح ہوئی۔ لیکن ایک بہت بڑے جنگ جو کا قول ہے کہ
"سنگینوں سے اور کام لے سکتے ہیں مگر ان پر بیٹھ نہیں سکتے" ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا
اس طرح محکوم رہنا زیادہ اچھا ہے بجائے اس کے کہ ہم اپنے ضمیر کو بیچ ڈالیں
اور روحانی اعتبار سے فنا ہو جائیں۔ قید خانوں میں اگرچہ ہمارے جسم بالکل بے
بس تھے مگر ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم یہاں بھی اپنا کام کر رہے ہیں بلکہ شاید ان
لوگوں سے بہتر کر رہے ہیں جو جیل سے باہر ہیں۔ تاکہ ہم کر دیں مگر یہ بات
کہاں تک ٹھیک ہے کہ ہم اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہندوستان کا مستقبل
قربان کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی قوتیں اور اس کی طاقت محدود
ہے اور ہمارے بہت سے ساتھی معذور ہو گئے یا مر گئے بعض نے علیحدگی اختیار کر لی
اور بعض نے ہمارے ساتھ غداری کی۔ پھر بھی ہماری جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنے مقصد کو فراموش نہ کرے اور اپنی ہمت و وفا کے ساتھ قائم رکھے تو اس کے لئے ناکامی کا کوئی امکان نہیں حقیقی ناکامی یہ ہے کہ ہم اپنے اصولوں کو ترک کر دیں یعنی اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں اور ظلم کے آگے ذلت سے سر جھکا دیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اپنوں کے لگائے ہوئے زخم دشمن کے لگائے ہوئے زخموں سے دیر میں بھرتے ہیں۔

اسی کمزوری اور حالات کی ناسازگاری کو دیکھ کر اکثر طبیعت افسردہ ہو جاتی تھی مگر اس کے باوجود ہمیں اپنی کامیابی پر فخر تھا کیونکہ ہماری قوم نے دائمی بڑی بہادری سے کام لیا تھا اور ہمیں یہ محسوس کر کے خوشی ہوتی تھی کہ ہم ایک شجاع اور باہمت جماعت کے فرد ہیں۔

سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں دو مرتبہ یہ کوشش کی گئی کہ کانگریس کا عام اجلاس منعقد کیا جائے۔ ایک مرتبہ دہلی میں اور دوسری مرتبہ کلکتہ میں ظاہر تھا کہ ایک خلاف قانون جماعت امن وامان سے اپنا اجلاس کس طرح منعقد کر سکتی ہے جب کبھی ایسا ہوتا پولیس سے اس کا تصادم ضروری تھا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان جلسوں کو پولیس ہمیشہ لاٹھیوں کے زور سے منتشر کرتی رہی اس نے بہت سے لوگوں کو گرفتار بھی کیا۔ لیکن یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان غیر قانونی اجتماعات میں سینکڑوں نمائندے ہندوستان کے ہر حصے سے آئے اور مجھے یہ سن کر حیرت ہوتی تھی کہ صوبجات متحدہ کا حصہ ان میں بہت نمایاں تھا مارچ ۱۹۳۳ء کے آخر میں جب اجلاس کلکتہ کی نوبت آئی تو میری ماں جی نے بھی اس میں شرکت پر اصرار کیا۔ مگر پنڈت مالویہ اور ان کے رفقاء کی طرح وہ بھی گرفتار ہو گئیں۔ اور انھیں بھی کلکتہ جاتے ہوئے چند دن آسنسول کی جیل میں گذارنا پڑے۔ اس موقع پر انھوں نے جس ہمت اور قوت کا اظہار

کیا اس پر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ وہ کمزور تھیں اور بیمار بھی لیکن وہ قید خانے
سے نہیں ڈرتی تھیں اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ سخت مصیبتیں برداشت
کر چکی تھیں۔ جس ماں کا بیٹا، دونوں بیٹیاں اور بہت سے عزیز جن کو وہ دل
سے چاہتی تھیں زیادہ تر جیل میں رہتے اسے خالی گھر سے وحشت نہ ہوتی
تو اور کیا ہوتا

جب ہماری جدوجہد دھیمی پڑ گئی اور اس نے ایک خاص رفتار
اختیار کر لی تو اس میں وہ جوش و خروش بھی نہیں رہا البتہ بیچ میں کبھی کبھی لوگ
بھڑک اٹھتے تھے اس زمانہ میں میرے خیالات زیادہ تر دوسرے ملکوں کی سیر
کیا کرتے تھے جہاں تک ممکن تھا میں نے جیل کے اندر اپنا وقت اس کی دنیا کی
کے مطالعہ میں گزارا خود دنیا پر بحالی ہوئی تھی اس بحث کے متعلق مجھے جو کتابیں
بھی ملیں میں نے انہیں پڑھ ڈالا اور جوں جوں مجھے زیادہ کتابیں دستیاب ہوتی
گئیں میری دلچسپی بھی بڑھتی گئی معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان اور اس کے تمام
مسائل اور جدوجہد اس زبردست ناٹک کا ایک جز ہے جو سیاسی اور
معاشی قوتوں کی کشمکش کی شکل میں دنیا بھر میں قومی اور بین الاقوامی اسٹیج
پر کھیلا جا رہا ہے۔ اس جدوجہد میں ہماری ہمدردی کا رخ روز بروز اشتراکیت
کی طرف ہوتا گیا۔

اشتراکیت اور اشتمالیت بہت دنوں سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں
اور روس کا میرے دل پر خاص اثر تھا یہ صحیح ہے کہ میں اس ملک کی اکثر باتوں
کو ناپسند کرتا تھا۔ مثلاً مخالف رائے کا بے رحمی سے دبا دینا مزدوروں کی
جبری تنظیم اور مختلف کارروائیوں میں تشدد سے کام لینا۔ جو میرے نزدیک
غیر ضروری تھا۔ لیکن سرمایہ داروں کی دنیا میں بھی تو جبر و تشدد کی کمی نہیں

غرض مجھے روز بروز یقین ہوتا گیا کہ ہماری حریص سماج اور ہماری ملکیت کی بنیاد ہی تشدد پر قائم ہے۔ اور بغیر تشدد کے اس کا زیادہ دن چلنا محال ہے اگر عام لوگوں کی یہی حالت رہی کہ بھوک اور فاقے کا ڈر انھیں چند آدمیوں کا حکم ماننے پر مجبور کرے اور ان کی فلاح و عظمت کا باعث ہو تو تھوڑی سی سیاسی آزادی لے کر کیا کرنا ہے۔

تشدد سے دراصل کوئی بھی خالی نہیں۔ لیکن سرمایہ داری نظام کا تو چھپا ہی تشدد سے سابقہ ہے۔ برخلاف اس کے روس کا تشدد بجائے خود کچھ بہت اچھی چیز نہیں۔ پھر بھی اس کا مقصد ایک جدید نظام قائم کرنا ہے جو صحیح تحریک اور جمہور کی حقیقی آزادی پر مبنی ہے۔ باوجود اپنی غلطیوں کے سوویٹ روس نے غیر معمولی مشکلات پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ اور ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس جدید نظام کی اساس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ جب تمام عالم میں کساد بازاری کا زور تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح ہر شخص کا قدم پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا سوویٹ روس میں ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی تھی۔ اس کی تشکیل لینن اعظم جیسے عظیم انسان کی قیادت میں مسلسل بڑھتی۔ اور وہ صرف یہی دیکھتا تھا کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے برعکس اس کے دوسرے ممالک ماضی کے ادبار رفتہ ہاتھوں میں دب کر اپنی قوتیں زائل کر چکے تھے۔ اور ان کی ساری کوشش یہ تھی کہ گزرے ہوئے عہد کے آثار کو محفوظ رکھیں۔ وسطی ایشیا کے پسماندہ ممالک نے سوویٹ حکومت کے ماتحت جو زبردست ترقی کی ہے اس کی روداد نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ لہٰذا ان دونوں مظاہر کا مقابلہ کرتے ہوئے بالآخر مجھے روس کے ساتھ اتفاق کرنا پڑا جو اس تاریک اور سنسان عالم میں میرے سامنے ایک روشن اور حوصلہ افزا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

لیکن اگرچہ سوویٹ روس کی کامیابی یا ناکامی ایک اشتمالی ریاست قائم کرنے کے عملی تجربے کی حیثیت سے بے حد اہم ہے۔ مگر نظریۂ اشتمالیت کی صحت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ممکن ہے بالشویک ایسی غلطیوں یا بعض قومی یا بین الاقوامی وجوہ کی بناء پر ناکام رہیں اور پھر بھی اشتمالیت کا نظریہ بالکل صحیح ہو خود اس نظریہ کی رو سے دوسروں کے لئے ہر بات میں اندھا دھند روس کی تقلید کرنا حماقت ہے۔ اس لئے کہ روس نے اشتمالیت کو جس طریق پر استعمال کیا ہے اس کا انحصار اس ملک کے مخصوص حالات اور تاریخی نشوونما پر ہے اور پھر ہندوستان اور دوسرے ممالک کو یہ موقع حاصل ہے کہ بالشویک روس کی غلطیوں سے بھی اتنا ہی فائدہ اٹھائیں جتنا اس کی کامیابیوں سے۔ والئ بالشویکوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ اپنا قدم نہایت تیزی کے ساتھ آگے بڑھائیں ان کے اردگرد دشمنوں کا زغم تھا اور وہ بیرونی حملہ آوروں سے ڈرتے تھے اگر ان کی رفتار اس قدر تیز نہ ہوتی تو شاید وہ اس مصیبت سے جو دیہاتی طاقتوں کو اٹھانی پڑی بچ سکتے تھے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ تبدیلی کی رفتار کم رکھنے سے انقلاب ممکن بھی تھا یا نہیں ایسی نازک صورت حال میں جب ایک نظام میں بنیادی تبدیلی کرنی تھی جزوی اصلاحات سے کام نہیں چل سکتا تھا چاہے آگے چل کر ترقی کی رفتار کتنی ہی سست کیوں نہ ہو پہلا قدم یہی ہونا چاہئے تھا کہ موجودہ نظام کا خاتمہ کر دیا جائے۔ جو اپنا کام پورا کر چکا تھا۔ اور آئندہ ترقی کی راہ میں حائل تھا۔

ہندوستان میں زمین اور صنعت کے مسائل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ بلکہ تمام کا حل صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ایک انقلابی لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ مسٹر لائیڈ جارج اپنی تصنیف "جنگ کی یادداشت" میں لکھتے

ہیں "اس سے بڑی غلطی اور کیا ہوگی کہ ہم ایک کہانی کو دو حصوں میں غور کرنے کی کوشش کریں گے"

مجھے اِس سے بحث نہیں مگر مارکسیت کے نظریے اور اس کے فلسفے نے میرے ذہن کے بہت سے تاریک گوشوں کو منور کر دیا۔ اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے مارکسی تعبیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا۔ اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ ایک ڈرامہ ہے جو گویا تاریخ کھیلا جا رہا ہے۔ اور اس کی تہ میں ایک مقصد اور نظام موجود ہے۔ خواہ وہ غیر شعوری کیوں نہ ہو۔ ماضی اور حال کی دل ہلا دینے والی تباہی اور بربادی کے باوجود مستقبل میں ہزارہا خطروں کے ساتھ امید کی روشنی جلوہ گر ہے مارکسیت کا جو پہلو مجھے خاص طور سے پسند آیا وہ اس کا علمی طرز خیال اور اذعانی عقیدے سے قطعاً آزاد ہونا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ روس اور بعض دوسرے مقامات میں سرکاری اسالیب میں اذعانیت کا زور ہے اور جو لوگ ان اسالیب کے منکر ہیں ان پر تشدد کیا جاتا ہے۔ یہ امر یقیناً افسوسناک ہے مگر سوویٹ ممالک میں جہاں زبردست تغیرات نہایت تیزی کے ساتھ رونما ہوئے ہیں اور اندرونی مخالفت کے قوی ہو جانے سے ہولناک ناکامی کا اندیشہ تھا اس تشدد کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی عظیم الشان کساد بازاری اور نازک حالات سے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے جو مارکسیت نے تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ جب اور تمام نظام اور نظریے اندھیرے میں بھٹک رہے تھے یہی ایک اصول تھا جس نے کم و بیش صحت کے ساتھ ان مشکلات کی توضیح کی اور ان کا حقیقی حل پیش کیا

جوں جوں مجھے اس بات کا یقین ہوتا گیا میں نے اپنے دل میں ایک یا
جوش محسوس کرنا شروع کیا۔ قانون شکنی کی تحریک کے ناکام رہنے سے جو ابتری
پیدا ہو رہی تھی لمحہ بلمحہ کم ہوتی گئی مجھے یہ نظر آنے لگا کہ دنیا نہایت تیزی
کے ساتھ منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا
راستہ جنگ کے زبردست خطرات اور مصائب و آفات سے پُر ہے۔ لیکن
بہرحال ہم اس راستے کو طے کر رہے ہیں۔ ہم میں جمود ہرگز نہیں ہے۔ قومی تحریک
نے میری نظر میں اس دور دراز سفر کے ایک مرحلے کی صورت اختیار کر لی۔
میں نے اسے بہت غنیمت سمجھا کہ حرکت دے ہماری قوم کو آنے والی
کشمکش کے لئے تیار کر دیا۔ اور اس پر مجبور کر دیا کہ جو نئے خیالات اس وقت
دنیا کو ہلا رہے ہیں ان پر غور کرے۔ جوں جوں ہمارے گرد و عناصر ہم سے
دور ہوں گے ہم زیادہ مضبوط، زیادہ منضبط اور زیادہ پختہ ہوتے جائیں
گے وقت ہماری مدد کر رہا ہے

یہی وجہ تھی کہ میں نے روس، جرمنی، انگلستان، جاپان، امریکہ،
فرانس، چین، سپین، اٹلی اور وسط یورپ کے واقعات کا زیادہ احتیاط
سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور کوشش کرتا رہا کہ موجودہ حالات کی
الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا سکوں۔ مجھے ان کوششوں سے بے حد دلچسپی تھی جو آنے
والے خطرناک دور کو روکنے کے لئے ہر ملک انفرادی طور پر یا دوسروں کے ساتھ مل کر
کر رہا تھا۔ بین الاقوامی کانفرنسوں کی ان مسلسل ناکامیوں سے جو سیاسی اور معاشی
[illegible] کی امداد کے لئے اور مختلف اختلافات کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے منعقد
کی جاتی تھیں مجھے [illegible] تھا جو ایسے ملک میں [illegible]
[illegible] اور [illegible] اور یکجہتی سے ہم اس مسئلہ کو [illegible]

حل نہیں کر سکے۔ اسی طرح جیسے اس عالمگیر یقین کے باوجود کہ ان کی ناکامی تمام دنیا کے لئے ایک خوفناک حادثہ کا باعث ہوگی۔ یورپ اور امریکہ کے مدبرین ایک دوسرے سے اتفاق رائے نہیں کر سکے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں جس طریقے سے معاملہ کو طے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ غلط ہے اور صحیح طریقہ اختیار کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی۔

دنیا کے مصائب اور نزاعات پر اس طرح غور کرتے کرتے میں اپنی ذاتی اور قومی حیثیتوں کو بھول گیا۔ بعض اوقات مجھے بڑی مسرت ہوتی تھی کہ تاریخ عالم کے اس نہایت ہی اہم انقلابی دور کا میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ دنیا کے اس گوشے میں آنے والے زبردست تغیرات میں میرا بھی کچھ حصہ ہو کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جنگ اور تشدد کی فضا کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ جاتا۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور یاس انگیز منظر تھا کہ بعض اچھے خاصے ذہین اور سمجھ دار آدمی حکومیت و غلامی اور پستی اخلاق کے اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ ان کے دل میں انسان کے اخلاص، اس کا دکھ درد اور مظلومیت سے بیزاری کا جذبہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا اس دم گھٹنے والی فضا میں ہر طرف سوقیانہ شور و غل اور منظم فریب کار دہشت۔ اور نیک لوگ خارجیت میں ہٹلر اور مسٹر کے لئے "چھوٹے چھوٹے" کی کامیابیوں سے مجھے بے حد قلق ہوا۔ لیکن اس خیال سے اپنے دل کو تسکین دی کہ یہ زیادہ دل چلنے والی جنس بعض ۔ پھر بھی احساس ہوا تھا کہ انسان کی سعی اور کوشش مائل بے سود [illegible] کہ قدرت کی تیس اندھا دھند اپنا کام کر رہی ہے اور اس میں ایک [illegible] چھوٹے سے پرزے [illegible] کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس نہم [illegible] ۱۶ [illegible] تیسرے میرے لئے تکلیف دہ نظر [illegible] کا

باعث تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ہندوستان میں اس پر کیوں کر عمل کیا جائے
ابھی تو ہم نے سیاسی آزادی کا مسئلہ ہی حل نہیں کیا۔ ہمارے دلوں پر قوم
پرستانہ نصب العین کا تسلط ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم معاشی آزادی کی کوشش
بھی اسی وقت شروع کر دیں یا سیاسی آزادی کے بعد اس کی طرف
توجہ کریں لیکن ہندوستان اور ہندوستان کے باہر جو واقعات رونما
ہوئے ہیں ان سے قدرتاً سماجی مسئلہ روز بروز ہمارے سامنے آتا گیا اور یہ
ظاہر ہو گیا کہ ہم اپنی سیاسی آزادی کے مسئلہ کو اس سے الگ نہیں کر سکتے
برطانوی حکومت نے جو پالیسی ہندوستان میں اختیار کی
اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رجعت پسند طبقے سماجی آزادی کی تحریک کے
خلاف برابر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ ایک ناگزیر امر تھا۔ مجھے اس
سے خوشی ہوئی کہ ہندوستان کے مختلف طبقوں اور جماعتوں کے دائرے
وضاحت کے ساتھ متعین ہو گئے۔ لیکن کیا دوسرے لوگوں کو بھی اس کا
احساس ہوا؟ بظاہر بہت کم لوگوں کو۔ یہ سچ ہے کہ چند بڑے بڑے شہروں
میں سطحی طرز کے کمیونسٹ تھے جو قومی تحریک کے مخالف تھے اور
اس پر شدت سے تنقید کرتے تھے، خصوصاً بمبئی اور ایک حد تک
کلکتے کے مزدوروں کی منظم تحریک ایک معنی میں اشتراکی تحریک
تھی۔ لیکن وہ کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی اور اسے کساد بازاری
سے بہت نقصان پہنچا تھا۔ درمیانی طبقے میں یہاں تک کہ حکومت کے بہت
افسروں میں بھی کچھ دھندلے سے اشتراکی اور اشتمالی خیالات پھیلنے لگے
تھے۔ نوجوان کانگریسی جو جمہوریت پر رسائل، مارکس، لینن اور مارکس کی تصانیف پڑھتے
تھے ان میں اکثر اشتراکیت، اجتماعیت اور روس پر کتابیں ملتی تھیں تو انہیں بھی پڑھ ڈالتے تھے تاکہ ...

نے لوگوں کے ذہن کو بڑی حد تک ان نئے خیالات کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور دنیا کی نازک صورتِ حال نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ اس بحث پر غور کریں اس طرح تحقیق اور تنقید اور موجودہ نظام کی مخالفت کی فضا پیدا ہو گئی۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ اب ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ تاہم یہ تحریک نہایت کمزور اور ڈانواں ڈول تھی بعض لوگ اشتراکی خیالات کی حمایت کر رہے تھے۔ غرض اشتراکیت کا کوئی صاف اور واضح تصور لوگوں کے ذہن میں نہیں تھا اور وہ ابھی تک قومیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

میں اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی ہمارے لئے قومیت کا تخیل ہی سب سے بڑا محرکِ عمل ہوگا اگر کانگریس اب تک ہندوستان کی سب سے زیادہ مضبوط اور ترقی پسند جماعت ہے (بعض دوسری جماعتوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) تو اس کی وجہ یہی ہے کہ پچھلے تیرہ برس سے اس نے گاندھی جی کی زیرِ قیادت اسی اوسط طبقے کے شہریوں کی ذہنیت کے باوجود ایک غیر معمولی بیداری پیدا کر دی ہے جس نے انقلابی مقاصد کو بڑی مدد دی۔ اس کا وجود ابھی تک کار آمد ہے اور آئیندہ بھی ہے گا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قومیت کے جذبہ کی جگہ سماجی انقلاب کا جذبہ پیدا ہو جائے اس لئے ہماری امید ترقی اصول اور عمل دونوں کے لحاظ سے کانگریس سے وابستہ ہے۔ اگرچہ ہم دوسرے ذرائع سے بھی کام لے سکتے ہیں۔

چنانچہ میرے نزدیک کانگریس سے قطع تعلق کرنا گویا قومی مدگی کی رَو سے الگ ہونا اور اپنے سب سے قوی حربے کو کھو دینا ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ ہم اپنی قوتوں کو بیکار تجربات میں ضائع کر دیں لیکن سوال

یہ ہے کہ کیا کانگریس اپنی موجودہ شکل میں کبھی ایسا کر سکے گی کہ ہمارے سماجی
نظام کو بنیادی طور پر بدل ڈالے۔ اگر اس قسم کا کوئی مسئلہ اس کے سامنے
پیش کیا جاتا تو یقین ہے کہ اس کے دو یا دو سے زیادہ ٹکڑے ہو جاتے اور
اگر یہ نہ ہوتا تو اس کے بہت سے اجزا اس سے الگ ہو جاتے۔ اگر اس
سے ہر جماعت کے مقاصد بالکل صاف ہو جاتے اور ایک اچھی منظم پارٹی
خواہ اسے کانگریس میں اکثریت حاصل ہوتی یا اقلیت انقلابی سماجی پروگرام کی
حمایت کرتی تو یہ صورت کچھ ایسی بری نہ تھی۔

لیکن اس وقت کانگریس اور گاندھی جی ایک چیز تھے۔ سوال یہ
تھا کہ گاندھی جی کیا کریں گے۔ اصول اور نظریات کے لحاظ سے وہ بعض
اوقات اس قدر پیچھے رہ جاتے ہیں کہ انسان کو تعجب ہوتا ہے لیکن جہاں تک
عمل کا تعلق ہے وہ بحالت موجودہ ہندوستان کے سب سے بڑے انقلاب
پسند ہیں۔ انھوں نے ایک عجیب و غریب شخصیت پائی ہے۔ انھیں
عام پیمانوں سے ناپنا یا معمولی منطقی اصول سے جانچنا ناممکن ہے۔ مگر چونکہ وہ
فطرتاً انقلاب پسند ہیں اور ہندوستان کی سیاسی آزادی کے حصول کا بیڑا
اٹھا چکے ہیں اس لئے جب تک یہ آزادی حاصل نہ ہو جائے وہ یقیناً انتہا پسندانہ
طرز عمل اختیار کریں گے۔ اس دوران میں وہ عام لوگوں میں زبردست قوتیں
کو بیدار کریں گے اور مجھے تو تھوڑی سی امید ہے کہ وہ خود بھی رفتہ رفتہ اشتراکیت
کی منزل کی طرف بڑھیں گے۔

ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اکثر اشتمالی سالہا سال سے
گاندھی جی اور کانگریس پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کر رہے ہیں اور کانگریس
کے لیڈروں پر بدترین الزامات لگاتے ہیں۔ نظری اعتبار سے دیکھئے تو

کانگریس کی ذہنیت کے متعلق ان کی بہت سی تنقیدیں بہت صحیح اور برمحل
تھیں جن کی آیندہ واقعات نے ایک حد تک تائید کی۔ اس کے علاوہ ہندوستان
کے عام سیاسی حالات کا تجزیہ جو بعض اشتمالی اس سے پہلے کر چکے تھے غیر معمولی
طور پر صحیح ثابت ہوا لیکن اصول اور کلیات کی بحث سے قطع نظر کر کے جب
تفصیلات کا اور کانگریس کی سرگرمیوں کا سوال آتا ہے تو اس پر انھیں بڑا
دھوکا ہوتا ہے ہندوستان میں اشتمالیوں کی قلیل تعداد اور بے اثری کا ایک
سبب یہی ہے کہ اشتمالیت کی اشاعت و تبلیغ اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کے
بجائے ان کا مشغلہ زیادہ تر دوسروں کی مذمت کرنا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ
اس کا ردعمل ان کے لئے کس قدر مضرت رساں ثابت ہو رہا ہے۔ انھوں نے
زیادہ تر مزدور حلقوں کو اپنی جولانیوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔ جہاں دو چار چلتے
ہوئے فقرے مزدوروں کو ان کی طرف کھینچ لاتے ہیں۔ لیکن پڑھے لکھے لوگوں کے
لئے محض چلتے ہوئے فقرے کافی نہیں۔ اشتمالی اس بات سے بے خبر ہیں کہ
اس وقت ہندوستان میں اوسط طبقہ سب سے بڑی انقلابی قوت کا مالک
ہے یہ صحیح ہے کہ کثیر اشتمالیوں کے اس طرز عمل کے باوجود بہت سے تعلیم یافتہ
لوگ اشتمالیت کی طرف کھنچ آئے ہیں مگر ان دونوں کے درمیان ابھی تک
ایک خلیج حائل ہے۔

اشتمالیوں کی رائے میں کانگریس کے لیڈروں کا مقصد رہا ہے کہ
حکومت پر عام لوگوں کا دباؤ ڈال کر ہندوستانی سرمایہ داروں اور زمینداروں
کے لئے صنعتی اور تجارتی فوائد حاصل کریں۔ کانگریس کا کام یہ ہے کہ ملک کے
نچلے اوسط طبقہ کے لوگوں اور صنعتی مزدوروں کی سیاسی اور معاشی بے چینی
کی قوت سے بمبئی، احمد آباد اور کلکتہ کے مالکان کارخانہ اور ساہوکاروں کی

گاڑی چلائے، گویا ہندوستانی سرمایہ دار پس پردہ بیٹھے کانگریس کی ورکنگ
کمیٹی کے نام حکم جاری کر دیتے ہیں کہ اول جمہور میں ایک تحریک اٹھائے اور جب
وہ بہت بڑھ جائے یا بہت خطرناک ہو جائے تو اسے دفعتاً ملتوی کر دے
یا اصل راستے سے ہٹا کر کسی اور طرف موڑ دے۔ کانگریسی رہنما نہیں
چاہتے کہ انگریز سچ مچ ہندوستان سے چلے جائیں۔ کیونکہ انہیں کی مدد سے
یہاں کی نادرست آزادی قابو میں رکھی جا سکتی ہے اور اس سے فائدہ
اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور ہندوستان کا وسطی طبقہ اسے اپنے بس کی
بات نہیں سمجھتا۔

یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ کانگریس کی سرگرمیوں کا خوب غور سے
تجزیہ کرنے اور پیش کیا ہے جس کا نتیجہ ہندوستانیوں کو دل سے یقین
ہے علامت کہ جب ان کے خیالات اس قسم کے ہوں تو انہیں ہندوستان
میں کیوں کر کامیابی ہو سکتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ ہندوستان
کی قومی تحریک کا مدار یورپ کی ہر تحریک کے سبب ست کرتے ہیں چونکہ
مغرب میں مزدوروں کے لیڈر انقلاب سے مدار کرتے ہیں وہ ان کا خیال
ہے کہ ہندوستان میں بھی یہی حال ہوگا۔ انہوں نے اس بات کو فراموش کر
رکھا ہے کہ ہندوستان کی قومی تحریک عوام اور مزدوروں کی تحریک نہیں یہ
مطلقاً بورژوا کی تحریک ہے۔ جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر
ہوتا ہے۔ اور اس کا مقصد محض سیاسی آزادی ہے۔ کہ سماجی نظام کی
تبدیلی پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ یہ مقصد بہت محدود ہے اور قومی تحریک
ایک فرسودہ چیز ہے۔ اس تحریک کی بنیاد کو سمجھ لینے کے بعد یہ کہنا بالکل بجا
ہے کہ اس کے رہنما عوام سے عاری کرتے ہیں کیونکہ وہ طرز زندگی یا اعداد

سرمایہ داری کو مدنے کی کوششیں میں کرتے۔ انھوں نے تو کبھی یہ دعویٰ ہی نہیں کیا۔ البتہ کانگریس میں بعض لوگ اس قسم کے ضرور موجود ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ جو سرمایہ اور زمین کے موجودہ نظام کو بالکل بدل دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک اپنے آپ کو کانگریس کا ترجمان نہیں کہہ سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی سرمایہ دار جماعتوں کو جن میں زمیندار اور تعلقہ دار شامل نہیں ہیں، برطانوی اور بدیسی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی کی ترویج سے بہت بڑا فائدہ پہنچا ہے اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ ہر قومی تحریک ملکی صنعتوں کی حمایت اور بدیسی چیزوں کے بائیکاٹ کا سبق دیتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ سول نافرمانی اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کے دوران میں بمبئی کے مالکان کارخانہ نے بطور ایک جماعت کے بہ حمارت کی لنکا شائر کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ کانگریس کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہمارے قومی مقاصد کے ساتھ بہت بڑی غداری تھی۔ اور اسے بجا طور پر غداری ہی سے تعبیر کیا گیا۔ بمبئی کے مالکان کارخانہ کے نمائندوں نے بھی جب ہم میں سے اکثر جیل میں تھے اسمبلی میں ہمیشہ کانگریسیوں اور "انتہا پسندوں" کا مضحکہ اڑایا۔

پچھلے چند سال سے سرمایہ دار طبقوں نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ کانگریس اور قوم سب کے نقطۂ نظر سے ہی سرناک ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ ممکن ہے کسی چھوٹی سی جماعت کو عارضی فائدہ پہنچا ہو۔ مگر بحیثیت مجموعی اس نے ہندوستان کی صنعت کو نقصان پہنچایا اور اسے برطانوی سرمایہ اور صنعت کا اور بھی محتاج کر دیا۔ یہ معاہدہ جو عام لوگوں کے لئے بے حد

معترض تھا اس وقت کیا گیا جب ہماری جد وجہد جاری تھی اور ہزاروں ہندوستانی
جیلوں میں بند تھے۔ نو آبادیوں نے جہاں تک ہو سکا انگلستان سے بہتر سے
بہتر شرائط حاصل کیں۔ لیکن ہندوستان کو جو کچھ حاصل ہے کہ اس نے
سب کچھ انگلستان کو بخش دیا بلکہ بعض مرتبے ساہوکاروں نے بھی حاکموں کو
کے کاروبار میں ہندوستان کے مفاد کو قربان کر کے خوب نفع کمایا۔

گول میز کانفرنس میں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار آپس میں مل کر
کانگریس کی مخالفت کرتے تھے۔ سول نافرمانی کے زمانے میں انھوں نے
کھلم کھلا جارحانہ حیثیت سے حکومت کا ساتھ دیا۔ ماضی کی امداد سے حکومت
نے تعزیراتی ضابطوں کی شکل میں جابرانہ قوانین منظور کرائے اور یو پی کونسل کے
زمیندار اراکین کی بہت بڑی اکثریت نے ان لوگوں کی رہائی کی مخالفت کی جو
سول نافرمانی کی تحریک میں قید ہوئے تھے۔

یہ خیال کر گاندھی جی نے سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۳۰ء میں محض جمہور کے دباؤ سے
دو تحریکیں جو ظاہر جارحانہ معلوم ہوتی تھیں شروع کیں سراسر غلط ہے۔ سچ
ہے کہ جمہور میں اکثر حرکت پیدا ہوتی رہی لیکن دونوں موقعوں پر جو کانگریس
نے اسے ایک بڑی تحریک کی شکل دی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں تو انھوں نے تن تنہا
کانگریس سے ترک موالات کی تحریک منظور کرائی اور سنہ ۱۹۳۰ء میں اگر وہ ذرا
سی بھی مخالفت کرتے تو ہم ہرگز حکومت کے خلاف کوئی مؤثر اور جارحانہ
طرز عمل اختیار نہ کر سکتے۔

یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ بعض اوقات محض جماعت یا ان کی قیمت
کی وحدت و اثبات پر زور دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ کی
طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ گاندھی جی کے خلوص نیت پر حملہ کرنا خود اپنی

ذات اور مقصد کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ہندوستان کے کروڑہا باشندوں کے نزدیک وہ حق و صداقت کا مجسمہ ہیں۔ اور جو شخص اُن سے ذرا بھی واقف ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس قدر جوش اور خلوص سے ہر موقع پر صحیح طرزِ عمل اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اشتراکیوں نے اسے آپ کو بڑے بڑے شہروں کے مزدوروں سے وابستہ کر رکھا ہے دیہاتی علاقوں سے انھیں واقفیت ہے اور نہ اُن سے کوئی تعلق ہے مگر ہندوستان کا مسئلہ اس وقت کسانوں کا مسئلہ ہے اس لیے صنعتی مزدوروں کو اگرچہ وہ بجائے خود بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور مستقبل میں ان کی اہمیت برابر بڑھتی جائے گی وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جو کسانوں کو حاصل ہے کانگریس کارکن اس وقت ہر جگہ دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ کانگریس کسانوں کی ایک جماعت بن جائے گی لیکن کسان جب اپنا پورا مقصد حاصل کر لیتا ہے تو بہت کم انقلاب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی کچھ دنوں کے لیے شہر اور دیہات اور مزدور اور کسان کے مابین کا مسئلہ چھڑ جائے۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ کانگریس کے لیڈروں اور کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد سے میرے تعلقات بہت گہرے رہے ہیں اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ان سے بہتر انسان نہیں مل سکتے پھر بھی میں نے ہر اہم معاملہ میں ان سے اختلاف کیا ہے اور بعض دفعہ مجھے اس بات پر کوفت بھی ہوئی ہے کہ بعض ایسی باتیں جو میری نظر میں بالکل عیاں اور واضح ہیں ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ذی عقل نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم نے فکر و نظر کی دنیا میں الگ الگ راہیں اختیار کر لی ہیں۔ میں

اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان سے نکلنا کس قدر مشکل اور دیر طلب ہے۔ یہ مختلف
فلسفۂ زندگی کے دائرے ہیں جن میں انسان تدریجاً غیر شعوری طور پر نشوونما
پاتا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کو جو ہم سے اختلاف خیال رکھتے ہیں، الزام دینا
بے کار ہے۔ اشتراکیت نام ہے زندگی اور اس کے مسائل کے ایک خاص
نظریے کا جس کا انحصار محض منطق پر نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے نظریے
بھی وراثت، تربیت، ماضی کی روایات اور موجودہ ماحول کے اثرات پر
مبنی ہیں۔ یہ قوت صرف زندگی اور اس کے تلخ تجربات میں ہے کہ وہ ہمیں
نئی راہوں پر چلائیں اور رفتہ رفتہ ہمارے خیالات کو بدل دیں۔ حواس سے
کہیں زیادہ مشکل ہے۔ شاید ہم اپنی ذاتی کوشش سے اس انقلاب میں
تھوڑی بہت مدد دے سکیں اور شاید "انسان جو راہیں اپنے مقصد سے ملنے
کے لیے اختیار کرے وہی اسے مقصد کی منزل تک پہنچا دیں"۔

(۴۶)

مذہب کیا ہے؟

ستمبر ۱۹۳۲ء کے وسط میں ہمارا جیل کا پرسکون اور یکساں روزمرہ معمول یکایک درہم برہم ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی گولا آکر پھٹا ہو۔ خبر آئی کہ گاندھی جی نے ان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر اظہار ناپسندیدگی کرنے کے لئے جو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے اپنے فرقہ وارانہ فیصلہ میں بیچ داتوں کے لئے تجویز کئے تھے اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ روزہ رکھ کر جان دے دیں گے اس شخص میں بھی لوگوں کو جھنجھوڑنے کی کیسی کچھ صلاحیت ہے؟ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ ہر قسم کے اتفاقات و احتمالات سامنے آئے اور میرا توازن ذہنی بالکل بگڑ گیا۔ دو دن تک بالکل تاریکی میں رہا۔ کوئی روشنی نہ تھی جو راہ دکھاتی۔ گاندھی جی کے فعل کے بعض نتائج کا خیال آتا تو دل بیٹھا جاتا تھا۔ معاملہ کا ذاتی پہلو بھی خاصا قوی تھا اور دل میں کس کس دکھ کے ساتھ یہ خیال آتا تھا کہ شاید اب انہیں نہ دیکھ سکوں گا۔ کوئی سال بھر ہوا تھا کہ انگلستان جاتے وقت انہیں جہاز پر دیکھا تھا۔ کیا یہی آخری دیدار ثابت ہونے کو تھا۔

پھر سخت الجھن ہوتی تھی کہ انہوں نے اپنی آخری قربانی کے لئے ایک ضمنی مسئلہ کو کیوں چنا۔ محض حلقہ ہائے انتخاب کے معاملہ کو۔ اس کا اثر ہماری تحریک آزادی پر کیا ہوگا؟ کیا یہ نہ ہوگا کہ کم سے کم تھوڑے دن کے

نے اہم ترین مسائل پس پشت ڈال دیے گئے۔ اور اگر ان کا یہ مقصد حاصل ہو بھی گیا اور پنجاب کے حلقہ ہائے انتخاب اور ہندوؤں کے ساتھ مخلوط ہو بھی گئے تو کیا اس کا ردعمل یہ نہ ہوگا کہ لوگ سمجھنے لگیں گے کہ اچھا کچھ تو مل ہی گیا اور اب تھوڑے دنوں کچھ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کا یہ عمل فرقہ وارانہ فیصلہ کو اور اس کل تجویز کو جسے حکومت نے تھوپ رکھا ہے مان لینے اور جزوی طور پر قبول کرنے کی مترادف نہیں، اور کیا یہ بات ترک موالات اور سول نافرمانی کے اصولوں کے منافی ہے؟ اتنی قربانی اتنی تحاشا سعی کے بعد کیا ہماری تحریک ایک حقیر سی چیز ہو کر رہ جانے والی ہے۔

مجھے ان پر غصہ بھی آتا تھا کہ ایک سیاسی مسئلہ کو یوں مذہبی اور خدائی طریق پر حل کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں بار بار خدا کا ذکر کرتے ہیں معلوم تو ایسا ہوتا تھا کہ ان کے خیال میں خدا نے روزے کی تاریخ تک ان کے لئے مقرر کی ہے۔ لوگوں کے لئے یہ کیسی بری مثال قائم کر رہے ہیں۔ اور اگر باپو کہیں مر گئے؟ تو پھر ہندوستان کا کیا حال ہوگا؟ اس کی سیاست کس راہ پر چلے گی؟ سامنے تیرہ و تار مستقبل دکھائی دیتا تھا اور جب اس کا خیال آتا تو دل پر یاس و حرمان کا تسلط ہو جاتا۔

غرض یوں ہی سوچتا تھا اور سوچے جاتا تھا۔ دماغ میں انتشار تھا اور غصہ تھا اس اور اس شخص کی محبت جو اس ساری پریشانی کا باعث تھے میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی اور ہر ایک سے جھگڑتا تھا اور سب سے زیادہ خود اپنے سے۔

پھر ایک عجیب کیفیت گزری یوں سمجھئے کہ ایک جذباتی بحران سا ہوا

اور جب وہ ختم ہوا تو طبیعت میں کافی سکون محسوس ہوا اور مستقبل پھر تاریک
رہا۔ باپو میں ہمیشہ سے ایک عجیب صفت ہے کہ ٹھیک نفسیاتی موقع پر صحیح
بات کر گزرتے ہیں اس لئے خیال ہوا کہ شاید ان کا یہ فعل بھی جسے بہت سے
اعتبارات سے حق بجانب ثابت کرنا ممکن نہ تھا، بڑے نتائج کا باعث بن جائے
اور صرف اس تنگ میدان ہی میں نہیں جس سے اس کو واسطہ ہے بلکہ قومی
جدوجہد کے وسیع تر میدان میں بھی۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ اگر باپو مر بھی گئے
تو ہماری آزادی کی سعی تو بہر حال جاری رہے گی۔ اس لئے ہرچہ بادا باد
ہمیں تیار رہنا چاہئے اور اپنے کو اس کام کا اہل بنانا چاہئے۔ ایسے ذہن
کو جب یوں سیدھے گاندھی جی کی موت تک کے مقابلہ کے لئے تیار کر لیا
تب کہیں سکون اور جمعیت خاطر نصیب ہوئی اور میں پھر دنیا اور اس کے
ہنگامات سے نبٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔

اس کے بعد اس حیرت انگیز بیداری کی خبریں آئیں جو ہمارے ملک
میں پیدا ہوئی۔ اس جادو اثر جوش کی لہر کی جو ساری ہندو سماج میں دوڑ
گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ چھوت چھات بس اب ختم ہوئی۔ دل نے کہا کیسا
جادوگر ہے یہ چھوٹا سا آدمی جو یروڈا کے قید خانے میں بیٹھا ہے۔ یہ ان
تاروں کو کتنی اچھی طرح بجانا جانتا ہے جن سے دلوں کو جنبش دی جاتی ہے۔
ان کا ایک تار مجھے ملا۔ سزا یابی کے بعد یہ ان کا پہلا پیام تھا۔ اتنے
عرصے کے بعد پیام پا کر دل بہت خوش ہوا۔ اس تار میں انھوں نے
لکھا تھا "کرب کے ان تمام دنوں میں تم میرے ذہن کی آنکھ کے سامنے
رہے ہو۔ تمہاری رائے جاننے کا بڑا فکر ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری رائے
کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ اندو سے اور سروپ کے بچوں سے ملا تھا۔ اندو خوش و خرم

تھی۔ ذرا گوشت بھی آگیا ہے۔ میری حالت بہت اچھی ہے۔ تار سے
جواب دو۔ پیار"

بڑی پیاری بات تھی یہ پڑھ کر گاندھی جی کی یہی بات تھی کہ برت کی کلفت
میں اور اسی نے تمام مشغولیتوں میں بھی انہیں کا خیال رکھا کہ میری بچی اور میری
اس کے بچوں کے آنے کا ذکر کر دیا (مدرا مدرا کے موٹے ہو جانے تک کا
(میری بہن بھی اس زمانے میں قید میں تھیں) اور یہ سب کچھ بولنے کے ایک
دسمبر میں پڑھتے تھے۔ زندگی میں جو چیزیں یوں ذرا ذرا سی معلوم ہوتی
ہیں یہ در اصل بہت کچھ ہوتی ہیں۔ ہم انھیں کبھی نہیں بھولتے۔

اسی زمانے میں خبر ملی کہ حلقہائے انتخاب کے متعلق کچھ تصفیہ ہو گیا
جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے مہربانی سے مجھے گاندھی جی کے تار کا جواب دینے
کی اجازت دے دی اور میں نے تار بھیجا "آپ کے تار اور اس مختصر سی
اطلاع نے کہ تصفیہ ہو گیا دل کو خوشی اور اطمینان سے بھر دیا۔ برت کی خبر
سے پہلے تو سخت ذہنی کوفت اور انتشار پیدا ہوا۔ لیکن آخر میں امر شتی
نے فتح پائی اور مجھے ایسا گم شدہ اطمینان پھر سے مل گیا دبے ہوئے مظلوم
طبقوں کی خاطر جو قربانی بھی کی جائے کم ہے۔ آزادی کا معیار سب سے ادنیٰ
گروہ کی آزادی ہے۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں ان باتوں میں ہمارا مقصد چند
پس پشت پڑ جائے۔ مذہبی نقطہ نظر سے تو کوئی حکم میں لگا نہیں سکتا ڈر ہے
کہ کہیں آپ کے طریقوں کو دوسرے بے جا طور پر استعمال نہ کریں۔ لیکن
آپ جیسے جادوگر کو میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ پریم"

پونا میں جو ہر قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے انھوں نے ایک معاہدہ
پر دستخط کئے اور برطانوی وزیر اعظم نے غیر معمولی عجلت کے ساتھ اسے

قبول کرلیا اور اپنے سابقہ فیصلہ میں اس کے مطابق تبدیلی کر دی اور ورت
ٹوٹ گیا مجھے اپنے میثاق و معاہدے سے بہت ناپسند ہیں فرپونلکے معاہدے
کا اس کے معاہدے قطع نظر، میں نے دل سے خیر مقدم کیا۔
آخر یہ بہا ہی ختم ہوئی اور پھر وہی جیل کا روز مرہ معمول شروع ہوا۔
ہریجن تحریک کی اندر گاندھی جی جیل خانے سے جو کام کر رہے تھے اس کی
اطلاعیں پہنچتی تھیں۔ اور میرا دل ان سے کچھ بہت خوش رہتا تھا۔ اس
میں تو شک نہیں کہ چھوت چھات کو ختم کرنے اور نیچ ذاتوں کو ابھارنے کی
تحریک کو بڑی مدد پہنچی۔ لیکن اس عہد نامے سے اس قدر نہیں جتنی کہ اس
عام اور جوش سے جو تمام ملک کے اندر پیدا ہوگیا۔ اور یہ ایسی چیز تھی جس
کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔
مگر اس میں شک نہیں کہ سول نافرمانی کو نقصان پہنچا۔ ملک کا دھیان
دوسرے معاملوں کی طرف مڑ گیا اور کانگریس کے بہت سے کام کرنے والے
ہریجن تحریک کی طرف چلے گئے۔ غالباً ان میں سے بہتیرے اس بات کا بہانہ
ہی ڈھونڈھ رہے تھے کہ کوئی ذرا زیادہ محفوظ کام مل جائے جس میں جیل
جانے کا ڈر نہ ہو اور اس سے زیادہ لاٹھی کی مار اور املاک کی ضبطی کا
خطرہ نہ ہو۔ یہ بات ہے بھی فطری اور ایسے ہزارہا کارکنوں سے یہ توقع
رکھنا بھی بے جا ہے کہ وہ ہر وقت انتہائی تکلیف اٹھائے اور اپنے
گھربار کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے آمادہ رہیں گے۔ پھر بھی اس عظیم الشان
تحریک کے اس تدریجی انحطاط کو دیکھ دیکھ کر جی بہت کڑھتا تھا۔ مگر باوجود
اس کے سول نافرمانی ابھی تک جاری تھی اور کبھی کبھی نوبر ڈے بڑے مظاہرے
ہوتے رہتے تھے۔ جیسے مارچ اپریل ۱۹۳۳ء میں کلکتہ کانگریس کا مظاہرہ

گاندھی جی یروادا جیل میں تھے مگر ان کے ساتھ خاص رعایت یہ کر دی گئی تھی
کہ وہ لوگوں سے مل سکتے تھے اور ہریجن تحریک کے لئے ہدایات دے سکتے
تھے۔ کچھ ہوا اس سے اس ناگواری میں کمی ہو گئی جو ان کے قید میں ہونے کی وجہ
سے قوم میں تھی اس لئے ان سب باتوں سے طبیعت پست ہوتی تھی۔
مئی ۱۹۳۳ء کے شروع میں گاندھی جی نے اکیس دن کا برت
شروع کیا۔ اس کی اطلاع آئی تو بھی پہلے پہل تو صدمہ سا ہوا۔ مگر میں نے
اسے ایک ناگزیر حادثہ جان کر قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ اسے کو اس کا عادی
بنا لیا لیکن مجھے اس سے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ جب وہ برت رکھنا طے ہی
کر چکے اور اس کا اعلان بھی کر چکے تو لوگ کیوں خواہ مخواہ اس کے ترک
کرانے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ برت میری سمجھ میں تو آتا نہ تھا۔ اور اگر فیصلہ سے
پہلے مجھ سے رائے لی جاتی تو میں سختی سے اس کی مخالفت کرتا۔ مگر میں گاندھی جی
کے قول کی بڑی قدر کرتا ہوں اور مجھے یہ بات غلط معلوم ہوتی تھی کہ
ایک دانستہ شخصی معاملہ پر جو ان کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا کوئی
بھی ان سے اس قول کے تڑوانے کی کوشش کرے۔ اس لئے اس
برت پر ہر چند کہ بہت استادہ ناگوار ہی تھا۔
برت شروع کرنے سے چند روز پہلے انھوں نے مجھے ایک مخصوص
انداز میں ایک خط لکھا جس سے مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ انھوں نے جواب چاہا
تھا اس لئے میں نے تار بھیجا۔ آپ کا خط ملا جن باتوں کو میں سمجھتا ہی نہیں
ان کی بابت کیا کہہ سکتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پردیس میں بھٹک گیا ہوں
جہاں راہ اگر کوئی ہے تو بس آپ کی ذات۔ اندھیرے میں راہ ڈھونڈتا ہوں
اور ٹھوکریں کھاتا ہوں۔ جو کچھ بھی ہو میرا دھیان اور میری محبت آپ کے

ساتھ ہے"

"ایک طرف میں ان کے حل کو ناپسند کرتا تھا۔ دوسری طرف بہ نکر کر انھیں دکھ۔ دونوں اور ان دونوں میں کس کمش تھی میں نے سوچا کہ میں نے انھیں دل دہی کا کوئی پیام سن بھیجا اور اب کے وہ اس تکلیف کی آزمائش میں اسے کوڑالنے پڑتے ہی ہوتے ہیں جس میں ممکن ہے کہ رہ گئی ہے ست ہاتھ دھو بیٹھیں۔ میرا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کا دل بڑھاؤں ہمن کی زندگی میں ذرا ذراسی باتوں سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے اور اس مصیبت سے جانبر ہونے کے لئے انھیں اپنے اعصابی قوت کا تمام تر درکار ہوگا۔ یہ بھی مجھے محسوس ہوا کہ اب جو کچھ بھی ہو چاہے بدقسمتی سے ان کی موت ہی کیوں نہ واقع ہو بہت کو مضبوطی سے تھامنا چاہئے، چاہے جس نے خیں۔ تار بھیجا " اب کے آپ نے اپنی عظیم الشان مہم شروع ہی کر دی ہے میں اپنی محبت اور مبارک کا ہدیہ پھر پیش کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ اب مجھے بہت صاف محسوس ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہوگا وہ اچھا ہوگا اور جو بھی ہو جیت آپ کی ہے"

وہ اس برت سے جانبر ہوگئے۔ برت کے پہلے ہی دن انھیں جیل سے چھوڑ دیا گیا۔ اور ان کے مشورے سے چھ ہفتے کے لئے سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی۔

اس برت کے زمانے میں پھر میں نے اس جذباتی جوش کا نظارا اور بار بار سوچا کہ آیا سیاست میں یہ بھی کوئی صحیح طریقہ ہے یہ تو مری چیزوں کو نظر انداز کرنا ہے اور اس کے مقابلے میں وضاحت سے سوچنے مجھے کے لئے ذرا بھی تو موقع نہیں۔ سارا ہندوستان یا اس کا بہت بڑا

حسبِ ادب اور احترام سے مہاتما کا ذکر کیا ہے اور توقع کرتا ہے کہ وہ معجزے
بلا معجزہ دکھائیں چھوت چھات کو ختم کرادیں۔ سوراج حاصل کرادیں وغیرہ وغیرہ
اور خود کوئی کچھ نہیں کرتا اور گاندھی جی ہیں کہ دوسروں کو سوچنے سمجھنے کی
ہمت نہیں دلاتے۔ ان کا اصرار ہے بس خلوص اور قربانی پر۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ اپنی جذباتی وابستگی کے باوجود میں رفتہ رفتہ ذہنی طور پر ان سے
دور ہوتا جاتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر سیاسی کاموں میں ان کی جبلت سلیم
ان کی صحیح رہنمائی کرتی ہے عمل کا ولولہ بھی ہے لیکن کیا عقیدت مندی
کا راستہ ایک قوم کو تربیت دینے کا صحیح راستہ ہے؟ ممکن ہے کچھ دن
تو اس سے کام چلے، اگر پھر آگے؟

پھر ایک بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ موجودہ نظام معاشرت
کو کہ تشدد اور کشاکش پر مبنی ہے کس طرح قبول کرتے ہیں۔ اور معلوم نہیں کیا ہوتا
تھا کہ قبول کرتے ہیں۔ میرے سینے میں بھی کشاکش تھی اور میری وفاداریاں مجھے
مختلف سمتوں میں کھینچتی تھیں۔ جاتا تھا کہ تشدد کی غیر اختیاری آرڈیننس اور بہت
سے فتنوں کا سامنا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بالکل یکہ و تنہا ہوں اور
یکسر غریب الوطن۔ ہندوستان جسے اپنا دل دیا اور جس کے لیے جان لڑائی
ایک عجیب سا وحشت کدہ معلوم ہوتا تھا۔ سوچتا تھا کہ کہیں میرا ہی قصور تو
نہیں کہ میں اپنے ہم وطنوں کی ذہنیت اور طریق فکر کو نہیں اپنا سکتا؟ نہایت
قریب کے ساتھیوں کے متعلق بھی معلوم ہوتا کہ ان کے میرے درمیان ایک
عجیب روک ہے جسے دور کرنے میں ناکام رہتا تو ناشاد ہوتا اور پھر
اپنے ہی خول میں سمٹ رہتا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ مجھے چاروں طرف سے
پرانی دنیا گھیرے ہوئے ہے یعنی ماضی کے افکار اور امیدیں اور آرزوئیں

کی دنیا اور نئی دنیا ابھی بہت دور ہے۔ بقول شاعر" دو دنیاؤں کے درمیان
سرگرداں، ایک مردہ، دوسری پیدا ہونے کو مقدور قدرت میں۔ غرض کہیں
بھی سر دھرنے کا ٹھکانا نہ تھا۔"

کہتے ہیں کہ اور سب باتوں سے زیادہ ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے
ہندو، مسلمان، سکھ سب اپنے اپنے مذہب پر فخر کرتے ہیں اور ایک دوسرے
کا سر پھوڑ کر اس فخر کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس چیز کو ہم مذہب یا منظم مذہب کہتے
ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل بہت رنجور ہو
گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اکثر مٹا دینے کی آرزو ظاہر
کی ہے تقریباً ہمیشہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا،
بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ
اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے لئے! کا
حامی ہے۔ لیکن باوجود اس کے میں جانتا ہوں کہ اس میں اور کچھ بھی ہے
کوئی ایسی بات جس سے انسانوں کی ایک گہری احتیاج بھی پوری ہوتی ہے
ورنہ یہ ایسی زبردست قوت کیسے ہوتا جیسی کہ رہ چکا ہے، اور بے شمار،
بے تاب روحوں کی تسکین کا سامان کیسے کرتا؟ اس کا محتاج ہوا؟ اس
کا محض اندھے یقین اور بے سوالی کی بنا ہے؟ کیا وہ سکون سے جو
چٹان سے بندرگاہ میں پہنچ جانے اور کھلے سمندر کے طوفان کے بیچ جانے
پر حاصل ہوتا ہے؟ اس سے زیادہ کچھ اور؟ بعض صورتوں میں تو یقیناً
یہ کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

لیکن منظم مذہب کا ماضی کچھ بھی رہا ہو آج تو وہ زیادہ تر ایک خالی
شکل ہے جس میں حقیقت نام کو نہیں۔ مسٹر جی کے چسٹرٹن نے اس کی تمثال ایسے

اس میں شک نہیں کہ اس کے معتقدوں میں بہت سے لوگ ہمارے
اعلیٰ سیرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کلیسا نے
کس کس طرح برطانوی سامراج کی حسب منشا خدمت انجام دی ہے اور سرمایہ داری اور
سامراج دونوں کو ایک اخلاقی اور مذہبی لباس پہنایا ہے۔ اس نے اعلیٰ ترین
اخلاقی معیاروں سے ایشیا اور افریقہ میں برطانیہ کی غاصبانہ سیاست کو حق بجانب
ثابت کیا ہے اور انگریزوں کے اندر اس غیر معمولی اور قابل رشک احساس کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۲) میں بھی صداقت ہے انگریزی مشن کے ذریعے انہیں اس بات پر آمادہ کیا ہے
کہ دوسروں کو سمجھیں اور ان کی سیوا کریں، ہر چند خواہ مخواہ سیکٹ بنائیں اور حصوں سے اپنی تمام
اعلیٰ صلاحیتوں کو ہندوستان کی بے غرض خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اور یہی بہت سے
انگریز اہل کلیسا ہیں جن کی یاد ہندوستان میں زندہ رہے گی۔

کنٹربری کے لاٹ پادری صاحب نے ۱۲ دسمبر ۱۹۳۴ء کو دارالامراء میں تقریر کرتے
ہوئے ۱۸۱۲ء کے بانگ ہو بیشپ "ہیولی" صاحب کے تمہیدی کلمات کا ذکر کیا تھا اور فرمایا
تھا کہ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ یہ اعلان ذرا عجلت میں کر دیا گیا اور گمان ہوتا ہے
کہ یہ بھی عملاً ان ریاستوں کی باغیانہ حرکتوں کے سبب ہے جو جنگ کے بعد کی گئیں لیکن اب جو سرکل
معرض ہو گئی اسے واپس لیا تو گیا نہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انگریزی کلیسا کا سردار ہندوستانی
سیاست کے متعلق ایسا انتہائی قدامت پسندانہ والا رویہ اختیار کرتا ہے وہ قدم جو
ہندوستانی رائے عامہ سے بالکل ناکافی تھا اور جس نے ابھی حال میں عدم تعاون اور اس کے
ملحقات کے لئے راہ کھولی تھی۔ اسے یہ لاٹ پادری صاحب عجلت اور دریا دلی پر مبنی خیال
فرماتے ہیں۔ انگریزی حکمران طبقے کے نقطۂ نظر سے ٹھیک یہی تنگ خیالی ہے اور ایسی
دریا دلی کے لیے یہ ہے جو جاگیرداری اقتصادی کی حد تک حتیٰ ہو (بقیہ صفحہ ۱۶۴ پر)

پیدا ہونے کا سامان کیا ہے کہ وہ ہمیشہ حق بجانب ہی ہوتے ہیں یہ ٹھیک نہیں بتایا
جاتا کہ برابر حق بجانب ہونے کا یہ آرام دہ خیال کلیسا نے پیدا کرایا ہے یا خود
کلیسا اس کی پیداوار ہے۔ یہ مسلّم یورپ اور امریکہ کی دوسری قومیں جو ذرا کم
خوش حال ہیں، انگریزوں پر ریاکاری کا الزام لگاتے ہیں اور اطالیوں، انگریزوں کی
ریاکاری کا طعنہ بہت پرانا ہے۔ مگر یہ الزام غالباً برطانوی کامیابی پر حسد کی وجہ
سے پیدا ہوا ہے اس لئے کہ بھلا کوئی اور سامراجی طاقت برطانیہ کیا یہ تخت پھیلا سکے
گی! جو اس کا اپنا نامہ اعمال بھی تو اتنا ہی سیاہ ہوگا۔ جو قوم جان بوجھ کر
ریاکاری کر رہی ہو وہ قوت کے ایسے محفوظ، جیسے بروئے کار نہیں لا سکتی
جیسے کہ انگریز بارہا لائے ہیں۔ اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ مذہب کا جو خاکہ انھوں نے
اختیار کیا ہے اس نے ان کی بڑی مدد کی ہے۔ یوں کہ جہاں خود ان کی اغراض کا
معاملہ ہے وہاں اس نے ان کے اخلاقی حس کو کند کر دیا ہے دوسرے لوگوں
اور قوموں نے بارہا انگریزوں سے زیادہ بری طرح کام کئے ہیں لیکن ان
میں اتنی بھی اس قدر کامیابی نہیں ہوئی کہ اپنے فائدے کی بات کو تو خیر
اور نیکی بھی مان لیں۔ یوں تو ہم سب کو دنیا میں بڑی آسانی ہے کہ دوسرے
کی آنکھ کا تنکا دیکھیں اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر انداز کر دیں لیکن انگریز

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۳) ضرور ان لوگوں میں مسلمان قلب کی ایک روحانی رو
دوڑ جاتی ہوگی۔

اور سب سے بازی لے گیا[1]

پروٹسٹنٹ مذہب نے نئے حالات سے مطابقت کی کوشش کی اور اس کی تدبیر کی کہ دونوں دنیاؤں سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے اسے بڑی کامیابی ہوئی۔ لیکن دینی نقطۂ نظر سے حیثیت ایک منظم مذہب کے وہ نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مذہب کی جگہ محض عادات اور کاروبار نے لی۔ کلیسا روما کے مذہب کا یہ حشر نہیں ہوا اس لئے کہ وہ یکسوئی سے اپنی پرانی جگہ پر جما رہا اور جب تک وہ جگہ مستحکم ہے یہ بھی پھلتا پھولتا رہے گا۔ اگر فقط مذہب کے محدود معنی لئے جائیں تو آج مغربی دنیا میں اس کلیسا روما کا مذہب ہی ایک زندہ مذہب ہے۔ قید خانے میں ایک رومن کیتھولک دوست نے مجھے اپنے مذہب کی بہت سی کتابیں اور پاپائے روم کے گشتی اعلانات ضرور دئے تھے۔ اور میں نے انھیں بڑے شوق سے پڑھا اور ان کے مطالعے سے مجھے معلوم ہوا کہ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد پر اس مذہب کا کیا تسلط ہے۔ اسلام اور عام ہندو مت کی طرح۔ بھی شک و شبہ او

---

[1] ہندوستانی سیاست پر کلیسا انگلستان کے بالواسطہ اثر کی ایک مثال حال میں میرے علم میں آئی۔ صوبہ متحدہ کے عیسائیوں کی ایک کانفرنس نومبر ۱۹۳۲ء کو کانپور میں ہوئی تھی جس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مسٹر ای۔ ڈی۔ ٹوڈ نے فرمایا "عیسائی ہونے کی حیثیت سے ہم مذہباً ملک معظم کی وفاداری پر مامور ہیں کہ وہ ہمارے دین کے محافظ ہیں۔ اس کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کو مدد دی جائے" آگے چل کر مسٹر ٹوڈ نے سول سروس، پولیس اور کل مجوزہ دستور اساسی کے متعلق انگلستان کے سربر آوردہ قدامت پسند گروہ کے خیالات سے ہمدردی کا اظہار فرمایا کہ ان لوگوں کی مدد کے بغیر اس مجوزہ دستور کے عمل میں آنے پر ہندوستانی مسیحیت کا سلامت رہنا خطرے میں پڑ جائے۔

وہی اقتدار کے طوفانی سمندر میں ایک محفوظ لنگر کا کام دیتا ہے اور آنے والی
زندگی کا یقین دلاتا ہے جس میں اس زندگی کی خامیوں کی تلافی ہو جائے۔
مگر کیا کروں میرے لئے اس طرح پناہ ڈھونڈنا ممکن نہیں میں کھلے سمندر کو
ترجیح دیتا ہوں، اور اس کے طوفان ڈھلانی کو۔ مجھے بعد والی زندگی میں، اور
موت کے بعد جو ہوگا اس میں بہت کچھ دلچسپی ہے میرے ذہن کو مشغول رکھنے کے
لئے تو اسی زندگی کے مسائل کافی ہیں۔ مذہبیوں کا روایتی نقطۂ نظر جو اصولاً اخلاقی
ہے مگر غیر مذہبی یا یوں کہئے کہ مذہبی تشکیک سے متاثر ذہنوں میں بہت کم ملتا ہے
اگرچہ مذہبیوں نے جس طرح اسے زندگی پر لاد دیا ہے اس سے میں متفق نہیں
مجھے یقین ہے ان کے نزدیک اس کے طریق حیات سے، اس راستے سے جس پر
کہ ان کے نزدیک چلنا چاہئے۔ زندگی کو سمجھنا چاہئے رستے رد کرنا چاہئے بلکہ
قبول، اس سے مطابقت کرنا چاہئے اور اس کو احترام کرنا چاہئے لیکن عموماً مذہبی
نظام کو اس زندگی سے سروکار ہی نہیں ہوتا میرے نزدیک یہ وضاحت طلب ہے
ہوتا ہے اس سلسلے ہی میں کہ بعض مقررہ اور ناقابل تغیر نظریوں اور عقیدوں
کے چون و چرا تسلیم کرنے پر اس کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر اس سے بھی کہ یہ جذبات
حق اور حل پر منحصر ہوتا ہے۔ اس جیسے ست(؟) ہوتا ہے جسے میں روحانیت
اور روح کی باتیں جانتا ہوں اور یہ تو جان بوجھ کر یا دانستہ حقیقت سے
آنکھیں بند کر لیتا ہے اس لئے کہ کہیں حقیقت اس کے تعصبات سے مطابقت
کرنے سے معذور نہ ہو۔ یہ تنگ نظر ہوتا ہے اور دوسرے خیالات و آرا کے ساتھ
روا داری نہیں برتتا یہ خود غرض اور اکثر خود غلط ہوتا ہے۔ اور اکثر مطلبی لوگوں
موقع شناسوں کو اپنے سے بے جا فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔
اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہل دین کبھی بھی اعلیٰ ترین اخلاقی اور روحانی

زندگی کا نمونہ نہ تھے۔ اب بھی نہیں ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ مذہبی
نقطۂ نظر کسی قوم کی اخلاقی اور روحانی ترقی میں مدد نہیں دیتا بلکہ اس میں حائل
ہی ہوتا ہے۔ اگر اخلاق اور روحانیت کو اس دنیا کے معیاروں سے جانچا جائے
یہ کہ آخرت سے عموماً تو مذہب خدا یا ذات مطلق کی غیر معاشرتی جستجو بن کر
رہ جاتا ہے اور مذہبی آدمی کو سماج کی بھلائی سے کہیں زیادہ اپنی شخصی نجات
کی فکر رہتی ہے۔ صوفی اپنے کو نفس سے رہا کرانا چاہتا ہے اور اس کوشش
میں اکثر نفس اس پر چھا جاتا ہے۔ اخلاقی معیاروں کو اجتماعی ضروریات سے کوئی
علاقہ نہیں ہوتا مگر ان کی مابعدیت سے، فوق الطبیعیت سے سابقہ پڑتا ہے
اور نظم مذہب تو علانیتاً مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر
ایک ترقی دشمن قوت بن کر تبدیلی اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ مسیحی کلیسا نے شروع میں غلاموں کو اپنی معاشرتی
حالت بہتر کرنے میں مدد نہیں دی۔ غلام لوگوں کو جو قرون وسطیٰ کے مفت
داری نظام میں زرعی چاکر کی حیثیت ملی تو وہ معاشی اسباب سے۔ کلیسا
کا نقطۂ نظر تو ابھی، دو سو سال پہلے تک ([illegible] تک) جو تھا اس کا پتا
ایک خط سے چلتا ہے جو لندن کے بڑے پادری نے امریکہ کی نوآبادیوں کے
غلاموں کے مالکوں کو لکھا تھا۔

پادری صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ مسیحیت یا کتاب مقدس کے
قبول کرنے سے شہری حقوق ملکیت میں یا شہری تعلقات سے متعلق جو دستور
ہیں ان میں مطلق کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان سب حیثیات سے تو آدمی اسی حالت
میں رہتے ہیں جس میں وہ پہلے تھے۔ مسیحیت جو آزادی بخشتی ہے، وہ تو گناہ سے
شیطان سے، اور انسان کے شہوات، جذبات اور بے جا خواہشات سے آزادی ہے

لیکن جہاں تک ان کی حالت کا تعلق ہے۔ وہ پہلے جو کچھ تھے۔ چاہے وہ آزاد تھے یا غلام، تو اس میں عیسائی ہو جانے یا بپتسمہ لینے سے کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

آج تو کوئی مستقل مذہب اس صفائی سے اپنا یہ خیال ظاہر نہ کرے گا۔ لیکن سچ پوچھیے تو دین میں حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ الفاظ بجائے خود خیالات کے منتقل کرنے کا بہت ناقص ذریعہ ہیں اور مختلف لوگ ان کے مختلف معنی سمجھ سکتے ہیں اور شاید کسی زبان کے کسی اور لفظ کی مختلف لوگ اتنی مختلف تعبیریں نہ کرتے ہوں جتنی کہ لفظ مذہب یا دوسری زبانوں میں اس کے مترادف لفظوں کی۔ اس لفظ کو پڑھ کر یا سن کر شاید دو آدمیوں کے ذہن میں بھی خیالات و تصورات کا ایک سا مجموعہ سامنے نہ آتا ہوگا۔ جو خیالات و تصورات اس لفظ سے ابھرتے ہیں وہ کہیں رسم و رواج کے ہیں، کہیں مختلف کتابوں کے، کہیں آدمیوں کی ایک جماعت کے تو کہیں چند قطعی عقائد کے، کہیں اخلاق، احترام، محبت کے، کہیں خوف و نفرت کے، خیرات، قربانی، رہبانیت کے، روزہ رکھنے کے، اور خوب کھانے پینے کے جشنوں کے، دعا اور عبادت کے، قدیم تاریخ کے، شادی کے، موت کے، آنے والی دنیا کے، ملاؤں کے، سر پھوڑنے کے، غرض طرح طرح کے۔ تعبیروں اور تصوروں کی اس بے حساب رنگارنگی سے جو سخت انتشار پیدا ہوتا ہے اس کے علاوہ اس کے ساتھ ساتھ تقریباً ہمیشہ ایک غیر عقلی تحریک بھی شامل ہوتی ہے جس میں ٹھنڈے دل سے سوچنے سمجھنے کا امکان نہیں رہتا۔ لفظ مذہب کے کوئی واضح معنی باقی نہیں رہتے ہیں، اگر کبھی تھے۔ چنانچہ اس سے سخت

انتشار پیدا ہوتا ہے اور دلیل و بحث کا ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو کہیں ختم ہونے پر نہیں آتا۔ اس لئے کہ مختلف لوگ اس کے بالکل ہی جداجدا معنی لیتے ہیں۔ سب سے بہتر ہوتا اگر اس لفظ کا استعمال ہی ترک کر دیا جاتا اور اس کی جگہ دوسرے لفظ استعمال کئے جاتے جن کے معنی زیادہ محدود و متعین ہوتے مثلاً دینیات، فلسفۂ اخلاق، اخلاقیات، روحانیت، مابعد الطبیعات، فرض، رسم وغیرہ جو دیر انسا ... بھی جا سکتے مبہم ہیں۔ لیکن ان کا مفہوم مذہب سے کہیں محدود رہے۔ اور ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان لفظوں کے ساتھ وہ جذبات اس طرح وابستہ نہیں ہیں جن میں کہ لفظ مذہب چاروں طرف سے لپٹا ہوا ہے۔

پھر آخر مذہب ہے کیا؟ اگر باوجود اس کے عیوب کے اسی لفظ کو استعمال کیا ہی جائے، تو غالباً اس سے مراد فرد کی اندرونی نشوونما ہے یعنی اس کے شعور کا ارتقا کسی ایسی سمت میں جسے اچھا سمجھا جاتا ہے پھر خود یہ بات موضوع بحث بن جاتی ہے کہ وہ سمت کیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں مذہب اس اندرونی تبدیلی پر زور دیتا ہے اور خارجی تبدیلی کو اسی داخلی نشوونما کا پرتو جانتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندرونی تبدیلی خارجی ماحول پر زبردست اثر ڈالتی ہے لیکن یہ بات بھی اتنی ہی صاف ہے کہ خارجی ماحول بھی اسی اندرونی تبدیلی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے پر اثر ڈالتی ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مغرب کی جدید تہذیب میں خارجی ترقی اندرونی نشوونما کی نسبت بہت آگے بڑھ گئی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا جیسا کہ مشرق کے بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ ہم صنعت میں پیچھے ہیں اور ہماری ترقی سست ہے اس لئے ہمارا اندرونی ارتقا کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ بھی ان دھوکوں میں سے ایک دھوکہ ہے جس سے

ہم اپنے کو تسلی دے لیا کرتے ہیں اور اپنے ہمسایوں کے احساس برتری کو ختم کی
کوشش کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ افراد حالات اور ماحول سے ماورا ہو کر
اندرونی آزادیاں حاصل کر لیں لیکن انسان کے بڑے گروہوں اور قوموں کے
لیے تو اندرونی ارتقا شروع ہونے سے پہلے لازم ہے کہ خارجی نشوونما ایک
خاص درجہ تک پہنچ چکا ہو جو شخص معاشی حالات کا شکار ہوا اور جو اسے
کی کشمکش اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہو وہ مشکل ہی سے معمور داخلی کے
کسی بلند مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے جو صفت دوسروں کے قدموں تلے پس رہا ہو اور
دوسرے جس سے بے جا فائدہ اٹھا رہے ہوں وہ کسی اندرونی ترقی میں
کر سکتا جو قوم سیاسی اور معاشی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی محکوم ہو اور
ہر طرف سے گھری ہو جس پر طرح طرح کی پابندیاں ہوں جس سے دوسرے
فائدہ اٹھا رہے ہوں اسے کسی اندرونی ترقی نصیب نہیں ہو سکتی غرض جو
اندرونی نشوونما کے لیے باہر کی آزادی اور مناسب ماحول لازم ہو جاتا
اس خارجی آزادی کے حاصل کرنے اور ماحول کو اس طرح ڈھالنے میں کہ اندرونی
نشوونما کی راہ میں جو رکاوٹیں ہوں وہ ہٹ جائیں پسندیدہ بات یہ ہے کہ
جو وسائل اختیار کیے جائیں وہ ایسے ہوں کہ یہ مقصد فوت نہ ہو جائے میں
سمجھتا ہوں کہ جب گاندھی جی فرماتے ہیں کہ وسائل مقاصد سے زیادہ اہم ہیں
تو ان کے خیال میں اسی قسم کی کوئی بات ہوتی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ وسائل
ایسے ہوں جو اس مقصد تک نہ لے جا سکیں ورنہ ساری کوشش ضائع
ہو گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اندرونی اور بیرونی دونوں اعتبار سے حالت
پہلے سے پست تر ہو جائے۔

گاندھی جی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "کوئی" سبب کے بغیر نہیں ہوتا

بعض لوگ ہیں جو اپنی عقل کے غرور میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ انھیں مذہب
سے کچھ سروکار نہیں۔ مگر اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو کہے کہ میں سانس
لیتا ہوں مگر میرے ناک نہیں" پھر کہیں وہ کہتے ہیں "حق و صداقت کے ساتھ میری
شیفتگی مجھے سیاست میں گھسیٹ لائی ہے اور میں ادب سے تامل کے بغیر اگرچہ پورے
عجز کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کچھ واسطہ
نہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ مذہب ہے کیا" زیادہ صحیح ہوتا اگر وہ یہ فرماتے کہ جو
لوگ زندگی اور سیاست سے مذہب کو خارج کرنا چاہتے ہیں وہ لفظ مذہب
کے معنی اس سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ یہ بات تو صاف ہے
کہ گاندھی جی اس لفظ کو ایک ایسے معنی میں استعمال کرتے ہیں (غالباً اور کسی معنی
سے زیادہ اخلاقی معنی میں)؛ جو مذہب کے کٹر حامیوں کے معنی سے مختلف ہے
ایک لفظ کو یوں مختلف معنوں میں استعمال کرنے سے ایک دوسرے کا مطلب
سمجھنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

مذہب کی ایک بالکل ہی نئی تعریف، جس سے اہل مذہب اتفاق نہ کریں
گے پروفیسر جان ڈیوی کی تعریف ہے۔ ان کے خیال میں "مذہب ہر اس چیز
جس سے وجود کے مقصود اور تغیر حوادث و واقعات میں حقیقی توحید نظر پیدا ہو"
یا پھر ایک جگہ کہتے ہیں کہ "ہر وہ عمل جو کسی نیکی مقصد کے لئے موانع کے مقابلے
میں اور شخصی نقصان کے ڈر کے باوجود کیا جائے اس لئے کہ اس کی عام اور مستقل
قدر کا یقین ہے اپنی کیفیت میں مذہبی ہوتا ہے" اگر مذہب یہ ہے تو پھر یقیناً
کسی کو اس پر ذرا سا بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

رومین رولاں نے بھی مذہب کے تصور کو پھیلا کر اسے وہ معنی دیئے
ہیں جس سے شاید منظم مذہب کے راسخ العقیدہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھریں۔

سوائے نام کے جس میں گئے ہیں وہ بہت سی روحیں ہیں جو مذہبی عقیدہ سے آزاد
ہیں یا سمجھتی ہیں کہ آزاد ہیں۔ لیکن ہر لمحہ ایک مستقل شعور میں ڈوبی رہتی
ہیں جس کا نام وہ اشتراکیت رکھ لیتی ہیں یا اشتمالیت، انسان دوستی یا قوم
پرستی یا عقلیت تک خیال کی کیفیت سے اس کا منبع مذہبی ہوتا ہے مگر
اس کے موضوع سے اور ایسی کیفیت کی بنا پر ہم فیصلہ کرسکتے ہیں کہ وہ
مذہب سے نکلی ہے یا نہیں۔ اگر وہ تلاش حق کی طرف سے خوف و تنہا چڑھتا
ہے پھر چاہے تو می ہو اور یکسوئی اور خلوص کے ساتھ ہر مرحلہ کے لئے تیار ہو
تو میں اسے مرد مذہبی کہوں گا۔ اس لئے کہ وہ مرد انسانی سعی کے لئے ایک
ایسے مقصد پر یقین رکھتا ہے جو موجودہ معاشرہ کی زندگی سے بالا ہے بلکہ کل انسانیت
کی زندگی سے بھی ارفع، خود تخلیق تک روح مذہبی کے لشکر بزرگ کے ساتھ چلتی
چلتی ہے، بشرطیکہ یہ تخلیق قومی اور گروہی نظریوں سے پیدا ہوا اور کمزوری کا مظہر
نہ ہو بلکہ قوت کا۔

دعا ہے میں ان شرائط کو پورا بھی کرتا ہوں یا نہیں جو روحانی رہنماؤں نے
لگائی ہیں۔ مگر ان حالات میں تو میں اس لشکر بزرگ کا ایک ادنیٰ سپاہی ہونے
کے لئے ہمہ وقت تیار رہوں۔

(۴۸)

برطانوی حکومت کی دورخی پالیسی

بہرحال تحریک جاری تھی۔ باپو جی پہلے پونا جیل سے اس کی رہنمائی کرتے رہے اور اب باہر سے کر رہے تھے۔ اس کے لئے سخت جدوجہد ہو رہی تھی کہ مندروں کے داخلے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور کر دی جائیں اور اس کا ایک مسودہ قانون اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس وقت یہ حیرت انگیز منظر دیکھنے میں آیا کہ کانگریس کے ایک ممتاز لیڈر دہلی میں گھر گھر پھر رہے تھے اور اسمبلی کے ممبروں کو اس مسودۂ قانون کی تائید پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو خود گاندھی جی نے ان کے ذریعے اسمبلی کے ممبروں سے اپیل کیا تھا۔ پُرلطف یہ کہ سول نافرمانی اب بھی جاری تھی اور لوگ جیل میں ڈالے جا رہے تھے اور کانگریس نے اسمبلی کا بائیکاٹ کیا تھا اور ہمارے مسلم ممبروں سے استعفیٰ دے کر باہر آ گئے تھے۔ یہ کچھ ممبروں نے اور ان لوگوں نے جو کانگریسی ممبروں کی جگہ منتخب ہوئے تھے اس نازک زمانے میں ہمیشہ کانگریس کی مخالفت اور حکومت کی موافقت کی تھی۔ ان کی اکثریت نے حکومت کو اس جابرانہ قانون کے پاس کرنے میں مدد دی تھی جس کے ذریعے عارضی ضابطوں کو ایک مستقل شکل دے دی تھی۔ انھوں نے اتنا مبالغے کو تسلیم کر لیا کہ اب قبول کر لیا تھا۔ شملہ اور لندن میں بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ دعوتیں اڑا رہے تھے۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت کی شکرگزاری کے گیت گائے تھے اور اس کی دورخی پالیسی کے لئے دست راست تھے۔

مجھے ان حالات میں گاندھی جی کے اپیل پر حیرت ہوئی اور میں نے سوچا کہ

کرر رہا تھا گوپال آچاریہ جو جدوجہد سے پہلے کانگریس کے قائم مقام پریسیڈنٹ تھے ان کی حمایت
کی تائید حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے سوال کی
کی جدوجہد کو نقصان پہنچا ہے نیز اس کا اخلاقی پہلو اور زیادہ تکلیف دہ ہے میرے
خیال میں گاندھی جی یا کسی کانگریسی لیڈر کا یہ طرز عمل اعلانیہ ناجائز تھا اور ایک قسم
کی بدعہدی تھی ان ہزاروں آدمیوں سے جو جیل میں تھے یا اس تحریک کو چلا رہے تھے
گویا مانتا تھا کہ گاندھی جی کا لفظ آخر دوسرا ہے۔
حکومت نے اس وقت اور اس کے بعد شاردا کے مسودہ قانون کے متعلق جو
رویہ اختیار کیا اس سے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے اس کے حامیوں کی راہ
میں ہر طرح کے روڑے اٹکائے۔ اس کی دار طلبی کرتی رہی اور اس کے مخالفوں کو
شہ دیتی رہی۔ یہاں تک کہ آخر میں اس کی کھلم کھلا مخالفت کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ کم و بیش
یہی رویہ وہ ہندوستان کی ہر سماجی اصلاح کے معاملہ میں رکھتی ہے اور مداخلت
نہ کرنے کے بہانے وہ معاشرتی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ وہ
ہماری سماجی خرابیوں پر نکتہ چینی کرتی ہے اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرتی ہے۔
اتفاق سے شاردا بل پر جو کمسنی کی شادی کو روکنے کے لیے پیش کیا گیا اور منظور ہو گیا مگر
اس بدنصیب ایکٹ کا جو حشر ہوا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حکومت کو اس قسم کی تدبیر
پر عمل کرانا کس قدر ناگوار ہوتا ہے۔ وہی حکومت جدید آرڈیننس تعزیری ضابطے سازی
ہے جس میں نئے نئے جرم تراشے جاتے ہیں اور ایک شخص کے جرم کی سزا دوسروں کو دی
جاتی ہے۔ جو سیکڑوں ہزار آدمیوں کو ان ضابطوں کی خلاف ورزی کے لیے جیل بھیج
دیتی ہے اور شاردا ایکٹ جیسے باقاعدہ قانونوں کو نافذ کرنے سے ڈرتی ہے۔ سب سے
پہلے تو اس ایکٹ کا اثر یہ الٹا ہوا اس لیے کہ اس میں ارادۃً فاقت لوگوں کو
چھ مہینے کی مہلت دی گئی تھی جس سے بے شمار آدمیوں نے فائدہ اٹھایا اور کم

یہ معلوم ہوا کہ یہ ایکٹ محض ایک مذاق ہے اور اگر اس کی خلاف ورزی کی
جائے تو حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوتی سرکاری طور پر اس
کی اشاعت کی مطلق کوشش نہیں کی گئی اور بہت سے گاؤں والوں کو آج تک
یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس ایکٹ کا کیا منشا ہے۔ اس کے سلسلے ہندو مسلمان مذہبی دانشوروں
کو تو ذکر نہیں کرتے تھے جنہیں خود بھی صحیح واقعات کا علم نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ حکومت ہندوستان کی معاشرتی خرابیوں کے معاملے میں جو رواداری
کا برتاؤ کرتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ان کی مؤید ہے بلکہ اس میں شک نہیں کہ
اسے ان خرابیوں کے دور کرنے کی فکر نہیں کیونکہ اس سے اس کے کام میں یعنی ہندوستان
پر حکومت کرنے میں اور اس کی دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں خلل پڑتا ہے پھر
یہ خطرہ بھی ہے کہ سماجی اصلاح کی تجویز سے بعض لوگ ناراض ہو جائیں گے اور چونکہ حکومت
کو ملک کی سیاسی مخالفت سے سابقہ پڑا ہے اس لئے وہ نہیں چاہتی کہ اپنے لئے اور
مشکلات پیدا کرے مگر کچھ دنوں سے سماجی حلقوں کے کام میں ادھر سخت دشواری پیدا
ہو گئی ہے اس لئے کہ حکومت رد روایات کے حامیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے اس
کی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے ترقی پسند عناصر سے رشتہ
جوں جوں اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے ٹوٹتا جاتا ہے جو کہ آج تک
ملتے ہیں اور آج کل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی قدامت پرست، مذہبی
رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی، معاشی
اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں یہ جماعتیں ہندو مہاسبھا سے کچھ کم نہیں گو مذہبی
رجعت پسندی میں اس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں خود ہندو مہاسبھا کے ارکان میں ہر قسم
کی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں اور یہی لوگ برطانوی حکومت کے بڑے وفادار ہیں
یا کم سے کم دستوری وفاداری کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر حکومت خاموش رہی اور اس نے رولٹ ایکٹ کو ہر دلعزیز بنانے اور نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی تو کانگریس یا دوسری غیر سرکاری جماعتوں نے اس کے لئے پروپگنڈا کیوں نہیں کیا؟ یہ سوال برطانیہ کے اور دوسرے ملکوں کے نکتہ چینوں کی طرف سے اکثر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے پچھلے بیس سال سے خصوصاً ۱۹۲۰ء سے برطانوی حکومت سے قومی آزادی کی شدید جنگ میں مصروف ہے جس پر اس کی موت اور زندگی کا دارومدار ہے۔ نیز یہ دوسری انجمنیں نوابوں میں حقیقی قوت ہی اور نہ انہیں عام لوگوں سے تعلق ہے۔ وہ عورتیں اور مرد جو عالی مقاصد اور اخلاقی قوت رکھتے ہیں اور عوام میں ہر دلعزیز ہیں سب کے سب کھنچ کر کانگریس میں چلے آئے ہیں اور زیادہ تر اپنا وقت قید فرنگ میں گذارتے ہیں۔

دوسری انجمنیں اس سے آگے نہیں بڑھتیں کہ چند منتخب لوگوں کو جمع کر کے ریزولیوشن پاس کر دیں۔ عام لوگوں سے تعلق پیدا کرنے کی ان میں جرأت نہیں۔ مردوں کی انجمنیں جنگلیوں کی طرح اور انجمن خواتین ہندلیڈیوں کی سالوں سے کام کرتی ہیں۔ اور عام پروپگنڈا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ علاوہ تحریری مباحثوں اور ان قانونوں سے جو ہر قسم کی پبلک جدوجہد کو دبانے کے لئے بنائے گئے تھے ان مجلسوں کو بھی معطل کر دیا تھا۔ ممکن ہے کہ مارشل لا اٹھنے پر جدوجہد کو مکمل دے مگر اسی کے ساتھ وہ تمدنی اور تمدنی جدوجہد کو بھی معطل کرتا ہے۔

مگر کانگریس یا دوسری غیر سرکاری انجمنوں کا سماجی اصلاح میں زیادہ حصہ نہ لینے کا اصلی سبب اس سے زیادہ گہرا ہے۔ ہم لوگ قوم پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں ہمارے دل و دماغ پر اسی کا خیال چھایا ہوا ہے اور اس وقت تک چھایا رہے گا جب تک ہمیں سیاسی آزادی حاصل نہ ہو جائے۔ برنارڈ شا کا قول ہے کہ ایک محکوم قوم کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سرطان کے مرض میں مبتلا ہو وہ دن رات

اسی فکر میں رہتا ہے سچ پوچھیے تو کسی قوم کے لئے قومی تحریک سب سے بڑی مصیبت ہے یہ ایک طبعی عمل کو روک دئے جانے کی تکلیف وہ علامت ہے محکوم قومیں دنیا کی رفتار ترقی میں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ان کی ساری توجہ اس کوشش صرف ہوتی ہے کہ کسی طرح قومی آزادی حاصل ہو اور قومی تحریک سے پیچھا چھوٹے۔"

پچھلے تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہم موجودہ حالات میں سماجی ترقی نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ظاہر حکومت کے بعض محکمے منتخب شدہ وزیروں کی طرف منتقل کر دیئے گئے ہیں حکومت کے انتہائی جمود نے ہمیشہ قدامت پسندوں کو مدد دی ہے اور برٹش گورنمنٹ مدتوں سے ہماری روح عمل کو کچلتی رہی ہے اور ہم پر استبدادی بالعقول خود ریگانہ حکومت کرتی رہی ہے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ غیر سرکاری لوگ کوئی غیر منظم تحریک شروع کریں اور اسے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کی نیت کچھ اور ہے ہریجن تحریک ایسے چلانے والوں کی انتہائی احتیاط کے باوجود کبھی کبھی سرکاری ملازموں سے ٹکرا جاتی ہے مجھے یقین ہے کہ اگر کانگریس سرے تک میں پروپیگنڈا کرے کہ صابونوں زیادہ مقدار میں استعمال کیا جائے تو بہت سے مقامات پر اس سے اور حکومت سے ٹکر ہو جائے گی۔

میرے خیال میں اگر ریاست سماجی اصلاح کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو عام لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی مگر غیر ملکی حکمرانوں کی طرف سے لوگوں کو ہمیشہ شبہ رہتا ہے اور ان کو حالات کے بدلنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہو سکتی اگر غیر ملکی حکومت ہٹ جائے اور معاشی تبدیلیاں مقدم رکھی جائیں تو قابل اور مستعد کام آسانی سے بڑی بڑی سماجی اصلاحیں کر سکتے ہیں۔

مگر جیل میں ہمیں سماجی اصلاح اور شاردا ایکٹ اور ہریجن تحریک کی کچھ زیادہ خبر نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو یہ بات ناگوار تھی کہ ہریجن تحریک نے سول نافرمانی میں رکاوٹ

ڈال دی۔ شروع ستمبر ۳۳ء میں تحریک چھ ہفتے کے لئے ملتوی کر دی گئی تاکہ عام کو
یہ فکر بھی کر دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ التوا کی وجہ سے تحریک کا بچا سہارا بھی ختم ہو گیا کیونکہ
قومی لڑائی کوئی کھیل نہیں کہ جب چاہا شروع کر دیا اور جب چاہا بند کر دیا۔ التوا سے
پہلے بھی تحریک کے لیڈروں کی کمزوری اور لوٹنے پن کا ثبوت دے رہے تھے جن کا چھوٹی
چھوٹی کام نہیں ہو رہی تھیں وہ طرح طرح کی افواہیں مشہور کی جاتی تھیں جن سے عملی کام
میں خلل پڑتا تھا کانگریس کے بعض قائم مقام پریسیڈنٹ بہت قابل قدر لوگ تھے مگر جنہیں
جنگ کا سپہ سالار ان پر ظاہر تھا وہ کچھ تھکے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے اور چاہتے تھے
کہ اس مشکل سے کسی طرح پیچھا چھڑائیں۔ بڑے لیڈروں کی اس ہچکچاہٹ اور لیت و لعل سے
کچھ لوگ بیزار تھے مگر وہ اپنی بیزاری کا اظہار منظم طریقے سے نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ تمام
کانگریس کمیٹیاں خلاف قانون قرار دے دی گئی تھیں۔

اسی حالت میں گاندھی جی کا کیس دل کا برت شروع ہوا وہ جیل سے رہا کر دئے
گئے اور سول نافرمانی چھ ہفتے کے لئے ملتوی کی گئی برت ختم ہو گیا اور گاندھی جی کو رفتہ رفتہ
ہونے لگا دستخطوں میں سول نافرمانی کی التوا کی یہ وجہ بتائی اور بڑھا دی گئی جس زمانہ
میں حکومت کے حسب وعدہ تشدد میں کوئی کمی نہیں ہوئی جزیرہ انڈمان میں سیاسی قیدی جو شمالی ہند کے
انقلابی تشدد کے جرم میں وہاں بھیجے گئے تھے بد سلوکی کی وجہ سے بھوک ہڑتال کر رہے تھے
ان میں سے دو ایک فاقہ کرتے کرتے مر گئے اور بہت سے قریب مرگ تھے جن لوگوں نے
ہندوستان میں انڈمان کے واقعات کے خلاف احتجاج کے جلسے کئے انہیں بھی
گرفتار کر کے سزائیں دی گئیں۔ حکومت کی مرضی یہ تھی کہ ہم تکلیف اٹھائیں اور اف تک نہ
کریں چاہے سیاسی قیدی جن کے پاس بھوک ہڑتال کے سوا احتجاج کا کوئی ذریعہ نہ تھا
ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں چند مہینے بعد ستمبر ۳۳ء میں جب میں جیل سے رہا ہو چکا تھا ایک
اعلان شائع کیا گیا جس پر رابندرناتھ ٹیگور سی ایف اینڈریوز اور بہت سے اور مشہور لوگوں کے

دستخط تھے جن میں سے اکثر کانگریس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس میں یہ درخواست
کی گئی تھی کہ انڈمن کے قیدیوں سے زیادہ انسانیت کا سلوک کیا جائے بلکہ بہتر یہ ہے
کہ وہ ہندوستان کی جیلوں میں منتقل کر دیئے جائیں۔ حکومت ہند کے ہوم ممبر اس اپیل
پر بہت خفا ہوئے اور جن لوگوں نے اس پر دستخط کئے تھے ان کو برا بھلا کہا کہ وہ
قیدیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آگے چل کر جہاں تک مجھے یاد ہے ان قیدیوں سے
ہمدردی کرنا قابل سزا جرم قرار دے دیا گیا۔

سول نافرمانی کے التوا کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہیں دہرہ دون میں یہ چلا
کہ گاندھی جی پونا میں ایک بے ضابطہ کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں دو تین سو آدمی
جمع ہوئے اور گاندھی جی کے مشورے سے عام سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی مگر انفرادی
نافرمانی کی اجازت دی اور ہر قسم کے خفیہ طریقوں کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ فیصلے حوصلہ افزا نہیں
تھے مگر مجھے ان پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سول نافرمانی کو روکنے کے معنی صرف یہ تھے کہ موجودہ
حالات کا اعتراف کیا جائے اور اس کو تسلیم کیا جائے کیونکہ سچ پوچھئے تو عام تحریک پہلے ہی
ختم ہو چکی تھی۔ خفیہ کام کرنا محض ایک بہانہ تھا کہ تحریک اب بھی جاری ہے اور ہماری تحریک کی
نوعیت دیکھتے ہوئے اس سے اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ اس کی ضرورت
صرف اس حد تک تھی کہ لوگوں کو ہدایتیں بھیجی جا سکیں اور ان سے تعلق قائم رکھا جا سکے مگر
خود سول نافرمانی کو بدستور رکھنا ناممکن تھا۔

مجھے جس بات سے تعجب اور افسوس ہوا وہ یہ تھی کہ پونا میں ہماری موجودہ حالت
اور مقاصد کے متعلق صحیح معنوں میں کوئی بحث نہیں ہوئی۔ کانگریس والے تقریباً دو سال کی
شدید جنگ کے بعد جمع ہوئے تھے اور اس عرصے میں ساری دنیا میں اور ہندوستان میں
بڑے بڑے اہم واقعات رونما ہو چکے تھے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت
کے وہائٹ پیپر میں دستور اساسی کی اصلاح کی تجاویز شائع کی گئی تھیں۔ ہم اس مرحلے میں

خاموش رہے تھے اور دوسری طرف سے مسلسل جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا تھا تاکہ اصل
مسئلہ لوگوں کی نظر سے چھپ جائے۔ صرف حکومت کے حامیوں ملک لبرل پارٹی اور
دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی بار بار یہ کہا جا چکا تھا کہ کانگریس نے اپنا کامل آزادی کا
مقصد ترک کر دیا ہے میرے خیال میں اس موقع پر اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ ضرور کرنا چاہئے
تھا کہ ہمارا سیاسی مقصد دوبارہ واضح کر دیا جائے اور ممکن ہو تو اس کے ساتھ سماجی اور معاشی
مقاصد کا بھی اعادہ کر دیا جائے۔ اس کے بجائے ساری بحث اس بات تک محدود رہی کہ عام
سول نافرمانی بہتر ہے یا انفرادی نافرمانی اور خفیہ طریقوں سے کام لینا مناسب ہے یا نہیں۔
اس کے علاوہ ایک عجیب بات یہ تھی کہ حکومت سے "صلح" کرنے کا چرچا ہو رہا تھا جہاں تک
مجھے یاد ہے گاندھی جی نے وائسرائے کو ایک تار بھیجا اور ملاقات کی درخواست کی مگر وائسرائے
نے انکار کر دیا اس کے بعد گاندھی جی نے ایک اور تار بھیجا جس میں "باعزت صلح" کا ذکر تھا بھلا
اس وقت اس پراسرار صلح کی تلاش کا کیا موقع تھا جبکہ حکومت بڑے زور شور سے قوم کو
ہر طرح کچلنے کی کوشش کر رہی تھی اور انڈمن میں لوگ فاقہ کر کے جان دے رہے تھے مگر میں
جانتا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو گاندھی جی کا اصول یہی ہے کہ وہ صلح کی درخواست ضرور کرتے ہیں
حکومت کا جبر و تشدد زور شور سے جاری تھا اور پبلک چندہ وغیرہ کو روکنے کے لئے تمام
خاص قوانین نافذ تھے۔ فروری ۱۹۳۴ء میں میرے والد کے یوم وفات کا جلسہ ہونے والا تھا مگر
پولیس نے اس کو بھی روک دیا حالانکہ اسے کانگریس سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کے صدر
سر تیج بہادر سپرو جیسے اعتدال پسند تجویز کئے گئے تھے۔ آئندہ جو واقعات ہمارے حال پر
ہونے والے تھے ان کی جھلک ہمیں وہائٹ پیپر میں دکھائی گئی تھی۔
یہ ایک عجیب و غریب تحریر تھی جسے پڑھ کر انسان دم بخود رہ جاتا تھا اس میں یہ
تجویز تھی کہ ہندوستان موجودہ ہندوستانی ریاستوں کا ایک تابعدار صوبہ بنا دیا جائے
اور اس کی وفاقی حکومت میں ان ریاستوں کے قدامت پسند نمائندوں کا اثر غالب ہو

مگر جو ان ریاستوں میں باہر والوں کا کوئی اثر ہو اور وہاں ہی دستور خالص استبداد کا
دور دورہ ہے مستشاہی کی اصل کڑیوں یعنی قوموں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہم ہندوستانیوں
کے مرنے کے عالم ہیں اور ہمارے ملک کے اندر کی پالیسی زیر دیک کے کو سلطے سکریٹری آف انڈیا
کے ہاتھ میں رہے۔ تمام مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کی حفاظت اس طرح کی جائے کہ
اس میں کوئی دست اندازی نہ ہو سکے ملک نے مستقل حقوق رکھنے والے مقتدر پیدا کیے
جائیں عظیم الشان امپیریل سروسیں جن سے ہمیں دلی محبت ہے بدستور آزاد اور خود مختار
رہیں تاکہ وہ ہمیں رفتہ رفتہ حکومت خود اختیاری کی تربیت دیں صوبوں میں انتخابی
حکومت ہو مگر گورنر ایک شفیق مختار کل کی حیثیت سے ہماری تادیب کرتا رہے اور سب کے
اوپر حاکموں کا حاکم مختاروں کا مختار وائسرائے ہو جسے سعید دنیا کا اختیار حاصل ہو صحیح پوچھیے
تو برطانیہ کے حکمران طبقے کو نو آبادیوں پر حکومت کرنے کا جو ملکہ حاصل ہے اس کا کمال اس
دستاویز میں نظر آتا ہے اور اگر ہٹلر اور مسولینی جیسے لوگ ہندوستان کے وائسرائے
پر رشک کریں تو بجا ہے جائیں۔

ہندوستان کو اس دستور کی زنجیروں میں جکڑنے کے بعد ویسٹ منسٹر اور لیا
اور تحفظات کی بیڑیاں اس کے پیروں میں ڈال دی گئیں تاکہ وہ بصیب تمدن میں چل بھی
نہ سکے بقول مسٹر نویل چیمبرلین کے حکومت برطانیہ نے انتہائی کوشش سے ان تجویز
کے ساتھ ان تمام تحفظات کو بھی کر دیا ہے جو انسان کی عقل سوچ سکتی تھی۔

پھر ہمیں یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ ان عنایات کے بدلے میں ہمیں ایک بھاری رقم ادا
کرنی پڑے گی یعنی چند کروڑ قیمت اور پھر سالانہ قسطیں۔ ظاہر ہے کہ سوراج کی کرسیاں بغیر
معقول قیمت دیئے ہوئے کیونکر حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہم اس دھوکے میں تھے کہ ہندوستان
ایک غریب ملک ہے اور بھاری بوجھ میں دبا ہوا ہے اور ہمیں امید تھی کہ جب آزادی ملے گی
تو یہ بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر اب معلوم ہوا کہ نہیں۔ یہ اور بڑھ جائے گا

ہندوستان کے مسئلہ کا یہ مضحکہ خیز حل اس شان کے ساتھ پیش کیا گیا جو برطانوی قوم
کے حصے میں آئی ہے اور ہم سے کہا گیا کہ دیکھو تمہارے حکمراں کس قدر فیاض ہیں۔ آج تک کسی
شہنشاہی حکومت نے کسی محکوم قوم کو ایسے اختیارات اور حقوق اپنی خوشی سے نہ دیے
ہوں گے۔ انگلستان میں بھی بڑا غل تھا اور ان لوگوں میں جو اس سخاوت کو دیکھ کر
دہشت زدہ ہو گئے تھے اور اس کی مخالفت کر رہے تھے بڑی کڑی بحثیں ہوئیں۔ اس
تدوین کا جو ہندوستان اور انگلستان کے درمیان تین سال سے ہو رہی تھی
تین گول میز کانفرنسوں اور بے شمار کمیٹیوں کا یہ نتیجہ تھا۔

مگر انگلستان جانے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کی جوائنٹ
سلیکٹ کمیٹی وہائٹ پیپر کا فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھی تھی اور ہندوستانی اسیسر
اور گواہوں کی حیثیت سے بڑے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور کمیٹیوں کا اجلاس
لندن میں ہو رہا تھا اور ہمارے ملک میں بہت سے لوگ ان کمیٹیوں کی ممبری کے لئے فکر کر رہے
تھے تاکہ لندن کا ٹکٹ مفت میں مل جائے اور مرکز سلطنت کی زیارت کا موقع نصیب
ہو۔ وہائٹ پیپر کی دل شکن تجویزیں ان سورماؤں کی ہمت کو پست نہیں کر سکیں اور وہ
سمندر اور ہوا کے سفر کی جوکھم اٹھانے اور لندن کے قیام کے شدید خطروں کا مقابلہ کرنے
کو تیار ہو گئے تاکہ اپنی صلاحیت اور جادو بیانی کے زور سے ان تجویزوں کو بدلوانے کی
کوشش کریں۔ وہ یہ جانتے تھے، کہتے بھی تھے کہ کام ذرا دشوار اور مایوس کن ہے مگر وہ میدان
سے ہٹنے والے نہ تھے اور اس پر تلے ہوئے تھے کہ کوئی اُسے ہاتھ سے ہم ایسی کیسے جانے دیں گے
ان میں سے ایک صاحب جو تعاونی پارٹی کے لیڈر تھے اور سب لوگوں کے دیس آنے کے
بعد بھی جمے رہے اور لندن کے ارباب اقتدار سے ملاقات پر ملاقات کرتے رہے اور ان کے
ساتھ ڈنر پر ڈنر کھاتے رہے تاکہ خوب اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیں کہ وہ کیا سیاسی
تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ جب وہ مداحا کر کے وطن لوٹے تو انھوں نے پبلک سے جو ان کے

اس تار میں جو بھیجی تھی یہ فرمایا کہ وہ مرہٹوں کی شہرۂ آفاق پارٹی کے ساتھ لندن میں ڈٹے رہے
اور آخر وقت تک اپنے مطالبات کو دہراتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے تعاونی دوست ظرافت
کی حس مطلق نہیں رکھتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے مذاق میں کوئی بات کہی جس سے یہ حضرات
محظوظ ہونے کے بجائے بگڑ بیٹھے اور والد کو اپنا مطلب سمجھانا پڑا اور ان کی تالیف قلب کرنی
پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس سے انھیں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ مجھے یہ شکایت سن کر مرہٹوں کے
قابل قدر سیاسی جوش کا دھیان آتا تھا جس کا اظہار نہ صرف پچھلے زمانہ میں ہوا بلکہ آج
بھی ہماری قومی جنگ میں ہو رہا ہے اور ملک کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی جو دنیا
کی کسی قوت سے نہیں ڈرتا تھا جس کا سر کٹ جائے مگر جھکتا نہ تھا۔

لبرل وہائٹ ہیپر کے دل سے مخالف تھے اور انھیں وہ جبر و تشدد بھی ناپسند تھا
جو ان دنوں ہندوستان میں ہوتا رہتا تھا بلکہ ایک آدھ بار انھوں نے اس کے خلاف
احتجاج بھی کیا اور اس کے ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ وہ کانگریس اور اس کی جدوجہد کو برا سمجھتے ہیں
کبھی کبھی وہ حکومت کو کسی بڑے کانگریسی لیڈر کی رہائی کا مشورہ دیتے تھے اور ان کی ہمدردی
صرف چند افراد تک محدود تھی جن کی ان سے ملاقات تھی۔ لبرل اور تعاونی دونوں جو دلیل
پیش کرتے تھے وہ یہی کہ فلاں شخص رہا کر دیا جائے کیونکہ اب امن عامہ کے لئے کوئی خطرہ
نہیں ہے اور پھر حکومت کو ہر وقت اختیار ہے کہ اگر وہ اور کوئی شرارت کریں تو انھیں
دوبارہ گرفتار کر لے۔ اس وقت حکومت کا یہ عمل زیادہ قرین انصاف ہوگا۔ انگلستان کے
بعض حضرات بھی ازراہ عنایت ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبروں اور چند خاص افراد کی رہائی
کی تحریک کرتے تھے اور یہی دلیلیں پیش کرتے تھے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہم ان حضرات کے
شکرگزار نہ ہوں جو اسیری میں ہمارے پرسان حال تھے مگر بعض وقت یہ خیال آتا تھا کہ
ہمارے یہ مہربان اگر ہم پر احسان جو کرتے تو یہ احساس ہوتا ہمیں ان کے خلوص نیت میں

عمل درآمد کریں۔ ان کے خیال میں دوسری صورت یہی ہو سکتی تھی کہ کچھ نہ کیا جائے لوگ
چپ کر کے بیٹھے رہیں۔ فرمایا کہ اگر ہم عمل اتنا پاس اعتدال رکھتے ہیں۔ اگر ہم میں خاموشی سے دوسروں
پر اثر ڈالنے کی صلاحیت، اس کی رائے بدلنے کی قوت اور حقیقی قابلیت ہے تو یہی موقع
ہے جب ہمیں ایسی صفات کا پورا پورا ثبوت دینا چاہیے۔ بقول کلکتے کے اخبار سٹیٹسمین
کے ایڈیٹر، یہ دلکش الفاظ کا ایک طلسم تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر شاستری کا مسلک ہے سب خطیبوں کی طرح ان کو بھی عمدہ عمدہ الفاظ کو
خوش اسلوبی سے ادا کرنے کا شوق ہے۔ مگر وہ اکثر اپنے خوش کن لفظوں کی رو میں بہہ جاتے ہیں
اور جب الفاظ کا طلسم وہ باندھتے ہیں اس میں خود بھی اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ انہیں
پتہ چلتا ہے نہ دوسروں کو۔ اگر ہم ان کے اس اپیل پر جو انہوں نے اپیل سے پہلے
سول نافرمانی کے دوران میں کلکتہ میں کیا تھا تنقیدی نظر ڈالیں تو جائزے سے عیاں
ہوگا۔ بنیادی اصول و مقاصد سے قطع نظر کر کے دو باتیں قابل غور معلوم ہوتی ہیں
اول یہ کہ ان کے خیال میں خواہ برطانوی حکومت ہمیں کتنا ہی ذلیل کرے ہمیں
ہمیں اس کی اطاعت سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔ کوئی ایسی حد نہیں مقرر کی جا سکتی
جس کے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ گو درست کہ ورسٹلوم بھی ایک وقت مثلاً اگر ظالم
سے لڑنے پڑ جاتا ہے تو لڑنا پڑتا ہے۔ مگر مسٹر شاستری کے مشورے کے مطابق ہندوستانیوں کو
کبھی اس کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیے۔ گویا ان کے نزدیک برطانوی حکومت کی اطاعت
اور اس کے احکام کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ ہے۔ یہ لفظ یہاں موزوں نہیں اگر مجبوراً استعمال
کرنا پڑے یہ نوشتہ تقدیر ہے تو ہمیں چار و ناچار پورا کرنا ہے۔

یہ یاد رہے کہ وہ یہ مشورے کسی خاص صورت حال کے متعلق نہیں دے رہے
تھے۔ دستور اساسی کی تبدیلیاں ابھی تک زیر غور تھیں۔ اگرچہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو گیا
تھا کہ وہ بہت ناقص ہوں گی۔ وہ یہ کہتے تو ایک بات بھی تھی کہ گو وہ خاص بہتر

کی تجاویز باقی میں جیسکن میں تمام حالات کے لحاظ سے یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر وہ
قانون کی شکل اختیار کریں تو ہمیں چاروناچار ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس صورت میں
حواہ ان کا مشورہ اچھا سمجھا جاتا یا نہ اگر وہ واقعات کے مطابق ہوتا اگر تجاویز منظور ہو جاتیں
تو اس سے کہیں آگے بڑھ گئے۔ ان کا ارشاد تھا کہ خواہ یہ تبدیلیاں کتنی ہی بری
کیوں نہ ہوں ہمیں بہرحال قبول کر لینی چاہییں۔ وہ اس معاملے میں حق تو می
نقطۂ نظر سے انتہائی اہمیت رکھتا تھا اور برطانوی حکومت کو سیاہ و سپید کا اختیار
دینے کو تیار تھے۔ مری سمجھ میں نہیں آتا کس طرح کوئی شخص یا جماعت بالکل مستقل
کے متعلق دوسروں کے فیصلہ کو پہلے سے قبول کر سکتی ہے۔ یہ تو تب ہی ہو سکتا ہے
جب وہ مطلق کوئی اصول یا اخلاقی اور سیاسی معیار نہ رکھتی ہو اور اس کا دین ایمان
یہی ہو کہ حاکم کے حکم پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ اس وقت مصلحت کا مقتضا کیا تھا۔ وہائٹ پیپر
صرف پہلا مرحلہ تھا اور ابھی ان تجویزوں کے قانون بننے میں بہت سے مرحلے باقی تھے
اس میں شک نہیں کہ حکومت کے نقطۂ نظر سے وائٹ پیپر کی منزل بہت اہم تھی مگر
بہرحال ابھی اسے بہت سی منزلوں سے گزرنا تھا اور یہ ممکن تھا کہ اس دوران میں
اس میں اچھی یا بری تبدیلیاں ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلیاں اس بات پر منحصر تھیں
کہ برطانوی حکومت اور پارلیمنٹ پر مختلف فریقوں کی طرف سے کس حد تک دباؤ پڑے۔
یہ بات بعید از قیاس نہ تھی کہ حکومت اس کشمکش میں ہندوستانی لبرل پارٹی کو اپنی
طرف کھینچنے کے لیے ان تجاویز کو کچھ بہتر بنا دے یا کم سے کم بدتر بنانے سے باز رہے
مگر ابھی اصلاحات کے قبول کرنے یا رد کرنے کا سوال اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ
مسٹر شاستری نے زور شور سے یہ اعلان کر دیا اور حکومت پر ظاہر ہو گیا کہ
ہندوستانی لبرل پارٹی کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں اپنی طرف کھینچنے کو

تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ وہ خود بخود کھنچے چلے آتے تھے۔ اور اگر حکومت انھیں
دھکا دے کر نکالنا چاہتی تب بھی نہ نکلتے۔ جہاں تک میں اس معاملہ پر خود لبرل پارٹی
کے نقطۂ نظر سے غور کر سکتا ہوں مجھے یہی نظر آتا ہے کہ مسٹر شاستری کی کلکتہ کی
تقریر بالکل خلاف مصلحت اور لبرل جماعت کے مقاصد کے لئے مضر تھی۔

میں نے مسٹر شاستری کی پرانی تقریر پر تفصیلی بحث اس وجہ سے نہیں کی کہ
بجائے خود یہ تقریر یا لبرل فیڈریشن کا جلسہ کوئی اہمیت رکھتا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ
میں لبرل لیڈروں کی ذہنیت کو سمجھتا ہوں۔ یہ لائق اور قابل قدر لوگ ہیں مگر
انتہائی کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے یہ طرزِ عمل کیوں
اختیار کیا ہے۔ مسٹر شاستری کی ایک اور تقریر کا بھی جو میں نے جیل میں پڑھی تھی
مجھ پر بہت اثر ہوا۔ جون ۱۹۳۲ء میں وہ پونا میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی
کے جلسے میں صدر کی حیثیت سے تقریر کر رہے تھے۔ اس میں انھوں نے یہ دکھایا کہ
اگر برطانوی عملداری ہندوستان سے یکایک اٹھ جائے تو کس قدر خطرے پیدا
ہو جائیں گے اور سیاسی تحریکیں باہمی نفرت اور ایک دوسرے پر حد درجہ تشدد کر کے
کیا آفت برپا کر دیں گی۔ بقول ان کے برطانیہ کی سیاسی زندگی ہمیشہ روا داری پر
مبنی رہی ہے۔ اس لئے اگر ہندوستان کی آئندہ نشوونما برطانیہ کے اتحاد عمل سے
ہو تو یہاں رواداری کا پیدا ہونے کی زیادہ امید ہو سکتی ہے۔ جیل میں ہونے کی وجہ
سے میرے پاس اس تقریر کا ماخذ صرف اس کا وہ خلاصہ تھا جو کلکتہ کے اسٹیٹسمین
میں شائع ہوا۔ اس پر اسٹیٹسمین نے یہ لکھا کہ "یہ بڑا دل خوش کن نظریہ ہے اور ہم
یہ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر مونجے نے بھی حال میں اسی قسم کی تقریریں کی ہیں"۔ اس تقریر کے
آخر میں مسٹر شاستری نے اس کا ذکر کیا کہ روس، اٹلی اور جرمنی میں رعایا کی آزادی
سلب کر لی گئی ہے اور ان پر وحشیانہ مظالم ہو رہے ہیں۔

اس کو پڑھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے
میں مسٹر شاستری کا خیال برطانیہ کے انتہائی قدامت پرست جماعت سے کس قدر حیرت انگیز
مشابہت رکھتا ہے۔ دونوں میں کچھ جزوی اختلافات ضرور ہیں مگر بنیادی خیال ایک
ہی ہے۔ اگر مسٹر ونسٹن چرچل بھی بالکل انہیں الفاظ میں تقریر کرتے تو کوئی بات ان کے
اصول کے خلاف نہ ہوتی۔ مسٹر شاستری ہماری لبرل پارٹی کے ترقی پسند فریق سے
تعلق رکھتے ہیں اور اس کے سب سے قابل لیڈر ہیں۔

افسوس ہے کہ میں شاستری کے تاریکی نظریے اور ان خیالات سے جو وہ
تمام عالم خصوصاً برطانیہ اور ہندوستان کے متعلق رکھتے ہیں مطلق اتفاق نہیں کر سکتا۔
غالباً انگریزوں کے سوا کوئی شخص بھی ان کی تائید نہ کرے گا لیکن روشن خیال انگریز
بھی ان سے متفق نہیں ہوں گے۔ شاستری صاحب میں یہ کمال ہے کہ وہ دنیا کو اور
خود اپنے ملک کو برطانوی حکمرانوں کی منتخب نظر سے دیکھتے ہیں پھر بھی یہ تعجب کی
بات ہے کہ انھوں نے اپنی تقریر میں ان غیر معمولی واقعات کا کوئی ذکر نہیں کیا جو
پچھلے اٹھارہ مہینے میں ہندوستان میں پیش آ چکے تھے اور جیسی اس تقریر کے وقت پیش
آ رہے تھے۔ انھوں نے روس، اٹلی اور جرمنی کے مظالم بیان کر ڈالے مگر خود اپنے
ملک کے خوفناک جبر و تشدد اور ہر قسم کی قانونی آزادی کی پامالی کا نام تک نہ لیا
ممکن ہے کہ انھیں صوبۂ سرحد کے ہولناک واقعات اور بنگال کے حالات جنہیں ابو
راجندر پرشاد نے حال میں کانگریس کے خطبۂ صدارت میں قیامت خیز بتا کر تعبیر کیا
تھا، معلوم نہ ہوں اس لئے کہ ان پر احتساب کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ مگر کیا انہیں
یہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا کہ ہندوستان سخت مصیبت میں ہے اور اس کے ہم قوم
ایک زبردست دشمن سے شدید جنگ میں مصروف ہیں جن پر ان کی موت اور زندگی
کا انحصار ہے؟ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ملک کے بڑے بڑے علاقوں میں

پولیس کا راج ہے مارشل لا کی سی حالت ہے تعزیری ضابطوں کی گرم بازاری ہے۔
لوگ جیل میں بھوک ہڑتال کر رہے ہیں اور طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں، کیا
انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ جس آزادی اور رواداری کے لئے وہ برطانیہ کی تحسین
کیا کرتے تھے اسے خود برطانیہ ہندوستان میں کچل رہا ہے۔
اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کانگریس سے متفق تھے یا نہیں تھے۔ انہیں
اس کا پورا حق تھا کہ وہ کانگریس کی پالیسی پر تنقید کریں اور اسے برا بھلا کہیں مگر
سوال یہ ہے کہ کیا ایک ہندوستانی ایک محب آزادی ایک ذی حس انسان کی
حیثیت سے ان پر اپنے ملک کے مردوں اور عورتوں کی حیرت انگیز بہادری اور قربانی
کا کچھ اثر نہیں ہوا؟ کیا انہیں یہ دیکھ کر مطلق تکلیف نہیں ہوئی کہ ہمارے حکمراں ہندوستان
کے دل پر آرے چلا رہے ہیں؟ کیا انہیں اس پر کوئی جوش نہیں آیا کہ سینکڑوں ہزار
آدمی ایک زبردست سلطنت کی قوت کے آگے جھکنے اور اپنی روح کو ہلاک کرنے
سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ ان کے جسم روند ڈالے جائیں، ان کے گھر برباد ہو جائیں اور
ان کے پیارے دنیا بھر کی تکلیفیں سہیں؟ ہم لوگ جیل میں اور جیل سے باہر صبر کا
اظہار کرتے تھے ہنستے تھے اور مسکراتے تھے۔ مگر اکثر تبسم کے ساتھ ہماری آنکھوں
میں آنسو جھلک آتے تھے اور کبھی کبھی ہمارا ہنسنا رونے سے مشابہ ہوتا تھا۔
ایک بہادر اور فراخ دل انگریز مسٹر ویرر ایلون نے ان تاثرات کا ذکر کیا
جو اس منظر سے اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے وہ ۱۹۳۱ء کے متعلق لکھتے ہیں:
"ایک قوم کی قوم کو اپنی ذہنی غلامی کی زنجیریں توڑتے ہوئے اور عزم واستقلال کی
بلندی پر چڑھتے ہوئے دیکھنا ایک عجیب و غریب تجربہ تھا" اور ایک موقع پر سیتاگڑھ
صوبے کے گورنر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے۔

مسٹر سری نواس شاستری ایک قابل قدر اور روشن آدمی ہیں اور ان کے ہم وطن ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ کسی طرح یقین نہیں آتا کہ ان کے دل پر اثر نہیں ہوا اور انہیں اس تحریک میں اپنے ہم وطنوں سے ہمدردی رہی تھی۔ ان سے یہ توقع تھی کہ ان کی آواز اس حیرت زدہ کے خلاف اٹھے گی۔ جس کے ذریعے حکومت تمام قانونی حقوق کو پامال کر رہی تھی اور ہر قسم کی پبلک جدوجہد کو روک رہی تھی۔ یہ امید تھی کہ وہ اور ان کے رفیق جو مصیبت زدہ علاقوں، یعنی صوبہ سرحد اور بنگال میں جائیں گے اس لئے نہیں کہ کانگریس یا سول نافرمانی کو مدد دیں گے بلکہ اس لئے کہ حکام اور پولس کی زیادتیوں کا پردہ فاش کر کے انہیں روکیں۔ دوسرے ملکوں میں سیاسی اور ملی آزادی کے حامی عموماً یہی کرتے ہیں۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ فاسد کے استبداد کو روکتے جو ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو کچل رہا تھا اور جس نے انہیں معمولی حقوق سے بھی محروم کر دیا تھا۔ یا کم سے کم حقیقت حال سے واقفیت حاصل کرتے، انھوں نے برطانوی حکومت کو حمایت، آزادی اور روا داری کی سند دے دی۔ ٹھیک اسی وقت جب یہ حوصلہ ہندوستان کی برطانوی حکومت میں عام کر رہی تھیں اپنی اخلاقی تائید سے انھوں نے حکومت کی ہمت افزائی کی اور اس کے استبداد کو تقویت پہنچائی۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی نیت یہ نہ ہوگی اور انہیں اپنے طرز عمل کے نتائج کا اندازہ نہیں ہوا ہوگا مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ان کی تقریر کا یہی اثر ہوا سوال یہ ہے کہ آخر کار ان کے یہ خیالات اور یہ عمل کیوں ہے؟

مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ سوا اس کے کہ لبرل پارٹی نے اپنے ہم وطنوں سے اور جدید خیالات سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہے۔ جو فرسودہ کتابیں انھوں نے پڑھی ہیں ان کی بدولت ہندوستان میں لبرل کے حالات اور خیالات ان کی

طرف سے چھپ گئے ہیں اور وہ خود سستی میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں ہم جیل میں گئے اور ہمارے جسم کال کوٹھری میں بند ہیں مگر ہمارے ذہن قید سے آزاد ہماری روحیں ہیبت اور وحشت سے بری رہیں۔ مگر لبرلوں نے اپنے ہاتھوں اپنے لئے ایک ذہنی قید خانہ سا بنا لیا ہے جس میں وہ بھٹکتے پھرتے ہیں مگر نجات کی کوئی صورت نہیں پاتے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز جیسی اب ہے ویسی ہی رہنی چاہئے مگر حالات بدل رہے تھے اگر اس بدلنے والی دنیا کا دستور ہے تو ان کی سست رفتار کی کشتی ڈگمگانے لگی۔ وہ جسمانی اور ذہنی حیثیت سے بے بس ہو کر رہ گئے ان کا کوئی نصب العین رہا اور نہ اخلاقی معیار۔ ہم میں سے ہر شخص کو دو چیزوں میں سے ایک چیز اختیار کرنی ہے۔ یا خود قدم بڑھائے یا دھکے دے کر آگے بڑھایا جائے اس حرکت پذیر دنیا میں کوئی ساکن نہیں رہ سکتا۔ ہمارے لبرل حرکت اور تغیر سے ڈرتے تھے۔ اس لئے وہ اس طوفان کو دیکھ کر جو چاروں طرف سے اٹھ رہا تھا بدحواس ہو گئے۔ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ موجوں کو چیر کر آگے بڑھیں اس لئے ڈبکیاں کھانے لگے اور جو تنکا سامنے آگیا اس کا سہارا ڈھونڈھنے لگے ہندستان کی سیاست میں ان کی حیثیت کشمیر کے بطخ کی سی ہو گئی" جس کے چہرے پر فکر کی زردی چھائی رہتی تھی" اور وہ تنک بھچکاہٹ اور تذبذب کا شکار ہو کر رہ گئے۔

" زمانے کا شیرازہ بکھر گیا تھا ہو تقدیر کی ستم ظریفی تھا
جس نے مجھے اس بگاڑ کے لئے پیدا کیا "

سرونٹ آف انڈیا جو لبرل جماعت کا ہفتہ وار اخبار ہے سول نافرمانی کے آخری دنوں میں کانگریس والوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ خود ہی جیل جاتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ رہا کر دئے جائیں۔ وہ اس پر جھاتا تھا کہ کانگریس کی بے ڈھنگی ایک پالیسی رہ گئی ہے اور لبرل جماعت کی پالیسی کیا تھی؟ رضاکارانہ ور...

حرمت میں ڈپوٹیشن بھیجا اور دعائیں مانگتے رہا کہ انگلستان میں حکومت بدل جائے۔
یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ کانگریس کی پالیسی ان دنوں زیادہ تر یہی تھی کہ لوگ
تحریری ضمانتوں کی خلاف ورزی کر کے جیل جائیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ قوم ایک حد
تک لڑتے لڑتے پست ہو گئی تھی اور حکومت پر کچھ زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکتی تھی
مگر یہ پالیسی اخلاقی اور عملی مصلحتوں پر مبنی تھی۔

کھلا ہوا استبداد جو ان دنوں ہندوستان میں ہو رہا تھا حکومت کو
بہت مہنگا پڑتا تھا۔ خود اس کے لئے بھی یہ بڑی تکلیف دہ اور پریشان آزمائش تھی
اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ پالیسی آخر میں اس کی حکومت کی بنیادوں کو کمزور
کر دے گی۔ اس سے نہ صرف ہندوستانی قوم بلکہ ساری دنیا کے سامنے اس کے
طرز حکومت کا پردہ فاش ہو جاتا تھا وہ اسے بدرجہا بہتر سمجھتی تھی کہ اس کا آہنی پنجہ
مخمل کے دستانے میں چھپا رہے۔ حکومت کے لئے اس سے زیادہ ناگوار اور اگر
غور سے دیکھا جائے تو اس سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں کہ اسے ایسے لوگوں سے
سابقہ پڑے جو کسی حال میں بھی اس کی مرضی کے آگے سر نہ جھکائیں اس لئے استبدادی
قوانین کی خلاف ورزی کی متفرق اور منتشر کوششیں بھی فائدے سے خالی نہ تھیں ان سے
قوم کو تقویت پہنچتی تھی اور حکومت کی ہمت پست ہوتی تھی۔

اخلاقی مصلحت اس سے بھی زیادہ اہم تھی تھورو کا مشہور مقولہ ہے کہ "جب
مرد اور عورتیں بے انصافی سے قید کی جا رہی ہوں تو ہر انصاف پسند مرد اور عورت
کو قید خانے جانا چاہئے" ممکن ہے کہ یہ مشورہ لبرل حضرات اور دوسرے بزرگوں کو
پسند نہ آئے لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ موجودہ حالات میں اخلاقی
زندگی نا قابل برداشت ہے۔ جبکہ سول نافرمانی کے علاوہ یوں بھی ہمارے اکثر رفیق
قید فرنگ میں گرفتار رہتے ہیں اور حکومت کے استبداد کا نظام ہمیں ہر وقت ستاتا

ہماری قوم کو رہتا ہے ہم ایسے ملک میں بستے لوگوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں
ہر وقت ہماری نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہتی ہے، ہر لفظ جو ہماری زبان سے نکلتا
ہے قلمبند کر لیا جاتا ہے کہ کہیں اس میں ہم گیر تاؤں بغاوت کی خلاف ورزی نہ ہو ہمارے
خطوط کھول لیے جاتے ہیں اور ہمیں ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ ہمارا حکم امتناعی
یا گرفتاری کا پروانہ آرہا ہے، ہمارے سامنے دو ہی صورتیں ہیں یا تو حکومت کی قوت
کے آگے سر جھکا دیں اور روحانی ذلت اختیار کرلیں اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیں اپنی
اخلاقی دولت کو ادنیٰ اغراض کے بدلے بیچ ڈالیں یا مخالفت کریں اور اس کی سزا
بھگتیں کوئی شخص خوشی سے جیل جانا یا تکلیف اٹھانا نہیں چاہتا مگر جیل جانا
ذلت کی زندگی بسر کرنے سے بہتر ہوتا ہے بقول برنارڈ شا کے زندگی کی حقیقی
مصیبت یہ ہے کہ انسان پرستوں کے ہاتھوں میں ان اغراض کا آلۂ کار بنے
جن کو وہ ادنیٰ اور ذلیل جانتا ہے اور جتنی مصیبتیں ہیں وہ زیادہ سے زیادہ بدقسمتی
اور تقدیری حادثات کا حکم رکھتی ہیں یہی ایک چیز ہے جو تمام غلامی اور دنیا کا دوزخ
ہے"

طویل سزا کا خاتمہ

میری رہائی کا وقت قریب آرہا تھا۔ "نیک چلنی" کی ساری مجھے حسبِ معمول
چھوٹ ملی تھی۔ اس لئے میری ۹ سال کی سزا میں ۳½ مہینے کی تخفیف ہوگئی،
تھی رہائی کی توقع نے میرے سکونِ قلب میں خلل ڈال دیا تھا یا یوں کہیے
کہ وہ عام بے حسی جو جیل میں پیدا ہو جاتی ہے دُور ہوگئی تھی۔ باہر نکل کر مجھے کیا کرنا
چاہیے؟ یہ بڑا مشکل سوال تھا اور چونکہ اس کا کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آتا
تھا اس لئے رہائی کا سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا مگر یہ عارضی کیفیت تھی جو بہت جلد
گزر گئی۔ میرا ارادوں کا دبا ہوا جوشِ عمل اُبھر آیا اور میں بے چینی سے رہائی کا
انتظار کرنے لگا۔

جولائی ۱۹۳۳ء کے آخر میں یہ دردناک خبر آئی کہ جے ایم سین گپتا کا
یکایک انتقال ہوگیا۔ ہم دونوں نہ صرف کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں برسوں
سے ساتھ ساتھ کام کرتے رہے تھے بلکہ میرے اور ان کے اس زمانے کے تعلقات
تھے جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا۔ وہیں پہلے پہل میری اُن کی ملاقات ہوئی تھی جب
میں وہاں داخل ہوا تو وہ سند حاصل کرکے فارغ ہو چکے تھے۔

سین گپتا کا انتقال نظربندی کے دوران میں ہوا۔ ۱۹۳۲ء کے آغاز میں
جب وہ یورپ سے واپس آئے تو ابھی اُنھوں نے ساحلِ بمبئی پر قدم بھی نہ رکھا
تھا کہ شاہی قیدی کی حیثیت سے گرفتار کرلئے گئے۔ اس وقت

سے وہ بار قید یا نظر بند رہے اور اُن کی صحت خراب ہوتی گئی حکومت نے انہیں
بہت کچھ سہولتیں بہم پہنچائیں لیکن مرض برابر بڑھتا گیا اُن کی آرتھی کے موقع پر
کلکتہ میں ایک عظیم الشان مظاہرہ ہوا اور بے شمار آدمیوں نے نذرِ عقیدت
پیش کی۔ گویا مظلوم بنگال کے گھٹے ہوئے جذبات کو کم سے کم عارضی طور
پر نکاس کا ایک راستہ مل گیا

عرصہ میں گپتا ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے سوبھاش بوس بھی
شاہی قیدی تھے، اور ان کی صحت بھی مدتوں قید اور نظربندی کے سبب سے خراب ہوگئی
تھی، خدا خدا کرکے حکومت نے انہیں علاج کی غرض سے یورپ جانے کی اجازت
دی۔ ہمارے پرانے اور آزمودہ کار لیڈر وٹھل بھائی پٹیل بھی یورپ میں بیمار
پڑے ہوئے تھے اس کے علاوہ اور نہ جانے کتنے جیل کی مصیبتوں اور باہر
کی پیہم مصروفیتوں کی تاب نہ لاکر اس دنیا سے سدھار گئے، یا اپنی صحت
کھو بیٹھے کچھ کتنے ایسے تھے جنہیں اگرچہ بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن
اس غیر طبعی زندگی کی وجہ سے ان کے دماغ میں خلل پیدا ہوگیا اور ان کے
نفس میں طرح طرح کی گرہیں پڑ گئیں

سین گپتا کی موت نے میری آنکھیں کھول دیں اور میں نے دیکھا کہ سارا
ملک خاموشی سے انتہائی مصیبتیں اٹھا رہا ہے مجھ پر افسردگی اور اداسی چھا گئی۔
اور میں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سب کس لئے؟

صحت کے معاملے میں، میں بڑا خوش قسمت ہوں اگرچہ کانگریس کے کام
میں مجھے سخت محنت کرنا پڑی اور میں نے نہایت بے ترتیب زندگی گذاری لیکن
میری صحت ہمیشہ اچھی رہی اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ میرے قویٰ طبعی
طور پر بہت اچھے تھے دوسرے یہ کہ میں اپنے جسم کی بڑی نگہداشت کرتا تھا۔

جس طرح میں بیماری اور کمزوری کو برا سمجھتا تھا اسی طرح موٹاپے کو بھی سخت ناپسند کرتا تھا اس لئے کافی ورزش اختیار ہوا اور سادہ غذا کے ذریعے سے میں اُن دونوں سے محفوظ رہا میرا تجربہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اوسط طبقے کی بہت سی بیماریوں کی وجہ غلط قسم کی غذا ہے اس میں چکنائی اور ثقیل اجزا بہت ہوتے ہیں اور مقداریں بھی زیادہ ہوتی ہے (یہ صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس اسراف کی مقدرت رکھتے ہیں) لاڈ کرنے والی ماں اپنے بچوں کو مٹھائیاں اور طرح طرح کی چیزیں، ٹھوس ٹھوس کر کھلاتی ہے اور ابتدا سے منہ کا مزہ بگاڑ دیتی ہے جو پھر تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس کے علاوہ بچوں پر بہت سے کپڑے بھی لاد دیئے جاتے ہیں ہندوستان آکر انگریزوں کی خوراک بھی بہت بڑھ جاتی ہے گرچہ ان کی غذا میں چکنائی اور ثقیل چیزوں کی اتنی بھرمار نہیں ہوتی غالباً اب وہ لوگ اعداد کے مقابلہ میں کچھ سنبھل گئے ہیں جو بہت بڑی مقدار میں گرم اور ثقیل مہ کھایا کرتے تھے

میں کبھی غذا کی اصلاح کے وہم میں نہیں پڑا صرف ثقیل غذاؤں سے، و زیادہ کھانے سے پرہیز کرتا رہا۔ تقریب تقریب تمام کشمیری برہمنوں کی طرح ہمارا خاندان بھی گوشت کھایا کرتا تھا اس لئے بچپن سے میں بھی گوشت کھاتا رہا اگرچہ مجھے اس کا شوق نہ تھا ۱۹۲۰ء میں جب عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی میں نے گوشت کھانا ترک کر دیا اور نباتی غذا کا عادی ہو گیا۔ چھ برس تک میں نے گوشت نہیں کھایا لیکن یورپ جا کر کھانے لگا ہندوستان آکر پھر چھوڑ دیا اور اُس وقت سے اب تک میں کم و بیش نباتی غذا کا پابند ہوں۔ گوشت مجھے موافق آتا ہے لیکن اب مجھے اس سے رغبت نہیں رہی ہے بلکہ کراہت معلوم ہوتی ہے۔

۱۹۳۲ء میں جیل خانے میں کئی مہینہ تک مجھے روزانہ حرارت رہا کی، اس قسم کی خفیف علالتیں مجھے بہت ناگوار ہوتی تھیں کیونکہ مجھے اپنی صحت پر گھمنڈ تھا اسے صدمہ پہنچاتا تھا، تو بحیات اور جوش عمل کا جو تصور میرے پیش نظر رہا کرتا تھا۔ وہ اب قائم نہیں رہا اور ضعف اور انحطاط کا خیال مجھے ستانے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے موت کا کچھ زیادہ خوف نہیں ہے لیکن دماغ اور جسم کا آہستہ آہستہ گھُلنا بالکل دوسری چیز تھی۔ لیکن میرا وہم غلط ثابت ہوا میری طبیعت سنبھل گئی اور میں نے اپنی صحت پر قابو پالیا۔ جاڑوں میں دیر تک "دھوپ کا غسل" کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا اور مجھے پھر تندرستی کا احساس ہونے لگا جس زمانے میں میرے جیل کے ساتھی کوٹ پہنے اور شال اوڑھے سردی سے کانپتے رہتے تھے میں ننگا دھوپ میں بیٹھا رہتا تھا اور سورج کی خوشگوار گرمی کا لطف اُٹھاتا تھا یہ چیز صرف جاڑے کے موسم اور وہ بھی شمالی ہند میں ممکن ہے کیونکہ اور جگہ تو بہت سخت دھوپ پڑتی ہے۔

ورزشوں میں ترتیب آسن میں مجھے جس لُطف آتا تھا اس کی ترکیب یہ ہے کہ سر کے بل کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں گونتھ کر اُن سے گردن کو سہارا دیا جائے اور کہنیاں زمین پر ٹکی رہیں، میرا خیال ہے کہ یہ ورزش جسمانی صحت کے لئے بہت مفید ہے لیکن میں اس لئے اسے زیادہ پسند کرتا تھا کہ مجھ پر اس کا نفسیاتی اثر بہت اچھا پڑتا تھا۔ اس ترتیب سے جو کسی قدر مضحک تھا تفریح ہوتی تھی اور زندگی کی خفیف الحرکاتی سے طبیعت زیادہ مانوس ہو جاتی تھی

افسردگی اور اُداسی کے دوروں میں جو جیل میں لازمی طور پر ہوتے

ہیں صحت اور تندرستی کا یہ احساس بہت کم آتا تھا اور اسی کی بدولت میں جیل کے امداد اور جیل کے باہر اپنے حالات کے ساتھ نباہتا رہا مجھے بہت سے قیدیکے پیچھے، حواس وقت ناقابل برداشت معلوم ہوتے تھے۔ لیکن مجھے جو حیرت ہے کہ میں خلاف توقع ان سے بہت جلد سنبھل گیا میرے دل و دماغ کی صحت اور اعتدال کا ایک ثبوت ہے کہ جو آج تک میرے سر میں درد ہوا، اور نہ کبھی بے خوابی کی شکایت ہوئی تہذیب جدیدہ کی ان عام بیماریوں سے اور ضعف بصارت سے بھی میں محفوظ رہا اگرچہ میں کثرت سے پڑھتا لکھتا رہا ہوں اور وہ بھی بعض اوقات جیل کی دھندلی سی روشنی میں، مگر میری نظر اب تک کمزور نہیں ہوئی پچھلے سال ایک امراض چشم کے ماہر کو اس پر سخت تعجب ہوا آٹھ سال پہلے انھوں نے یہ پیشینگوئی کی تھی کہ دو ایک سال کے اندر ہی مجھے عینک کی ضرورت پڑ جائے گی لیکن ان کی رائے غلط نکلی اور آج بھی میں بغیر عینک کے اچھی طرح سب کام کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے ان باتوں سے لوگ مجھے نہایت معتدل اور محتاط سمجھنے لگیں اس لئے میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ان لوگوں سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ جو کسی وقت اعتدال اور احتیاط کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

ادھر میں جیل میں اپنی رہائی کا منتظر تھا اور ادھر ملک میں سول نافرمانی کی نئی صورت یعنی انفرادی نافرمانی شروع ہو رہی تھی گاندھی جی نے خود اس کی ابتدا کی اور حکام کو پہلے سے اطلاع دینے کے بعد یکم اگست کو گجرات کے کسانوں کو سول نافرمانی کی تلقین کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوگئے انہیں فوراً گرفتار کر کے ایک سال کی سزا کردی گئی۔ اور پھر یرواڈا جیل بھیج دیئے گئے۔ مجھے اُن کے

دوبارہ جیل جانے سے خوشی ہوئی۔ لیکن اس کے بعد ہی ایک نئی پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ گاندھی جی نے اصرار کیا کہ مجھے جیل میں بھی ہریجن اُدّھار کا کام کرنے کی وہی سہولتیں ملنا چاہئیں، جو باہر حاصل تھیں لیکن حکومت نے صاف انکار کر دیا۔ یکایک ہمیں اطلاع ملی کہ گاندھی جی نے پھر اس سلسلے میں برت شروع کر دیا ہے۔ ہمیں تو یہ بات عجیب و غریب معلوم ہوئی کہ اتنی چھوٹی سی بات کے لئے اتنا بڑا قدم اٹھایا جائے چاہے حکومت کے مقابلے میں ان کی دلیلیں کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی ان کا یہ فیصلہ میری سمجھ سے باہر تھا لیکن ہم بالکل بے بس تھے۔ اور حیرت کے عالم میں حالات کی رفتار کو دیکھ رہے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد ان کی حالت بڑی تیزی سے خراب ہونا شروع ہوئی اس لئے وہ جیل سے اسپتال پہنچا دئے گئے۔ لیکن یہاں بھی وہ قیدی کی حیثیت سے تھے اور حکومت انہیں ہریجن اُدّھار کے کام میں کوئی سہولتیں بہم پہنچانے کو تیار نہ تھی۔ پچھلے برتوں میں انھوں نے عزم حیات کو نہیں چھوڑا تھا مگر اب کی بار انھوں نے بالکل کندھا ڈال دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بس چند دن کے مہمان ہیں۔ انھوں نے سب کو الوداع کہا اور ان چند چیزوں کے متعلق جو اسپتال میں ان کے پاس تھیں وصیت بھی کر دی۔ ان میں سے بعض چیزیں نرسوں کو دیں۔ لیکن حکومت کب چاہتی تھی کہ ان کی موت کا الزام اس کے سر آئے۔ اس لئے اسی روز شام کو یکایک وہ رہا کر دئے گئے۔ ۔۔۔

رہائی میں دوست پر ہوئی اگر ایک دن بھی دیر ہو جاتی تو بس کام تمام تھا اُن کی جان بچانے کا سہرا اصل میں مس ف اینڈریوز کے سر ہے جو گاندھی جی کے حکم کے خلاف ہندوستان بھاگے ہوئے آئے

اسی عرصہ میں میں ۲۳ر اگست کو ڈیرہ دون جیل سے نینی جیل میں تبدیل کیا گیا کوئی ڈیڑھ برس دوسرے جیلوں میں رہنے کے بعد میں یہاں واپس آیا تھا اسی وقت مجھے اطلاع ملی کہ میری ماں سخت بیمار ہیں۔ اور ہسپتال بھیجا دی گئی ہیں۔ چونکہ ان کی حالت نازک تھی۔ اس لئے میں ۳ر اگست کو رہا کر دیا گیا ویسے میری میعاد ۱۲ر ستمبر کو ختم ہونی تھی غیر معمولی حالات کی وجہ سے صوبے کی حکومت نے میرے ساتھ ۱۳ دن کی اور رعایت کر دی۔

(۵۰)

گاندھی جی سے ملاقات

مئی کے ع میں سیدھا اپنی بیماریاں کے پاس لکھنؤ گیا اور چیدور اُس کے بعد بہت عرصے کے بعد جیل سے باہر نکلا تھا اس لئے ماحول سے بیگانگی سی محسوس کرتا تھا مجھے یہ دیکھ کر کچھ صدمہ سا ہوا کہ دنیا رنگ بدلتی ہوئی بہت آگے بڑھ گئی تھی اور ہم جیل میں پڑا سڑتا رہا جیل سے باہر نکل کر سب سے پہلی کیفیت گذرتی ہے ہم باہر آکر دیکھتے ہیں کہ وہ بچے لڑکے اور لڑکیاں جنہیں ہم بہت چھوٹا چھوڑ گئے تھے اب ماشاءاللہ بڑے ہو گئے ہیں بہت سی شادیاں ولادتیں اور موتیں ہو چکی ہیں دنیا محبت اور نفرت، کام اور کھیل، الم و راحت کے بہت سے منظر دیکھ چکی ہے زندگی کی نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہو گئی ہیں صحت کے نئے نئے موضوع اٹھ کھڑے ہوئے ہیں بغرض میں جو کچھ سنتا یا دیکھتا تھا اس میں میرے لئے حیرت کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا تھا جیسے زندگی مجھے جہالت کے گڑھے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی ہے یہ کوئی خوش گوار خیال نہ تھا یہ ممکن تھا کہ میں بہت جلد اپنے ماحول سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر لیتا لیکن میں نے اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں نے خیال کیا کہ مجھے صرف چند روز جیل کے باہر رہنا ہے اس کے بعد پھر وہیں جانا پڑے گا اس لئے میں ان چیزوں سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کیوں کروں، جو مجھ سے بہت جلد چھوٹ جائیں گی۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں کم و بیش خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

پبلک جدوجہد کو حکومت دبا رہی تھی۔ اور کبھی کبھی گرفتاریاں بھی ہو جاتی تھیں۔ لیکن اس وقت ہندوستان کی یہ خاموشی بڑی معنی خیز تھی یہ منحوس خاموشی تھی جو خوفناک تشدد کے بعد چھا جاتی ہے۔ وہ خاموشی جو زباں حال سے بہت کچھ کہتی ہے، لیکن تشدد کرنے والی حکومتیں اُسے سُن نہیں سکتیں۔ اس وقت ہندوستان اس ریاست کا مکمل نمونہ تھا جو محض پولیس کا کام کرتی ہے پولیس کی ذہنیت حکومت کے تمام شعبوں پر چھائی ہوئی تھی ہر طرح کی مخالف آواز دبا دی جاتی تھی حصہ پولیس والوں جاسوسوں اور مخبروں کا سارے ملک میں ایک جال پھیلا ہوا تھا عام طور پر لوگوں پر رعب و ہراس طاری تھا اور ساری فضا میں اخلاقی پستی کے آثار نمایاں تھے۔ حکومت ہر طرح کی سیاسی جدوجہد کو دور آزما دیتی تھی خصوصاً دیہاتی علاقوں میں مختلف صوبوں کی حکومتیں اس کی کوشش کر رہی تھیں کہ میونسپلٹی اور لوکل بورڈ کی ملازمت سے کانگریس والوں کو نکال باہر کیا جائے۔ ان کی نظر میں وہ شخص جو سول نافرمانی کے سلسلے میں جیل ہو آیا تھا میونسپل مدارس میں تعلیم دینے یا میونسپلٹی میں اور کوئی کام کرنے کی قطعاً اہلیت نہیں رکھتا تھا چنانچہ میونسپلٹیوں پر بہت دباؤ ڈالا گیا اور انھیں دھمکی دی گئی کہ اگر کانگریس والوں کو برخاست نہیں کیا تو سرکاری امداد بند کر دی جائے گی اس طرز اور زیادتی کی سب سے نمایاں مثال کلکتہ کارپوریشن میں دیکھنے میں آئی میرا خیال ہے کہ آخر میں حکومت بنگال نے ایسا قانون بنا دیا کہ جو شخص کسی سیاسی جرم میں سزایاب ہو چکا ہو وہ کارپوریشن میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔

جرمنی میں نازی جو زیادتیاں کر رہے تھے، ہندوستان کے برطانوی افسروں اور ان کے اخباروں پر اس کا عجیب و غریب اثر پڑا تھا اسے وہ اپنے طرز عمل کے جواز میں پیش کرتے تھے اور اپنی نیکی پر ناز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اگر نازی تمہارے حاکم ہوتے تو تمہاری کیا گت بنتی؟ نازیوں نے تشدد کے عجیب عجیب طریقے

ایجاد کئے گئے تھے اور جبر کی حد کردی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مقابلہ کرنا
مشکل تھا ممکن ہے ان کی حکومت میں ہماری حالت اس سے بدتر ہوتی لیکن میں
اس کا صحیح فیصلہ نہیں کرسکتا کیونکہ گذشتہ پانچ سال میں خود ہندوستان میں جو کچھ ہوتا
رہا ہے اس سے میں پوری طرح واقف نہیں ہوں حکومت ہند اس نیک اصول کی
قائل ہے کہ سیدھا ہاتھ جو کچھ کرے الٹے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہونا چاہئے چنانچہ وہ غیر
جانب دارانہ تحقیقات کی تجویزوں کو رد کردیتی ہے حالانکہ اس قسم کی تحقیقات میں
ہمیشہ اسی کا پلہ بھاری رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام انگریز وحشیانہ مظالم
سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نازیوں کی طرح کھلم کھلا
"بہیمیت" پر فخر کریں اور اس کا فلسفہ پڑھیں اگر وہ کبھی بہیمیت سے کام بھی لیتے ہیں
تو انہیں خود اس پر شرم آتی ہے لیکن چاہے جرمن ہوں یا انگریز یا ہندوستانی سبھی
پر تہذیب کا ملمع اتنا ہلکا ہے کہ جذبات کی رگڑ سے فوراً اتر جاتا ہے اور پھر اندر سے
وہ چیز نکل آتی ہے جسے دیکھ کر کراہت آتی ہے جنگ عظیم نے انسانوں میں خوفناک
بہیمیت پیدا کردی اس کے اثرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں یعنی صلح
کے بعد بھی جرمنی کا بحری محاصرہ جاری رہا اور انسانیت وہمدردی کے دستانے پہنے
سے لوگوں کو فاقے کرنے پڑے اس کے متعلق ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ "دنیا
کی کسی قوم نے ایسا احمقانہ، خوفناک اور وحشیانہ ظلم نہ کیا ہوگا" ہندوستان میں بھی
۵۷ء اور ۵۸ء کی یاد دلوں سے محو نہیں ہوئی ہے جب کبھی کسی کے مفاد اور
حقوق خطرے میں ہوتے ہیں تو پھر شرافت اور تہذیب کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے
جھوٹ کا نام پروپیگنڈا پڑ جاتا ہے بہیمیت کو "سائنٹفک تشدد" اور امن وانصاف
کا تحفظ، کہنے لگتے ہیں اس میں افراد یا کسی خاص قوم کا کوئی قصور نہیں ہے ان
حالات میں ہر شخص کا کم وبیش یہی طرز عمل ہوتا ہے ہر محکوم ملک کی طرح ہندوستان

میں بھی ہمیشہ حکمراں قوت کی مخالفت کا ایک دبا ہوا مادہ موجود رہتا ہے کبھی کبھی یہ بھڑک اٹھتا ہے اور خطرناک صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اس مخالفت سے حکمران قوم میں اچھی بری ہر طرح کی وحشی صفات پیدا ہو جاتی ہیں گذشتہ چند سال میں ہمیں ہندوستان میں ان وحشی صفات کا بہت اچھی طرح تجربہ ہوا کیونکہ ہم حکومت کی جو مخالفت کر رہے تھے وہ بہت قوی اور بہتر ہوگئی تھی لیکن ہندوستان کو تو ہمیشہ سے اس وحشت و دہشت سے (جو حقیقی سیاسیات روح سے خالی ہے) سابقہ رہا ہے یہ شہنشاہی کا لازمی نتیجہ ہے اور اس میں حاکم اور محکوم دونوں کی ذلت ہے ہندوستانیوں کی ذلت تو کھلی ہوئی ہے لیکن انگریزوں کی ذلت اس قدر آسانی سے محسوس نہیں ہوتی البتہ جب نازک وقت آتا ہے تو یہ صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا فریق بھی ہے جس کے حصہ میں بدقسمتی سے دونوں قسم کی ذلتیں آتی ہیں۔

جیل میں مجھے اتنی کافی فرصت تھی کہ میں نے اعلیٰ افسروں کی تقریریں ان کے اسمبلی اور کونسلوں کے سوالات کے جواب اور حکومت کے اعلانات تفصیل سے پڑھے مجھے اندازہ ہوا کہ گذشتہ تین برس میں ان میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے اور یہ تبدیلی رفتہ رفتہ زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ ان کا لہجہ زیادہ درشت اور تحکمانہ ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک سرجنٹ میجر اپنے سپاہیوں کو حکم دے رہا ہو۔ اس کی ایک دلچسپ مثال وہ تقریر ہے جو مدنا پور (بنگال) کے کمشنر نے نومبر یا دسمبر ۱۹۳۳ء میں کی تھی یہ جنگجویانہ بات تمام سرکاری حلقوں میں یکساں پائی جاتی ہے غیر سرکاری یورپی خصوصاً بنگال میں سرکاری افسروں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ ان کی تقریر اور عمل دونوں میں بالکل وحشت و دہشت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

ہیبت کی ایک دوسری بین مثال سارہ میں دیکھنے میں آئی حال ہی میں

وہاں چند مجرموں کو منظرِ عام پر پھانسی دی گئی، چونکہ سندھ میں جرائم بڑھ رہے تھے اس لئے
افسروں نے طے کیا کہ ان مجرموں کو سب کے سامنے پھانسی دی جائے تاکہ دوسروں
کو عبرت ہو ۔ دہشتناک منظر دیکھنے کے لئے عام لوگوں کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی
گئیں سنا ہے کہ اس وقت ہزاروں آدمی جمع ہو گئے تھے۔

غرض رہائی کے بعد میں نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات کا جائزہ
لیا ان کو میں نے کچھ خوشگوار نہیں پایا میرے بہت سے ساتھی جیل میں تھے۔ اور
گرفتاریاں ابھی جاری تھیں۔ تمام تحریری ضابطے ابھی تک باقی تھے ۔ اسباب
اخباروں کا گلا گھونٹ رہا تھا، اور اس سے ہماری خط و کتابت میں ابتری ڈال رکھی
تھی میرے ایک رفیق کار رفیع احمد قدوائی، سنسر کی زیادتیوں سے نالاں تھے اُن
کے خط روک لئے جاتے تھے، دیر سے ملتے تھے یا غائب ہو جاتے تھے جس سے اُن
کے کاموں میں بڑی گڑبڑ ہوتی تھی وہ چاہتے تھے کہ سنسر سے درخواست کریں کہ اپنا
روش ذرا معقولیت سے انجام دے، لیکن مشکل یہ تھی کہ کسی کو خبر نہیں
تھی کہ سنسر کون ہے غالباً وہ کوئی خفیہ پولیس کا افسر ہوتا ہے جو پوشیدہ طور پر
اپنی خدمات انجام دیتا ہے اور اس کا وجود اور کام تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ لیکن
رفیع احمد نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ سنسر کے نام خط لکھا، اور لفافے
پر اپنا پتہ لکھ دیا چنانچہ واقعی یہ خط مرسل معکوس پر بھیج گیا اور اس کے بعد سے
رفیع احمد کے خطوں کے معاملے میں زیادہ احتیاط برتی جانے لگی

مجھے پھر جیل جانے کی امید تھی کیونکہ اتنے دن قید میں رہتے رہتے میرا جی
بھر گیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں اس سے بچ نہیں سکتا۔ پھر
آج کے سیاست سے کنارہ کش ہو جاؤں اس کے لئے میں ہرگز تیار نہیں تھا اور
حکومت سے ٹکر ہونا ناگزیر تھا۔ وہ جب چاہتی حکم نامہ بھیج دیتی کہ فلاں کام کرو۔ یا

فلاں کام نہ کرو اور میری طبیعت اس قسم کی ہے کہ زبردستی کبرداشت ہی نہیں کر سکتی
سے ملک میں ہندستانیوں کو ڈرانے اور دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں
اس معاملے میں بے بس تھا۔ بس سلسلے میں کوئی جدوجہد کرنا میرے امکان سے باہر تھا
بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ خود ڈر نہیں اور دب کر اطاعت نہ کروں۔

جیل جانے سے پہلے مجھے کئی کام نبٹانے تھے میری ماں بیمار تھیں اور سب
سے پہلے مجھے ان کی خدمت کرنی تھی۔ انھیں رفتہ رفتہ صحت ہو رہی تھی مگر اس
میں اتنی دیر لگ گئی کہ تقریباً ایک سال تک وہ صاحب فراش رہیں۔ پھر میں
گاندھی جی سے ملنا چاہتا تھا جو پونا میں اپنے برت کے ختم ہونے کے بعد
آہستہ آہستہ طاقت حاصل کر رہے تھے۔ مجھے اُن سے ملے دو برس سے زیادہ
ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ میں چاہتا تھا کہ اپنے صوبے کے زیادہ سے زیادہ
رفیقوں سے ملوں اور نہ صرف ہندستان کی سیاسی حالت بلکہ دنیا کی عام
حالت اور ان خیالات کے متعلق گفتگو کروں جو میرے دل و دماغ پر چھائے
ہوئے تھے اس وقت میرا خیال تھا کہ دنیا سیاسی اور معاشی اعتبار سے
بڑی تیزی کے ساتھ ہلاکت کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور اپنا قومی پروگرام
بناتے وقت اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

میرے خانگی معاملات بھی میری توجہ کے محتاج تھے اب تک میں ان
سے انتہائی بے پروائی برتتا رہا تھا یہاں تک کہ والد کے انتقال کے بعد میں نے
ان کے کاغذات بھی نہیں دیکھے تھے ہم نے اپنے اخراجات بہت گھٹا دیے تھے مگر
اب بھی وہ ہماری موجودہ حیثیت سے زیادہ تھے تاہم جب تک ہم اپنے پرانے گھر میں
رہتے ان کا اور گھٹانا مشکل تھا۔ موٹر اب ہمارے پاس نہیں تھی کیونکہ ہم اس کا خرچ
برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ حکومت جب چاہے گی اس پر قبضہ

کرے گی ایک طرف تو یہ مالی مشکلات درپیش تھیں اور دوسری طرف سیکڑوں خط آتے تھے جن میں لوگ مجھ سے مالی امداد طلب کرتے تھے (مسٹر ان خطوں کو نہیں گنتا تھا) سارے ملک میں اور خصوصاً صوبہ متحدہ میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ میں بڑا مالدار آدمی ہوں۔

میری رہائی کے بعد ہی میری چھوٹی بہن کرشنا کی منگنی ہو گئی اور میں چاہتا تھا کہ جیل بھیجے جانے سے پہلے اس کی شادی کر دوں۔ کرشنا خود بھی ایک سال کی سزا بھگتنے کے بعد ابھی چند مہینے ہوئے جیل سے آئی تھی

جوں ہی میری ماں کی طبیعت سنبھلی میں فوراً گاندھی جی سے ملنے کے لئے پونا روانہ ہو گیا مجھے ان سے مل کر اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ گو وہ ابھی تک کمزور تھے مگر ان کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جاتی تھی ہم دونوں میں گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں یہ ظاہر ہے کہ سیاست معاشیات اور زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق ہمارے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن میں ان کی اس شفقت کا ممنون ہوں کہ حتی الامکان انھوں نے میرے خیالات کی رعایت مدنظر رکھی میری ان کی خط و کتابت میں (جو بعد میں شائع ہو گئی) بہت سے وسیع مسائل پر جن پر میں ان دنوں غور کر رہا تھا، بحث کی گئی تھی اور اگرچہ ان کا ذکر مبہم الفاظ میں تھا لیکن منشا بالکل واضح تھا میں گاندھی جی کا یہ اعلان سن کر بہت خوش ہوا کہ مستقل حقوق کو منسوخ کر دیا جانا چاہئے۔ اگرچہ وہ اس پر زور دیتے تھے کہ ہمیں جبر سے نہیں بلکہ سمجھا بجھا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہئے چونکہ میرے نزدیک ان کے بعض طریقے مہذب اور معقول قسم کے جبر کے مترادف ہیں اس لئے میں دونوں صورتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں سمجھتا مجھے پہلے کی طرح اب بھی ان سے یہ توقع تھی کہ اگرچہ وہ مبہم نظریوں پر غور کرنے کے مخالف ہیں لیکن واقعات کی منطق انہیں رفتہ رفتہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دے گی کہ مساوی سماجی تبدیلی ناگزیر ہے وہ بھی عجیب و غریب شخص ہیں ایک طرف وہ (بہ قول مسٹر ویریر ایلون

کہ آقروں وطن کے کیتھولک اسلاف کی طرح ہیں اور دوسری طرف وہ عملی رہنما ہیں اور
ان کا ہاتھ ہمیشہ ہندوستانی کسانوں کی نبض پر رہتا ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وقت
آنے پر وہ کدھر جھکیں گے لیکن یہ یقینی بات ہے کہ جدھر بھی وہ جھکیں گے وہی پلہ
بھاری ہو جائے گا ممکن ہے وہ ہمارے نزدیک غلط راستہ اختیار کریں لیکن اس میں
کوئی شک نہیں کہ وہ ایک کھلا ہوا راستہ ہوگا ان کے ساتھ مل کر کام کرنا اس سے
بہتر ہے لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو پھر دوسری راہ اختیار کرنی پڑے گی۔

میرے خیال میں اس وقت تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تاہم اپنی قومی
جدوجہد میں مصروف تھے اور اصولاً کانگریس کا پروگرام اب تک سول نافرمانی تھا۔
اگرچہ وہ افراد تک محدود کر دی گئی تھی میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس وقت ہمیں موجودہ
صورت پر قناعت کرنی چاہیئے اور اشتراکی خیالات عام لوگوں میں خصوصاً کانگریس کے
ان کارکنوں میں جو سیاسیات میں کچھ دخل رکھتے ہیں پھیلانے چاہئیں تاکہ اگر وہ
جب کبھی ہماری پالیسی کے تعین کا موقع آئے تو ہم کافی پیش قدمی کے لئے تیار ہیں اس
وقت تو کانگریس خلاف قانون جماعت تھی اور حکومت برطانیہ نے کچل ڈالا یا ہی
تھی اس لئے ہمیں اس کے حملے کی مدافعت کرنی تھی۔

گاندھی جی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ خود انہیں کیا کرنا چاہیئے؛
وہ عجیب کشمکش میں تھے۔ اگر وہ جیل جاتے تو پھر ہریجن ادھار کی ہلچل کا
سوال درپیش ہوتا اور غالباً حکومت اپنی پہلی پالیسی سے ہٹتی اس لئے انہیں پھر
برت رکھنا پڑتا کیا پھر اسی طرح چلتا رہے، وہ اس آنکھ مچولی کے کھیل کو پسند نہیں کرتے
تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر اب ان سہولتوں کے لئے میں نے برت رکھا تو چاہے
میں رہا بھی کر دیا جاؤں برت جاری رہے گا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ وہ برت رکھ
کر جان دے دیں گے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اپنی سزا کی باقی میعاد میں (جس میں ابھی ڈیڑھ
مہینے باقی تھے) جیل جانے کی کوشش۔ کریں صرف ہریجن ادھار کا کام کرتے
رہیں البتہ کانگریس کے کارکنوں سے ملتے رہیں اور حسب ضرورت انہیں مشورہ دیتے رہیں
تیسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ عارضی طور پر کانگریس سے کنارہ کش
ہو جائیں اور سارا کام (بقول خود) سی آئی ڈی کے ہاتھ میں دے دیں
پہلی صورت کی ہم میں سے کوئی بھی تائید نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس میں بظاہر
ان کی موت یقینی تھی تیسری صورت اس وقت جبکہ کانگریس بطور خلاف قانون
جماعت تھی بہت نامناسب بات تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یا تو سول نافرمانی
اس قسم کی عملی جدوجہد فوراً ملتوی ہو جاتی اور آئینی کارروائی شروع ہو جاتی یا کانگریس
بے یار و مددگار رہ جاتی اور حکومت اسے اور زیادہ کچل ڈالتی اس کے علاوہ، اس جماعت
قانونی ادارے پر حملہ نہ ہو سکتا تھا اور نہ اس کی پالیسی پر بحث، کوئی جماعت
فیصلے کیوں کرتی غرض پہلی اور تیسری شکل رد کر کے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دوسری شکل
مناسب ہے ہم میں سے اکثر کو یہ صورت بھی پسند نہیں تھی اور ہم جانتے تھے کہ سول
نافرمانی کا رہا سہا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اگر لیڈر خود جنگ سے کنارہ کش ہو جائے
تو پھر کیا توقع ہو سکتی تھی کہ کانگریسی کارکنوں میں سے ایسے باہمت لوگ زیادہ
تعداد میں نکل آئیں گے، جو اس آگ میں کودنا گوارا کریں گے۔ لیکن اس کے سوا چارہ
ہی کیا تھا، بالآخر گاندھی جی نے اس مضمون کا بیان شائع کر دیا

گاندھی جی اور میں اس معاملے میں متفق تھے (اگرچہ ہمارے وجوہ مختلف
تھے) کہ سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے اور چاہے کمزور حالت
میں سہی لیکن اسے جاری رکھنا چاہیے۔ اسی لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوگوں کو
اشتراکی اصولوں اور واقعات عالم کی طرف توجہ دلاؤں۔

بات نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب کی جڑوں سے الگ ہو گئے ہیں
اور فنی روایات سے بالکل کورے ہیں۔ وہ ادنیٰ قسم کی نامعقول تصویروں
سے لطف اُٹھاتے ہیں جو جرمنی اور آسٹریلیا میں ڈھیروں چھپتی ہیں ان کی زیادہ
سے زیادہ پرواز راوی ورما کی تصویروں تک ہے۔ ہارمونیم ان کا محبوب ساز ہے
میں اسی امید میں بسر کرتا ہوں کہ سوراج کی حکومت پہلا کام یہی کرے گی
کہ اس نامعقول باجے کی ممانعت کر دے۔ لیکن شاید اس تکلیف دہ بے تکے
پن اور بد مذاقی کی انتہا لکھنؤ یا دوسری جگہ کے بڑے بڑے تعلقہ داروں کے
یہاں نظر آتی ہے۔ ان کے پاس خرچ کرنے کو روپیہ ہے اور انہیں نمود و نمائش
کا شوق ہے۔ وہ دل کھول کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ اور جو کوئی ان کے
یہاں جاتا ہے اُسے یہ تکلیف دہ منظر دیکھنے پڑتے ہیں۔

ادھر کچھ عرصے سے ٹیگور کے نامور خاندان کی سرکردگی میں آرٹ کے
صحیح مذاق کو پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کا اثر سارے ملک میں
صاف نظر آ رہا ہے لیکن جس ملک کے لوگ ہر قدم پر دبائے اور کچلے جا رہے ہوں
اور دہشت کی فضا میں زندگی بسر کرتے ہوں وہاں کوئی آرٹ کیسے پنپ سکتا ہے۔
بمبئی میں، میں بہت سے دوستوں اور ساتھیوں سے ملا۔ جن میں سے بعض
ابھی قید سے چھوٹ کر آئے تھے۔ وہاں اشتراکیت کا عنصر قوی ہے اس لئے
کانگریس کے ادبی حلقہ میں جو تازہ ترین واقعات ہوئے تھے ان پر دل کی بہت
کچھ ناخوشی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ گاندھی جی پر بحث نکتہ چینی ہو رہی تھی، کہ وہ
سیاست کو الٰہیات کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجھے بہت سے اعتراضوں سے
اتفاق تھا۔ لیکن یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی
چارہ نہیں ہے کہ ہم اسی طرح کام چلنے دیں۔ سول نافرمانی ملتوی کرنے سے کوئی

جو آج تک کسی نام نہاد انقلابی سے نہ ہو سکا۔ اس کی نئی تحریکیں ادھار کی
گرمجوشی بھی نہیں رکھتی ہے، مگر اس زبردست قوت کے ساتھ جس کا کوئی مقابلہ
نہیں کر سکتا کئی ہزار برس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ کٹر متعصبین کی ساری
جماعت اس کی مخالف ہو گئی ہے اور اسے ایسا سخت خطرناک دشمن سمجھتی ہے
حالانکہ وہ ہمیشہ ان سے بڑی نرمی اور شرافت سے پیش آتا رہا کہ وہ اپنے خاص
اندر سے اندرونی قوتوں کا خزانہ کھول دیتا ہے۔ جو سطح سمندر کی ہلکی ہلکی موجوں
کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہیں اور کروڑوں آدمیوں کو اپنے ساتھ بہائے جاتی ہیں۔ وہ
رہنما ایسا ہو یا انقلابی، گاندھی کی ذات تھی جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا
ایک پست اور توہم پرست قوم کو عزم و ہمت عطا کی۔ عام لوگوں میں بیداری اور قوت پیدا
کر دی اور ہندوستان کے مسئلے کو دنیا کا مسئلہ بنا دیا۔ پرامن عدم تعاون، اصول
ایثار کے مقصد اور فلسفیانہ نتائج سے قطع نظر اس کا طریق کار ایک عجیب
و غریب قوی اور موثر حربہ ہے جو اس شخص نے ہندوستان کے اور ساری دنیا کے
ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ اور ابھی تک۔ یہ نہیں کہ ہندوستان کے حالات
کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایمانداری کے ساتھ جو نکتہ چینی کی جائے ہمیں
اس کی قدر اور حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ اور جہاں تک ہو سکے لوگوں
کو موقع دینا چاہئے کہ وہ ہمارے معاملات پر دل کھول کر بحث کریں۔ یہ بات قدرتاً قابل
افسوس ہے کہ گاندھی جی کے اقتدار نے ایک حد تک سخت معاملے میں رکاوٹ
پیدا کر دی ہے۔ لوگ ہر معاملے میں ان کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں اور ہر بات کا فیصلہ
ان پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ طریقہ صریحی طور پر غلط ہے۔ قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے
جب وہ مقاصد اور طریق کار کو سمجھ بوجھ کر قبول کرے اور اس کا عمل اور انضباط

جلے کیا کرتی تھی اب انھیں اپنی تک و تاز کے لئے نئے میدانوں کی تلاش ہوئی۔ چنانچہ وہ مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے جینوا کی لیبر کانفرنس میں جانے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی حکومت کے وزیر اعظم بننے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ جو انگلستان میں "قومی حکومت" کہلاتی ہے۔

اس قسم کے رنگ برنگے خیالات اور سرگرمیاں بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوتی ہیں پھر بھی کانگریس کے معترضین میں ایسے بہت سے لوگ تھے جو مختلف میدانوں میں گھوڑے دوڑا چکے تھے اور اب بھی ہر طرح کی تحریکوں میں شریک تھے۔ ان میں سے بعض لوگ اپنے آپ کو اشتراکی بھی کہتے ہیں۔ انھیں کی وجہ سے اشتراکیت بدنام ہوتی ہے۔

(۱۱)

لبرل ذہنیت

جب میں گاندھی جی سے مل چکا تو ایک دوروں کے ساتھ سرونٹس
آف انڈیا سوسائٹی کے مرکز میں چلا گیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک سوسائٹی کے
خاص اراکین ان سے سیاسی مسائل پر سوالات پوچھتے رہے اور جواب دیتے
رہے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں سری نواس شاستری صاحب تھے جو اس
سوسائٹی کے صدر تھے اور پنڈت ہردے ناتھ کنزرو جو ان کے بعد اس کے
کے سب سے لبرل رکن تھے مگر بعض پرانے اراکین موجود تھے جو سب حال کے
تھوڑے سے آدمی تو اس گفتگو کو سن رہے تھے ان کی حیرت بڑھتی سی
بڑھتی جاتی تھی۔ اس لئے کہ سوالات اس وقت کے بہت اونچے واقعات کے
متعلق تھے اور ان کا موضوع زیادہ تر وہ درخواست تھی جو گاندھی جی نے ہم سے
دو دن پہلے وائسرائے سے ملاقات کے لئے کی تھی اور جسے وائسرائے نے منظور نہیں
کیا تھا۔ گویا بس یہی ایک اہم سوال رہ گیا تھا جو ان لوگوں کے ذہن میں آسکتا تھا
جب کہ ملک میں چاروں طرف دیکھئے تو اس سے اہم مسائل درپیش تھے جب اس کا بالکل آزادی
کے لئے ایک بہت بڑا جنگ میں چھڑا ہوا تھا اور سینکڑوں ادارے خلاف قانون قرار
دئے جا چکے تھے۔ اس وقت کاشتکاروں کے مسئلے کی حالت نازک ہو گئی تھی معیشت
ہماری کے سبب سے ہر طرف بے روزگاری پھیل رہی تھی سکال درہم جدید
کچھ ہو، یا تھا اس کا خیال کر کے کسی دفتر کے گنتا تھا حالات کی بلکہ کسی تحریک

اور اجتماع کی آزادی کا سر کچلا جارہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کیا جائے کتنی قومی اور
بین الاقوامی مسائل تھے مگر لبرل حضرات نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق
سوالات کرتے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ اگر گاندھی جی نے پیل کی تو اس کا
وائسرائے اور حکومت ہند پر کیا اثر ہوگا؟
مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں ایک خانقاہ میں پہنچ گیا ہوں جس کے رہنے والوں کا
ذہن گرد و پیش کی بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ ہی نہیں رہا ہے اور یہ خیال میرے
دل میں جاگزیں ہوگیا بلکہ نہ کہ ہمارے یہ دوست عملی سیاست میں حصہ
لے رہے تھے، ہوشیار لوگ تھے اور ان کی قومی خدمت اور ایثار کی کارگزاریاں
بھی کچھ کم نہ تھیں۔ یہ اور ان کے چند ساتھی لبرل پارٹی کی روح رواں تھے۔ باقی
پارٹی ایک مبہم اور بے شکل سی جماعت تھی جس کے رکن کبھی کبھی بس اس احساس کا
لطف اٹھانا چاہتے تھے کہ ہم بھی سیاسی جدوجہد میں شریک ہیں۔ ان میں سے بعض
خصوصاً بمبئی اور مدراس والے تو ایسے تھے کہ ان میں اور سرکاری ملازموں میں بس
نام کا فرق تھا۔
کسی ملک کے لوگ جس طرح کے سوالات کرتے ہیں وہ ان کی سیاسی نشوونما
کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ اکثر ان کی ناکامی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے ایسے
سوالات نہیں پوچھتے جو اصل اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری سیاسی پستی کا اندازہ اس
سے کیا جاسکتا ہے کہ ہم نشستوں کی فرقہ وارانہ تقسیم پر اپنا وقت اور پوری قوت
ضائع کرتے ہیں اور جھگڑا کیا کرتے ہیں یا فرقہ وارانہ فیصلے کی مخالفت یا
موافقت میں پارٹیاں بناتے ہیں اور ان مسائل کو نظرانداز کرتے ہیں جن پر ہماری
زندگی اور موت کا دارومدار ہے اس کے متعلق لاتامس تحقیق کرتے رہتے
ہیں۔ اسی طرح وہ سوالات جو اس دور میں سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے

مرکز میں پوچھے گئے۔ اس سوسائٹی اور لبرل پارٹی کی عجب واہی حالت کا آئینہ تھے معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے کوئی سیاسی اور معاشی عقائد ہی نہیں ہیں ان کی نظر میں وسعت نہیں ان کی سیاست بس اسی قسم کی ہے جس کا ڈرائنگ روم یا دربار میں چرچا رہتا ہے مثلاً یہ کہ فلاں بڑے عہدہ دار کیا کریں گے اور کیا نہ کریں گے۔

لبرل پارٹی کا نام غلط فہمی پیدا کرسکتا ہے۔ اور جگہ خصوصاً انگلستان میں اس جماعت کی ایک خاص سیاست تھی یعنی آزاد تجارت اور کاروبار کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا اصول اور شخصی آزادی اور شہری حقوق کا ایک خاص فلسفہ۔ انگلستان کی لبرل پارٹی کی تعلیم اور عقائد کی بنیاد معاشیات پر تھی اور تجارتی آزادی حاصل کرنے اور شاہی اجاروں اور بے ضابطہ محصولوں سے چھٹکارا پانے کی خواہش نے سیاسی آزادی کا حوصلہ پیدا کیا تھا ہندستان کی لبرل پارٹی کے عقائد ایسا کوئی پس منظر نہیں رکھتے۔ ہندوستانی لبرل آزاد تجارت کے قائل نہیں۔ حال کے واقعات نے انہیں اچھی طرح روشن کر دیا ہے کہ وہ سیاسی آزادی اور شہری حقوق کو بھی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ دیسی ریاستوں میں قریب قریب مطلق العنانی کا نظام رائج ہے۔ ان کی حکومتیں مطلق العنانی رکھتی ہیں اور وہاں جمہوریت اور شخصی آزادی کا ابھی تک ذکر بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود لبرل ان سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اور عموماً ان کی حمایت کرتے ہیں یہ بھی ایک صفت ہے جو انہیں یورپ کے لبرلوں سے ایک حد تک ممتاز بنا دیتی ہے۔ لبرل کے معنی ہیں حریت پسند۔ بہرحال اس لفظ کے جو معنی بھی لیجئے ہندوستانی لبرل حریت پسند نہیں ٹھہرائے جا سکتے زیادہ سے زیادہ [illegible]

یہ ٹھیک ٹھیک بتانا کہ وہ ہیں کیا، بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ ان کے خیالات
کی کوئی مبسوط اساسی بنیاد نہیں اور اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں پھر بھی ایک دوسرے
سے متفق نہیں۔ ان کی طاقت صرف نفی میں ہے۔ انہیں ہر طرف غلطیاں ہی
دکھائی دیتی ہیں وہ ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ
اس طرح حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔ سچ پوچھئے تو ان کے لئے حقیقت ہمیشہ
دو انتہائی مسلکوں کے بیچ میں کہیں پر ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز پر جس میں انہیں
انتہا پسندی نظر آتی ہے اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح وہ محسوس کرتے
رہتے ہیں کہ ہم نیک، اعتدال پسند اور اچھے ہیں۔ یہ طرز عمل انہیں غور و فکر کی
تکلیف دہ اور دشوار سلسلوں میں الجھنے سے بچائے رکھتا ہے اور وہ اس پر
کبھی مجبور نہیں ہوتے کہ اپنی طرف سے کوئی تعمیری خیال پیش کریں۔ بس کو
ایک طرح سے خیال ہوتا ہے کہ یورپ میں سرمایہ داری پورے طور پر کامیاب
نہیں ہوئی ہے اور انفرادیت میں بڑی ہے لیکن دوسری طرف ان کے نزدیک
یہ بات بھی کھلی ہوئی ہے کہ اشتراکیت بری چیز ہے کیونکہ وہ مسلّم حقوق
اور اصولوں پر حملہ کرتی ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر کوئی پُراسرار تدبیر سمجھ میں
آجائے کوئی بیچ کی منزل اس لئے اس درمیان میں مستقل شخصی حقوق املاک
وغیرہ کا تحفظ کرانا چاہیئے۔ اگر کبھی بحث چھڑے کہ سماگول سے تو غالباً لوگ
ان دونوں خیالات کو جس سے انتہا پسندی ظاہر ہوتی ہے رد کر کے کام
چلانے کے لئے کہہ دیں کہ وہ شاید جزوکوریا صادق ہو۔

یہ لوگ اصول اور غیر اہم باتوں پر جلسے برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور ایسی
چیخ پکار مچاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے حالانکہ اس لئے بھی کہ یہ
خصوصیت ان کے شعور کی تہہ میں بیٹھ گئی ہے۔ وہ بنیادی مسائل سے پہلو

ہوتے ہیں کیونکہ ایسے مسائل میانہ روی اصلاح اور مردانہ حکمت اندیشی اور عمل کے طالب ہوتے ہیں اس لئے لبرلوں کی بحیثیت دونوں یکساں سے اثر ہوتی ہے۔ اس کا کسی اصول سے تعلق نہیں ہوتا گویا اس پارٹی کی سب سے بڑی خصوصیت (اور اگر ایسے ہیں تو اس میں یہ بات ممکن ہو) اس کی خاص علامت) ہر نرمی اور بیچ بیچ میں اعتدال ہے۔ ایک فلسفہ حساب ہے۔ اور اس پارٹی کا پروگرام یہی موڈریٹ ہی شاید اس کے لئے سب سے زیادہ مناسب تھا۔

میں میانہ روی میں اپنی خاص شان سمجھتا ہوں'
لوگ مجھے ٹوری سمجھتے ہیں۔ اور ٹوری لوگ بیاں کرتے ہیں"
(الیگزینڈر پوپ)

لیکن میانہ روی چاہے جیسی قابل تعریف چیز ہو وہ ایک درجہ تک اوصاف صفت نہیں ہے۔ وہ مرلح میں حتکی پیدا کرلی ہے اور اس طرح بدقسمتی سے ہندوستانی لبرل رونے والوں کی طرح بن گئے ہیں۔ ان کے چہرے زرد اور روکھے۔ ان کی تحریر اور بات سے رس ہو لی ہے اور وہ زندہ دلی سے بالکل ناآشنا ہیں۔ ظاہر ہے ان میں سبھی ایسے نہیں اور ان لوگوں میں بعض مستثنیٰ کرنا ضروری ہے۔ سر تیج بہادر سپرو سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں شخصی طور پر سر تیج بہادر ہرگز عمر دل جیسے آدمی نہیں ہیں۔ ان میں ظرافت کی کمی نہیں اور خود ان پر کوئی فقرہ چست کیا جائے تو اس کا لطف اٹھا سکتے ہیں لیکن مجموعی طور پر لبرل جماعت کا فلسفہ تن پروری اور دولت پرستی کے کھسٹ اور خوش پن کا مزاج ہے۔ الہ آباد کے اخبار "لیڈر" نے جو لبرل اخبار وں

---

(۱) وگ انگلستان کی پرانی حریت پسند اور ٹوری قدامت پسند پارٹی کا نام تھا

یلی بہت سے متاثر ہے۔ پارسال ایک ایڈیٹوریل میں لکھا تھا جس سے اصل صورت حال خوب ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں بیان کیا تھا کہ بڑے اور غیر معمولی صفات کے لوگ ہمیشہ دنیا کے سر بلا میں لائے ہیں اور اس نے معمولی اوسط قابلیت کے آدمیوں کو ان پر ترجیح دیا جا رہا ہے۔ کس دیدہ دلیری سے یہاں کند ذہنی اور سست روی کا جھنڈا لہرایا گیا ہے۔

میانہ روی، قدامت پسندی، خطرے اور اچانک تبدیلی سے بچنے کی خواہش ایسی خصوصیتیں ہیں جو بڑھاپے کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں اور اکثر کے لئے ان میں مبتلا ہو جانا لازمی ہے۔ نوجوانوں میں ان کا ہونا اتنا ساسب نہیں لیکن ہمارا ملک پڑا ہے اور کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں بچے تک تھکے ماندے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے چہروں پر جھریاں اور بڑھاپے کے آثار نظر آتے ہیں لیکن اس پرانے ملک کو بھی وہ قوتیں جو زندگی کو بدلتی ہیں رستے دے رہی ہیں۔ اور میانہ روی کا فلسفہ حیات درہم برہم ہو گیا ہے پرانی دنیا ٹوٹ رہی ہے اور نسل لوگوں کی ساری میٹھی میٹھی معقول پسندی سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، طوفان، سیلاب اور زلزلے کسی کی دلیلیں نہیں سنتے نسلوں نے اب تک جن تصورات پر اپنے عقیدے اور عمل پر مبنی کیا تھا وہ سب جواب دے رہے ہیں اور ان میں اب اتنی ہمت نہیں ہے کہ غور و فکر اور عمل کے لئے نئی راہیں نکالیں۔ ڈاکٹر اے ایس وائٹ ہیڈ یورپ کی تہذیبی روایات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں" ان تمام نظریات کو اس مفروضے نے ناقص کر دیا ہے کہ ہر نسل کم و بیش اسی ماحول میں اپنی زندگی گزارے گی جس میں کہ پچھلی نسلوں نے گزاری تھی۔ اور اس ماحول کو اسی وقت تشکیل کے ساتھ اپنی اولاد کی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنے کے لئے چھوڑ جائے گی۔ ہم

انسانی تاریخ کے اس دور میں رہتے ہیں جب کہ پہلی بار یہ وصیہ غلط ثابت ہوا ہے " ڈاکٹر وائٹ ہیڈ نے اپنی اس تشریح میں بہت زیادہ نرمی سے کام لیا ہے اس لئے کہ یہ وصیہ ایک ہمارے زمانے کے لئے نہیں بلکہ مدت سے غلط رہا ہے۔ اگر یورپی روایات میں بھی قدامت پسندی ہے تو ہماری روایات میں قدامت پسندی سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ لیکن جب تبدیلی کا وقت آتا ہے تو زندگی کی تشکیل تو میں ان روایات کا ذرا بھی خیال نہیں کرتی ہیں۔ ہم نے بس کھڑے دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے منصوبوں کی ناکامی کا الزام دوسروں پر لگاتے ہیں اور کیفیت کو مسٹر ہرلڈ ہیرڈ نے دکھایا ہے " خود فریبی کی سب سے خطرناک صورت یہ ہے اس تصور کو ذہن میں قائم کر دیتی ہے کہ ہماری تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو یہ ہماری تدبیروں کا قصور نہیں بلکہ کسی دوسرے کا ہاں لوجہ کہ ہمارے کام کو بگاڑ دینے کا نتیجہ ہے "

ہم سب اس افسوس ناک خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ گاندھی جی بھی اس سے بالکل بچے ہوئے نہیں ہیں لیکن ہم کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں اس کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کی حقیقتوں سے غافل نہ ہو جائیں۔ ہمارے تجربے اور ہماری غلطیاں کبھی کبھی اس خود فریبی کے زور کو کم کر دیتی ہیں اور ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں لیکن لبرلوں میں یہ مرض ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ شدید ہے وہ غلطی کرنے کے ڈر سے کچھ کرتے ہی نہیں۔ گرنے کے ڈر سے جگہ ہی سے نہیں ہٹتے۔ عوام کے ساتھ وہ تعلقات قائم نہیں کرتے۔ خود دماغ اور حوصلہ کی درستی کے لئے ضروری ہیں اور آپ تصورات کی کوٹھریوں میں اس طرح بیٹھے رہتے ہیں گویا ان پر کسی نے جادو کیا ہے اور دانشوں نے ان پر آپ کو ہلنے جلنے کی قوت

سے محروم کردیا ہے۔ کوئی ڈیڑھ سال ہوا مسٹر بوا س شاستری صاحب نے اپنے لبرل بھائیوں کو خبردار کرنے کے لئے کہا تھا کہ یہ مت کو آپ الگ کھڑے رہیں اور بس جو کچھ ہوتا ہوا سے ہونے دیں۔ اس آگاہی کا پورا مطلب مسٹر نواس شاستری صاحب خود بھی نہیں سمجھے۔ ان کا مقصد تو حکومت کی کارروائیوں تک محدود ہے اور در اصل ان دستوری اصلاحات کی طرف اشارہ کر رہے تھے جنھیں جناب سرکاری کمیشیاں عمل میں لانے کی تدبیریں کر رہی تھیں۔ لیکن لبرلوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ جب ان کی اپنی قوم کے لوگ قدم بڑھائے آگے چلے جا رہے تھے تب بھی وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ وہ اپنے ملک کے عوام سے ڈرتے تھے۔ انھوں نے اپنے اور عوام کے درمیان خلیج کا پیدا ہونا گوارا کیا مگر حاکموں سے نہیں ہو سکی۔ پھر کیا تعجب ہے کہ وہ اپنے دیس میں پردیسی بن گئے۔ وہ زندگی کا قافلہ گزر گیا اور انھیں الگ کھڑے چھوڑ گیا۔ اس وقت جب ان کے ملک والے جان اور آزادی کے لئے جی توڑ کر لڑ رہے تھے تو اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ لبرل لوگ کس طرف ہیں۔ وہ دوسری طرف سے ہمیں اچھے اچھے مشورے دیتے رہتے تھے اور بڑی سنجیدگی سے ایسے اخلاقی اصول بیان کر رہے تھے جنھیں ہر کوئی جانتا ہے۔ اور جنھیں سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گاؤں کا ٹھالس وار روس ہمارے سر پر بیس رہا ہے۔ گول میز کانفرنسوں میں حکومت برطانیہ کے ساتھ ان کے اتحاد عمل نے حکومت کو جو اخلاقی تقویت پہنچائی اس کا خاص اثر ہوا۔ اگر وہ اتحاد عمل سے انکار کرتے تو اس سے ضرور فرق پڑتا۔ بات قابل غور ہے کہ ان کانفرنسوں میں سے ایک میں برطانیہ کی لبرل پارٹی شریک نہیں ہوئی۔ مگر ہمارے لبرلوں کو بھلا کون چیز روک سکتی تھی۔ ان سے بعض

انگریزوں نے بھی درخواست کی کہ آپ شریک رہیں۔ پردہ۔ بائے۔ ہم سب
میانہ رو یا انتہا پسند ہوتے ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ؛ کبھی غرض کے لئے کبھی
کسی کے لئے، اگر ہمارا دل کسی بات میں لگا ہے تو اس کا ہمارے جذبات پر
اثر ہوگا۔ ہر معاملے میں جہاں اس سے بحث ہوگی ہم نرمی کی بہ نسبت گرمی کی طرف
مائل ہوں گے۔ جب ایسا ہو تو اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں اگر ہم
خوشی کے ساتھ رواداری برتیں اور ایک فلسفیانہ میانہ روی اختیار کریں جس کا
اصل مقصد بے علمی پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے موڈریٹ
نہایت انتہا پسند اور لڑنے پر آمادہ ہوگئے ہیں جب یہ تجویز پیش ہوئی ہے
کہ ملک کے کوئی مستقل حقوق املاک وغیرہ مٹا دیئے جائیں ہمارے لبرل دوست
ایک حد تک خوش حال اور دولت مند لوگوں کے نمایندے ہیں ان کا سوراج
کے لئے انتظار کرنے میں کوئی ہرج نہیں اس لئے وہ سوراج کے معاملے میں
برانگیختہ نہیں ہوتے لیکن مادی معاشرتی اصلاح کی ہر تجویز انھیں بہت ہی
گرما دیتی ہے۔ وہ اپنی میانہ روی بھول جاتے ہیں اور دوسرے کی بات
ماننے پر خوشی سے آمادہ بھی نہیں ہوتے یعنی ان کی میانہ روی درحقیقت اس
روش تک محدود ہے جس کا تعلق برطانوی حکومت ہند سے ہے اور
وہ اپنے دل میں اس امید کی پرورش کر رہے ہیں کہ اگر وہ
ادب سے بات کریں اور حکومت پر آسانی سے راضی ہوتے رہے تو شاید
انھیں اس نیک چلنی کے بدلے میں شنوائی کا شرف بخشا جائے۔ ان کے لئے
انگریزوں کی رائے تسلیم کرنا اگر یہ ہے وہ پہلی کتابوں کا شوق اور ان کے مطالعہ

لہ

کرسکتے ہیں۔ ارسکن مے کی تصنیف "پارلیمنٹ کے رواج" اور اسی قسم کی دوسری
کتابیں ہر وقت ان کے پاس رہتی ہیں۔ اور کوئی نئی سرکاری رپورٹ شائع ہوتی
ہے تو ان کے یہاں بڑی چہل پہل ہوتی ہے اور خیالی گھوڑے دوڑائے جانے
لگتے ہیں۔ لبرل لیڈر جب انگلستان سے واپس آتے ہیں تو ایک عجب رعب
اور داب سے وائٹ ہال کے بڑے آدمیوں کی کارروائیوں کا حال بیان کرتے ہیں۔
کیونکہ وائٹ ہال لبرلوں، جوابی تعاونیوں اور ایسی جماعتوں کا مکہ ہے۔ پہلے کہا
جاتا تھا کہ جب نیک امریکن مرتے ہیں تو ان کی روحیں پیرس بھیجی جاتی ہیں اور اب
ممکن ہے کہ اچھے لبرلوں کی روحیں وائٹ ہال کے گرد و نواح میں گشت لگاتی ہوں۔
میں لکھ تو رہا ہوں لبرلوں کے متعلق لیکن یہ سب ہم لوگوں کے متعلق بھی
جو کانگریسی ہیں کہا جا سکتا ہے۔ جوابی تعاون والوں کی نسبت یہ اور بھی زیادہ
صحیح ہے۔ کیونکہ وہ میانہ روی میں لبرلوں سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ معمولی لبرل
اور معمولی کانگریسی میں بہت بڑا فرق ہے لیکن دونوں کی ایسی حد بندی نہیں
کی جا سکتی جو صاف ہو اور وسط لسٹر کی گنجائش نہ چھوڑے۔ کیونکہ خیالات اور
تصورات کو دیکھئے تو ان لبرلوں میں جو اس جماعت میں سب سے زیادہ
آزاد خیال ہیں اور میانہ رو کانگریسیوں میں ایک کو دوسرے پر برتری ثابت کرنا مشکل
ہے۔ لیکن گاندھی جی کی بدولت یہ تو ہو گیا ہے کہ ہر کانگریسی کا اپنی سرزمین اور
ملک کے رہنے والوں سے تھوڑا بہت تعلق ہو گیا ہے۔ اس نے سیاسیات
کے میدان میں ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح وہ مبہم اور
ناقص تصورات کے چند رسمی قسموں سے بچ گیا ہے۔ لبرلوں کا حال کچھ اور
ہے۔ ان کا رشتہ پرانی دنیا سے بھی ٹوٹ گیا ہے اور نئی دنیا سے بھی۔ مجموعی
حیثیت سے وہ انسان کی ان قسموں میں سے ہیں جو اب ناپید ہو رہی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں ہم میں سے اکثر ان احساسات کو کھو چکے ہیں جو ذہنوں کے عروج سے پہلے انسان کی رہبری کرتے تھے اور بصیرت کی نئی شکل ہمیں حاصل نہیں ہوئی ہے ہماری قسمت میں نہ ورڈسورتھ کو سمندر سے نکلتے ہوئے دیکھنا ہے، نہ بوڑھے ٹرٹین کو اپنا بیج دار سنکھ بجاتے سنا" اور بس تھوڑے ہی ایسے خوش قسمت ہیں کہ

"ریت کے ذرے میں ایک دنیا دیکھ سکیں
اور ایک جنگلی پھول میں فردوس کا سماں
فضائے لامحدود کو ہتھیلی پر رکھ سکیں
اور ایک گھڑی میں ابدیت محسوس کر لیں"

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم میں سے اکثر فطرت کی رگوں میں جوش کو دوڑتے پھرتے نہیں محسوس کر سکتے۔ نہ اپنے کان کے پاس اس کے دھیمے بول سن سکتے ہیں، نہ اس کے چھونے سے ہمارے جسم میں مسرت کا لرزہ آتا ہے۔ وہ دن لد گئے لیکن اگر ہم پہلے کی طرح فطرت میں عظمت کے آثار نہیں دیکھ سکتے تو ہم نے نوع انسانی کی فتح اور شکست میں اس کے زبردست حوالوں اور دلی طوفانوں میں اس کے تڑپا دینے والے درد اور اس کی ناکامیوں میں اس کی کشمکش اور اس کی حیثیتوں میں اور اس یقین میں جو اور سب کیفیتوں پر چھایا رہا ہے اور اس کا عظیم الشان مقصد اور اس کی آرزوئیں پوری ہوں گی دیکھنے کی کوشش کی ہے یہ ایک طرح سے سادھ ہے ان تمام دل تسکیوں کا جو ایسی کوشش اور جستجو کے ساتھ لگی ہوئی ہیں

لہ پروٹیس اور ٹرٹین یونانیوں کے دریائی دیوتا تھے۔

اور اس نے ہمیں اکثر حقیر حوصلوں کو بھلا کر بلندی کی طرف مائل کیا ہے لیکن
بہتیرے ایسے ہیں جنہوں نے انسانی سرگذشت میں حقیقت کو تلاش کرنے
کی کوشش نہیں کی ہے اور چونکہ انہوں نے پرانی وضع کو چھوڑ دیا ہے
انہیں اب کسی طرف کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ وہ بہتر زندگی کے خواب دیکھتے
ہیں۔ ان میں عمل کی صلاحیت ہے ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ فرانس کے
بڑے انقلاب میں اور روسی انقلاب میں نوع انسانی نے کس طرح جینا
ہو کر طے کیا ہے۔ نوع انسانی کی وہ خواہشیں جو مدتوں سے دبی ہوئی ہیں
جب اپنی تمام پیچ پیچیوں سمیت کوہ آتش کی طرح اچانک اور بڑے درد
کے ساتھ آگ برسانے لگتی ہیں تو وہ ڈر جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک نوع انسانی
نے اپنے قید خانے کی ایک دیوار بھی نہیں گرائی ہے۔

لوگ خود پسندی کے عنصر میں اکثر کہتے ہیں کہ "وطن پرستی کانگریسیوں
کا اجارہ نہیں ہے" یہی فقرہ بار بار اس طرح دہرایا جاتا ہے کہ آدمی اس بات
سے مایوس ہو کر پریشان ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ کسی کانگریسی نے
اس حق میں کبھی دوسروں کے حصہ دار ہونے کا دعویٰ نہ کیا ہوگا۔ بہرحال میں
اسے ہرگز کانگریس کا اجارہ نہیں سمجھتا اور جو کوئی بھی چاہتا ہو میں خوشی سے
اسے اس کے حوالے کر دوں گا۔ وطن پرستی اکثر ان لوگوں کی جائے پناہ
ہوتی ہے جو موقع سے فائدہ اٹھانا یا اپنی حیثیت بنانا چاہتے ہیں اور
مذاق اور غرض اور طبقے کے لوگوں کے لئے اس کی ایک مناسب شکل
حاصل ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ کا وہ چیلا جس نے انہیں دغا دی تھی آج کل
ہوتا تو وہ بھی وطن پرستی کی آڑ لیتا۔ وطن پرستی اب کافی نہیں رہی ہے
ہمیں اب اس سے برتر اس سے وسیع تر اور بلند تر مسلک درکار ہے۔

بے دردی مذاق خود کبھی کافی نہیں۔ ضبط اچھی چیز ہے اور ہماری شائستگی
کا اسی سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ضبط کے ساتھ وہ بھی تو چاہیئے کہ
جسے روکئے اور قابو میں رکھئے۔ انسان کی قسمت میں ازل سے مقرر ہے کہ وہ
تمام قدرت کو قابو میں لائے۔ بجلی پر سوار ہو، آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں اور
پانی کے منہ زور بہتے دھاروں کو اپنے کام میں لائے۔ لیکن اس کے لئے سب
سے زیادہ مشکل ان جذبات کی روک تھام کرنا اور انھیں قابو میں لانا ہے جو
اس کے اندر امڈتے اور جلاتے رہتے ہیں۔ جب تک وہ انھیں اپنے قبضے
میں نہ کر لے وہ انسانیت کے پورے ورثہ کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا
اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ان ٹانگوں کو آگے نہ بڑھائیں جو خود چلنے سے معذور
ہیں ان ہاتھوں سے کام نہ لیں جن پر فالج گرا ہے؟

اس موقع پر رائے کیمپبل کے چار مصرعے لکھے بغیر نہیں رہا جاتا جو اس نے
جنوبی افریقہ کے چند ناول نویسوں پر کہے تھے۔ یہ ہندوستان کی بعض سیا
ستوں پر بھی اسی طرح پورے اترتے ہیں۔

لوگ اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ تمہارے ضبط پر کوئی مدِ مقابل نہیں آ سکتا۔
اس معاملے میں مجھے تم سے پورا اتفاق ہے۔
تم لگام اور دہانے کو تو خوب استعمال کرتے ہو
مگر یہ تو بتاؤ کہ گھوڑا کم بخت کہاں ہے؟

ہمارے لبرل دوست کہتے ہیں کہ وہ اعتدال کے تنگ راستے پر چلنے میں
کانگریس اور حکومت ہند کے دونوں کناروں کے بیچ میں اس کشتی کو کھیتے
انھوں نے اس کا فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے [illegible] کر اس میں۔ اس میں
بھی دانائی ہے اور اس بات پر [illegible] کریں گے

عیب ہیں اس کے۔ وہ ترازو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور انصاف کی دیوی کی طرح شاید وہ اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں یا ان پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ کیا میرا خیال ہی ہے جو مجھے صدیوں پیچھے لے جاتا ہے اور مجھے دستور کچھ سناتا ہے۔

" ظالموں اور خود پسند عابدو! تم اندھے رہبر ہو کہ ایسی گناہ کی جو اونٹ کے برابر ہو چشم پوشی کر سکتے ہو اور ذرا ذرا سی بات تمھاری نظر میں کھٹکتی ہے!!"

(۵۲)

درجۂ نوآبادی اور کامل آزادی

پچھلے سترہ برس میں جن لوگوں نے کانگریس کی سرپرستی کی ہے
وہ بیشتر متوسط طبقہ کے لوگ تھے خواہ وہ لبرل ہوں یا کانگریسی۔ وہ تھے ایک
ہی طبقے کے لوگ اور انھوں نے ایک سے ماحول میں تربیت پائی تھی۔ ان کی زندگی
ان کا میل جول، ان کے تعلقات ایک ہی رنگ کے تھے اور بورژوا[1] ذہنیت بعض
کی دو قسمیں جن سے انھیں الگ الگ عقیدت تھی ان امیر یوں سمجھئے کہ ایک ہی سانچے
کے تھے۔ مزاج اور طبیعت کے اختلافات نے ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا اور
ان کے نقطۂ نظر کو بدل دیا۔ ایک گروہ کی نگاہ حکومت اور متوسط طبقے کے سربرآوردہ
اور مالدار آدمیوں کی طرف اٹھی دوسرے کی متوسط طبقے کے کم حیثیت والے حصے
کی طرف جھکی۔ ان کے حالات دراصل ایک سے تھے۔ ان کے مقاصد میں کوئی فرق
نہ تھا۔ لیکن دوسرے گروہ کو اپنے ادبی پیشوں کے لوگوں اور تعلیم یافتہ مگر
بے روزگار آدمیوں کی کثیر تعداد پیچھے سے ڈھکیلنے لگی۔ اس کا لہجہ بدل گیا

---

[1] بورژوا (Bourgeois) کے اصلی معنی ہیں متوسط طبقے کے لوگ لیکن
اشتراکی ادب میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چاہے خود بڑے سرمایہ دار نہ ہوں مگر سرمایہ داری
کے جاری نظام اور تہذیب کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اسی لئے وہ ہر اس شخص کے
لئے استعمال ہو سکتا ہے جو اشتراکی نہ ہو۔

انھوں نے مراتب کا لحاظ اور ادب سے بات کرنا چھوڑ دیا اور دوسرے اور بڑھ
چڑھ کر دعوے کرنے لگے۔ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ عمل میں تدبیر پیدا کریں اس لئے
انھوں نے سخت کلامی کر کے کچھ تسکین حاصل کی سیاسیات کو اس طرح کروٹ لیتے
دیکھ کر معتدل پسند (موڈریٹ) ڈر گئے۔ انھوں نے اس دوڑ میں شریک ہونے
کا خیال چھوڑ دیا اور تنہائی کو سلامتی جانا۔ اس حالت میں بھی کانگریس کے اندر متوسط
طبقے کے (نیچے درجے کے) رہنماؤں کی تعداد بہت تھی۔ اگرچہ اکثریت انھیں کی رہی جو اونچے
درجے کے تھے ان کو ادھر بھی ایک حوصلہ کھینچ کر یہیں لایا کہ قوم کو جنگ میں کامیابی ہو
بلکہ وہ اس جنگ کے ذریعے اپنے دل کی ایک خواہش بھی پوری کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس
کی بدولت اپنی کھوئی ہوئی "مروت اور خودداری" حاصل کرنا اور اپنی بگڑی حیثیت کو
بنانا چاہتے تھے۔ قومیت کا جذبہ عام طور سے اسی طرح ابھرتا ہے اور اگرچہ چھوٹے
ہر خیال کے لوگوں میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ اعتدال اور انتہا پسندوں کے مزاج
کا فرق یہیں پر ظاہر ہوا۔ آہستہ آہستہ متوسط طبقہ کا ادنیٰ درجہ کانگریس پر حاوی ہو گیا
اور اس کے بعد کسانوں کا اثر محسوس ہونے لگا

جیسے جیسے کانگریس دیہاتی آبادی کی نمائندگی کرنے لگی اس کے اور
لبرلوں کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی تھی وہ بڑھتی گئی یہاں تک کہ لبرلوں کے لئے
کانگریس کا نقطۂ نظر سمجھنا یا اس کی قدر پہچاننا ناممکن سا ہو گیا۔ ڈرائنگ روم میں
بیٹھنے والے بڑے آدمی کے لئے پھوس یا مٹی کے جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے والے
کی بات سمجھنا مشکل ہے لیکن ان اختلافات کے باوجود دونوں کا مقصد قومی اور
خود اختیاری فرق جو تھا وہ قسم کا نہیں تھا، مدت کا تھا بہت سے لوگ جو لبرل جماعت
میں بے تکلفی سے کھپ سکتے تھے آخر وقت تک کانگریس میں رہے۔

کئی پشتوں تک انگریز ہندوستان کو اسی دنیا کا ایک حصہ بڑا

زمینداروں کا گھر سمجھتے رہے جیسے کہ اگلے زمانہ میں انگلستان میں ہوتے تھے۔ وہ گویا میاں لوگ تھے جو اس مکان کے مالک تھے اور اس کے سب سے پچھلے حصوں میں رہتے تھے۔ اور ہندوستانی ملازموں کی طرح شاگرد پیشے برتن دھونے کے کمرے اور باورچی خانے میں رکھ دئے گئے تھے۔ ہر باضابطہ زمیندار گھرانے کی طرح جن میں ملازموں کے مراتب مقرر ہوتے ہیں یعنی خانساماں منتظم، باورچی، خادمہ، سائیس وغیرہ۔ ویسے ہی یہاں کا بھی قاعدہ تھا اور اس کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ کس کا درجہ بڑا ہے کس کا کم لیکن اس گھر کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ کے درمیان معاشی اور سیاسی تفاوت تھا جس کا مٹانا ممکن تھا ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہئے کہ برطانی حکومت نے ایسے انتظام کو ہمارے اوپر مسلط کیا تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم نے باہم میں سے ایک بڑی تعداد نے اسے منظور کر لیا اور اسے اپنی زندگی یا اپنے مستقبل کا ایک قدرتی اور لازمی نظام سمجھا ہم میں وہی ذہنیت پیدا ہو گئی جو ایک زمیندار گھرانے کے اچھے نوکر کی ہوتی ہے کبھی کبھی ہمیں یہ انوکھی عزت بخشی جاتی تھی کہ ڈرائنگ روم میں چائے کی ایک پیالی پینے کو دے دی جاتی تھی اور ہمارے حوصلہ کی انتہا یہ تھی کہ شریف سمجھے جائیں اور فرداً فرداً ترقی کر کے اعلیٰ طبقہ میں پہنچ جائیں۔ انگریزوں کا ہماری طبیعتوں کو اس طرح قابو میں کر لینا ایک کارنامہ تھا۔ جس کی عظمت ان کے تدبر اور فوج کی کامیابیوں سے زیادہ تھی جیسا کہ اگلے زمانے کے حکماء نے کہا ہے۔ غلام کے دماغ میں غلامی سرایت کر گئی وہ غلام کی طرح سوچنے بھی لگا۔

زمانہ بدل گیا ہے اب اس وضع کی تہذیب جس کا نمونہ انگریز زمینداروں کا گھرانا تھا انگلستان میں خوشی سے تسلیم کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں پھر بھی ہم میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو شاگرد پیشہ ہیں انھیں رہنا چاہئے

ہیں اور ملازمت کی سنہری پیٹیوں اور وردیوں پر نثار کرتے ہیں۔ دوسرے ہیں
جو لبرلوں کی طرح اس زمینداروں کے گھر اور اس کے تمام لوازمات کو قابل قبول
سمجھتے ہیں۔ عمارت اور طرز تعمیر کی تعریف کرتے ہیں لیکن اس کی امید رکھتے ہیں
کہ ایک ایک کر کے خود اس کے مالکوں کی جگہ لے لیں گے۔ اسے وہ "ہندوستانی
بنانا" یا "ہندیانا" کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ نظام حکومت کا
رنگ بدل جائے یا زیادہ سے زیادہ کوئی نیا انتظام کیا جائے۔ بالکل نئی ریاست
قائم کرسکنے کا تو تصور بھی نہیں کرسکتے۔

ان کے لئے سوراج کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز پہلے کی سی حالت پر قائم رہے
بس رنگ زیادہ گہرا ہو جائے۔ مستقبل کا بھی ایک نقشہ ان کے ذہن میں اسکا
ہے کہ دو یا انہیں کے سے لوگ سیاسی ڈرامہ کا خاص پارٹ کریں اور اعلیٰ
انگریز عہدہ داروں کے عہدے حاصل کریں۔ ملازمتوں، سرکاری محکموں،
قانون ساز مجلسوں، تجارت، صنعت سب کی صورت یہی ہے۔ سول سروس والے
اپنے کام میں لگے رہیں۔ راجہ مہاراجہ اپنے محلوں میں رہتے رہیں۔ اور کبھی کبھی فینسی
ڈریس یا نایاب رنگ کے لباس جواہرات کی چمک سے اپنی رعایا کو مرعوب کرنے
کے لئے جلوہ افروز ہوں۔ زمیندار ایک طرف خاص تحفظ کا مطالبہ کرنے اور
دوسری طرف کاشت کاروں کو ستاتے رہیں۔ ساہوکار اپنی روپیوں کی
تھیلیاں لئے زمیندار اور کاشتکار دونوں کی مدد کی دوڑ دھوپ کرتا رہے یا
وکیل اپنی فیس وصول کرے اور خدا اپنے آسمان پر رہے۔

اصل میں ان لوگوں کے فلسفہ کی بنیاد موجودہ صورت حال قائم رہنے
پر ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو تبدیلیاں وہ چاہتے ہیں۔ وہ بس شخصی ہیں۔
ان تبدیلیوں کو وہ انگریزوں کی رضامندی سے آہستہ آہستہ عمل میں لانا چاہتے

ہیں، جیسے کوئی چیز چھن کر قطرہ قطرہ آتی ہے۔ ان کی سیاسیات اور معاشیات کا دارومدار برطانوی سامراج کے استحکام اور بقا پر ہے۔ ان کے نزدیک اس سامراج کو کم سے کم ایک بڑی مدت تک زوال نہیں آسکتا۔ انھوں نے اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھال لیا ہے اور وہ اس کے سیاسی اور معاشی فلسفے ہی کو نہیں تسلیم کرتے بلکہ اس کے اخلاقی معیار کو بلکہ جو برطانوی تسلط کے قیام کو مدنظر رکھ کر مقرر کیا گیا ہے۔

اس رویہ سے کانگریس کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ اس لئے کہ کانگریس انتظام حکومت کو بدلنا ہی نہیں بلکہ ایک نئی ریاست کی طرح ڈالنے کی فکر میں ہے۔ اس نئی ریاست کا نقشہ اوسط قابلیت کے کانگریسیوں کے ذہن میں بالکل صاف نہیں ہے اور لوگ اپنی اپنی رائے رکھتے ہیں۔ مگر سوا چند لوگوں کے جو ایک سرے پر ہیں اور میانہ روی کے قائل ہیں۔ کانگریسی عام طور سے اس پر متفق ہیں کہ موجودہ حالات اور طرز عمل پر جاری رہ سکتا ہے اور رہے گا بنیادی تبدیلیاں کرنا اگر پر ہے۔ اسی میں بجھے درجۂ نوآبادی اور کامل آزادی کا فرق ظاہر ہوتا ہے کہ درجۂ نوآبادی میں پرانے معاشرتی نظام کا باقی رہنا اور انگلستان کے معاشی نظام سے ہمارا ظاہری اور پوشیدہ زنجیروں سے جکڑے رہنا فرض کیا جاتا ہے۔ آزادی میں ہمیں اس کا اختیار ہوگا یا ہونا چاہئے کہ ہم اپنی ضروریات کے مطابق ایک نیا نظام تعمیر کریں۔

اس سے مراد یہ نہیں کہ انگلستان یا انگریزی قوم سے ایسی عداوت برتی جائے جسے کم یا دور کرنے کی گنجائش نہ ہو اور نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سے قطع تعلق کرنے کی خواہش کو ہر طرح کا نقصان اٹھا کر پورا کریں۔ گذشتہ واقعات کو دیکھتے ہوئے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان بغض و کینہ

کا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ ٹیگور نے کہا ہے کہ "بے سلیقہ طاقت کنجی کو خراب کرکے
کلہاڑی سے تالا کھولتی ہے" ہمارے دلوں کی کتنی ڈبیاں ہوں گی کہ توڑ ڈالی گئیں
اور انگریزوں سے ہمیں اس بنا پر شکایت ہو نہیں سکتی تھی کہ انھوں نے اس کنجی
کی جگہ بے تکلف کلہاڑی سے کام لیا۔ لیکن اگر ہمارا حوصلہ یہ ہے کہ چھوٹی باتوں
سے گزر کر ہندوستان اور نوع انسان کی ترقی کے مدارج انجام دیں تو
ہمارے لئے اس کا موقع نہیں ہے کہ اپنے آپ کو وقتی جوش کے حوالے کر دیں
اور اگر ہم اس طرف مائل بھی ہوں تو وہ سخت تربیت جو گاندھی جی برسوں سے
دے رہے ہیں ہمیں روک لے گی۔ میں یہ باتیں انگریزوں کے بنائے ہوئے
جیل خانے میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ سات مہینے سے میرے دل میں طرح طرح
کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں اور جتنی تکلیف مجھے اس قید تنہائی میں ہوئی
اتنی جیل میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے واقعات سے میرا دل غصہ
اور عداوت سے بھر آیا ہے۔ لیکن میں اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈھونڈھتا
ہوں تو وہاں مجھے انگلستان یا انگریزوں سے عداوت کا کوئی
پتہ نہیں ملتا۔ مجھے برطانوی ملوکیت سے نفرت ہے اور مجھے اس پر غصہ
آتا ہے کہ ہندوستان اس کا شکار ہوا ہے۔ مجھے سرمایہ داری کے نظام
سے نفرت ہے اور جس طرح برطانیہ کے حاکم طبقے ہندوستان کا خون چوستے
ہیں اس سے مجھے اور بھی نفرت ہے۔ اور اس پر بہت زیادہ غصہ آتا ہے
لیکن میں انگلستان یا تمام انگریزی قوم کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھیراتا۔ اگر
میں ایسا کرتا بھی تو اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس لئے کہ پوری قوم کی قوم
سے خفا ہو جانا یا اسے مجرم قرار دینا کس قدر حماقت کی بات ہے۔ وہ بھی حالات
سے اتنی ہی مجبور ہوتی ہے جتنے کہ ہم۔

اپنی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ انگلستان کا میری ذہنی ساخت پر اتنا زیادہ اثر ہے کہ میں اس سے کبھی بھی پوری طرح علیحدہ نہیں برت سکتا۔ میں چاہے جتنی کوشش کروں، میں ان ذہنی عادتوں، اس معیار اور دوسری قوموں اور عام زندگی کے بارے میں رائے قائم کرنے کے ان طریقوں سے جو میں نے انگلستان کے اسکول اور کالج میں سیکھے تھے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ سیاسی معاملات کے سوا میرے ذہنی میلانات بھی مجھے انگلستان کی طرف مائل کرتے ہیں اور اگر میں ہندوستان میں انگریزی حکومت کا ایسا کٹر مخالف ہو گیا ہوں جو کسی مصالحت پر راضی نہیں ہو سکتا تو اس سے میری تربیت اور طبیعت کا کوئی قصور نہیں۔ انگریزوں کی قوم نہیں بلکہ یہ ملوکیت، یہ تسلط اصل چیز ہے جس پر ہمیں اعتراض ہے اور اسی سے ہم کوئی مصالحت کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم چاہیں تو انگریزوں سے اور دوسری غیر قوموں سے ضرور کارآمد میل جول رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ہم کو تازی ہوا چاہئے تازے اور حال بخش خیالات اور ایسا اتحاد عمل جس سے ہماری بیستر بجھی ہوئی ہمتیں اٹھیں، کیونکہ ہم سٹھیا گئے ہیں، ہمارے خیالات بوسیدہ ہیں، لیکن اگر انگریز مشیریوں کرنا چاہیں تو انہیں دوستی یا اتحاد عمل کی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ ملوکیت کے بستر کا اسی بے دردی سے مقابلہ کیا جائے اور آج ہمارے ملک کا اس خونخوار جانور سے سابقہ ہے جنگل کے وحشی چیتے کو سدھانا اور اس کی خلقی خونخواری کو تربیت کے جادو سے دور کرنا ممکن ہے لیکن جب سرمایہ داری اور ملوکیت مل جائیں اور کسی بدقسمت ملک پر چھاپا ماریں تو انہیں قابو میں کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

کسی کا یہ کہنا کہ وہ یا اس کی قوم مصالحت نہ کرے گی ایک معنی میں بے وقوفی ہے۔ کیونکہ دنیا ہمیں ہر وقت مصالحت کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہے اور

کا ہونا ایک قدرتی بات ہے ٹیگور نے کہا ہے کہ مہر سلیقہ طاقت کبھی کو ہرا کے کمزوری سے تالا کھولتی ہے" ہمارے دلوں کی کنجی دبتیں ہو گئیں کہ توڑ ڈالی گئیں اور اگر بیرونی سے ہمیں اس سادہ پُرعظمت ہوتی نہیں سکتی تھی کہ انھوں نے اس کنجی کی جگہ بے تکلف کلہاڑی سے کام لیا۔ لیکن اگر ہمارا حوصلہ یہ ہے کہ چھوٹی باتوں سے گذر کر ہندوستان اور نوع انسان کی بڑی خدمات انجام دیں تو ہمارے لئے اس کا موقع نہیں ہے کہ اپنے آپ کو وقتی جوش کے حوالے کر دیں اور اگر ہم اس طرف مائل بھی ہوں تو وہ سخت تربیت ہوگا مدتی جو بیس دن سے دے رہے ہیں ہمیں روک لے گی۔ میں یہ باتیں انگریزوں کے بنائے ہوئے جیل خانے میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ سات مہینے سے میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں اور جتنی تکلیف مجھے اس قید تنہائی میں ہوئی اتنی جیل میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے واقعات سے میرا دل غصّہ اور عداوت سے بھر آیا ہے۔ لیکن میں اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈھونڈھتا ہوں تو وہاں مجھے انگلستان یا انگریزوں سے عداوت کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ مجھے برطانوی ملوکیت سے نفرت ہے اور مجھے اس پر غصہ آتا ہے کہ ہندوستان اس کا شکار ہوا ہے۔ مجھے سرمایہ داری کے نظام سے نفرت ہے اور جس طرح برطانیہ کے حاکم طبقے ہندوستان کا خون چوستے ہیں اس سے مجھے اور بھی نفرت ہے۔ اور اس پر بہت زیادہ غصہ آتا ہے لیکن میں انگلستان یا تمام انگریزی قوم کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھیراتا۔ اگر میں ایسا کرتا بھی تو اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس لئے کہ پوری قوم کی قوم سے خفا ہو جانا یا اسے مجرم قرار دینا کس قدر حماقت کی بات ہے وہ بھی حالات سے اتنی ہی مجبور ہوتی ہے جتنے کہ ہم۔

اسی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک میں نے یہ بات ثابت نہیں کی
زیادہ اثر ہے کہ میں اس سے کبھی کنارہ کش ہو کر غیر جانب دار بن سکوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ
کوشش کروں، میں ان دوسری ماڈلوں، اپنی سیاسی مذہبی یا کسی
زندگی کے بارے میں رائے قائم کرنے کے ان طریقوں سے جو میں نے انگلستان
کے اسکول اور کالج میں سیکھے تھے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ میری ذہنی ساخت
میرے ذہنی میلانات بھی مجھے انگلستان کی طرف مائل کرتے ہیں۔ تاہم
میں انگریزی حکومت کا ایسا کٹر مخالف ہو گیا ہوں جو کسی مصالحت پر تیار نہیں
تو اس سے میری تربیت اور طبیعت کا کوئی قصور نہیں۔ انگریزوں کی قوم نہیں
بلکہ یہ ملوکیت، یہ تسلط اصل چیز ہے جس پر ہمیں اعتراض ہے اور اسی سے ہم کوئی
مصالحت کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم چاہیں تو انگریزوں سے اور دوسری
غیر قوموں سے ضرور گاڑھا میل جول رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ہم کو تنگ
نظری چھوڑ دینا، نسلی اور جاہلی خیالات اور ایسا انحطاط جس سے ہماری سیرت
کچھ نہیں پہنچے، کیونکہ ہم سٹھیا گئے ہیں، ہمارے خیالات بوسیدہ ہیں۔
لیکن اگر انگریز شیر بن کر آنا چاہیں تو انھیں دوستی یا اتحاد عمل کی توقع
نہ رکھنی چاہیے۔ ملوکیت کے شیر کا اسی کی سی بے دردی سے مقابلہ کیا جائے
اور آج ہمارے ملک کا اس خون خوار جانور سے سابقہ ہے جنگل کے وحشی
چیتے کو سدھانا اور اس کی طبعی خونخواری کو تربیت کے جادو سے دور کرنا ممکن
ہے لیکن جب سرمایہ داری اور ملوکیت مل جائیں اور کسی بدقسمت ملک پر چھاپا
ماریں تو انھیں قابو میں کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

کسی کا یہ کہنا کہ وہ یا اس کی قوم مصالحت نہ کرے گی ایک معنی میں
بے وقوفی ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہر وقت مصالحت کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہے اور

جب یہ بات کسی اور قوم یا ملک کے بارے میں کہی جائے تب تو وہ صحیح بات ہے لیکن لوگ اس پر اڑ جائیں کہ ہم فلاں نظام کو تسلیم نہ کریں گے یا فلاں صورت حال کو گوارا نہ کریں گے تو اس میں صداقت ہو سکتی ہے اور تب انھیں کوئی انسانی قوت اس پر مجبور نہیں کر سکتی کہ مصالحت کر لیں۔ ہندوستانی آزادی اور برطانوی ملوکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور انھیں نہ تو کوئی عمل دائمی ہم آہنگ اور یکجا کر سکتی ہے اور نہ مدبروں کی ساری نس پوت ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان سچے اتحاد عمل کے لئے موافق حالات اسی وقت پیدا ہوں گے جب ہندوستان سے برطانوی ملوکیت مٹا دی جائے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ آج کل کی دنیا میں جب ہر روز ایک ملک کو دوسرے کی ضرورت روز بروز زیادہ ہو رہی ہے کامل آزادی کا عقیدہ رکھنا تنگ نظری ہے اور ہم آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو گویا زمانہ کی گھڑی کو پیچھے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لبرل اور امن پرست اور برطانیہ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں سب یہی دلیل پیش کر کے ہماری تنگ نظر قومیت پر ہماری سرزنش کرتے ہیں اور ضمناً یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ ہمارے لئے مکمل قومی زندگی کا ذریعہ برطانوی اقوام کی کامن ویلتھ ہے۔ یہ ایک عجب بات ہے کہ انگلستان میں ہر رنگ کی حکمت (لبرل، امن پرست، اشتراکی وغیرہ) سامراج کے قیام کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ برٹرنڈ رسل نے لکھا ہے کہ "حاکم قوم کی یہ خواہش کہ ہر چیز اس کے حال پر قائم رہے اکثر ایک خاص انداز اختیار کر لیتی ہے جو اپنے کو "قومیت" کے خیال پر برتر جتاتا ہے۔ بالکل جیسے فاتح قوم مال غنیمت کو قبضہ میں رکھنے کے لئے بڑی آسانی سے امن پرست بن جاتی ہے اسی طرح گاندھی جی کے معاملہ میں میکڈونلڈ آپ کو بین الاقوامی مسلک

کا حامی سمجھتے ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کیا کرے گا اور اس کا کیا حال ہو گا لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ وہی لوگ جو آج قومی آزادی چاہتے ہیں وہی ہمارے بین الاقوامی تعلقات کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع کرنا چاہتے ہیں اشتراکیوں کے نزدیک تو قومیت کے کوئی معنی ہی نہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اشتراکی نہیں اور کانگریس کی اگلی صفوں میں ہیں وہ بھی بین الاقوامی میل ملاپ سے بڑے معتقد رہے ہیں۔ اگر آج ہم کامل آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب دنیا سے قطع تعلق نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ہم تیار ہیں کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنی اس آزادی کے ایک حصہ سے دست بردار ہو جائیں تاکہ ایک بین الاقوامی نظام قائم کیا جا سکے۔ ملوکیت کا کوئی نظام اس کا نام چاہے جو شان دار ہو، ایسی تنظیم کا دشمن ہو گا اور اگر ہم دنیا میں اتحاد عمل اور امن چاہتے ہیں تو اسے حاصل کرنے کے لئے ملوکیت کا نظام کبھی کام نہ آئے گا

حال کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے تمام سامراجی نظام خود کفائتی اور معاشی سامراج کے ذریعہ اپنے آپ کو روز بروز دوسروں سے جدا کر رہے ہیں اس لئے بجائے اس کے کہ قوموں کا تعلق زیادہ گہرا ہو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بالکل خلاف ہو رہا ہے۔ اس کے اسباب دریافت کرنا کچھ مشکل نہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ معاشی نظام کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس حکمت عملی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ جہاں اس علاقے میں جو خود کفیل ہو اتحاد عمل بڑھ جاتا ہے وہاں دوسری طرف باقی دنیا سے علٰحدگی بھی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اوٹاوا اور دوسرے فیصلوں کا اثر ملا

ہے کہ برطانوی سامراج کے سوا اور ملکوں سے ہمارے تعلقات اور میل جول
میں کمی ہو رہی ہے۔ ہم پہلے سے زیادہ برطانوی صنعت کے دست نگر ہو گئے
ہیں اور ان نقصانات کے علاوہ جو ہم برداشت کر چکے آگے چل کر اس حکمت عملی
کے خطرے بھی ظاہر ہیں۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ درحقیقت آزادی ہمارے بین الاقوامی
تعلقات کو بڑھانے کی جگہ ہمیں الٹا اور دنیا سے جدا کر دے گی۔

مگر ہمارے لبرل دوستوں میں یہ حیرت انگیز صفت ہے کہ وہ دنیا اور
خصوصاً اپنے ملک کو برطانیہ کی خالص قومی رنگ کی عینکوں سے دیکھتے ہیں۔ انہیں
یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کانگریس کیا کہتی ہے اور کیوں کہتی ہے۔ بس
انگریزوں کے اس پرانے اعتراض کو کہ آزادی درجۂ نوآبادی کے مقابلے
میں تنگ ہے اور درجۂ نوآبادی کو اس سے آگے فروغ نہیں ہو سکتا دہراتے رہتے ہیں
ان کی بین الاقوامی دنیا بس وائٹ ہال ہے اس لئے کہ دوسرے ملکوں کے
بارے میں کچھ تو زبان کی دشواری کے سبب سے مگر زیادہ تر اسی وجہ سے کہ وہ
دوسرے ملکوں کو اطمینان کے ساتھ نظر انداز کر سکتے ہیں انہیں مطلق کوئی علم نہیں
ہوتا۔ ہندوستان کے اندر تو وہ ہر اس طرز عمل کے خلاف ہوتے ہیں جس میں
حکومت کی براہ راست مخالفت ہو یا جس سے جنگ جوئی کا ظاہر ہوتی ہو لیکن یہ دیکھ
کر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے بعض لیڈروں کو اس وقت کوئی اعتراض نہیں ہوتا جب
کسی دوسرے ملک میں یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ وہ ایسی چیزوں کو دور سے
سمجھ سکتے ہیں اور ان کی قدر بھی کر سکتے ہیں اور مغربی ملکوں کے کئی حاکم مطلق ایسے
جنہیں ان سے مذہبی احترام اور عقیدت کا خراج ملتا رہتا ہے۔

ناموں سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اصل سوال
یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر ایک نئی ریاست ہے یا صرف ایک بدلا ہوا انتظام حکومت

لبرل اس کا یوں واضح کیے دیتے ہیں وہ صاف ہے انھیں ایک مدت ہوئے استحکام حکومت سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیے اور وہ بھی ان کے نزدیک ایک منزل مقصود ہے جہاں تک ہم ایک لمبا سفر کرکے بتدریج ہی پہنچیں گے۔ وہ کبھی کبھی درجہ نوآبادی کا ذکر کرتے ہیں لیکن فی الحال جو چیز دراصل ان کے مدنظر ہے وہ "مرکز میں ذمہ داری" کے پراسرار الفاظ سے ظاہر کی جاتی ہے۔ اسے جوشیلے لفظ جیسے کہ طاقت، خودمختاری، حریت، آزادی انھیں نہیں بھاتے۔ ان کی آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ خطرناک ہیں۔ حالوں والوں کی زبان اور بحث کا طریقہ انھیں بہت پسند ہے۔ اگرچہ ان سے عوام کے دلوں میں گرمی پیدا نہیں ہوتی۔ تاریخ میں ہمیں اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ افراد اور جماعتوں نے عقیدے اور آزادی کے لئے خطروں کا مقابلہ کیا اور جان کو بھی داؤں پر لگا دیا۔ مگر اس میں شک ہے کہ "مرکز میں ذمہ داری" یا کسی ایسی قانونی اصطلاح کی خاطر کوئی شخص کبھی بھی جان بوجھ کر ایک وقت کا کھانا چھوڑے گا یا کسی کی گہری نیند ہلکی ہو جائے گی۔

، تو ہے ان کا مطمح نظر اور یہ مقصد حکومت کی کھلم کھلا مخالفت یا کسی طرح کی پیش قدمی کرکے حاصل نہ کیا جائے گا بلکہ جیسا کہ سری نواس شاستری صاحب نے فرمایا ہے "دانشمندی، تجربہ کاری، میانہ روی، دوسرے کو قائل کرنے کی قوت، خاموش اثر اور سچی مستعدی" کی خوبیوں کو نمایاں کرکے۔ امید اس کی جاتی ہے کہ ہمارا نیک چلن اور ہمارے اچھے کام آخرکار ہمارے حاکموں کو اس پر آمادہ کر لیں گے کہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دے دیں یعنی دوسرے الفاظ میں ہمارے حاکم آج کل ہماری مخالفت یا تو اس سبب سے کرتے ہیں کہ ہمیں لڑائی پر تلے دیکھ کر انھیں غصہ آتا ہے یا اس وجہ سے کہ انھیں ہماری استعداد پر شبہ

ہے یا نکس سے یہ دونوں باتیں یکساں ان کے رویّہ پر اثر ڈال رہی ہوں۔ ملوکیت کی اور موجودہ حالات کی اس توضیح سے کسی قدر سادہ لوحی ظاہر ہوتی ہے پروفیسر آر۔ ایچ ٹونی نے جو ایک ممتاز انگریز مصنف ہیں۔ اس خیال کے متعلق کہ اقتدار ورثہ میں مدارج اور حاکم طبقوں کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے ایک جگہ بڑی اچھی اور چبھتی ہوئی بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا تو ہے برطانوی لیبر پارٹی کے متعلق۔ لیکن جو کچھ وہ کہتے ہیں ہندوستان پر اور بھی پورا اترتا ہے۔ کیونکہ انگلستان میں کم از کم جمہوری ادارے تو ہیں۔ جن کے ذریعہ سے اصولاً اکثریت کا ارادہ ظاہر کیا جاسکتا ہے پروفیسر ٹونی کہتے ہیں:۔

"پیاز تو پرت پرت کرکے کھائی جاسکتی ہے۔ لیکن آپ چاہیں کہ زندہ شیر کی کھال کھینچیں، پہلے ایک پنجہ کی اور پھر دوسرے کی، تو یہ نہیں ہوسکتا چیر پھاڑ تو خود شیر کا پیشہ ہے۔ وہ پہلے کھال اتار لیتا ہے۔"

دنیا میں شاید کوئی ایسا ملک ہو جہاں کے سربرآوردہ اور حاکم طبقہ کے لوگ سب بدھو ہیں لیکن انگلستان تو ہرگز ایسے ملکوں میں نہیں۔ یہ خیال کہ لیبر پارٹی کے مطالبات پیش کرنے میں موقع شناسی اور دوستانہ انداز سے کام لیا جائے تو یہ لوگ اس دھوکے میں ڈالے جاسکتے ہیں کہ یہ ان کے اپنے مطالبات ہیں ایسا ہی فضول ہے جیسے یہ کوشش کہ ایک چلتے ہوئے وکیل سے ایسی جائداد دھوکہ دھڑی سے حاصل کرلی جائے جس کی دستاویز حقیت اس کے قبضہ میں موجود ہے۔ ہمارے یہاں کے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں دولت اور اقتدار ہے خوش گوار اخلاق کے ہوشیار، زور دار اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے والے لوگ ہیں اور جب رنجیدہ ہوتے ہیں تو پھر تو کسی

اخلاقی اصول کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ روٹی پر مکھن کس طرف لگا ہے" اور وہ اس پر بھی تلے ہوئے ہیں کہ مکھن کی فراہمی میں کمی نہ ہو . . . اگر انھوں نے اپنے آپ کو خطرے میں دیکھا تو وہ ہر سیاسی اور معاشی چال چلیں گے اور ہر ہتھیار سے کام لیں گے، ایوانِ امراء، بادشاہ، اخبار، فوج میں بدامنی، مالی دشواریاں، بین الاقوامی پیچیدگیاں اور جیسا کہ وہ حملہ جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں پاؤنڈ پر کیا تھا ظاہر کرتا ہے، وہ ویسی چالوں کی اس حد تک جائیں گے جس میں اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کی خاطر ملک کو نقصان پہنچایا جاتا ہے :

برطانوی لیبر پارٹی کا ایک زبردست نظام ہے۔ مزدوروں کی یونین جس کے لاکھوں چندہ دینے والے اراکین ہیں اور جنھوں نے ایک نہایت مکمل امداد باہمی کا نظام مرتب کر لیا ہے اس کی پشت پر ہیں اور اعلیٰ پیشوں کے بہت سے لوگ اس کے رکن اور ہمدرد ہیں۔ برطانیہ میں جمہوری مشاورتی ادارے ہیں جن کی بنیاد عام حق رائے دہندگی پر ہے اور سیاسی آزادی کا رواج صدیوں سے قائم ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود مسٹر ٹونی کی رائے ہے اور حال کے واقعات نے ثابت بھی کر دیا ہے کہ ان کی رائے درست ہے کہ لیبر پارٹی محض مسکرانے اور نرمی سے بات سمجھانے سے اصل اقتدار حاصل نہیں کر سکتی۔ اگرچہ دونوں طریقے اپنی جگہ مفید اور بے ضرر ہیں۔ مسٹر ٹونی کہتے ہیں کہ اگر ایوانِ عام میں لیبر پارٹی کی اکثریت ہو گئی تب بھی اسے بنیادی اصلاحیں عمل میں لانے کا درا صلی اختیار نہ ہو گا کیونکہ سربرآوردہ اور مقتدر طبقے کے لوگ جو ان کے مقابلے میں صف آرا ہیں، بہت سے سیاسی، معاشرتی، معاشی، مالی، اور فوجی قلعوں پر

اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ ہندوستان کی حالت بالکل اور ہے یہاں نہ جمہوری ادارے ہیں نہ روایات بلکہ اس کے برخلاف آرڈیننس اور حکومت مطلق کا رواج پرانا اور مستند ہوگیا ہے یہاں آئے دن شخصی اور تقریر و تحریر اجتماع اور پریس کی آزادی کا سر کچلا جایا کرتا ہے لبرلوں کی پشت پر کوئی مضبوط نظام نہیں ہے اس لئے انہیں بس اپنے کسی ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

لبرل ہر تحریک کی جو دستور یا قانون کے خلاف ہو سختی سے مخالفت کرتے ہیں ایسے ملکوں میں جہاں کا دستور جمہوری ہو" دستور" کے معنی صحیح سمجھے جاتے ہیں۔ وہ قانون ساز ی پر حاوی ہوتا ہے۔ آزادی کا تحفظ کرتا ہے عاملہ کی روک تھام کرتا ہے اور سیاسی اور معاشی نظام میں تبدیلیاں کرنے کے جمہوری طریقے معین کر دیتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ایسا کوئی دستور نہیں۔ اور یہاں یہ اصطلاح اپنے کوئی معنی نہیں رکھتی[1]۔ اسے استعمال کرکے ہم صرف ایک تصور کو اپنی سیاسی بحث میں داخل کرتے ہیں جس کے لئے ہماری موجودہ زندگی میں کوئی گنجائش نہیں عجیب بات یہ ہے کہ یہ لفظ اکثر عاملہ کی کم دستی سے ضابطہ کارروائیوں کی تائید کے لئے کام میں لایا جاتا ہے یا ان

---

[1] مسٹر سی وائی چنتامنی نے جو ایک ممتاز لبرل لیڈر اور اخبار "لیڈر" کے صدر مدیر ہیں یوپی کونسل میں پارلیمنٹری جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان میں کسی قسم کی دستوری حکومت نہیں " بہتر ہے کہ ہم موجودہ غیر دستوری حکومت کے ماتحت رہیں بہ نسبت اس آئندہ کی حکومت کے جو اور بھی بہت لیسد اور بہت زیادہ غیر دستوری ہوگی "

سے مراد فقط "قانونی" ہوتا ہے ہمارے لئے بہت بہتر ہے اگر ہم "قانون" اور "علاوہ قانون" پر اکتفا کریں۔ اگرچہ یہ اصطلاحیں بھی مبہم ہیں اور ان کے معنی آج کچھ ہوتے ہیں تو کل کچھ اور۔

ایک نیا قانون یا نیا آرڈیننس ایک جرم قائم کر دیتا ہے کسی پبلک جلسہ میں سریک ہونا جرم ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ یا بائسکل پر چڑھنا یا کوئی خاص کپڑے پہننا یا مغرب سے پہلے گھر کے اندر پہنچ جانا۔ باتھانے میں روز حاضری دینا ہندوستان کے بعض حصے ہیں جہاں آج کل یہ سب باتیں قانون کی خلاف ورزی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ملک کے ایک حصے میں کوئی بات جرم مانی جائے اور دوسرے میں نہ مانی جائے۔ جب کوئی غیر ذمہ دار عاملہ مختصر سے مختصر اطلاع کے بعد ایسے قانون جاری کر سکتی ہے تو "قانون" سے مراد اس عاملہ کے ارادے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا معمولاً ایسے قانون کی حوصلتی سے ہاتھ ہلا کر تعمیل کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ نافرمانی کے نتیجے ناگوار ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی کہے کہ وہ ہمیشہ قانون کی فرماں برداری کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مطلق حکومت یا غیر ذمہ دار قوت کے سامنے زمین پر سر رکھ دیتا ہے۔ اپنے ضمیر کو اس کے حوالے کر دیتا ہے اور جہاں تک کہ اس کے اپنے عمل کا تعلق ہے آزادی حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

آج کل ان ملکوں میں جہاں کی حکومت جمہوری ہے اس پر بحث ہو رہی ہے کہ معاشی نظام میں ان ذریعوں کی بدولت جو دستور نے مہیا کئے ہیں بنیادی تبدیلیاں معمولی کارروائی کے طور پر عمل میں لائی جا سکتی ہیں یا نہیں، بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا اور کوئی غیر معمولی انقلابی تدبیر اختیار کرنا ہوگی۔ ہمارے لئے تو یہ دیکھنا بے کار ہے کہ اس بحث سے کیا

نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ ہم جو تبدیلیاں چاہتے ہیں انہیں عمل میں لانے کے لئے دستور
میں کوئی ذریعے مقرر ہی نہیں کئے ہیں اگر وائٹ پیپر) والی
پالیسی ہی کسی اور تحریرے قانون کی شکل پا گئی تو ہماری دستوری نشوونما کی طرف
بالکل بند ہو جائے گی اور انقلابی یا غیر قانونی کارروائی کے سوا اس قید سے
آزاد ہونے کا کوئی چارہ نہ رہے گا تو پھر کیا کرنا چاہئے، کیا اصلاح کا خیال
چھوڑ کر قسمت پر شاکر ہو بیٹھیں۔

آج کل جو صورت ہے وہ اور بھی زیادہ عجیب ہے عاملہ کو اس کا اختیار
ہے اور یہ اختیار کام میں بھی لایا جاتا ہے کہ ہر قسم کے پبلک کام کو بالکل بند کردے
یا اس میں رکاوٹیں پیدا کردے۔ ہر کام جو اس کی رائے میں اس کے لئے خطرناک
ہے ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے اور اس طرح، جیسے کہ پچھلے تین سال میں
ہوتا رہا ہے۔ قوم کی ہر نتیجہ خیز جد و جہد بند کی جا سکتی ہے۔ اس صورت کو
گوارا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہر قومی کام چھوڑ دیا جائے اور اس کا مان لینا
تو ایک مہمل سی بات کو مان لینا ہے۔

اس کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ہمیشہ اور بلا استثنا قانون
کے مطابق عمل کرے گا جمہوری ریاستوں میں بھی ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی
ہیں جب انسان کا ضمیر اسے قانون کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہے جس ملک
کی حکومت استبدادی یا غیر ذمہ دارانہ ہو۔ ایسے موقعے بہت کثرت سے
آتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی ریاست میں قانون اخلاقاً حق بجانب
رہتا ہی نہیں۔

لبرل کہتے ہیں کہ براہ راست سیاسی عمل حکومت مطلق سے ملتی جلتی
چیز ہے۔ جمہوریت سے نہیں اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت کو

فتح ہوا انہیں براہ راست سیاسی عمل کا یہ اصول چھوڑ دینا چاہئے یہ بات الجھے ہوئے خیالات اور مبہم عبارت کا ایک نمونہ ہے کبھی کبھی ۔ براہ راست سیاسی عمل مثلاً مزدوروں کی ہڑتال تو انونی ہی ہوسکتا ہے لیکن یہاں جاپانیا صرف سیاسی کا،، دانشوں سے بحث ہے جرمنی میں آج کل کسی طرح کا عمل ممکن ہے ؟ ہٹلر کی دلت آمیز فرماں برداری یا کوئی انقلابی یا خلاف قانون کارروائی ۔ جمہوریت کی وہاں اور کس طرح خدمت کی جاسکتی ہے ۔

ہندوستانی لبرل اکثر جمہوریت کا ذکر کرتے ہیں مگر ان میں بہت سے اس کے قریب بھی جانا نہیں چاہتے ۔ مسٹر ی ۔ پی شیوسوامی آئیر نے جو ہندوستان کے سب سے ممتاز لیڈروں میں سے ہیں مئی ۱۹۳۴ء میں کہا تھا " کانگرس کا یہ مطالبہ کہ ایک دستور ساز مجلس طلب کی جائے عوام کی سوجھ بوجھ پر بہت زیادہ بھروسہ کرنا ہے اور ان لوگوں کے خلوص اور قابلیت کے ساتھ ظلم ہے جنہوں نے مختلف گول میز کانفرنسوں میں حصہ لیا ہے ۔ مجھے اس میں بہت شک ہے کہ دستور ساز مجلس اس سے کچھ بہتر کر دکھاتی " اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمہوریت کا جو تصور مسٹر شیوسوامی آئیر کے ذہن میں ہے وہ " عوام سے ایک جدا چیز ہے اور ایسے مخلص اور قابل " لوگوں کا اجتماع جنہیں برطانی حکومت نے نامزد کیا ہو اس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے ۔ اس کے علاوہ خاص کر ہو وائٹ پیپر کی تجویزوں کو دعائیں دیتے ہیں ۔ اس لئے کہ گو وہ ان سے " پورے طور پر مطمئن نہیں " وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کا ساری کی ساری تجویزیں رد کر دینا عقلمندی کی بات نہیں " ہمیں اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حکومت برطانیہ اور مسٹر شیوسوامی آئیر کے درمیان پورا اتحاد عمل نہ ہو ۔

کانگریس نے جب سوال نامہ پیش کر دی تو لبرل ظاہر ہے بہت خوش

ہوئے۔ اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس حماقت آمیز اور خلاف مصلحت تحریک سے الگ اور دور رہنے پر انھوں نے اپنی عقلمندی کی داد بھی لیا تھا "دیکھو ہم نے کہا تھا نا"؛ وہ اکثر ہم سے کہا کرتے تھے۔۔ دلیل بھی ٹالی ہے۔ چونکہ ہم لڑنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور لڑے بھی خوب تھے ہم گرا دئے گئے، اس لئے ہم کو نصیحت کی گئی کہ کھڑا ہونا پڑا ہے سب سے اچھی اور محفوظ چال پیٹ کے بل گھسٹنا ہے۔ آدمی اس طرح پڑا ہو تو نہ گرایا جا سکتا ہے نہ گر سکتا ہے۔

پرانا اور نیا ہندوستان

یہ ایک قدرتی اور لازمی بات تھی کہ قوم پرست ہندوستانیوں کو غیروں
کی حکومت پر غصہ آئے لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ انیسویں صدی کے آخر
تک بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانی شعوری یا غیر شعوری طور پر سلطنت کے
برطانوی تصورات کو تسلیم کرتے رہے۔ وہ اپنی دلیلیں انھیں تصورات پر قائم کرتے
تھے۔ اور انھیں صرف ان کے چند جزوی نتائج پر اعتراض کرنے کی ہمت ہوتی تھی
ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ اور معاشیات کی جو تعلیم دی جاتی تھی
اس کا نقطۂ نظر بالکل برطانوی ملوکیت کا تھا۔ اس میں ہماری پچھلی اور موجودہ
خامیاں جتائی جاتی تھیں اور انگریزوں کے اوصاف اور ان کی بلند اقبالی
ہم حالات کی اس بگڑی تصویر کو کسی حد تک صحیح مانتے تھے اور جہاں طبیعت
اسے قبول نہ کرتی وہاں بھی ہم پر اس کا اثر ضرور پڑتا۔ پہلے تو ذہن کو
اس سے محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ کیونکہ ہم اور واقعات یا
دلیلوں سے واقف ہی نہ تھے۔ اس لیے ہم نے مذہبی ناموس کے دامن میں
پناہ لی اس خیال سے کہ کم سے کم مذہب اور فلسفے کے میدان میں ہم کسی قوم
سے پیچھے نہیں۔ مصیبت اور ذلت میں ہم اپنے آپ کو یقین دلاتے رہتے کہ اگرچہ
ہم میں مغرب کی سی ظاہری شان اور ٹھاٹ باٹ نہیں ہے پھر بھی ہم اس باطنی
دولت کے مالک ہیں جو اصل چیز ہے جس کی حیثیت بہت زیادہ ہے اور جس کا

حاصل کر رہا ہے ایک طرف سوامی دویکانند اور ان جیسے اور لوگوں سے دوسری طرف اس دل چسپی نے جو مغربی عالم ہمارے قدیم فلسفوں سے رکھتے تھے ہمیں پھر کسی قدر خود دار بنایا اور گذشتہ باتوں پر فخر کرنے کے جذبہ کو بیدار کیا۔

آہستہ آہستہ ہم ان باتوں پر جو انگریز ہمارے ماضی اور موجودہ حالات کے متعلق کہتے تھے شبہ کرنے لگے۔ ہم نے ان کی تنقید شروع کر دی لیکن اب بھی ہمارا خیال اور عمل انگریزوں کے قائم کئے تصورات کے دائرے میں محدود تھا کوئی بری بات ہوتی تو ہم کہتے کہ یہ انگریزوں کی فطرت کے خلاف ہے ہندوستان میں کوئی انگریز بد تمیزی کرتا تو یہ قصور برطانوی نظام کا نہ ٹھہرایا جاتا بلکہ اس شخص کا لیکن برطانوی حکومت پر تنقیدوں کا مواد جمع ہوتا۔ لکھنے والوں کی اعتدال پسندی کے باوجود ایک انقلاب کا کام کر گیا اور اس سے ہماری قومیت کی سیاسی اور اقتصادی بنیاد ڈال دی۔ دادا بھائی نوروجی کی تصنیف "ہندوستان کا افلاس اور برطانوی فطرت کے خلاف حکومت" اندر دیش دت ولیم ڈگبی وغیرہ کی کتابوں نے قومیت کی نشوونما میں ایک انقلابی عنصر پیدا کر دیا۔ قدیم تاریخ ہند کی تحقیق کی گئی تو ایسے درخشاں دوروں کا انکشاف ہوا جن میں تہذیب و تمدن عروج کو پہنچ گیا تھا۔ وہاں کا حال پڑھ کر ہمیں بڑی تقویت حاصل ہوئی ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے کارنامے اس سے بہت مختلف تھے جو ہم ان کی تاریخ کی کتابیں پڑھ کر سمجھا کرتے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ ... شانت ... نظام حکومت کے متعلق انگریزوں ... نا مناسب ... نیکر ... کی بحث کے ...

کی جو کہ اس کا نصب العین سے میاد نہیں رکھ سکتا"۔ یہاں پر بظاہر مصنف کا اشارہ
پہلا ہی انتہا پسند یا ترقی پسند ہندوستانیوں کی طرف ہے۔ کیونکہ جب وہ
لیجسلیٹو اسمبلی کے صدر تھے تو انہیں لوگوں سے ان کا زیادہ سابقہ رہا ہوگا کانگریس
کا یہ عقیدہ نہیں ہے اور جو دوسری ترقی پسند جماعتیں ہیں ان کا تو ذکر ہی بیکار
مگر مسٹر فرڈاک کے اس خیال سے انہیں اتفاق ہے کہ جب تک ہندوستانیوں کا یہ
خیال خام مٹ جائے اور ہندوستان منفردہ حیثیت کا سامنا کرنے کو اکیلا چھوڑ
دیا جائے تب تک آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ برطانیہ کے فوجی تسلط کا مکمل زوال
ہو جانا ہندوستانی آزادی کا پہلا قدم ہوگا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انیسویں صدی میں تعلیم یافتہ ہندوستانی
ایسے ہی تصورات کے قائل تھے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے
جوش دلانے والے واقعات اور تجربات کے بعد بھی بعض لوگ اس دام فریب
میں گرفتار ہیں۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کے حکمراں طبقے اپنی دولت، کامیابی
اور اقتدار کی روایات کی بنا پر دنیا میں امراء کی شان رکھتے تھے۔ ان روایات
کے سائے میں تربیت پانے سے ان میں امارت کے کچھ اوصاف اور کچھ
خامیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہم ہندوستانی اس بات سے تسلی حاصل کر سکتے ہیں
کہ پچھلے پینسٹھ دو سال میں ہم نے انہیں اس اعلیٰ مرتبے پر فائز ہونے کے وسائل
اور مواقع بہم پہنچائے۔ جیسا کہ پہلے بھی بہت سی نسلیں اور قومیں کر چکی ہیں۔
انگریز اپنے آپ کو خدا کے برگزیدہ بندے اور اپنی سلطنت کو خدا کی حکومت
سمجھنے لگے جب تک ان کا یہ مرتبہ تسلیم کیا گیا اور ان کے دعوائے فضیلت
کی تردید نہیں ہوئی وہ لطف و کرم سے کام لیتے رہے مگر وہیں تک جہاں
تک ان کا کوئی مد مقابل نہ رہا لیکن ان کی مخالفت حکومت ہند کی

اور رجعت کی کمر تھا جس کا توڑنا لازم ہوگیا۔

موسیو آندرے زند نے انگریزی سیرت کے اس پہلو پر بہت دلچسپ طریقے سے لکھا ہے۔[1]

"استعمار اور دولت کی موروثی روایات نے رفتہ رفتہ ان میں ایک امارت کی شان پیدا کر دی اور اس کے مدعی بن گئے کہ ان کی قوم کو حکومت کا خداداد حق حاصل ہے۔ ان کا یہ زعم اس حالت میں بڑھتا ہی گیا۔ جب لوگ ان کے دعوئے فضیلت کی رٹ بند کرنے لگے۔ یہاں تک کہ پچھلی صدی کے آخری حصہ کے نوجوان غیر شعوری طور پر سمجھنے لگے کہ ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہم واقعی اس کے مستحق ہیں۔

اس طرز خیال پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ کیونکہ اس سے انگریزوں کی نفسیات کے ایک نازک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ ہر شخص نے محسوس کیا ہوگا کہ انگلستان سمجھتا ہے کہ اس کی مشکلات کا سرچشمہ خارجی اسباب میں ہے۔ وہ ہر بحث میں یہی کہتا ہے کہ دنیا کی غلطی ہے۔ اگر یہ ملک اپنی اصلاح کرنے پر راضی ہو جائے تو انگلستان پھر خوش حال ہو جائے گا ... ہر موقع پر انگریزوں کی اس جذبہ کا اظہار ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کے بجائے کسی دوسرے کی اصلاح کریں۔"

اگر اور ملکوں کے ساتھ انگریزوں کا یہ عام رویہ تھا تو ہندوستان میں یہ اور بھی زیادہ نمایاں رہا۔ ہندوستان کے متعلق جس انداز سے انگریز خود

---

[1] Revue Britannique Avenue Siecle

کرتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے کتنا ہی تکلیف دہ ہو مگر دلکشی سے خالی نہیں۔ ان
کو راسخ عقیدہ ہے کہ وہ ہر حال میں حق بجانب ہیں اور ایک عظیم الشان فرض سے
پوری طرح عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ ان کا تو صاف یہ کہنا ہے کہ قوم اور ان کی سلطنت
دنیا کی بہترین سلطنت ہے۔ ان گنہگاروں کو جو اس سچے عقیدے کے منکر ہیں
وہ غصہ اور حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس طرز خیال میں ایک مذہبی رنگ
کی جھلک ہے۔ کلیسا کے قدیم محکمہ احتساب کی طرح وہ اس پر تلے ہوئے ہیں
کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں وہ ہمیں نجات ضرور دلا کر رہیں گے۔ اس روحانی
کاروبار سے اتفاق سے ان کو دنیاوی منافع بھی حاصل ہو گیا اور اس طرح ایک
پرانی مثل کہ "ایمانداری سب سے زیادہ نفع کی چیز ہے" صحیح ثابت ہو گئی۔
ہندوستان کی ترقی کے معنی یہ قرار پائے کہ وہ برطانوی سلطنت میں کھپ
جائے اور منتخب ہندوستانی والیان سلطنت کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ برطانوی نصب العین
اور مقاصد کو ہم جتنا زیادہ اختیار کرتے اتنی ہی زیادہ ہم میں اپنے آپ پر حکومت
کرنے کی صلاحیت تسلیم کی جاتی۔ جس وقت ہم یہ دکھا دیتے اور اس کا یقین
دلا دیتے کہ ہم اپنی آزادی برطانیہ کی خواہشوں کے مطابق استعمال کریں گے
اسی وقت آزاد کر دئے جاتے۔

برطانوی حکومت کے کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں
ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان میں ضرور اختلاف رائے ہوگا
یہ ایک قدرتی بات ہے مگر جب بڑے بڑے انگریز عہدہ داروں کو بھی
دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے گذشتہ اور موجودہ حالات کی خیالی تصویریں کھینچتے
ہیں اور ایسے بیانات سنتے ہیں تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ چند باہر والے
دوسرے لوگوں کے سوا، ہندوستان کے متعلق تمام انگریزوں کا خیال نہایت

حیرت انگیز ہے جب وہ مخصوص واقعات کو نہیں دیکھ سکتے تو ظاہر ہے کہ
ہندوستان کی روح تک ان کی رسائی کیسے ہوسکتی ہے۔ انھوں نے اس کے
جسم پر قبضہ کرلیا۔ لیکن ہمیشہ بے حس دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس کی سیرت کو نہیں سمجھ
سکے اور نہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کبھی اسے آنکھ سے
آنکھ ملا کر نہیں دیکھا کیونکہ ان کی نظریں پھری ہوئی تھیں اور ان کی نگاہیں شرم و
ذلت سے جھکی تھیں۔ صدیوں کے ساتھ کے بعد بھی باہمی اجنبیت دور نہیں ہوئی
اور دونوں ایک دوسرے سے بیزار رہیں۔

اس احساس اور ذلت کے باوجود ہندوستان شرافت اور عظمت
سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ وہ قدیم روایات اور مصیبتوں کے بوجھ سے دبا
ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں تھکن اور صدیوں کا بار تھا مگر اسی کے ساتھ اس میں
ایک حسن تھا جو روحانی کیفیت نے اس کے خدوخال میں پیدا کردیا تھا اس کے
عجیب و غریب تصورات اور تخیلات اور پاکیزہ جذبات کے نقش ایک ایک
کرکے اس کے چہرے پر ابھر آئے تھے۔ اس کے شکستہ جسم سے روحانی عظمت
عظمت و وقار کی جھلک اب تک نظر آتی ہے۔ اس نے تاریخ کی طویل سرنگیں
طے کی ہیں اور اس سفر میں علم و حکمت کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اسے
بہت سے اجنبیوں سے سابقہ پڑا۔ اس نے انھیں اپنے وسیع خاندان میں
شامل کرلیا۔ اس نے بڑے نشیب و فراز اٹھائے، سخت ذلتیں، شکستیں جھیلیں
اور عجیب عجیب تماشے دیکھے۔ لیکن اس لمبے سفر میں اول سے آخر تک اس
نے اپنی پرانی تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس سے تقویت اور زندگی حاصل
کی اور دوسرے ملکوں کو بھی اس میں سے حصہ دیا۔ جھولے کی طرح کبھی وہ اوپر کبھی
نیچے آیا۔ اٹھا تو اپنے تخیل کی پرواز سے آسمانوں کی خبر لایا۔ گرا تو پستی کے گڑھے

میں یہاں تک پہنچا۔ باوجود باطل اوہام اور لغو رسوم کے بوجھ کے جس تلے اس کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی۔ وہ اس روح افزا تعلیم کو بالکل بھولا نہیں تھا جو ابتدا میں ویدک دانا ترین روشن ضمیر حکیموں نے اپنشد کے ذریعہ دی تھی۔ اس کے تیز فہم حق طلب حق کی تلاش سے بے چین ہمیشہ سعی و جستجو میں لگے رہتے تھے۔ لاکھوں سادہ عقائد کے دامن میں پناہ نہیں لی۔ بے جان رسوم اور معمولات پر تکیہ نہیں کیا۔ نہ ان لوک میں اپنی ذات کو تکلیف اور مصیبت سے بچانا اور پرلوک میں سکھ میں ٹھکانہ نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ بصیرت اور معرفت کے طلب گار تھے "مجھے مجاز سے حقیقت تک پہنچا دے۔ اندھیرے سے روشنی تک، موت سے حیات دوام تک"[1] اپنشدوں کی منتر، علم و بصیرت کی دعا، ان دعاؤں میں جو آج کل لاکھوں آدمی روزانہ پڑھتے ہیں سب سے زیادہ مشہور ہے۔

اگرچہ سیاسی اعتبار سے ہندوستانی روح اکثر منتشر رہی لیکن اس نے اپنے مشترک روحانی سرمایے کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور اس کثرت میں وحدت کا رنگ جھلکتا رہا۔[2] تمام قدیم ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اچھائی اور برائی کا مجموعہ مرکب تھا لیکن اس کی اچھائیاں چھپی ہوئی تھیں اور انہیں تلاش کرنے کی

---

[1] برہدارنیک اپنشد ۱، ۳، ۲۸

[2] ہندوستان میں جو لسانی فرق پائے جاتے ہیں ان میں سب سے بڑا یہ ہے کہ اس کے اختلاف کی تہ میں ایک اتحاد موجود ہے جو فوراً محسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ تاریخ کا کوئی ایسا دور نہیں ہوا جب اس اتحاد نے ملک میں سیاسی ربط پیدا کرکے اسے ایک واحد ہستی بنا دیا ہو لیکن یہ اتنی بڑی حقیقت ہے اور اتنی بڑی قوت رکھتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس دائرے میں آ کر (بقیہ صفحہ ۲۵۷ پر)

مر رہی تھی اور تنزل کے آثار کھلے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی تیز سنہری دھوپ اب بھی اور چمکاتی تھی۔

ہندوستان اور اطالیہ کی حالت کچھ ملتی جلتی ہے۔ دونوں پرانے ملک ہیں اور ان کی تمدنی روایات کا سلسلہ بہت دور تک پہنچتا ہے۔ البتہ اطالیہ ہندوستان کے مقابلے میں کم عمر ہے اور وسعت میں اس سے بہت کم ہے۔ دونوں میں سیاسی انتشار رہا مگر متحدہ ہند اور متحدہ اطالیہ کا تصور کبھی فنا نہیں ہوا اور کوئی اختلافات کے باوجود اتحاد کا رنگ غالب رہا۔ اطالیہ کا اتحاد بڑی حد تک رومی اتحاد تھا کیونکہ یہ عظیم الشان شہر ملک پر چھایا ہوا رہا تھا اور یہی اتحاد کا مرکز اور نشان تھا۔ ہندوستان میں کوئی ایسا مرکز کوئی ایسا شہر نہیں تھا جو تمام ملک پر حاوی ہو۔ بنارس مشرق کا شہر لازوال[1] کہا جا سکتا ہے۔ نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام مشرقی ایشیا کا۔ لیکن بنارس نے کبھی سلطنت کا کھیل نہیں کھیلا۔ نہ کبھی دنیاوی اقتدار کی فکر میں سر کھپایا۔ ہندوستانی تہذیب سارے ملک میں اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ ملک کا کوئی حصہ اس کا مرکز نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ جنوب میں راس کماری سے شمال میں بدری ناتھ اور امرناتھ تک مشرق میں دوارکا سے مغرب میں پوری تک ایک ہی قسم کے خیالات جاری اور ساری تھے اور اگر کسی جگہ پر خیالات کا تصادم ہوتا ہو تو اس کی دھمک سارے ملک میں دور دور تک پہنچ جاتی تھی۔

(بقیہ صفحہ ۲۵۵) وہ اس سے بہت کچھ متأثر ہوئے" مسٹر برڈرک وائٹ "شرق اور مغرب کا مستقبل" (انگریزی)

[1] رومی سلطنت کے زمانے میں روم "شہر لازوال" کہلاتا تھا

میں زوال تک پہنچا۔ باوجود باطل اوہام اور لغو رسوم کے وجود کے جس نے اس کا
کمر توڑ دی تھی۔ وہ اس روح افزا تعلیم کو بالکل بھولا نہیں تھا جو ابتدا میں ان کے
دانا ترین، روشن ضمیر حکیموں نے ابتدا کے ذریعہ دی تھی۔ ان کے تیز ذہن جو تلاش
حق کی تلاش میں بے چین ہمہ تن سعی و جستجو میں لگے رہتے تھے ناقصوں سے مادے
عقائد کے دامن میں پناہ نہیں لی نہ بے جان رسوم اور معمولات پر تکیہ نہیں کیا۔ نہ ان
لوگوں نے اپنی ذات کو تکلیف اور مصیبت سے بچانا اور پرلوک میں سکھ میں ٹھکانا
نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ بصیرت اور معرفت کے طلب گار تھے "مجھے مجاز سے حقیقت
تک پہنچا دے، اندھیرے سے روشنی تک، موت سے حیات دوام تک"[1] اپنشد کی
مشہور علم و بصیرت کی دعا، ان دعاؤں میں جو آج کل لاکھوں آدمی روزانہ پڑھتے
ہیں سب سے زیادہ مشہور ہے۔

اگرچہ سیاسی اعتبار سے ہندوستانی روح اکثر منتشر رہی لیکن اس نے
اپنے مشترک روحانی سرمایہ کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور اس کثرت میں وحدت کا
رنگ جھلکتا رہا[2] تمام قدیم ملکوں کی طرح ہندوستان میں اچھائی اور برائی کا مجموعہ
مرکب تھا لیکن اس کی اچھائیاں چھپی ہوئی تھیں اور انہیں تلاش کرنے کی

---

[1] برہدآرنیک اپنشد ۱۔ ۳۔ ۲۸

[2] ہندوستان میں جو اختلافات نظر آتے ہیں ان سب سے مراد ہے کہ اس کے وجود کی تہ میں ایک اتحاد موجود ہے جو محسوس نہیں ہوتا۔ اس سے کہ تاریخ کا کوئی ایسا دور ہو جب اس اتحاد نے ملک میں سیاسی رشتہ پیدا کر کے اسے ایک قوم بنا دیا ہو لیکن یہ ایک بڑی حقیقت ہے اور اتنی بڑی قوت رکھتی ہے کہ ہندوستان کے مخالف کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس دائرے میں آ کر (بقیہ صفحہ ۲۵۸ پر)

جیسے اطالیہ نے مغربی یورپ کو مذہب اور تہذیب عطا کی اسی طرح
ہندوستان نے مشرقی ایشیا کو۔ دولت چین۔ اگرچہ ایسی ہی قدامت زدہ تھا
میں اس سے کم تر تھا اس زمانے میں بھی جب کہ سیاسی اعتبار سے اطالیہ
کمزور اور تباہ تھا یورپ کی رگوں میں اسی کا خون دوڑ رہا تھا
اطالیہ کے متعلق شاید میٹرنخ نے کہا تھا کہ "ایک جغرافیائی اصطلاح ہے"*
بہت سے لوگ جو میٹرنخ بننا چاہتے ہیں ہندوستان کی نسبت بھی یہی فقرہ
کہتے ہیں اور اتفاق سے دونوں سرزمینوں میں ان ملکوں کا محل وقوع بھی
ایک ہی سا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ انگلستان اور آسٹریا کی
مشابہت ہے۔ اور بیسویں صدی کے انگلستان کا انیسویں صدی کے آسٹریا
سے مقابلہ کیا بھی گیا ہے۔ انگلستان بھی اسی طرح متکبر اور مغرور اور بظاہر طاقتور
اور رعب دار ہے مگر وہ جڑیں جن سے اسے قوت حاصل ہوتی تھی اب سوکھ گئی
ہیں اور اس عالی شان عمارت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔
یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان ملکوں کو بھی اسی طرح مجسم تصور کیے بغیر
نہیں رہ سکتا یہ عادت اور قدیم خیالات کا اثر ہے چنانچہ ہندوستان عورت
ماتا اور بھارت ماتا ایک خوبصورت خاتون کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو بہت بوڑھی ہیں
مگر دیکھنے میں ہمیشہ جوان معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں غم سے بھری اور دل ترا
یاس سے معمور ہے۔ اجنبیوں کے ظلم سے نالاں ہیں اور اپنے بچوں کو مدد
کے لیے پکارتی ہیں۔ یہی تصور ہے جو لاکھوں آدمیوں کے جذبات
کو ابھارتا ہے اور انہیں عمل اور ایثار پر آمادہ کرتا ہے لیکن ہندوستان

---

* میٹرنخ مشہور مدبر جو ۱۸۱۵ء سے ۱۸۴۸ء تک یورپ کی سیاسی رہنمائی کرتا رہا

میں زیادہ تر مزدور اور کسان بستے ہیں اور وہ دیکھتے ہیں چین نہیں ہے کیونکہ
ان میں کوئی حسن نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے محل کی خوبصورت
خاتون کھیتوں اور کارخانوں کے تھکے اور کمر جھکے مزدوروں کی ہمسائیگی کرلی
ہیں یا ان لوگوں کی چھوٹی سی جماعت کی خوشحالی سے غریبوں کو سزا ملتے
رہتی اور ان کا خون چوستی رہی ہے جس نے انہیں ظالمانہ رسم و رواج
کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور ان میں سے بہتوں کو اچھوت تک بنا دیا ہے
ہم حقیقت پر تخیلات کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ
واقعات کی دنیا سے بھاگ کر خواب و خیال کی دنیا میں پناہ لیں۔

لیکن ان مختلف طبقوں اور ان کی باہمی کشمکش کے باوجود ایک
رشتہ تھا جو ان سب کو مربوط کئے ہوئے تھا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے
کہ یہ رشتہ کتنا مضبوط اور پائدار تھا۔ اس کی مضبوطی کا راز کیا تھا؟ یہ محض ذہانت
اور جمود کی انفعالی قوت نہیں تھی، اگرچہ یہ قوت بہت بڑی ہوتی ہے۔ اس
میں کوئی جاندار اور فعال تحرک جوہر کام کر رہا تھا۔ کیونکہ اس نے قومی خارجی
اثرات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ اور ان داخلی اثرات کو جو اس میں انتشار پیدا
کرنا چاہتے تھے جذب کر لیا لیکن ایسی اس قوت کے باوجود وہ سیاسی آزادی
کو محفوظ نہ رکھ سکا اور سیاسی اتحاد پیدا نہ کر سکا۔ ان چیزوں کو اس قابل
ہی نہیں سمجھا گیا کہ ان کے لئے زحمت اٹھائی جائے۔ انھوں نے حماقت سے
ان کی اہمیت کو نظر انداز کیا اور ہم اس غفلت کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اپنی تاریخ
میں ہم شروع سے آخر تک دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم نصب العین میں
سیاسی اور فوجی کامیابی کو کبھی وقعت نہیں دی گئی اور دولت پیدا کرنے والے
لوگ ہمیشہ حقیر سمجھے گئے۔ عزت اور دولت کا ساتھ نہیں ہو سکتا تھا۔ عزت کے کم

فطری طور پر ان لوگوں کا حصہ سمجھی جاتی تھی جو اعلیٰ معاوضے پر سماج کی خدمت کریں۔
پرانی تہذیب بہت سے سخت طوفانوں سے سلامت گزر گئی۔ لیکن اگرچہ
اس کی ظاہری صورت قائم رہی اس میں باطنی حقیقت باقی نہیں رہی۔ آج کل
وہ خاموشی کے ساتھ مگر گہری توڑ کر ایک نئے اور نہایت طاقتور حریف سے
مقابلہ کر رہی ہے یعنی مغربی سرمایہ داری کی "بیسویں" والی تہذیب سے اس
نئے حریف سے وہ شکست کھا جائے گی۔ کیونکہ مغرب اپنے ساتھ سائنس لیا
ہے۔ اور سائنس سے لاکھوں فاقہ کشوں کو روٹی ملنے کی امید ہے لیکن تاہم
تہذیب کے زہر کا تریاق بھی مغرب اپنے ساتھ لایا ہے اور وہ اشتراکیت
ہے یعنی اتحاد عمل اور عام مفاد کی خاطر جماعت کی خدمت کرنے کا اصول برہمنوں
کا جو پرانا خدمت کا نصب العین تھا اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں لیکن اس
کا تقاضا یہ ہے کہ ہر طبقہ اور جماعت کو برہمن کا رتبہ دیا جائے (ظاہر ہے کہ یہاں
برہمن کے مذہبی معنی مراد نہیں) اور طبقوں کی تفریق اور امتیازات مٹا دیئے
جائیں۔ ممکن ہے ہندوستان جب نیا لباس پہنے اور وہ تو پہنتا ہی ہے
اس لئے کہ پرانا بہت کچھ شکستہ چیتھڑے ہو گیا ہے تو اس کی تراش ایسی ہو کہ
موجودہ حالات اور پرانی وضع دونوں کے ساتھ نبھ سکے۔ جو رنگ وہ اختیار
کرے وہ ایسا ہونا چاہئے کہ قدیم رنگ میں کھپ جائے۔

(۵۴)

انگریزی حکومت کی کارگزاری

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی کارگزاری کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی انگریز یا ہندوستانی اس کی کارگزاری کو ایک خارجی چیز ٹھہرا کر اس پر ٹھنڈے دل سے نظر ڈال سکے گا۔ اور گو یہ ممکن بھی ہو تو "نفسیاتی" اور دوسرے غیر مادی عناصر کا تولنا اور ان کا اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہوگا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو وہ دیا ہے جو اسے گذشتہ زمانے میں کبھی حاصل نہ تھا یعنی ایک حکومت جس کا حکم اس ملک میں جو ایک بر اعظم سے کم نہیں ہر جگہ بے چون و چرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے قانون کی عملداری قائم کی ہے اور ایک نظام حکومت جو عدل پرستی اور کارپرداز ہے۔ اس نے ہندوستان میں پارلیمانی حکومت یا ذاتی آزادی کے تصورات رائج کئے اور برطانوی ہند کو ایک واحد ریاست بنا کر اس نے ہندوستانیوں میں سیاسی اتحاد کا احساس پیدا کیا اور اس طرح قومیت کی اس کے ابتدائی مدارج میں پرورش کی۔[1] یہ دعوے انگریزوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں اور سب صحیح بھی ہیں اگرچہ قانون

---

[1] یہ اقتباس ہندوستان کے دستور کی اصلاح کے متعلق جو مشترک پارلیمنٹری کمیٹی تھی اس کی رپورٹ میں سے لئے گئے تھے

کی معماری اور مجسمی آزادیاں اب کئی برس سے دیکھنے میں نہیں آئی ہیں ۔

ہندوستانی اس دور پر نظر ڈالتے ہوئے اور بہت سے پہلوؤں پر زور دیتے
ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ غیروں کی حکومت نے ہم کو کیا کیا دنیوی اور روحانی نقصان
پہنچایا ہے ۔ یہ نقطۂ نظر اس قدر مختلف ہے کہ وہی چیزیں جنہیں انگریز تعریف کے لائق
سمجھتے ہیں اس کی ہندوستانی مذمت کرتے ہیں ۔ جیسے کہ ڈاکٹر آنند کمار سوامی نے
لکھا ہے "ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سب سے عجیب خصوصیات میں
سے ایک یہ ہے کہ ہندوستانی قوم پر جو سب سے بڑی زیادتیاں کی گئیں
بظاہر نعمتیں معلوم ہوتی ہیں "

واقعہ یہ ہے کہ پچھلی صدی یا اس سے کچھ زیادہ میں ہندوستان کے
اندر جو تبدیلیاں ہوئیں وہ ناگزیر تھیں اور مشرق اور مغرب کے ملکوں میں
یکساں ہوئی ہیں مغربی یورپ میں اور اس کے بعد باقی دنیا میں صنعتی ترقی نے
ہر جگہ اپنے ساتھ قومیت کا احساس اور ایک مضبوط مرکزی ریاست
پیدا کی ۔ انگریز اس کی داد تو دے سکتے ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے
مغرب کے لئے ہندوستان کا دروازہ کھولا اور ایک نوعیت کی صنعت اور
سائنس کو یہاں پہنچایا لیکن یہ کرنے کے بعد وہ صنعت کا گلا دبا کر اس کی ترقی
روکے رہے جب تک کہ حالات نے انھیں مجبور نہیں کر دیا ۔ ہندوستان
پہلے بھی وہ مقام تھا جہاں وہ مختلف تہذیبیں آکر ملیں ۔ مغربی ایشیا کی
اسلامی تہذیب اور مشرقی تہذیب جو اس کی اپنی تھی اور مشرق بعید
تک پھیلی ہوئی تھی اب دور دراز مغرب سے ایک مشینی اور پچھلی تہذیب صورت

اور اس طرح ہندوستان کے کئی پرانے مسائل حل کر دیتی مگر انگریز جنھوں نے اسے یہاں پر قدم جمانے میں مدد کی تھی اس کو اور آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے ہماری صنعت کو نشو ونما نہیں پانے دیا اور اس طرح ہماری سیاسی ترقی میں بھی حائل ہوئے اور تمام ملک میں جتنیں نظام جاگیری یا اور بھی فرسودہ آثار ملے ان کا انھوں نے تحفظ کیا۔ اصول سے ہمارے مذہبی اور کسی قدر اصلاح پذیر قانون اور رسموں کے ساتھ کچھ ایسا کیا کہ وہ جس حالت میں تھیں اسی میں ٹھٹھر کر رہ گئیں اور ہمارے لئے ان کی زنجیروں سے رہا ہونا مشکل کر دیا۔ ہندوستان میں بورژوا طبقہ ان کی خوشنودی یا مدد سے فروغ نہیں پایا لیکن ریل اور صنعت کی پیدا کی ہوئی اور چیزوں کو ایک مرتبہ رائج کرنے کے بعد پھر وہ اس گاڑی کا آگے چلنا اور تغیرات کا سلسلہ جاری رہنا بند نہیں کر سکتے تھے، ہاں یہ ممکن تھا کہ وہ رکاوٹیں ڈالیں اور رفتار سست کر دیں اور پھر انھوں نے یوں طور پر اپنے فائدے کے لئے کیا۔

"حکومت ہند کی شاندار عمارت اسی پختہ بنیاد پر قائم ہے۔ اور اس کا یقین کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۸ء سے جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام مقبوضات برطانوی تاج کے زیر نگیں ہو گئیں اس وقت تک ہندوستان نے جو تعلیمی اور تمدنی ترقی کی ہے اسے حاصل کر یا اس کی ملکی اور نگارنگ تاریخ کے کسی دور میں اس کے بس کی بات نہ تھی[۱]۔ یہ دعویٰ ایسا واضح اور یقینی نہیں ہے جیسا کہ معلوم ہوتا ہے اور نہ اکثر کہا گیا ہے کہ در اصل

---

[۱] ہندوستان کے پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۳۴ء

برطانوی حکومت قائم ہونے کے بعد پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کم ہو گئی لیکن اگر یہ بات
پورا پورا صحیح بھی ہوتا تو اس کا مطلب موجودہ صنعتی دور کا پچھلے زمانے سے مقابلہ کرنا ہوا
پچھلے سو سال میں سائنس اور صنعت کی بدولت دنیا کے ہر ایک حصے نے تعلیمی اور
تمدنی ترقی کی ہے اور ہم کسی ایسے ملک کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی ترقی حاصل کرنا
اس کی لمبی اور رنگارنگ تاریخ کے کسی دور میں اس کے بس کی بات رہی ہی پائے
اس کی تاریخ ہندوستان کے مقابلہ میں لمبی رکھی جا سکے تو کیا یہ ہماری بے کاری
کٹ حجتی اور کم ہمتی ہوگی۔ اگر ہم کہیں کہ اس صنعتی دور میں ہم بہرحال کچھ نہ کچھ
میکانکی ترقی کر ہی لیتے اور برطانوی حکومت کے بغیر بھی کر لیتے اور وہ اصل
اگر ہم دیسی حالت کا اور بہتیرے ملکوں سے مقابلہ کریں تو کیا ہم بغیر غلطی کے خوف
کے یہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ ترقی زیادہ ہوتی۔ کیونکہ خود انگریز اس ترقی کا
گلا گھونٹنے کے لئے جو کچھ کر رہے تھے اس کے خلاف ہم کو جد و جہد کرنا
پڑی، ریلیں، تار برقی، ٹیلیفون، لاسلکی ان سے اور ایسی دوسری چیزوں
سے برطانوی حکومت کی اچھائی اور فیض رسانی کو جانچنا درست نہیں۔ یہ
اچھی چیزیں ہیں اور ضروری تھیں اور چونکہ انگریز اتفاق سے انہیں
پہلے پہل یہاں لائے ہمیں ان کا احسان ماننا چاہئے لیکن صنعتی نظام کے یہ
پیش قیمت ہمارے یہاں بالخصوص اس لئے آئے کہ برطانوی حکومت مستحکم ہو جائے
یہ شریانیں اور رگیں ہیں جن میں قوم کے خون کو دوڑنا چاہئے تھا۔ انگلستان
کی تجارت کو بڑھانا، اس کی پیداوار کو انگلستان لے جانا اور اس کے لاکھوں
کروڑوں آدمیوں میں بیچ ڈالنا اور بعض دولت مند بنانا مانے تھا۔ یہ
تو سچ ہے کہ ان آلات سے کوئی ایسا نتیجہ نکلنے والا تھا لیکن ان کی تشہیر اور ان
سے کام لینے کا مقصد کچھ اور ہی تھا یعنی حکومت کی گرفت کو مضبوط کرنا اور منڈیاں

کو برطانوی مال کے لئے قبضہ میں کرنا اور یہ مقصد ان کی بدولت حاصل ہوگیا
میں صنعتی تنظیم اور نقل وحمل کے جدید ذریعوں کا بالکل موافق ہوں۔ لیکن
کبھی کبھی ہندوستان کے میدانوں سے سرعت کے ساتھ گذرتے وقت مجھے
ایسا معلوم ہوا کہ یہ ریلیں جو ملک کو زندگی بخشتی ہیں ایک طرح کی آہنی بیڑیاں
اور ہتھکڑیاں ہیں جو ہندوستان کو جکڑے اور قید کئے ہوئے ہیں۔

جس تصور کے مطابق انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کی اس میں
ریاست پولیس کی علمبرداری ہے۔ حکومت کا کام یہ تھا کہ ریاست کی حفاظت
کرے اور باقی سب دوسروں پر چھوڑ دے۔ انگریزی مالیات کا موضوع بس
فوج کے اخراجات، پولیس، نظام حکومت سرکاری قرضے کا سود تھے۔ شہریوں کی
معاشی اغراض کی نگرانی نہیں کی گئی بلکہ انھیں انگریزی اغراض پر قربان کیا گیا
سوائے ایک مٹھی بھر آدمیوں کے باقی سب کو سیدھی اور دوسری ضروریات کی
مطلق پروا نہیں کی گئی۔ انسان عامہ کے نئے تصورات جن کی بدولت دوسرے
ملکوں میں سرکاری خرچ سے ہر ایک کی تعلیم، عام صحت کی ترقی، غریب اور
کمزور دماغ والوں کی دیکھ بھال، مزدوروں کا بیمہ کہ بیماری، بڑھاپے اور
بے روزگاری کے زمانے میں بالکل محتاج ہو جائیں۔ اور دوسری باتوں کا انتظام
کیا جاتا ہے ہماری حکومت کی حد نظر سے بالکل باہر تھیں۔ اس طرح کے کاموں
کے لئے جن میں خرچ ہی خرچ ہوتا ہے اس کے یہاں کوئی گنجائش ہی نہیں
تھی۔ کیونکہ جس اصول پر اس نے لگان مقرر کئے تھے وہ بالکل الٹا تھا جن لوگوں
کی آمدنی کم تھی ان سے بڑی آمدنی والوں کی نسبت حساب سے بہت زیادہ
لیا جاتا تھا اور ملک کے تحفظ اور حکومت کے محکموں پر اس کا خرچ بے انتہا
تھا اور ساری آمدنی کو کھا جاتا تھا۔

انگریزی حکومت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی پوری
توجہ ان باتوں پر صرف کرتی تھی جن کے ذریعہ سے اس کا سیاسی اور معاشی
تسلط بڑھتا تھا۔ باقی سب ضمنی تھا۔ انگریزوں نے ایک نہایت طاقتور مرکزی حکومت
تعمیر کی اور پولیس کو بہت مستعد رکھا۔ یہ ایک کارنامہ تھا جس پر وہ خود فخر کر سکتے
تھے لیکن ہندوستانی قوم اس کو اپنی کامیابی نہیں سمجھ سکتی۔ اتحاد بڑی اچھی
چیز ہے مگر غلامی میں اتحاد کوئی فخر کی بات نہیں۔ ایک استبدادی حکومت
کی طاقت لوگوں پر اور بھی گراں ہو سکتی ہے اور پولیس اگرچہ وہ بے شک کئی
اعتبارات سے کارآمد ہوتی ہے۔ انہی لوگوں کے خلاف استعمال کی جا سکتی ہے
اور کی جاتی ہے جن کی حفاظت کرنا اس کا کام سمجھا جاتا ہے۔ مسٹر برٹرنڈ رسل
نے موجودہ اور قدیم یونانی تہذیب کا مقابلہ کرتے ہوئے حال ہی میں لکھا
ہے "یونانی تہذیب اگر ہماری تہذیب پر فضیلت رکھتی ہے تو اس لحاظ سے
کہ اس کا پولیس کا انتظام خراب تھا جس کی بدولت بھلے آدمیوں کی نسبتاً زیادہ
بڑی تعداد اس سے بچ نکلتی تھی۔"

انگریزوں کا تسلط ہونے سے ہم کو امن ملا ان کشمکشوں اور مصیبتوں
کے بعد جو مغل سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے پر ہمیں سہنا پڑیں۔
ہندوستان کو بے شک اس کی ضرورت تھی۔ امن ایک قیمتی چیز ہے جو ہر قسم کی
ترقی کے لئے ضروری ہے اور ہمیں جب وہ حاصل ہوا تو ہم نے اس کی آؤ بھگت
بھی کی۔ لیکن امن بھی بہت گراں داموں خریدا جا سکتا ہے۔ اگر وہ قبر کے
کامل سکون یا پنجرے یا قید خانے کی قطعاً محفوظ زندگی کے برابر ہو جائے
امن ایسے لوگوں کی ایک آلودہ مایوسی سے بھی پیدا ہو سکتا ہے جو اپنی حالت
کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ وہ امن جو کسی اجنبی فاتح نے جبراً قائم کیا ہو۔ اصل امن کی

بحر اٹلانٹک کے ساحل کی وہ امریکی نوآبادیاں جن کی اٹھارویں صدی میں
کوئی حیثیت نہیں تھی اب دنیا کی سب سے دولت مند اور طاقت ور قوم ہیں
اور صنعت میں سب سے آگے ہیں۔ جاپان میں اور اسی مدت میں حیرت انگیز
تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ روس کی سیبیریا سرزمین میں جہاں ابھی کل تک زار کی حکومت
کا شاہی ہاتھ ترقی اور لیاقت کا گلا دبا رہا تھا ایک نئی زندگی کا جوش ابھر
رہا ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا بنائی جا رہی ہے۔ ہندوستان
میں بھی تعمیرات ہوئے ہیں۔ ہر ملک اب وہ نہیں ہے جو اٹھارویں صدی میں تھا
اب ہم ریلیں دیکھتے ہیں۔ آب پاشی کا انتظام، کارخانے، اسکول اور کالج،
بڑے بڑے سرکاری دفتر وغیرہ وغیرہ

لیکن ان تعمیرات کے باوجود ہندوستان کی اس وقت کیا حالت ہے؟
ہندوستان ایک غلاموں کی ریاست ہے جس کی عظیم الشان قوت ایک
پنجرے میں بند ہے جس میں آزادی سے سانس لینے کی ہمت نہیں جس پر اجنبی
دور سے بیٹھے راج کر رہے ہیں۔ اس کے باشندوں سے زیادہ غریب کہیں
کے باشندے نہیں۔ ان کی عمریں کم ہوتی ہیں ان میں بیماری اور وبا کا مقابلہ
کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ جہالت کا دور دورہ ہے۔ بڑے بڑے علاقے ہیں
جن میں صفائی اور طبی امداد کا کوئی انتظام نہیں۔ متوسط طبقے اور عوام میں بے
روزگاری بے پناہ ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ آزادی، جمہوریت، اشتراکیت،
اشتمالیت کے نعرے، ناقابل عمل حوصلوں کے مثالی ہمدرد ان کے کٹر
پرستار یا جذباتی لگاتے ہیں۔ اصل معیار لوگوں کی اجتماعی بہبودی ہے بے شک
سب سے اہم معیار یہی ہے اور اس پر آج کل کا ہندوستان ناپا جائے
تو اس کی قدر بہت ہی حقیر نکلے گی۔ دوسرے ملکوں میں بے روزگاری کی امداد

سے قدم رکھتے ہیں اور ہماری ساری قوت کمیٹیوں اور کمیشنوں میں صرف
ہو جاتی ہے۔

ہندوستانیوں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ باتیں بہت کرتے ہیں
اور کام کم۔ یہ الزام صحیح ہے۔ لیکن کیا انگریزوں میں کمیٹی اور کمیشن بنانے کی
خوبی حد و حساب استثنا ہے۔ اس پر ہم اپنی حیرت ظاہر نہ کریں۔ وہ
کمیشن اور کمیٹیاں جن میں سے ہر ایک مدتوں محنت کرنے کے بعد ایک عالمانہ
رپورٹ پیش کرتا ہے "ایک اہم سرکاری دستاویز" جس کی حسب دستور تعریف
کی جاتی ہے اور پھر حسب دستور کسی طاق میں رکھ دی جاتی ہے اس طرح
کہ ہم کو احساس ہوتا ہے کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ترقی کر رہے ہیں اور یہ
فائدہ بھی ہوتا ہے کہ جہاں ہیں وہیں پر رہتے ہیں خودداری جو خاصی ہے
وہ بھی ہو جاتا ہے۔ مستقل اغراض وابستہ ہیں ان کا مال مہیا نہیں ہوتا
اور وہ محفوظ رہتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں اس برعکس کی جاتی ہے کہ ترقی
کیسے کریں ہم رکے اور ریک لگائے اور حقوق کا تحفظ کرنے کی تدبیر
کرتے ہیں کہ کہیں بہت زیادہ تیزی سے آگے نہ بڑھ جائیں۔

۱۹۲۳ء کی سترک یا ہیمبری کمیٹی کی رپورٹ میں نعل عہد کی نسبت
ہمیں بتایا گیا ہے کہ "شہنشاہ کی شان و شوکت رعایا کی عزت کا پیمانہ ہوگئی
تھی"۔ یہ خیال بالکل صحیح ہے لیکن کیا آج کل بھی ہم اسی پیمانے سے نہیں ناپ سکتے؟
آپ آج کل کی نئی دہلی اور وائسرائے کے ٹھاٹھ اور صوبے کے گورنروں اور
ان کے دکھاوے اور نمایش کو کیا کہیں گے؟ اس کا یہ منظر بھی بڑی انتہائی
اور حیرت انگیز عبرت ہے دونوں کو مقابلہ پر دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے اور یہ سمجھنے میں
دشواری ہوتی ہے کہ حساس لوگ اسے کیسے گوارا کرتے ہیں۔ سہتا ہی

لوگوں کی عقل چکرا گئی اور نئے حالات سے نمٹنے کے قابل نہیں رہے۔ ان کی محدود اور جامد تعلیم نے انھیں غیر معمولی موقعوں اور نئی صورتوں کے لئے تیار نہیں کیا تھا۔ ایک مدت تک خود مختار رہنے سے ان کی عادتیں بگڑ گئی تھیں۔ ایک جماعت کی حیثیت سے وہ قریب قریب خود مختار تھے لیکن برائے نام برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت تھے۔ لارڈ ایکٹن نے کہا ہے کہ "اقتدار آدمی کو بگاڑ دیتا ہے اور کامل اقتدار بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے۔"
مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اپنی بساط کے موافق یہ لوگ فرض کے عہدہ دار تھے جو اپنا روزمرہ کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ اگرچہ ان میں کوئی خاص ذہانت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کی تربیت ہی ایسی تھی کہ اگر کوئی غیر متوقع صورت پیدا ہو جاتی تو وہ رہ جاتے۔ اور بات یہ ہے کہ وہ اپنی خود اعتمادی، تنگ نظری، پست طبیعت اور باہمی اتحاد کی بدولت فوری مشکلات پر قابو پا لیتے۔ عراق میں جو گڑبڑ ہوئی تھی اس نے ظاہر کر دیا کہ ہندستان کی برطانوی حکومت کسی شخص واحد سے خاص قسم کے واقعات ہوتے تھے مگر ظاہر نہیں ہونے پاتے۔ عوامی بدامنی کو روکنے کے لئے جو کارروائیاں حکومت نے کیں وہ بھی بہت تھوڑی تھیں۔ بندوق اور لاٹھی چلا کر مخالفوں کو تھوڑی دیر کے لئے دبا سکتے ہیں مگر اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ خود وہ برتری کا احساس جس کا تحفظ مقصود ہے اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان لوگوں نے ایک بڑھتی ہوئی جارحانہ قومی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے لٹھ دینے کا کام لیا۔ لازمی تھا کیونکہ سلطنتوں کا دارومدار اسی پر ہے اور ان کو مخالفت کا سامنا کرنے کا اور کوئی طریقہ سکھایا نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ بے ضرورت اور حد سے زیادہ تشدد سے

جہاں تک کوئی بڑا عہدہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے تو ایک تو یہ خطرہ ہوتا
ہے کہ اس سے بدانتظامی اور بددیانتی پھیلے گی۔ انڈین میڈیکل سروس کے
وہ عہدے جو گورے آدمیوں کے لئے مخصوص ہیں کم کر دیئے جائیں تو
"ہندوستانیوں کی صحت عامہ کے لئے خطرہ پیدا ہوتا ہے" اور ظاہر ہے
کہ اگر دور کے اس حصے کو جس میں انگریز ہیں ہاتھ بھی لگایا گیا تو دماغ
کی آفتیں ہم پر ٹوٹ پڑیں گی۔

میرے خیال میں یہ ایک حد تک ٹھیک ہے کہ اگر اعلیٰ عہدہ دار
سب یکبارگی چلے جائیں اور اپنے محکموں کو اپنے ماتحتوں کے حوالے کر جائیں
تو کارگزاری کا معیار گر جائے گا۔ لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سارا انتظام
ہی اسی ڈھنگ سے ہوا ہے۔ اور ماتحت نہ تو قابلیت کے لحاظ سے منتخب
کئے گئے ہیں اور نہ کبھی ان پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان
میں قابل آدمی کثرت سے موجود ہیں اور اگر صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو تھوڑے ہی
عرصہ میں یہ لوگ کام کے لائق بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری حکومت
اور ہماری سلطنت کا نقطۂ نظر بالکل بدل جائے یعنی ایک نئی ریاست وجود میں آئے۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ ہم سے کہا جاتا ہے دستور میں چاہے
تغیرات ہوں ان بڑی سروسوں کا جو ہماری محافظ اور پشت پناہ ہیں یہ
تسلط بدستور قائم رہے گا۔ یہ سروسیں حکومت کے اسرار کی حامل
ہیں وہ اپنے مندر کی پاسبانی کریں گی اور نامحرموں کو اس حریم پاک میں قدم
نہیں رکھنے دیں گی۔ رفتہ رفتہ جوں جوں ہم اس عزت کے مستحق ہوتے جائیں
گے وہ پردوں کو ایک ایک کرکے ہٹاتے جائیں گے یہاں تک کہ کبھی نہ کبھی
وہ دن آئے گا جب آخری پردہ ہٹ جائے گا اور ہمیں اس معبد کا اندرونی

حصہ ہماری متحیر اور مبہوت نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔

امپیریل سروسوں میں سب سے بڑا درجہ ہندوستانی سول سروس کا ہے اور ہندوستان کی حکومت کو چلانے کی بیک مائی یا دنا مای اسی کے حصہ میں آتی ہے۔ اس سروس کے چند بر حیدا ادصاف ہیں بار بار سنائے جاتے ہیں اور سامراج کے نظام میں اس کو جو عظمت حاصل ہے وہ صرف اسی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس کا سلسلہ قائم ہے اور اسے قریب قریب استبدادی حکومت کے اختیارات حاصل ہوا اور پھر اس طرح آسمان پر چڑھایا جاتا کسی فرد یا جماعت کے ذہنی توازن کے لئے مفید نہیں ہو سکتا سول سروس کی میرے دل میں جو قدر ہے اس کے باوجود مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے یہ حضرات بہت جلد اس بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں جو پرانے زمانے سے چلی آتی ہے اور آج کل اور بڑھ گئی ہے۔ یعنی اپنی بڑائی کا مالیخولیا۔

سول سروس کی خوبیوں سے انکار کرنا فضول ہے۔ اس لئے کہ انہیں بھولنے کا ہم کو موقع ہی نہیں ملتا۔ لیکن ان کی تعریف میں اتنی لمبی تانیں کہی جاتی ہیں اور کہی جا رہی ہیں کہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے ذرا ان لغویات کی قلعی کھول دی جائے۔ امریکی ماہر معاشیات ویبلن نے امتیازی حقوق رکھنے والے طبقوں کو "داشتہ طبقے" کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آئی سی ایس اور دوسری امپیریل سروسوں کو "داشتہ سروسیں" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ عیش ہمیں بڑا مہنگا پڑتا ہے۔

مسٹر گریہیم پول نے جو پارلیمنٹ کے سابق لیبر ممبر ہیں اور ہندوستان کے معاملات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں کچھ دن ہوئے "موڈرن ریویو"

میں لکھا تھا کہ "ابھی تک کسی نے انکار نہیں کیا کہ آئی سی ایس ایک سایہ
قابل اور دیانت سروس ہے" چونکہ انگلستان میں ایسی باتیں اکثر کہی جاتی ہیں
اور مان لی جاتی ہیں اس لئے اس قول پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے
اس طرح کے قطعی دعوے جن کی آسانی سے تردید ہو سکتی ہے حرف سے
خالی نہیں اور میجر گریہیم کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس بات سے کسی نے انکار نہیں
کیا۔ بارہا اس کا انکار کیا جا چکا ہے بہت دن ہوئے مسٹر گوکھلے نے آئی سی ایس
کو کھری کھری سنائی تھیں آج بھی عام ہندوستانی خواہ وہ کانگریسی ہوں یا نہ ہوں
میجر گریہیم پول کے اس قول کی تردید کرنے کو تیار ہو جائیں گے گو یہ بھی ممکن ہے
کہ دونوں فریقوں کی رائے اپنی اپنی جگہ صحیح ہو۔ ان کا اشارہ مختلف صفات کی
طرف ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ سول سروس میں جو قابلیت اور دیانت ہی ہے وہ کس قسم کی
ہے اگر اس قابلیت اور دیانت ہی کا اندازہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ ہندوستان
میں برطانوی سلطنت کس حد تک مستحکم کی گئی اور اسے ملک سے ناجائز فائدہ اٹھانے
میں کتنی مدد پہنچائی گئی تو بے شک آئی سی ایس والے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انہوں
نے بڑی کامیابی حاصل کی لیکن اگر معیار ہندوستان کے عوام کی بہبودی ہے
تو وہ صریحاً ناکامیاب رہے اور ان کی ناکامیابی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے جب
دیکھتے ہیں کہ آمدنی اور معیار زندگی کے لحاظ سے ان میں اور عام لوگوں میں
جن کی خدمت کی غرض سے وہ رکھے گئے ہیں اور جن پر ان کی تنخواہوں کا
بار پڑتا ہے زمین آسمان کا فرق ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ مجموعی حیثیت سے اس سروس نے ایک خاص معیار
قائم کر رکھا ہے یہ معیار لازمی طور پر اوسط درجے کی قابلیت کا ہے اگرچہ
کبھی کبھی اس میں غیر معمولی لوگ بھی نکلے ہیں عام قسم کی سروس سے اس سے زیادہ

ان کی عقل جکڑ گئی اور وہ نئے حالات سے نمٹنے کے قابل نہیں رہے۔ ان کی
محدود اور جامد تعلیم نے انہیں غیر معمولی موقعوں اور نئی صورتوں کے لئے تیار
نہیں کیا تھا۔ ایک مدت تک غیر ذمہ دار رہنے سے ان کی عادتیں بگڑ گئی
تھیں۔ ایک جماعت کی حیثیت سے وہ قریب قریب خود مختار تھے لیکن
برائے نام برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت تھے۔ لارڈ ایکٹن نے کہا ہے کہ
"اقتدار آدمی کو بگاڑ دیتا ہے اور کامل اقتدار بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے"۔
مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اپنی بساط کے موافق، لوگ کھرے
کے عہدہ دار تھے جو اپنا روزمرہ کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ اگرچہ
اس میں کوئی خاص ذہانت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کی تربیت ہی ایسی تھی
کہ اگر کوئی غیر متوقع صورت پیدا ہو جاتی تو وہ رہ جاتے۔ یہ اور بات ہے
کہ وہ اپنی خود اعتمادی، جماعتی عصبیت اور باہمی اتحاد کی بدولت بڑی
مشکلات پر قابو پا لیتے تھے۔ عراق میں جو گڑبڑ ہوئی تھی اس نے ظاہر کر دیا کہ
ہندوستان کی برطانوی حکومت کتنی سست و غیر مستعد ہے۔ اس قسم کے واقعات
بہت ہوتے ہیں۔ مگر ظاہر نہیں ہونے پاتے۔ اس نااہلی کو دور کرنے کے لئے جو
کارروائیاں حکومت نے کیں وہ بھی بہت کھوکھلی تھیں۔ بندوق اور لاٹھی چلا کر
مخالفوں کو تھوڑی دیر کے لئے دبا سکتے ہیں مگر اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں
ہوتا بلکہ خود وہ زبردستی کا احساس جس کا کھلا مظاہرہ ہے اندر سے کھوکھلا ہو جاتا
ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان لوگوں نے ایک بڑھتی ہوئی
جارحانہ قومی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے تشدد سے کام لیا۔ یہ لازمی تھا کیونکہ
سلطنتوں کا دارومدار اسی پر ہے اور ان کو مخالفت کا سامنا کرنے کا اور کوئی
طریقہ سکھایا نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ بے ضرورت اور حد سے زیادہ تشدد تھے

کام لیا یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاملہ ان کے قابو سے باہر ہو گیا تھا اور معمولی حالت
میں جو ضبط و استقلال ان میں نظر آتا تھا وہ اس وقت باقی نہیں رہا تھا
اکثر وہ بدحواس ہو جاتے تھے اور ان کی پبلک تقریروں میں ہسٹریا کی سی
کیفیت نظر آتی تھی کوئی نازک موقع آ جائے تو بے رحمی سے وہ سب کی قلعی
کھول دیتا ہے اور طبیعت کی گہرائیوں میں جو کمزوریاں چھپی ہوئی ہیں سطح
پر آ جاتی ہیں سول نافرمانی میں بھی آزمائش کا موقع تھا اور مورچے کے
دونوں طرف، یعنی کانگرس اور گورنمنٹ دونوں کے یہاں ایسے لوگ بہت
ہی کم تھے جو اس آزمائش میں پورے اترے مسٹر لائڈ جارج کہتے ہیں "نازک
موقعوں پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد اور عورتیں جن میں واقعی اعلیٰ درجے کی
قابلیت ہے بہت کم ہیں اور باقی لوگ ایسے موقعوں پر بیکار ہیں۔ جب
کوئی بڑا سیلاب آتا ہے تو وہ ٹیلے جو یوں ملے ہوئے نظر آتے تھے ڈوب
جاتے ہیں اور صرف سب سے اونچی چوٹیاں پانی کی سطح کے اوپر نظر آتی ہیں"
آئی سی ایس کے لوگ اپنے ذہن اور جذبات کے اعتبار سے ان
طوفانوں کے لیے جو ہندوستان میں آ رہے تھے بالکل تیار نہ تھے۔ ان میں سے اکثر کی
اصل تعلیم کلاسیکی طرز پر ہوئی تھی جس سے ان میں ایک خاص قسم کی شائستگی اور ایک
خاص قسم کی دلکشی پیدا ہو گئی تھی لیکن یہ طرز پرانے زمانے کا تھا جو عہد وکٹوریہ
کے لیے موزوں تھا مگر موجودہ حالات سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ یہ لوگ
بھی ایک تنگ محدود دنیا اینگلو انڈین دنیا میں رہتے تھے۔ جو نہ انگریزی تھی نہ
ہندوستانی وہ ان قوتوں کی قدر و قیمت کا جو اس عہد کی سماج میں
کارفرما ہیں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ باوجود اس مضحک دعوے کے
کہ وہ ہندوستان کے عام لوگوں کے ولی اور امین ہیں وہ ان سے بہت کم

تعلیم رکھتے تھے اور سے اوسط طبقے کے شہریوں سے اونچا ہم کم۔ وہ ہندوستانیوں کی مسرت کا اندازہ ان خوشامدیوں اور ملازمت کے خواستگاروں کو دیکھ کر کرتے تھے جو انہیں گھیرے رہتے تھے باقی سب کو مفسد اور شرپسند جان کر قابل التفات نہ سمجھے۔ لڑائی کے بعد ساری دنیا میں جو تغیرات خصوصاً ایشیا کی زندگی میں ہوئے ان کا علم انہیں بہت ہی کم تھا۔ وہ اسے اسی پرانے ڈھرے پر چلتے تھے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو بدلنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ جس نظام کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں وہ اب فرسودہ اور بے کار ہو گیا ہے اور وہ ایک جماعت کی حیثیت سے فرعونی طرز عمل اختیار کر رہے ہیں جس کا نقشہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنی تصنیف "کھوکھلے آدمی" میں کھینچا ہے۔

فرسودہ نظام اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ برطانوی سلطنت قائم ہے اور اب بھی خاصی طاقتور ہے اور اس کے چلانے والے قابل اور ماہر ہیں۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت اس دانت کی طرح ہے جو سڑ گیا ہے مگر مسوڑھوں میں جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ اس سے درد ہوتا ہے مگر اس کو اکھاڑنا آسان نہیں۔ درد اسی طرح ہوتا رہے گا اور بڑھتا جائے گا جب تک کہ دانت نکالا نہ جائے یا خود ہی نہ گر جائے۔

انگلستان میں بھی پبلک اسکول کے پڑھے لکھے لوگوں کا دور دورہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ اب تک ملکی معاملات میں دخیل ہیں۔ مگر اب ان کی وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ ہندوستان میں وہ اور بھی زیادہ بے محل ہیں اور عام قومی تحریک سے ہٹانا ان کے لئے محال ہے اور سیاسی انقلابی تحریک سے ہٹانا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔

بے شک آئی سی ایس میں بہت سے اچھے لوگ ہیں انگریز بھی اور
ہندوستانی بھی لیکن جب تک موجودہ نظام قائم ہے ان کے اوصاف
اور مقاصد میں کام آئیں گے جو ہندوستانیوں کے حق میں مفید نہیں۔ سول
سروس کے بعض ہندوستانی ملک اسکول کے رنگ میں اس قدر ڈوب جاتے
ہیں کہ وہ "دماغ" سے بھی زیادہ بادشاہی کے حامی بن جاتے ہیں۔ مجھے یاد
ہے کہ ایک بار میں آئی سی ایس کے ایک نوجوان ہندوستانی سے ملا تھا
تو اپنے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ مجھے ان کی رائے
سے اتفاق نہ تھا۔ انھوں نے سروس کے سب سے اوصاف جانے اور آخر
میں برطانوی راج کی حمایت میں وہ دلیل پیش کی جس کا کوئی جواب نہیں کہ کیا
برطانوی راج رومی اور چنگیز کا اور تیموری راج سے بہتر نہیں؟
آئی سی ایس والوں کے خیالات کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض
نہایت قابلیت سے انجام دیتے ہیں اس لئے انہیں حق ہے کہ اپنے جدید
مطالبات پر جتنا چاہیں زور دیں۔ اگر ہندوستان غریب ہے تو یہ اس کے معاشرتی
رسم و رواج کا قصور ہے۔ یا اس کے بنیوں اور ساہوکاروں اور سب سے زیادہ
اس کی بے شمار آبادی کا۔ ہندوستان کے سب سے بڑے یعنی برطانوی حکومت
کو وہ چپ چاپ نظر انداز کر جاتے ہیں معلوم نہیں آبادی کی کثرت کا وہ کیا
علاج کریں گے۔ اس لئے کہ گو انہیں آئے دن کے قحط، وبا اور طرح طرح
کی بیماریوں سے بہت بڑی مدد ملتی ہے مگر پھر بھی آبادی ہے کہ بڑھتی ہی چلی
ہے لوگ ضبط تولید کی تجویز پیش کرتے ہیں اور میں خود اس سے پوری طرح
متفق ہوں کہ ضبط تولید کے طریقوں کے متعلق لوگوں کو معلومات بہم پہنچائی
جائیں لیکن ان تدبیروں پر عمل ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عام لوگوں کا

معیار زندگی بہت بلند ہو ان میں تھوڑی بہت تعلیم پھیل جائے اور سارے ملک میں بے شمار اسپتال قائم ہوں۔ موجودہ حالات میں ضبط تولید کے وسائل عام لوگوں کی پہنچ سے بالکل باہر ہیں۔ البتہ اوسط طبقے کے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور میرے خیال میں بڑی حد تک اٹھا رہے ہیں لیکن آبادی کی کثرت کا مسئلہ دوسرے پہلو سے بھی غور و توجہ کا مستحق ہے۔ آج کل دنیا کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے وہ غذا اور ضروریات کی کمی کا نہیں بلکہ اصل میں کھانے والوں کی کمی کا ہے۔ یعنی حاجت مندوں میں خریدنے کی استطاعت نہ ہونے کا۔

دنیا سے قطع نظر خود ہندوستان میں بھی غذا کی کمی نہیں، اگرچہ آبادی بڑھتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اشیائے خوردنی کی رسد آبادی کے تناسب سے زیادہ بڑھی ہے اور بڑھائی جا سکتی ہے اور پھر ہندوستان کی آبادی کا اضافہ جس کا اس قدر شور ہے (مگر پچھلے دس سال کے) اکثر مغربی ممالک کے مقابلہ میں بہت کم رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آگے چل کر یہ فرق بہت زیادہ ہو جائے گا۔ کیونکہ مختلف محرک مغربی ملکوں میں آبادی کے بڑھنے کی رفتار کم کر رہے ہیں بلکہ روک رہے ہیں لیکن ایسے اسباب ہندوستان میں بھی جلد پیدا ہو جائیں گے جو آبادی کو بڑھنے سے روکیں گے۔

جب کبھی ہندوستان آزاد اور اس قابل ہوگا کہ اپنی نئی زندگی کو حسب دلخواہ تعمیر کرے تو اسے لازمی طور پر اس کام کے لئے بہتر مرد اور عورتیں درکار ہوں گی۔ اچھے آدمی ہمیشہ کمیاب ہوتے ہیں اور ہندوستان میں اور بھی کمیاب ہیں۔ اس لئے کہ برطانیہ کی حکومت میں ہمارے لئے مواقع کی

رہی ہے ہم کو اپنے اجتماعی کاروبار کے کئی شعبوں میں غیر ملکی ماہرین کی ضرورت
پڑے گی۔ خاص طور پر ان شعبوں میں جن کے لئے میکانکی یا علمی واقفیت درکار
ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں جنھوں نے آئی سی ایس یا دوسری امپیریل سروسوں
میں کام کیا ہے بہت سے ہندوستانی اور غیر ملکی ہوں گے جو نئے نظام کے
لئے مفید ہوں گے اور خوشی سے رکھے جائیں گے لیکن اس بات کا مجھے پورا
یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی نیا نظام اس وقت تک تعمیر نہیں کیا جا سکتا
جب تک کہ آئی سی ایس کی روح ہمارے نظام حکومت اور سرکاری محکموں میں
سمائی ہوئی ہے۔ تحکم پسندی شہنشاہی کا زیور ہے اور آزادی کے ساتھ کسی
طرح نہیں مل سکتی۔ یا تو یہ آزادی کو فنا کر دے گی یا خود مٹا دی جائے گی۔ یہ تو
ریاست کے صرف ایک طرز میں کھپ سکتی ہے یعنی فاشسٹی طرز میں۔ اس لئے میں
سمجھتا ہوں کہ آئی سی ایس اور اسی قسم کی اور سروسوں کا موجودہ حالت میں باقی
رہنا ناممکن ہے۔ ان کو توڑے بغیر حقیقی معنوں میں کوئی نیا نظام تعمیر ہی نہیں کیا
جا سکتا۔ افراد کی حیثیت سے ان سروسوں کے لوگ اگر وہ نیا کام کرنا چاہتے
ہوں اور کرنے کی استعداد رکھتے ہوں تو خوشی سے لے لئے جائیں گے مگر نئی
شرائط پر۔ تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں ویسی ہی تنخواہیں اور الاؤنس
جو آج کل ملتے ہیں دئے جا سکیں گے۔ نئے ہندوستان کی خدمت کے لئے
ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوگی جو مخلص اور مستعد ہوں، جو اپنے نصب العین پر
ایمان رکھتے ہوں اور اس کے حاصل کرنے کی دل و جان سے کوشش کرتے ہوں،
جو کام اس لئے کرتے ہوں کہ اس سے مسرت اور عزت حاصل ہوتی ہے اس لئے
نہیں کہ بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔ روپے کے لالچ کو جس طرح بھی ہو سکے کم کرنا
پڑے گا۔ مگر خیال ہے کہ سب سے کم دلچسپی ان امتیازی افسروں کی رہنمائی کو کم

کی سی واقفیت نہیں رکھتے ایسے لوگ ہندوستان میں بہت کم آئیں گے۔
میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہمارے یہاں کی لبرل پارٹی اور دوسری جماعتوں
نے ہندوستان کے نظم و نسق کے معاملے میں برطانوی خیالات کو آنکھ بند کر کے
تسلیم کر لیا ہے۔ سروسوں کے معاملے میں یہ بات خاص طور پر نمایاں ہے کیونکہ
ان حضرات کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ان میں ہندوستانی رکھے جائیں۔ یہ نہیں
کہ ان سروسوں کی نوعیت، ذہنیت اور ریاست کا سارا نظام بدلا جائے۔
یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس میں دو رخی بات مان لینا ممکن نہیں کیونکہ
ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ صرف برطانوی فوج اور سروسوں کے نکلنے
سے حل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ سرکاری ملازموں کی تنظیم
یکسر مثالی بنا دی جائے اور ان کی تنخواہ اور اختیاری حقوق عام طور پر کم کر دئے
جائیں۔ اس دستور سازی کے بارے میں تحفظات کا بڑا چرچا ہے اگر تحفظات
ہندوستان کے فائدے کے لئے ہیں تو ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہونی چاہئے
کہ آئی سی ایس اور اس قسم کی دوسری سروسوں کی موجودہ صورت جس
میں انہیں غیر محدود اختیارات اور اختیاری حقوق حاصل ہیں ختم کر دی جائے
اور کہیں سے دستور میں کوئی دخل نہ ہو۔

آئی سی ایس سے بھی زیادہ پراسرار وہ سروسیں ہیں جو مخفی سروسیں
کہلاتی ہیں۔ ہم ان کے بارے میں زبان بھی نہیں ہلا سکتے۔ اس لئے کہ بھلا
ہم ان معاملات کو کیا جانیں؟ ہمارا کام تو صرف یہ ہے کہ چپ چاپ کروڑوں
روپئے دئے جائیں۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ستمبر ۱۹۳۲ء میں ہندوستان کے
کمانڈر انچیف سر فلپ چیٹووڈ نے کونسل آف اسٹیٹ کے جلسے میں جو تقریر
کی تھی وہ ہندوستان کے سیاست دانوں سے ایسی اکھڑ فوجی زبان میں

کہا کہ تم لوگ اپنے کام سے کام رکھو۔ صرف کام میں دخل نہ دو کسی صاحب
نے ایک ریزولیوشن میں ترمیم پیش کی تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحقیر
سے فرمایا کیا تھا اور ان کے دوست یہ سمجھتے ہیں کہ انگریز جیسی [illegible]
قوم جس نے تلوار کے زور سے سلطنت حاصل کی اور تلوار ہی کے زور سے اس
پر اب تک قائم ہے آرام کرسی پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کی یا بولنے والوں کی
صداؤں کی جنگی قابلیت اور تجربے کے معاملے میں کوئی وقعت نہ کرے گی
اس کے سوا انھوں نے اور دلچسپ باتیں کہیں اور اس خیال سے کہ کہیں ہم
یہ نہ سمجھ لیں کہ انھوں نے وقتی جوش میں یہ باتیں کہہ دی تھیں ہم کو یہ بھی بتا
دیا گیا کہ انھوں نے اپنی تقریر بہت سوچ سمجھ کر لکھی تھی اور اسے دیکھ دیکھ کر
پڑھ رہے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ناواقف فن کے لئے کسی کمانڈر انچیف
سے فوجی معاملات پر بحث کرنا گستاخی ہے۔ لیکن دو چار باتیں کہنے کی
اجازت تو آرام کرسی پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کو بھی ملنی چاہئے۔ ممکن ہے
کہ ان لوگوں کے اغراض جو سلطنت کو تلوار کے زور سے قائم رکھنا چاہتے ہیں کچھ اور ہوں
اور ان عوام کے اغراض کچھ اور جن کے سر پر تلوار مثلاً لٹکی رہتی ہے یعنی ہندوستانی
فوج سے ہندوستان کے فائدے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور برطانوی
سلطنت کے فائدے کا بھی اور ان دونوں کا مفاد کچھ ضروری نہیں کہ ایک
ہو۔ اس میں اختلاف بلکہ تصادم بھی ہو سکتا ہے۔ آرام کرسی پر بیٹھنے والا
تو اس بات میں بھی شبہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ جنگ عظیم کے تجربے
کے بعد بڑے بڑے جرنیلوں کا یہ مطالبہ کہ ان کے کام میں دخل نہ دیا جائے
جائز ہے یا نہیں۔ جنگ عظیم میں یہ حضرات سیاہ و سفید کے مالک تھے

اور ہر طرف سے یہی سننے میں آتا ہے کہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، آسٹروی،
اطالوی اور روسی غرض تمام قوموں میں انھوں نے ہر کام کو چوپٹ کر دیا۔
انگلستان کی فوج کے نامور مورخ اور فن جنگ کے ماہر کپتان لڈل ہارٹ
نے اسی جنگ عظیم کی تاریخ میں ایک جگہ کہا ہے کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب
انگریزی سپاہی دشمنوں سے لڑ رہے تھے۔ اور انگریز جنرل آپس میں
لڑ رہے تھے۔ قومی خطرے ان کے خیالات اور حد و حدود میں یک جہتی
پیدا نہ کر سکے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اس لڑائی نے ہماری ہیرو پرستی کو ہمیشہ
کے اس تصور کو کہ بڑے آدمی معمولی مٹی کے نہیں کسی اور مٹی کے
بنے ہیں، بالکل مٹا دیا۔ لیڈروں کی اب بھی ضرورت ہے بلکہ شاید
پہلے سے بھی زیادہ لیکن یہ احساس جو ہم میں اب پیدا ہو گیا ہے کہ وہ
بھی ہمارے ہی جیسے آدمی ہیں ہم کو اس غلطی سے محفوظ رکھے گا کہ ان سے
بہت زیادہ توقع رکھیں۔ یا ان پر حد سے زیادہ بھروسہ کریں۔"

سیاست دانوں کے علاوہ گرو مسٹر لائیڈ جارج نے اپنے تذکرۂ جنگ
میں جرنیلوں اور امرائے بحر کی ان کمزوریوں اور غلطیوں کی ایک بہت تاریک
تصویر کھینچی ہے جس کی بدولت لاکھوں آدمیوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور
انگلستان اور اس کے اتحادی لڑائی تو جیت گئے۔ لیکن جوں توں ہانپ کر
لڑکھڑاتے ہوئے فتح کی منزل تک پہنچے۔ بڑے افسروں نے آدمیوں اور
موقعوں سے اس ناعاقبت اندیشی سے کام لیا کہ انگلستان کی تباہی
کی نوبت آگئی تھی اور وہ اور اس کے اتحادی زیادہ تر اس وجہ سے بچ
گئے کہ ان کے حریفوں سے ان سے زیادہ ناقابل عفو حماقتیں سرزد ہوتی
رہیں۔ یہ ہے انگلستان کے عہد جنگ کے وزیر اعظم کا بیان۔ وہ کہتے ہیں کہ اعلیٰ

عمل حماقت کے۔ یہ امیر البحر لارڈ جیلیکو کی کمزوری میں معقول خیالات چھوٹے
بڑے خصوصاً علاقہ جہاز بھیجنے کے معاملہ میں۔ فرانسیسی مارشل تردوسے کے
متعلق ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا خاص وصف یہی تھا کہ ان کی
صورت سے مستقل مزاجی ظاہر ہوتی تھی اور اس سے لوگوں کی ہمت بڑھتی
تھی۔ پریشانی کے مارے ہوئے لوگ مصیبت کے وقت میں ایسی ہی چیزوں
کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ وہ غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انسان کی عقل ٹھوڑی
میں ہوتی ہے۔"

لیکن لائڈ جارج نے سب سے زیادہ قابل الزام فوج کے اعلیٰ افسر
فیلڈ مارشل ہیگ کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے واقعات سے ثابت کیا کہ لارڈ
ہیگ انتہائی خودپسندی کی وجہ سے سیاست والوں اور دوسرے لوگوں
کی رائے سننا بھی نہیں چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے خود برطانوی
مجلس وزراء سے بعض نہایت اہم معاملات پوشیدہ رکھے اور اس میں بڑا لگا
فوج کو اتنا سخت نقصان پہنچایا جتنا ساری لڑائی میں کہیں نہیں پہنچا تھا اور
اس وقت بھی جب شکست سر پر کھڑی تھی وہ آخر تک ایک بات پر اڑے
رہے اور کئی مہینے تک انھوں نے پاسشنڈیل اور کامبرے کی بے بنیاد تجویز
میں ایسی غلط پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ ۱۰ ہزار تو صرف افسر کام
آئے اور چار لاکھ بہادر انگریزی سپاہی مقتولوں اور مجروحوں کی فہرست
میں داخل ہو گئے۔ غنیمت ہے کہ "گمنام سپاہی" کی آج اس کے مرنے
کے بعد عزت کی جا رہی ہے۔ اس کا خون پانی کی طرح بہایا گیا اور جب تک
وہ زندہ تھا کسی کو اس کی پروا بھی نہ تھی۔
دوسرے لوگوں کی طرح سیاست داں بھی اکثر غلطی کرتے ہیں لیکن

جمہوری ملک کے سیاست والوں کو اشخاص اور واقعات سے متاثر ہونا اور ان کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ عموماً وہ اپنی غلطیوں کو محسوس کر لیتے ہیں اور ان کی تلافی کی کوشش کرتے ہیں۔ سپاہی کی تربیت اور ہی قسم کی ہوتی ہے۔ جہاں تحکم پسندی کا دور دورہ ہوتا اور تشدد گوارا نہیں کی جاتی۔ اس لئے سپاہی کو دوسروں کا تشدد برا لگتا ہے۔ اور جب وہ غلطی کرتا ہے تو دل کھول کر کرتا ہے اور اس پر اڑا رہتا ہے۔ اس کے لئے تھوڑی ذہن اور دماغ سے زیادہ اہم چیز ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ہم نے ایک مشترک ٹائپ پیدا کیا ہے۔ ہمارے ملکی نظام حکومت تحکم پسندی اور خودسری کی ایک نیم فوجی فضا میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے ملکی حکام کی تھوڑی بھی بڑی حد تک سپاہیوں کی سی ہے اور ان میں دو سرے سپاہیانہ اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ فوج میں ہندوستانی عنصر بڑھایا جا رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ تیس پینتیس برس کے بعد کوئی ہندوستانی جنرل بھی ہندوستانی اسٹیج پر نمودار ہو۔ شاید سو سوا سو سال میں ہماری فوج میں ہندوستانی عنصر ایک معقول حد تک بڑھ جائے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ آخر انگلستان نے ایک دو سال کے اندر کروڑوں آدمیوں کی زبردست فوج کیسے تیار کر لی۔ اگر ہمارے ہمارے جیسے دانا مشیر نصب ہوئے ہوتے تو شاید اس سے زیادہ احتیاط سے اور پھونک پھونک کر قدم رکھا ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کے تیار ہونے سے پہلے لڑائی کا فیصلہ ہو جاتا دشمن کے ساتھ ہمیں روسی فوج کا بھی خیال آتا ہے جو کچھ دن پہلے صفر کے برابر تھی جس نے تھوڑی سی مدت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے سارے دشمنوں کا مقابلہ

کیا اور اس پر فتح پائی اور دنیا کی سب سے جرار فوجوں میں گنی جاتی ہے
شاید انھیں مشورہ دینے کے لئے ایسے "جنگ آزمودہ" جرنیل نہیں ملے تھے۔
اب ہمارے یہاں دہرہ دون میں ایک فوجی اکادمی ہے۔ جہاں شریف
ما کے امیدوار فوجی افسری کی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ ہم سے کہا جاتا
رڈ میں وہ بہت ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور یقیناً بہت اچھے افسر
ہوں گے۔ لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس ٹریننگ سے کیا فائدہ ہو سکتا
ہے۔ اگر اسی کے ساتھ جدید آلات جنگ کا استعمال بھی نہ سکھایا جائے۔
پیادے اور سوار آج کل اتنے ہی کام آ سکتے ہیں جتنی رومی لشکر کی صفیں اور
ایسے زمانے میں جب کہ ہوائی جہاز، گیس کے بم، ٹینک اور بڑی زبردست
توپیں جنگ کے آلات ہیں۔ رائفل بھی تیر و کمان سے کچھ ہی زیادہ کارآمد
ہو سکتی ہے فوجی اکادمی کے استاد اور دانشمند مشیران سب ان باتوں
کو سمجھتے ہی ہوں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی کارگزاری
کیسی رہی؟ ہم اس کی خامیوں کی کس منہ سے شکایت کریں جب یہ خامیاں
ہماری اپنی کمزوریوں کا نتیجہ تھیں۔ اگر ہم دنیا کے تغیرات کے دھارے کو چھوڑ
کر کسی کھاڑی میں پناہ لیں، اپنی روح کی خیر منائیں اور اپنی حالت میں مگن
رہیں گڑھیا کے مینڈک کی طرح یہ نہ جانیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے تو یہ ہمارا
ہی قصور ہے اور ہمیں کو اس کی سزا بھگتنی ہے۔ انگریز یہاں بحر ہستی کے ایک
نئے سیلاب کے زور میں اور زبردست تاریخی قوتوں کے نمائندے بن کر آئے
اگرچہ انھیں خود اس کا احساس نہ تھا۔ اس سے کیا فائدہ کہ ہم اس طوفان
کی شکایت کریں جو ہمیں اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ یا اس سرد ہوا کی

ہمارا بدن کا نیتاہے ؟ ہمیں چاہئے کہ ابھی کے جھگڑوں سے سمجھا جیڑا اکیستقل
کا سامنا کریں۔ ہمیں انگریزوں کا شکرگذار ہونا چاہئے کہ وہ سائنس اور اس کے
بیش بہا ایجادات کا عہد اپنے ساتھ لائے۔ لیکن یہ بات ہمارے دل میں کانٹے
کی طرح کھٹکتی ہے۔ اور ہم اسے کبھی نہیں بھول سکتے کہ برطانوی حکومت ہمارے
ملک میں تفرقہ پیدا کرنے والے رجعت پسند، فرقہ پرست اور مطلب پرست
عناصر کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ مگر یہ بات بھی ہمارے لئے ایک ضمیر کی
آزمائش ہے۔ اور ہندوستان کو بھی مدد اسی وقت حاصل ہوگی جب وہ
بار بار اس آگ میں سے جو کھوٹ اور میل کو جلا دیتی ہے اور جو لوہے کو
فولاد بنا دیتی ہے۔

سول میرج اور رسم الخط کا مسئلہ

میں تو قریباً ایک مہینہ پورا اور لینگ ور، کر وسط ستمبر ۱۹۳۳ء میں لکھنؤ واپس آیا
والدہ ابھی تک اسپتال ہی میں تھیں اور رفتہ رفتہ صحت یاب ہو رہی تھیں
کملا بھی لکھنؤ میں تھی اور تیمارداری کی کوشش کرتی تھی۔ حالانکہ خود اس کی
صحت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ ہمیں ہر سہ پہر کو الہ آباد سے آنا جانا تعطیل میں۔ وقت
حصہ لکھنؤ ہی میں رہا۔ الہ آباد میں شاید اتنی فرصت نہ ملتی جتنی یہاں نصیب
ہوئی۔ میں دو بار اسپتال جایا کرتا تھا۔ فارغ اوقات میں اخبارات کے لئے
چند مضامین لکھنا شروع کر دئے جن کی اشاعت سارے ملک میں خوب
ہوئی۔ اس سلسلۂ مضامین کا عنوان تھا "ہندوستان کدھر جا رہا ہے"
اور ان مضامین میں سے واقعات عالم کا تعلق ہندوستانی حالات سے
بتا کر ان واقعات کا جائزہ لیا گیا۔ یہ مضامین بہت مقبول ہوئے۔ مجھ کو بعد میں
مجھے معلوم ہوا کہ کابل اور طہران میں بھی ان مضامین کا ترجمہ فارسی زبان میں شائع کیا
گیا۔ جو لوگ حالات حاضرہ اور جدید مغربی افکار اور خیالات سے واقف ہیں
ان کے لئے ان مضامین میں کوئی جدت تھی نہ کوئی جدت۔ لیکن ہندوستان
میں ہم لوگ اپنی خانگی مشکلات اور مصائب میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ ہم

شے تالونی شادی

مطلق خبر نہیں کہ دوسرے ملکوں پر کیا گذرتا ہے۔ میرے مضامین کو جو مقبولیت حاصل
ہوئی اُس سے میں بہت سی اور علامتوں سے یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگوں میں ایک
وسیع نقطہ نظر اب پیدا ہو رہا ہے۔

والدہ اسپتال رہتے رہتے اب باہر آگئی تھیں۔ اس لئے ہم لوگوں نے
انہیں الہ آباد واپس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری بہن کرشنا
کی نسبت کا اعلان حال ہی میں ہو چکا تھا۔ اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ قبل اس
کے کہ میں اچانک پھر جیل خانے بھیج دیا جاؤں، جس قدر جلد ممکن ہو شادی سے
فراغت کر لی جائے۔ مجھے بھی مطلق اس کا اندازہ نہ تھا کہ کتنے دن اور مجھے
آزاد رہنے دیا جائے گا۔ اس لئے کہ کانگریس کی طرف سے سول نافرمانی کی
تحریک باقاعدہ جاری تھی اور خود کانگریس اور اس کے علاوہ بیسیوں دیگر
انجمنیں اور ادارے خلاف قانون قرار دئے جا چکے تھے۔

شادی اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں بمقام الہ آباد قرار پائی۔ اور یہ بھی
طے ہوا کہ مروجہ سول قانون نکاح کے مطابق عقد کیا جائے۔ مجھے اس بات
سے خوشی ہوئی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم لوگوں کے طے کرنے
کرانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مختلف ذاتوں یعنی برہمن اور غیر
برہمن کے درمیان رشتہ قائم کیا جا رہا تھا اور مروجہ ہندو دھرم کے
مطابق یہ عقد جائز نہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے اسی لئے میں سول نکاح کا قانون
بنا تھا جس نے ہمیں تمام دشواریوں سے بچا لیا۔ اس وقت دو قانون رائج
ہیں اور دوسرا قانون جس کے مطابق میری بہن کی شادی ہوئی صرف
ہندوؤں یا اس نسل کے دیگر مذاہب مثلاً بدھ مت، جین اور سکھ مت والوں
کے لئے ہے۔ لیکن اگر فریقین کا تعلق بوجہ پیدائش یا بوجہ تبدیلی مذہب ان مذاہب میں سے

ہو سکتا تو پھر پہلے قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے اور۔ پہلا قانون فریقین سے
اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تمام مشہور مذاہب سے انکار کریں یا کم از کم یہ بیان
داخل کریں کہ ان کا کوئی تعلق ان سے نہیں ہے۔ یہ بلا ضرورت انکار بہت
تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اکثر لوگ جنہیں کٹر مذہبی نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ اس
قسم کا غیر ضروری اعلان کرنے پر معترض ہوتے ہیں اس قانون سے فائدہ نہیں
اٹھا سکتے۔ یا مختلف مذاہب کے کٹر لوگ ان تمام باتوں کی مخالفت کرتے ہیں
جن سے آپس کے شادی بیاہ میں آسانیاں پیدا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ لوگ یا تو مجبور ہو کر انکاری بیان داخل کرتے ہیں یا محض حدود قانون
میں رہنے کی خاطر صرف زبان سے تبدیلی مذہب کا اعلان کرنے پر مجبور
ہو جاتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں تو مختلف فرقوں کے درمیان شادی بیاہ کا
حامی ہوں۔ لیکن خواہ اس کی کوئی حمایت کرے یا نہ کرے یہ بے حد ضروری
ہے کہ سول نکاح کا ایک عام قانون ہو۔ جس کا اطلاق تمام مذاہب کے لوگوں
پر ہو اور ان کو اجازت دی جائے کہ مذہب کی تبدیلی یا کسی دین کو ترک
کرنے کا اعلان کئے بغیر آپس میں شادی بیاہ کر سکیں۔

میری بہن کی شادی بغیر کسی دھوم دھام کے نہایت سادہ طریقہ پر ہوئی۔
ہندوستان میں شادیوں کے موقع پر جو کھیڑا اور دھوم دھام ہوتی ہے وہ
مجھے یوں بھی ناپسند ہے پھر والدہ بیمار تھیں اور علاوہ اس کے سول نافرمانی
ابھی جاری تھی۔ میرے بہت سے ساتھی ابھی جیل خانے میں تھے ان حالات میں
کوئی ایسی بات کرنا جس سے جشن کی صورت پیدا ہو بے موقع اور نامناسب
تھی۔ صرف چند اعزا اور مقامی دوستوں کو میں نے شرکت کی دعوت دی
حالانکہ میرے والد کے بعض قدیم دوستوں کو بیحد ملال بھی ہوا کہ میں نے

انھیں اس موقع پر عمداً نظر انداز کیا۔

شادی کے سلسلہ میں نمونہ کا جو مختصر سا خط ہم لوگوں نے بھیجا وہ
ہندوستانی زبان اور لاطینی رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ یہ ایک جدت
تھی اس لئے کہ نیوتہ ہمیشہ یا تو ناگری یا فارسی رسم الخط میں لکھے جاتے
ہیں اور غالباً وہ فوجی یا عیسائی مشنری حلقوں کے کسی جگہ لاطینی رسم الخط میں
ہندوستانی زبان لکھنے کا بالکل رواج ہی نہیں۔ میں نے تجربہ کے طور پر
لاطینی رسم الخط اختیار کیا تھا محض یہ دیکھنے کے لئے کہ مختلف لوگوں پر اس کا کیا
اثر ہوتا ہے۔ اس نمونہ کے متعلق موافق اور مخالف دونوں قسم کی رائیں معلوم
ہوئیں۔ لیکن زیادہ لوگ مخالف ہی تھے۔ بہت تھوڑے لوگ ملائے گئے
تھے مگر اور زیادہ لوگوں کو ملایا جاتا تو مخالفت بھی اور زیادہ ہوتی۔ گاندھی جی
نے بھی میری اس جدت کو ناپسند کیا۔

گو لاطینی رسم الخط مجھے ایک عرصہ سے پسند ہے لیکن میں اس کا
قائل ہوں اور نہ اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا تھا۔ ترکی اور وسط ایشیا
میں اس کی کامیابی سے ضرور متاثر ہوا اور اس کی تائید میں دلائل بھی
خاصے وزنی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں اس کا حامی نہیں ہوں
اور اگر میں اس کا قائل بھی ہوتا تو بھی میں خوب جانتا تھا کہ ہندوستان
کے موجودہ حالات میں اس کو اختیار کرنے کا ذرہ برابر امکان نہیں۔
قوم پرست، مذہب پرست، ہندو مسلمان، قدیم اور جدید غرض ہر گروہ کی طرف
سے اس کی شدید مخالفت کی جائے گی۔ اور یہ بھی میں جانتا ہوں کہ یہ مخالفت
محض جذباتی نہیں ہوگی۔ رسم الخط کا اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور
رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا

تابدار رہا ہے۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں اور لہجے
بدل جاتے ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک
ناقابل عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب
بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے۔ جس زبان میں کوئی ایسا ادب موجود نہیں
کہ اس کی حفاظت کی ضرورت ہو وہاں البتہ یہ تبدیلی کر کے دیکھ لیا جا سکتا ہے لیکن
ہندوستان میں رسم الخط تبدیل کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ صرف اس لئے کہ
ہمارے ادب اور زبان کا ذخیرہ بے حد گراں قدر اور انمول ہے بلکہ اس لئے بھی
کہ ہماری تاریخ اور ہماری ذہنی ترقی اس سے وابستہ ہے۔ پھر عوام الناس کی زندگی
سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ زبردستی اس قسم کی تبدیلی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی
زندہ زبان کو بے رحمی سے ذبح کر رہے ہیں جس سے عوام الناس کی تعلیمی ترقی
بالکل مسدود ہو جائے گی۔

لیکن ہندوستان میں مسئلہ اب صرف ایک علمی مسئلہ نہیں ہے اور میرے
نزدیک رسم الخط کی اصلاح کے سلسلہ میں دوسرا قدم یہ ہوگا کہ سنسکرت کی مختلف
شاخوں یعنی ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی کے لئے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار
کر لیا جائے۔ ان زبانوں کے رسم الخط کی اصل ایک ہے۔ اور ان میں سب سے زیادہ
اختلاف بھی نہیں ہے اس لئے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کر لینا زیادہ دشوار
نہ ہوگا جس کی بدولت یہ چاروں زبانیں ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں۔

منجملہ دیگر افسانوں کے ایک یہ افسانہ بھی ہمارے انگریز حکمرانوں نے
تمام دنیا میں مشہور کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں کئی سو زبانیں (مجھے صحیح تعداد
اس وقت یاد نہیں) رائج ہیں اور یہ بھی ایک عجیب دلچسپ واقعہ
ہے کہ بہت تھوڑے انگریز ایسے ملیں گے جو تمام عمر ہندوستان میں گذار کر

دینے کے باوجود ان سیکڑوں زبانوں میں سے ایک زبان بھی معمولی طور پر جانتے ہوں
یہ لوگ تمام زبانوں کو ایک ہی درجہ میں شمار کرتے ہیں اس کا نام ورنا کو لر یعنی
غلاموں کی زبان رکھا ہے۔ (لاطینی زبان میں "ورنا" کے معنی ہیں خانہ زاد غلام)
اور ہم میں سے اکثر لوگوں نے بغیر جانے بوجھے اس اصطلاح کو اختیار کر لیا ہے
واقعی یہ حیرت کی بات ہے، کہ یہ انگریز لوگ ساری ساری عمر ہندوستان
میں گزار دیتے ہیں، لیکن ہماری زبان اچھی طرح سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں
کرتے، ان لوگوں نے خانساموں اور آیاؤں کی مدد سے ایک عجیب زبان
ایجاد کی ہے، جو ایک طرح کی گٹ پٹ گورا شاہی ہندوستانی ہے، یہ اسی کو
اصل زبان سمجھتے ہیں، جیسے ہندوستان کی طرز معاشرت اور زندگی کے
متعلق وہ اپنے ماتحتوں اور خوشامدیوں کی باتوں سے حالات معلوم کرتے ہیں،
اسی طرح ہندوستانی زبان کے متعلق ان کی معلومات کا واحد ذریعہ نوکر
اور بیرے ہوتے ہیں، جو ہمیشہ اپنی زبان توڑ مروڑ کر صاحب لوگوں سے انہیں
کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بات چیت کرتے ہیں، اس خیال سے کہ کوئی اور زبان
صاحب سمجھ ہی نہیں سکتے، انگریز لوگوں کو یہ بالکل معلوم ہی نہیں کہ ہندوستانی
زبان میں نیز دیگر ملکی زبانوں میں ہر قسم کا اعلیٰ ادب موجود ہے۔

اگر ہمیں مردم شماری کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں
دو تین سو زبانیں ہیں، تو اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ جرمنی میں بھی پچاس
ساٹھ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن ہم تو یہ نہیں جانتا، کہ کسی شخص نے بھی
اس واقعہ کو جرمنی کے اندر اختلافات اور جھگڑوں کے ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل
کے پیش کیا ہو، اصل بات یہ ہے کہ مردم شماری میں تو ہر قسم کی ان چھوٹی چھوٹی
زبانوں کو بھی گنوا دیا جاتا ہے جن کے بولنے والوں کی تعداد چند ہزار سے

زیادہ نہیں ہوتی۔ اور بسا اوقات ایک ہی زبان کی مختلف بولیوں کو جو مقامی
طور پر بولی جاتی ہیں محض علمی ترتیب کی خاطر اصل زبان کے درجہ میں شمار کر لیا جاتا
ہے ہندوستان کی وسعت اور رقبہ کو دیکھتے ہوئے مجھے تو اس بات پر تعجب ہوتا ہے
کہ یہاں اتنی کم زبانیں کیوں ہیں یورپ کے اسی رقبہ آبادی سے مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ
ہم لوگ یہاں باعتبار زبان ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب تر ہیں لیکن چونکہ
بے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لئے کوئی مشترکہ معیاری زبان
نہیں پیدا ہو سکی اور مقامی بولیاں رائج ہو کر رہ گئیں۔ برما کو چھوڑ کر ہندوستان کی
خاص خاص زبانیں یہ ہیں۔ ہندوستانی (جس کی دو شاخیں ہیں۔ یعنی اردو اور ہندی)،
بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلگو، ملیالم اور کناری اوڑ اور اگر اس میں سے
آسامی اوڑیا، سندھی پشتو اور پنجابی کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس میں پورے
ملک کی زبانیں آجاتی ہیں سوائے چند پہاڑی اور جنگلی قبائل کی بولیوں کے اس میں سے
سندھی، آریائی نسل کی تمام زبانیں جو شمالی مغربی اور وسطی ہند میں بولی جاتی
ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں البتہ جنوبی ہند کی دراوڑی زبانیں
گو بہت مختلف ہیں لیکن اس پر بھی سنسکرت کا بہت اثر پڑا ہے۔ اور یہ بھی
سنسکرت لفظوں سے بھری پڑی ہیں

مندرجہ بالا آٹھ خاص زبانوں کا ادب بہت قدیم اور گراں قدر ہے اور
ان میں سے ہر ایک زبان آج ایک بہت وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے ہر لسانی
علاقے کے حدود بھی متعین طور پر بتلائے جا سکتے ہیں چنانچہ یہ زبانیں بولنے والوں
کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں شمار کی جا سکتی ہیں
پانچ کروڑ آدمی بنگالی زبان بولتے ہیں جہاں تک ہندوستانی کا تعلق ہے مجھے
صحیح تعداد تو یاد نہیں پڑتی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس زبان کی مختلف بولیوں

کے بسنے والوں کی تعداد چودہ کروڑ سے کم ہیں۔ ان کے علاوہ اس زبان کے تھوڑا بہت سمجھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اور ہے۔ جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی زبان کی ترقی کے لئے بڑے امکانات ہیں

سلہ ہندوستانی زبان کے حامیوں نے حسب ذیل اعداد و شمار دیئے ہیں۔ مجھے صحیح نہیں معلوم، کہ یہ اعداد ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے جمع کئے گئے ہیں یا ۱۹۲۱ء کی مردم شماری سے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ۱۹۲۱ء ہی کی مردم شماری سے لئے گئے ہیں۔ اور اگر موجودہ اعداد و شمار جمع کئے جائیں، تو اس مرتبہ اور زیادہ اضافہ نظر آئے گا۔

ہندوستانی (بشمولیت ہندی، پنجابی اور راجستھانی)	۱۳۹٫۳	ملین
بنگالی	۴۹٫۳	؍؍
تلنگی	۲۳٫۴	؍؍
مرہٹی	۱۸٫۸	؍؍
تامل	۱۸٫۸	؍؍
کناری	۱۱٫۳	؍؍
اڑیا	۱۰٫۱	؍؍
گجراتی	۹٫۴	؍؍
میزان	۲۷۹٫۸	؍؍

بعض زبانیں مثلاً پشتو، آسامی اور برمی (جو لسانی اور نسلی دونوں اعتبار سے ایک بالکل مختلف خاندان سے تعلق رکھتی ہیں) اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔

کرنا چاہیئے کہ انتہا پسندی کے رجحانات کو روکا جائے۔ اور بول چال کی زبان جو عام طور پر رائج ہے اسی طرح کی ایک ملی جلی ادبی زبان پیدا کی جائے جب تعلیم عام ہوگی تب تو لازماً اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔ لیکن اس وقت متوسط طبقے کے کچھ لوگ جو ادبی ذوق اور طرز انشا کے ناقد اور استاد سمجھے جاتے ہیں بدقسمتی سے بہت زیادہ تنگ نظر اور لکیر کے فقیر واقع ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بس ایک مردہ قالب اور فرسودہ زبان کے محاوروں میں الجھے ہوئے ہیں جس میں نہ کوئی زندگی ہے، نہ اپنی قوم کے عوام الناس کی زبان سے کوئی تعلق ہے۔ اور نہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب سے کوئی واسطہ۔

ہندوستانی زبان کی ترقی اور رواج میں کوئی تصادم نہ ہوگا۔ لیکن بعض زبانیں ہندوستانی زبان کے مقابلہ میں پہلے ہی سے زیادہ ترقی یافتہ اور علمی حیثیت سے افضل ہیں۔ اور اپنے اپنے علاقے میں ان زبانوں کو تعلیمی اور دیگر کاموں کے لئے سرکاری زبان کی حیثیت برقرار رکھنا چاہیئے۔ انہیں زبانوں کے ذریعہ تعلیم اور تمدن عوام میں پھیلایا جا سکتا ہے۔

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ شاید انگریزی ہندوستان کی مشترکہ عام زبان بن جائے گی۔ لیکن مجھے تو یہ خیال بالکل دور از کار اور لغو معلوم ہوتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے مٹھی بھر پڑھے لکھے لوگوں میں ممکن ہے کہ یہ زبان رائج ہو۔ لیکن جہاں تک کہ عوام الناس کی تعلیم اور ان کے تمدنی مسائل کا تعلق ہے۔ انگریزی زبان ہمارے لئے محض بے کار ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی زبان کا استعمال کاروباری ضروریات علمی اور فنی کاموں میں اور بالخصوص بین الاقوامی تعلقات کے سلسلہ میں روز بروز بڑھتا جائے۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ ہم میں سے کچھ لوگوں کے لئے بدیسی زبانوں کا جاننا ضروری ہے، تاکہ دنیا کے خیالات اور واقعات سے ہم لوگ

ماحصر رہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یونیورسٹیوں میں علاوہ انگریزی کے فرانسیسی جرمنی، روسی، اسپینی اور اطالوی زبانیں سکھانے کا بھی انتظام کیا جائے انگریزی زبان سے تو بھی ہر گز نہ برتی جائے لیکن اگر واقعات عالم کے متعلق ہم صحیح رائے قائم کرنا چاہتے ہیں تو صرف انگریزی کی عینک لگا کر نہ دیکھنا چاہئے ایک ہی پہلو اور ایک ہی رخ ان ملکوں کو دیکھتے دیکھتے ہماری ذہنی اور دماغی صلاحیتیں بالکل چوپٹ ہوئی ہیں اور ہمارے بڑے سے بڑے حوصلے تو ہم بہت مشکل ہی سے یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ہندوستانی معاملات کے متعلق برطانوی نقطۂ نظر نے ہمارے لئے غور و فکر کا میدان کتنا محدود اور تنگ کر دیا ہے۔

بہرحال د ہ ی دیسی زبانوں کو رواج دینے کی چاہے جو کوشش کی جائے بیرونی دنیا کے ساتھ ہمارا رشتہ اور تعلق یقیناً انگریزی زبان ہی کے ذریعہ قائم رہے گا اور ایسا ہونا بھی چاہئے گذشتہ کئی نسلوں سے ہم لوگ اس زبان کو سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش میں ہمیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے ہم لوگ سخت حماقت کریں گے اگر اس زبان کو بھلانا چاہیں یا اس سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھائیں یوں بھی انگریزی زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جو تمام دنیا میں پھیل گئی ہے اور دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بازی لئے جاری ہے۔ اور اگر امریکن زبان نے اس کی ضد نہ لی، تو اغلب ہے کہ بین الاقوامی تعلقات اور ریڈیو کی بات چیت میں اس کا رواج روز بروز بڑھتا جائے گا۔ اس لئے ہم لوگوں کو چاہئے، کہ انگریزی زبان کی اشاعت کی کوشش برابر جاری رکھیں۔ اس زبان کو جتنا اچھی طرح سیکھ سکتے ہوں سیکھنا اچھا ہے لیکن میرے نزدیک یہ کوشش جو ہم میں سے اکثر لوگ کرتے ہیں، کہ زبان کے نکات اور باریکیوں کو سمجھیں تضیع اوقات ہے۔ چند افراد اگر ایسا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ایک بہت بڑی

تعداد کے سامنے یہ مقصد اگر رکھا جائے تو ان پر خواہ مخواہ کا ایک بوجھ ڈالنا ہوگا۔ اور اس سے دوسری راہوں میں ترقی مسدود ہو جائے گی۔

مجھے "بنیادی انگریزی" (Basic English) بہت پسند آئی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ انگریزی زبان کی اس سہل کی ہوئی شکل کے سامنے بڑا اچھا مستقبل ہے۔ اور ہم لوگوں کے لئے یہ مفید ہوگا کہ بجائے معیاری انگریزی زبان (standard English) کے یہ بنیادی انگریزی سکھلانے اور پڑھانے کا کام وسیع پیمانہ پر شروع کریں۔ معیاری انگریزی صرف محققوں اور خاص خاص طالب علموں کے لئے رہنے دی جائے۔

ذاتی طور پر میں اس کا بھی حامی ہوں کہ ہندوستانی زبان میں انگریزی اور دوسری بدیسی زبانوں کے الفاظ کو ہندوستانی بنا کر داخل کیا جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے یہاں جدید اصطلاحیں بالکل نہیں ہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ معروف الفاظ ہی کو اختیار کر لیا جائے، بہ نسبت اس کے کہ نئے اور مشکل الفاظ سنسکرت، فارسی اور عربی زبانوں سے نکالے جائیں۔ خالص زبان کے حامی بدیسی الفاظ کے استعمال پر معترض ہوتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے اس لئے کہ اپنی زبان کو ترقی دینے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس میں لچک اور دوسری زبانوں کے الفاظ اور خیالات حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

یہیں کی شادی کے بعد ہی مجھے اتفاق سے بنارس جانا پڑا۔ وہاں میرے پرانے دوست اور رفیق کار بابو شیو پرشاد گپتا تقریباً ایک سال سے بیمار تھے اور میں ان کی عیادت کی غرض سے وہاں گیا تھا۔ بابو صاحب لکھنؤ کے جیل میں تھے کہ وہیں اچانک ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اب رفتہ رفتہ مرض کا ازالہ

ہو رہا تھا۔ بنارس کے اس سفر میں ایک چھوٹی سی ہندی ادبی انجمن نے مجھے
ایک سپاس نامہ دیا اور اس انجمن کے اراکین سے میری بڑے مزے کی گفتگو
رہی۔ میں نے پہلے تو معذرت کی کہ جس مضمون کو میں نہیں جانتا اس مضمون کے
متعلق ماہرین کے سامنے بات چیت کرتے ہوئے مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے مگر بالآخر
میں نے اپنی چند تجاویز ان کو بتلائیں اور میں نے مروجہ قدیم طرز کی ہندی پر
اعتراض کیا۔ جو اس وقت لکھی جاتی ہے جس میں یا تو سنسکرت کے مشکل الفاظ
کی بھرمار ہوتی ہے، یا ایسی پُرتکلف اور پیچیدہ زبان ہوتی ہے۔ جس کو کوئی
نہ سمجھ سکے۔ میں نے یہ خیال بھی جرأت کرکے ظاہر کیا، کہ اس درباری طرز
انشا کو ترک کرنا چاہیے، جس کے مخاطب صرف چند منتخب لوگ ہی
ہو سکتے ہیں، اور اب ہندی لکھنے والوں کو عوام الناس کے لئے لکھنا چاہیے
اور ایسی زبان میں لکھنا چاہیے، جس کو سب لوگ سمجھ سکیں۔ عوام کے
ساتھ تعلق پیدا ہو جانے سے زبان میں ایک طرح کی صداقت اور زندگی
پیدا ہو جائے گی اور ادیبوں میں بھی عوام کی جذباتی قوت کا کچھ اثر آ جائیگا
اور وہ زیادہ بہتر کام انجام دے سکیں گے۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی کہا،
کہ اگر ہندی مصنف مغربی افکار و خیالات اور ادب کا اور زیادہ مطالعہ
کریں، تو اس سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور یہ بھی مفید ہوگا کہ اگر
مغربی زبان کی مستند کتابوں کا یا ایسی کتابوں کا ترجمہ کیا جائے جن میں جدید
خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، اسی کے ساتھ میں نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا، کہ
اس نقطۂ نظر سے ہندی کے مقابلہ میں جدید بنگالی، گجراتی اور مرہٹی زبانیں
غالباً زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اور یہ تو یقینی ہے کہ بمقابلہ ہندی کے بنگالی
زبان میں تحقیقی کام اس زمانہ میں بہت کیا گیا ہے۔

غرض ان مسائل پر دیر تک دلچسپ گفتگو اور بات چیت ہوئی، اور
پھر میں چلا آیا مجھے اس کا گمان بھی نہ تھا، کہ میری گفتگو اخبارات کو بھیجدی
جائے گی، لیکن کوئی صاحب جو وہاں موجود تھے، انہوں نے ایک رپورٹ
ہندی اخبارات میں بھیج دی۔

پھر کیا تھا، ہر طرف سے میرے خلاف ہندی اخبارات میں ایک آفت
مچ گئی، کہ مجھے محض مغالطہ ہے۔ میں نے کیوں ہندی زبان کو برا بھلا کہا۔ اور
بنگالی، گجراتی اور مرہٹی سے مقابلہ کرکے ہندی زبان کی تنقیص کی، مجھے جاہل
مطلق کہا گیا۔ اور واقعہ یہ ہے، کہ جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے، میں
واقعی جاہل ہوں، اس کے علاوہ بھی بہت سخت سست الفاظ میرے
متعلق کہے گئے تاکہ مجھے دبایا جائے، اور میری زبان بند کر دی جائے

میرے پاس تو اتنا وقت تھا نہیں کہ اس بحث و مباحثہ کو پڑھتا لیکن
مجھے معلوم ہوا کہ کئی مہینے تک یہ بحث جاری رہی یہاں تک کہ میں پھر جیل خانہ چلا گیا
اس واقعہ سے میری آنکھیں کھل گئیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہندی ادیب اور
اخبار نویس غیر معمولی طور پر زود رنج ہوتے ہیں اور اگر ان کا کوئی بھی خواہ
دیانتداری کے ساتھ تنقید کرے، تو اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اس کی
وجہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ خود کو ذلیل اور کمتر سمجھنے کے مرض میں مبتلا ہیں، خود اپنی
تنقید کرنے کا ان میں بالکل مادہ نہیں، عام تنقید کا معیار بھی بہت پست ہے
اور بالعموم یہ ہوتا ہے کہ مصنف اور اس کے ناقد میں جھگڑا ہونے لگتا ہے
اور ایک دوسرے کی نیت پر حملہ کرتا ہے ان کی ساری ذہنیت وہی محدود
اور تنگ بورژوا (سرمایہ دار طبقہ والوں کی ذہنیت ہے۔ اور ایسا معلوم
ہوتا ہے، کہ مصنف اور اخبار نویس دونوں یا تو ایک دوسرے کے لئے لکھتے

(۵۶)

فرقہ پرستی اور رجعت پسندی

جس زمانہ میں میری بہن کی شادی تھی اسی زمانہ میں یورپ سے یہ خبر آئی، کہ وٹھل بھائی پٹیل کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک عرصہ سے بیمار تھے اور اسی علالت کی وجہ سے ان کو قید خانہ سے رہا کر دیا گیا تھا۔ ان کی موت ہم لوگوں کے لئے ایک اندوہناک سانحہ تھا۔ اور یہ خیال کرکے دل اندر بیٹھا جاتا تھا کہ ہماری جدوجہد ابھی جاری ہے۔ اور ہمارے مقتدر رہنما ایک ایک کرکے دنیا سے اٹھتے چلے جارہے ہیں۔ وٹھل بھائی کی تعریف میں یوں تو بہت کچھ کہا گیا۔ لیکن سب سے زیادہ تعریف اس بات کی کی گئی۔ کہ ہندوستانی پارلیمنٹ میں انہوں نے اپنی قابلیت کا سکہ جمایا۔ اور اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے وہ بہت کامیاب رہے۔ یہ تعریفیں اپنی جگہ بالکل درست تھیں۔ لیکن جب بار بار اس کا ذکر کیا جاتا تھا، تو مجھے اس سے چڑھ ہونے لگی کہ کیا ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کچھ کمی ہے۔ جو اسمبلی کی صدارت کے فرائض قابلیت کے ساتھ انجام دے سکیں۔ یا جو پارلیمنٹ کی رکنیت کے اہل ہوں میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کے دیکھے صرف یہی ایک کام ہے۔ جس کے لئے وکالت کے پیشہ نے ہم کو تیار کیا ہے۔ اور میرے نزدیک وٹھل بھائی کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ بلند تھی، وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک بہت بڑے سورما اور سپاہی تھے۔

نومبر کے مہینے میں مجھے بنارس جانے کا اتفاق ہوا۔ ہندو یونیورسٹی کے
طلبائے مجھے تقریر کرنے کی دعوت دی، میں نے اس دعوت کو قبول کرلیا۔ اور
ایک بہت بڑے جلسے میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت مدن موہن مالویہ
کی زیر صدارت میں نے تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران میں فرقہ پرستی کے
متعلق بہت کچھ کہا اور پُرزور الفاظ میں ہر قسم کی ذہنیت کی مذمت کی، بالخصوص
ہندو مہاسبھا کی حرکتوں کو میں نے بہت برا کہہ ڈالا۔ لیکن میں نے جو کچھ کہا اس
میں پہلے سے سوچ بچار کو زیادہ دخل نہ تھا۔ ایک مدت سے مختلف جماعتوں
کے فرقہ پرستوں کی روزافزوں رجعت پسندی کو دیکھ دیکھ کر مجھے غصہ آتا تھا
اور اس موضوع پر تقریر کرتے وقت جب مجھے جوش آیا، تو قدرتاً اس غصہ
کا بھی کچھ اظہار ہوگیا۔ میں اس وقت ہندوؤں کے جلسہ میں تقریر کر رہا تھا،
اس لئے مسلمانوں کے اعمال کی مذمت کرنے کا یہ کوئی موقع نہ تھا۔ اور میں نے
عمداً صرف ہندو فرقہ پرستوں کی رجعت پسندی پر زیادہ زور دیا۔ مگر تقریر
کرتے وقت مجھے یہ خیال نہ آیا کہ مالوی جی جلسہ کی صدارت کر رہے ہیں وہ ہندو
مہاسبھا کے رکن رکین رہے ہیں۔ اس لئے ان کے منہ پر مہاسبھا کو یہ باتیں سُنانا
ذرا نامناسب بات تھی۔ ممکن ہے کہ یہ خیال مجھے اس لئے نہ رہا ہو کہ اس زمانہ
میں انہیں مہاسبھا سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہاسبھا
کے نئے تیز مزاج لیڈروں نے انہیں مہاسبھا سے نکال باہر کردیا ہے جب تک
مالوی جی مہاسبھا کے روح رواں رہے، اس وقت تک مہاسبھا باوجود اپنی
فرقہ پرستی کے سیاسی حیثیت سے رجعت پسند نہیں ہوئی تھی، لیکن بعد میں چل کر
اس کی رجعت پسندی سب کے لئے ایک مسلّم اور امتیازی خصوصیت بن گئی تھی، اور
مجھے اپنی جگہ یہ یقین تھا کہ مالوی جی کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بلکہ وہ

اس کو ناپسند کرتے ہیں' پھر بھی مجھے بعد میں یہ محسوس ہوا' کہ میرے لئے
یہ کسی طرح مناسب نہ تھا' کہ ان کی دعوت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر
ایسی باتیں کہوں' جس سے وہ مجھے میں پڑ جائیں - واقعی مجھے اپنی اس
غلطی پر بہت افسوس ہوا۔

ایک اور غلطی بھی مجھ سے سرزد ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے۔ کسی شخص نے
بذریعہ ڈاک مجھے ایک قرارداد کی نقل بھیجی' اور لکھا' کہ اجمیر میں ہندو نوجوانوں کی
کسی انجمن نے اس کو پاس کیا ہے۔ یہ رزولیوشن بہت زیادہ قابل اعتراض تھا
چنانچہ میں نے بنارس والی تقریر میں اس کا بھی حوالہ دے دیا۔ حالانکہ بعد میں مجھے
معلوم ہوا کہ کسی انجمن نے اس قسم کا کوئی رزولیوشن (قرارداد) کبھی منظور نہیں کیا
اور ہم لوگوں کو محض دھوکہ دے کر بیوقوف بنایا گیا

میری بنارس کی تقریر کی مختصر رپورٹ سے ایک ہنگامہ مچ گیا۔ اس میں
شک نہیں' کہ میں اس قسم کے تیز ردعمل سلے کا عادی ہو گیا ہوں' لیکن پھر بھی
ہندو مہا سبھا کے رہنما تو اس بری طرح میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں حیران رہ گیا' زیادہ تر
حملے ذاتیات پر کئے گئے۔ شاذ و نادر ہی کسی نے اصل معاملے کی طرف توجہ کی۔ (یہ
لوگ اس معاملے میں حد سے تجاوز کر گئے) مجھے ان سے کوئی شکایت
بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ انہوں نے مجھے بھی اس موضوع پر اظہار خیال
کا ایک موقع بہم پہنچا دیا۔ کئی مہینے سے اس مسئلہ پر میں غور کر رہا تھا' یہاں
تک کہ جیل خانہ میں بھی بےحساب بے چین رہا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس
بلا کو چھیڑا کس طرح جائے' اس کی کیفیت بھڑوں کے چھتے کی سی تھی اور اس
کو چھیڑنے سے میں ڈرتا نہیں تھا' پھر اپنے دل میں سوچتا تھا' کہ ایسی بحثوں
پڑنے سے کیا لطف آئے گا' جس کا خاتمہ گالی گلوج پر ہو' مگر اب تو

خاموش رہنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ چنانچہ میں نے ہندو اور مسلم فرقہ پرستی پر ایک مضمون لکھا۔ جو میرا خیال ہے کہ بہت مدلل تھا۔ اور اس میں میں نے ثابت کیا تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی حقیقی فرقہ پرستی ہی نہیں ہے۔ بلکہ محض سیاسی اور معاشرتی رجعت پسندی ہے۔ جو فرقہ پرستی کے بھیس میں چھپ کر کام کر رہی ہے۔ اتفاق سے میرے پاس فرقہ پرست لیڈروں کی تقریروں اور بیانوں کے تراشے موجود تھے۔ جو میں نے بڑے بڑے پرانے اخبارات سے کاٹ کر جیل خانہ کے قیام میں جمع کئے تھے اور میرے پاس اتنا زیادہ مواد جمع ہو گیا تھا کہ ایک اخباری مضمون کے لئے اس سب سے پورا فائدہ اٹھانا مشکل ہو گیا۔ ہندوستانی اخبارات میں میرے اس مضمون کی بہت اشاعت ہوئی اور تعجب کی یہ بات ہے کہ فرقہ پرست ہندو اور فرقہ پرست مسلمان دونوں میں سے کسی کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ حالانکہ دونوں کے متعلق میں نے اس مضمون میں بہت کچھ لکھا تھا۔ ہندو مہاسبھا کے رہنما جنہوں نے مجھے گالیاں تک دی تھیں۔ اب بالکل خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ مسلمانوں کی طرف سے صرف سر محمد اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کے متعلق میرے چند بیانات کی تردید کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے دلائل کا کوئی جواب انہوں نے بھی نہ دیا۔ انہیں کو جواب دیتے ہوئے میں نے یہ تجویز پیش کی تھی، کہ ایک نمائندہ اسمبلی منعقد کر کے تمام سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل کا تصفیہ کرنا چاہئے۔ اس کے بعد میں نے ایک یا دو مضامین اور فرقہ پرستی پر لکھے۔ یہ دیکھ کر کہ ان مضامین کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، اور جو لوگ ان مسائل پر خود غور و فکر کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں، انہوں نے بھی ان مضامین کو پسند کیا مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ یہ تو بہرحال میں جانتا تھا کہ میں اپنی حادثہ بیانی کے زور سے

ان جذبات پر ہرگز قابو نہیں پاسکتا ہوں، جو فرقہ پرستی کی تہ میں کام کررہے ہیں۔ میرا مقصد تو صرف یہ اقرار کرانا تھا، کہ فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہوگیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ کہے جاسکتے ہیں اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی، اور سیاسی سے بھی زیادہ معاشرتی اصلاح اور ترقی کے دشمن ہیں۔ ان کے چند مطالبات میں سے ایک مطالبہ بھی عوام الناس کے فائدے کے لئے نہیں ہے۔ ان مطالبات کی غرض صرف یہ ہے کہ اعلیٰ طبقے کے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ میرا تو قصد تھا کہ اس سلسلۂ مضامین کو جاری رکھوں۔ لیکن جیل خانہ نے مجھے پھر بلالیا ہندو مسلم اتحاد کی جو کوششیں بار بار کی جاتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ یہ مفید ضرور ہیں، لیکن میرے نزدیک اس وقت تک ان کوششوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ جب تک کہ اختلافات کے اصل اسباب دور سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے گی بعض ناسمجھ اسی دھوکہ میں ہیں کہ محض ہندو مسلم اتحاد پکارنے اور رٹنے میں کوئی ایسا جادو ہے کہ اتحاد آپ ہی آپ ہوجائے گا۔

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد سے فرقہ وارانہ معاملات میں برطانوی حکومت کا جو طرز عمل رہا ہے۔ اس کی تاریخ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ میرے خیال میں (حکومت کے) اس طرز عمل کا بنیادی اصول اور مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو اتحاد عمل سے روکا جائے۔ اور ایک جماعت کو دوسرے کے خلاف کھڑا کیا جائے ۱۸۵۷ء کے بعد بمقابلہ ہندوؤں کے مسلمانوں پر برطانیہ کا ہاتھ زیادہ صاف ہوتا رہا مسلمانوں کے دل میں حکومت کی یاد ابھی تازہ تھی اور وہ بمقابلتہً ذرا زیادہ جنگجو اور لڑاکو بھی سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے حکومت بھی ان کو زیادہ خطرناک سمجھتی تھی مسلمانوں نے جدید تعلیم سے بھی کنارہ کشی اختیار

کر لی تھی۔ اس لئے سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصہ کم تھا۔ ان تمام وجوہ سے ان کے متعلق حکومت کو طرح طرح کے شبہات اور خطرات تھے برخلاف اس کے ہندوؤں نے زیادہ شوق سے آگے بڑھ کر انگریزی زبان سیکھی اور کلرکی کی ملازمتیں حاصل کیں۔ اس سے حکومت نے یہی اندازہ کیا کہ ہندو زیادہ آسانی سے قابو میں آسکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ دور آیا کہ اعلیٰ طبقہ کے انگریزی پڑھے لکھے لوگوں میں جدید قسم کی وطنیت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اور چونکہ تعلیمی حیثیت سے مسلمان پیچھے رہ گئے تھے، اس لئے قدرتاً صرف ایک خاص طبقہ کے ہندوؤں ہی تک جدید وطنیت محدود رہا اس وطنیت کا اظہار نہایت ہی ملائم اور حد درجہ خوشامدانہ الفاظ میں ہوتا تھا۔ لیکن حکومت اس کو بھی پسند نہ کرتی تھی۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان مسلمانوں کے سر پر ہاتھ رکھا جائے اور انہیں وطن پرستی کے اس تحریک سے علیحدہ رکھا جائے جب تک مسلمانوں کا تعلق تھا انگریزی تعلیم کا نہ حاصل کرنا خود ان کی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی لیکن رفتہ رفتہ اس رکاوٹ کا دور ہونا لازمی یقینی تھا۔ چنانچہ برطانیہ نے پوری دور اندیشی سے مستقبل کے لئے انتظام کرنا شروع کیا اور اس کام میں سرسید احمد خاں جیسی ممتاز شخصیت سے حکومت کو بڑی مدد ملی۔

مسلمانوں کی اس حالت اور بالخصوص تعلیمی پستی کو دیکھ کر سرسید کو بڑا افسوس ہوا تھا اور یہ دیکھ کر بھی ان کو تکلیف ہوتی تھی کہ حکومت میں مسلمانوں کا کوئی اثر نہ رسوخ نہیں دوسرے حضرات کی طرح وہ بھی برطانیہ کے بہت بڑے مداح تھے اور یورپ کے سفر نے تو ان پر اور بھی گہرا اثر ڈالا۔

انیسویں صدی کے آخری پچاس سال کا وہ زمانہ ہے جب یورپ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مغربی یورپ اپنی تہذیب اور ترقی کے شباب پر تھا اور بلا خوف تردید ملکۂ عالم بنا ہوا تھا۔ اور جن خوبیوں کی بدولت اس کو یہ عظمت نصیب ہوئی۔ وہ بھی نمایاں طور پر معینہ مشہود پر تھیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ اپنی موروثی املاک اور جائدادوں پر قبضہ جمائے اطمینان اور جمعیت سے بیٹھے تھے۔ بلکہ اس میں برابر اضافہ کرتے جاتے تھے۔ ان کو وزرہ برابر یہ گمان نہ تھا کہ ان کے مقابل کوئی اور دعویدار بھی کبھی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ آزاد خیالی کی ترقی کا عہد تھا۔ اور ہر شخص ایک عظیم الشان مستقبل کا یقین واثق رکھتا تھا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جو ہندوستانی وہاں اس زمانہ میں گئے وہ بھی ان حالات اور خیالات سے متاثر اور مرعوب ہوئے۔ شروع شروع میں ہندو زیادہ تعداد میں گئے۔ اور یورپ بالخصوص انگلستان کے مداح بن کر واپس لوٹے لیکن رفتہ رفتہ آنکھیں اس ظاہری چمک کی عادی ہونے لگیں۔ اور تحیر کا پہلا پردہ چاک ہوا سر سید پر جو رعب اور اچنبھے کی کیفیت یورپ کے پہلے سفر میں طاری ہوئی اس کا نمایاں ثبوت جا بجا ملتا ہے ۱۸۶۹ء میں جب انہوں نے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں سے جو خطوط انہوں نے لکھے ان میں اپنے تاثرات کا ذکر کیا ہے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں "ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی بد اخلاقی اور ہندوستانیوں کو جانوروں سے بھی زیادہ حقیر و ذلیل سمجھنا گو میرے لئے قابل معافی نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں سے ناواقفیت کی ما پر وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور میرا تو خیال ہے کہ ہم لوگوں کے متعلق جو رائے انہوں نے قائم کی ہے۔ وہ زیادہ غلط بھی نہیں ہے۔ اگر میری بات کی ہجا تعریف کے بغیر میں سچ کہتا ہوں کہ ہندوستانی خواہ ادنےٰ طبقے

کے ہوں، یا نیچے طبقہ کے، سوداگر ہوں یا معمولی دوکاندار، تعلیم یافتہ ہوں، یا جاہل، جب ان کا مقابلہ تعلیم، اخلاق اور ایمانداری میں انگریزوں سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہی نسبت ہے جو ایک گندہ جانور کو ایک خوبصورت اور لائق انسان سے ہوتی ہے انگریز اگر ہندوستانیوں کو مردل اور جانور سمجھتے ہیں، تو ان کے پاس اس کے وجوہ بھی ہیں۔ جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہے، اور ہر روز دیکھتا ہوں، وہ ہندوستان کے باشندوں کے تصور میں بھی نہیں آسکتا، وہ تمام روحانی اور مادی خوبیاں جو ایک انسان میں ہونی چاہئیں اللہ تعالیٰ نے یورپ کو، بالخصوص انگلستان کو عطا فرمائی ہیں۔" سلہ

یورپ اور برطانیہ کی اس سے زیادہ تعریف کوئی انسان نہیں کرسکتا اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید بہت زیادہ مرعوب اور متاثر ہو گئے تھے ہوا۔ اور تقابل کے لئے جو شدید الفاظ انہوں نے استعمال کئے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ اپنی قوم کو غفلت کی نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھانا چاہتے تھے اور شرمندہ کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ یہ لوگ بھی ترقی کی طرف قدم بڑھائیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ترقی کا یہ قدم وہ مغربی تعلیم ہی کی طرف اٹھانا چاہتے تھے۔ اور انہیں یقین تھا کہ بغیر مغربی تعلیم کے ان کی حالت روز بروز کمزور اور پست ہوتی جائے گی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سرکاری ملازمت ملے۔ اس میں سے روزی ملے، اعزاز اور رسوخ حاصل ہو چنانچہ انہوں نے اس قسم کی تعلیم کو رواج دینے کیلئے مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب

سلہ یہ مقولہ ہانس کوہن کی کتاب مشرق کی تاریخ وطنیت سے نقل کیا گیا ہے۔

توجہ وقف کر دی۔ وہ کسی دوسری طرف اپنی توجہ کو منتشر کرنا نہیں چاہتے
تھے مسلمانوں کے جمود اور جھجک پر غلبہ پانے کا کام خود ہی بہت مشکل تھا
دوسری طرف بورژوا ہندوؤں کی کوششوں سے وطن پرستی کی جدید تحریک
شروع ہو رہی تھی اس میں شرکت سے ان کے نزدیک انتشار کا ڈر تھا اس
لئے انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ ہندو جو مغربی تعلیم میں [illegible] ہندی مسلمانوں
سے آگے تھے حکومت وقت پر نکتہ چینی کرنے کا متحمل [illegible] کر سکتے تھے لیکن
انہوں نے اپنے تعلیمی کاموں کو حکومت کے تعاون اور امداد کے بھروسہ پر
شروع کیا تھا۔ اور اس لئے وہ کوئی ایسا قدم [illegible] نہیں اٹھانا
چاہتے تھے جس سے ان کے کام کو نقصان پہنچے۔ چنانچہ انہوں نے انڈین
نیشنل کانگریس کو پس پشت ڈال دیا۔ ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت بھی
چاہتی تھی اور اس نے ان کی پوری حمایت کی

سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ
کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے
میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی مؤثر حصہ نہیں
لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں
کے غلام بن جائیں گے۔ جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی
اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔

ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بورژوا طبقہ نہیں
پیدا ہوا تھا۔ اس لئے نہ تو تاریخی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور
نہ ان کے خیالات میں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہوا تھا کہ مسلمان "بورژوا
تحریک وطنیت میں شامل ہو جائے۔

سرسید کی یہ تمام کارروائیاں جو بظاہر ہمیں معتدل قسم کی معلوم ہوتی ہیں حقیقتاً ایک قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھیں مسلمان ابھی تک اپنے خیالات کے اعتبار سے جمہوریت کے مخالف اور منصب داری نظام کے حامی تھے برخلاف اس کے ہندوؤں میں جو متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا، یہ یورپ کے آزاد خیال لوگوں سے متاثر تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک سے ایک بڑھ کر اعتدال پسند تھے۔ اور دونوں حکومت برطانیہ کے وابستگاں میں تھے۔ زیادہ سے زیادہ فرق یہ تھا کہ سرسید کا اعتدال زمیندار طبقہ کا اعتدال تھا اس لئے کہ مسلمانوں میں تھوڑے بہت صاحب حیثیت لوگ جو رہ گئے تھے۔ وہ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ہندوؤں کا اعتدال ایک ہوشیار بیشہ ور یا کاروباری آدمی کا اعتدال تھا۔ جو اپنی تجارت کی ترقی اور سرمایہ کو لگانے کے لئے راستہ نکالنا چاہتا ہے۔ ہندو مدبرین کی نظریں ہمیشہ گلیڈ اسٹون اور برائٹ وغیرہ کی طرف اٹھتی تھیں۔ اس لئے کہ انگلستان کے آزاد خیال گروہ کے یہی چشم و چراغ ہیں۔ مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ بد عالماً انگلستان کے قدامت پرست گروہ ٹوری اور طبقہ امرا کے زیادہ قائل اور مداح تھے۔ گلیڈ اسٹون نے چونکہ ترکی کی اور ارمنی قتل عام کی مذمت کی تھی۔ اس لئے گلیڈ اسٹون کو مسلمان ہو سمجھتے تھے۔ اور ڈسرائیلی چونکہ ترکی سے کسی قدر ہمدردی رکھتا تھا۔ اس لئے ان معاملات سے دلچسپی لینے والے مسلمان جن کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ ڈرا ڈسرائیلی کے طرفدار تھے۔

سرسید کی بعض تقریروں کو اگر آج پڑھا جائے تو بہت عجیب معلوم ہوتی ہیں دسمبر ۱۸۸۷ء میں انہوں نے لکھنؤ میں ایک تقریر کی۔ مسلم کانگریس کا

سالانہ اجلاس بھی اسی زمانے میں ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس تقریر میں انہوں نے کانگریس کے ان درجہ معتدل مطالبات پر بھی نکتہ چینی کی۔ اور اس کی مذمت کی۔ سرسید نے کہا: "کہ حکومت اگر انگلستان سے جنگ کرتی ہے یا برما پر قبضہ کر لیتی ہے، تو ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اس کے طرز عمل پر نکتہ چینی کریں۔ اس کونسل کے لئے وہ ہر صوبہ سے ایسے امیروں کا انتخاب کرتی ہے، جو ملکی انتظامات اور لوگوں کی حالت سے سب سے زیادہ واقف ہیں۔ اس کے علاوہ چند رئیسوں کو بھی لیا جاتا ہے۔ جو اپنے بلند مرتبہ کی وجہ سے اس مجلس میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ کچھ لوگ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ جائے قابلیت کے محض بلند مرتبہ کی وجہ سے انہیں کیوں منتخب کیا جائے۔ میں ہی آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے امراء اور رؤسا کا طبقہ اس کو پسند کرے گا کہ ایک نیچ ذات یا ایک بے نام و ننگ خاندان کے کسی آدمی کو خواہ وہ بی اے یا ایم اے ہی پاس کر لے اور اس میں قابلیت بھی کیوں نہ موجود ہوں کیا ایسا اختیار اور رتبہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ ان پر حکومت کرے۔ اور ان کو اسے تو انہیں مانے کی اختیار رکھنی حاصل ہو جس کا اثر ان کی زندگی اور املاک پر پڑے؟ ہرگز نہیں۔ سوائے اعلیٰ خاندان کے لوگوں کے اور کسی شخص کو وائسرائے بہادر اپنا رفیق کار نہیں بنا سکتے نہ اس سے برادرانہ تعلقات رکھ سکتے ہیں۔ نہ اسی دعوتوں میں اس کو شریک کر سکتے ہیں۔ جہاں اس کو ڈیوک اور ارل طبقہ کے لوگوں کے ساتھ ایک میز پر کھانا ہو۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ حکومت نے قانون سازی کا جو طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس میں وہ رائے عامہ کا کوئی لحاظ نہیں کرتی؟ اور کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قانون بنانے میں ہم لوگوں کا کوئی نفع نہیں؟

میں دعویٰ کرکے کہہ سکتا ہوں، کہ ایسا ہرگز نہیں ہے"۔ [1]

ہندوستان میں "جمہوریت اسلام" کے ایک نمائندہ اور رہنما کے یہ خیالات ہیں، کیا اودھ کے تعلقدار یا صوبہ آگرہ، بہار اور بنگال کے بڑے بڑے زمیندار بھی اس قسم کے خیالات ظاہر کرنے کی جرأت آج کر سکتے ہیں لیکن ایک صدی پہلے سرسید ہی اس قسم کے خیالات نہ رکھتے تھے خود کانگریس کی بہت سی تقریریں آج اگر پڑھی جائیں، تو اتنی ہی عجیب معلوم ہوں گی، بہر حال یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کا سیاسی اور معاشی پہلو یہ تھا، کہ ہندوؤں کا ایک متوسط طبقہ تھا، جو معاشی حیثیت سے دراصل بہتر حالت میں تھا۔ اور ترقی کر رہا تھا۔ اس طبقہ کے اقتدار اور ترقی کی مخالفت کسی حد تک زمیندار طبقے کی طرف سے کی گئی جس میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی ہندو زمیندار عموماً اپنے ورثہ والطبقہ سے گہرے تعلقات رکھتے تھے۔ اور اس لئے اپنے متوسط طبقہ

---

[1] یہ ٹکڑا ہانس کوہن کی مشرق کی تاریخ وطنیت سے نقل کیا ہے۔

نوٹ یہ پوری تقریر سرسید کے "مکمل مجموعہ لکچر و اسپیچ" میں شائع ہوئی ہے ہم یہاں ان کی اصل تقریر کا وہ حصہ نقل کرتے ہیں جس کا ہیڈ ٹو اسراول نے متن میں اقتباس دیا ہے۔

"اگر کوئی ملک گورنمنٹ فتح کرے سرہارے نے۔ افغانستان سے لڑے یا اس سے صلح کرے۔ ان سے ہم لوگ جو ملک کے باشندے ہیں کچھ سروکار نہیں رکھتے

اس کونسل میں چند ممبر تو والیان۔ علاوہ ان کے مرصوبہ سے تو گورنمنٹ کی ذات میں نہایت ہوشیار اہلکار گورنمنٹ کے ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۳۱۹ پر)

کے معاملات میں یا وہ غیر جانب دار رہے' یا ان سے ہمدردی کرتے رہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اکثر اوقات یہ مطالبات انہیں کے اشاروں سے کئے جاتے تھے حکومت برطانیہ حسبِ معمول اس کش مکش میں منصب داروں اور جاگیرداروں کا ساتھ دیتی رہی - اور جہاں تک بچارے عوام اہالیان یا ادنیٰ متوسط طبقہ کا تعلق ہے خواہ وہ ہندو ہوں' یا مسلمان' اس پوری تصویر میں ان کا چہرہ کہیں بھی نظر نہیں آتا -

بالآخر سرسید کی پرزور اور چھا جانے والی شخصیت نے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں پر ایسا سکہ جما دیا - اور ان کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کی تشکیل علی گڑھ کالج کی صورت میں ہوئی - تغیر اور تبدیلی کے زمانہ میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ترقی کی تحریک جلد ہی اپنی قوت ختم کر چکتی ہے اور پھر بجائے محرک کے اُلٹے روک کا کام کرنے لگتی ہے - اس کی ایک روشن مثال ہندوستانی

(صفحہ ۳۱۸ کا بقیہ) مثلاً کمشنر یا اور کوئی واقف کار حال ہو جس نے مدت تک وہاں زندگی بسر کی ہے عدالت کے کام فوجداری' کلکٹری کے کام سے اور اس ملک اور اس ملک کے حال سے واقف ہے - ہر صوبہ سے ملاتی ہے پنجاب سے' اودھ سے' شمال و مغرب سے' مدراس بمبئی سے - اور ان کو مشورہ میں شریک کرتی ہے - گورنمنٹ ہندوستانی رئیسوں میں سے جس کو وہ اس کرسی پر بیٹھنے کے قابل اور باعتبار عزت کے مناسب سمجھتی ہے ان کو بھی ملاتی ہے - شاید اس بات پر لوگوں کو شبہ ہوا ہوگا کہ باعتبار عزت کے کیوں ملاتی ہے باعتبار لیاقت کے کیوں نہیں ملاتی؟ اس کی بابت آئے حضرات میں کچھ بیان کروں گا - (باقی صفحہ ۳۲۰ پر)

کی طرح حاصل ہے۔ وہ اکثر ہم لوگوں کو یاد دلا دیتے ہیں کہ کانگریس کی قدیم روایات کے اصل حامل اور جائز وارث وہی ہیں۔ ہم بہت بعد میں داخل ہوئے۔ خواہ مخواہ دخل پیدا کرنے والے لوگ ہیں۔ اور یہ بالکل درست ہے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ وہ کانگریس کی قدیم روایات کی طرح محو ہو چکی ہیں۔ جیسے پارسال کا برف پہاڑوں پر سے گھل کر غائب ہو گیا۔ اب صرف اس کی یاد ہی باقی ہے۔ شاید سر سید کا پیغام بھی اسی طرح اس وقت کے لئے مناسب حال اور ضروری تھا۔ لیکن ایک ترقی کر سکنے والی جماعت کے لئے وہ آخری نصب العین نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ اگر وہ ایک نسل تک اور زندہ رہتے تو وہ خود اپنے پیغام کو

(بقیہ صفحہ ۳۱۹) کیا ہماری ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجہ کا آدمی خواہ اس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی اور گو وہ لائق بھی ہو ان پر بیٹھ کر حکومت کرے ان کے مال جائداد اور عزت پر حاکم ہو۔ کبھی نہیں۔ کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا (چیرز) گورنمنٹ کی کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے۔ گورنمنٹ مجبور ہے کہ سوائے معزز کے کسی کو نہیں بٹھا سکتی اور نہ وہ کسی اس کو اپنی کلیگ یا ہانر ایبل کلیگ یعنی برادر یا معزز صاحب کہہ سکتا ہے نہ تماشہ دربار میں اور نہ شہنشاہی جلسوں میں جہاں ڈیوک اور ارل اور ایسے معززین شامل ہوتے ہیں۔ بلایا جا سکتا ہے۔

بہرحال قانون میں کچھ نقص ہو یا نہ ہو مگر طریقہ نافذ کا ایسا ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گورنمنٹ خود مختاری سے جو چاہتی ہے۔ وہ کرتی ہے ہم رعایا کی رائے نہیں لیتی اور نہیں سنتی ہے اور تو لوگ عذر کر ما چاہتے ہیں (باقیہ صفحہ ۳۲۱ پر)

ذرا ترچھی کر کے پہنتا ہے (یہ ترکی ٹوپی کہلاتی ہے۔ حالانکہ خود ترکوں نے اب اس کو بالکل ترک کر دیا ہے) جمہوریت اسلام میں شرکت کا یہ ناقابل انکار حق یقینی طور پر حاصل کر لینے کے بعد جس سے کہ اس کو دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ نماز پڑھنے اور کھانا کھانے کا حق مل جاتا ہے۔ اب اس کو اس کی متعلق فکر نہیں ہوتی، کہ اس کے وطن ہندوستان میں سیاسی جمہوریت کا وجود بھی کہیں ہے کہ نہیں ہے۔

سرکاری ملازمت کرنے کا یہ شوق اور یہ تنگ نظری صرف علی گڑھ یا دوسرے مقامات کے مسلمان طلبہ ہی میں نہیں مگر ہندو طلبہ میں بھی پائی جاتی تھی تو غالباً بہت ہی کم حیثیت ہوتے تھے۔ لیکن حالات نے انہیں بالآخر اس چکر سے نکلنے پر مجبور کر دیا ان کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اور ملازمتوں میں اتنی جگہ نہ تھی کہ سب کو دی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا ایک طبقہ ہو گیا جو قومی انقلابی تحریکات کے پشت پناہ ہیں۔

سرسید کے سیاسی پیغام کا اثر ابھی ہندی مسلمانوں پر باقی تھا، کہ بیسویں صدی کے اوائل میں چند واقعات نے برطانوی حکومت کو یہ موقع دیا کہ قومی تحریک اور مسلمانوں کے درمیان جو خلیج پہلے سے حائل ہے اس کو اور زیادہ وسیع کر دے۔ ۱۹۱۰ء میں سر ویلنٹائن چرول اپنی کتاب انڈین ان ریسٹ میں لکھتے ہیں کہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے مفاد اور قومی اغراض کو برطانوی حکومت کے قیام و استحکام کے ساتھ جس حد تک اب وابستہ کر دیا ہے اس سے پہلے کبھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن سیاسی پیشین گوئیاں خطرناک ہوتی ہیں۔ سر ویلنٹائن نے جب یہ لکھا اس کے پانچ سال کے بعد یہ دیکھا گیا، کہ تعلیم یافتہ

مسلمان بھی ان بیڑیوں کو توڑ پھینکنے کی کوشش اور جد وجہد کر رہے ہیں۔ اور کانگریس کے دوش بدوش چلنا چاہتے ہیں۔ اور اسی سال کے اندر ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ ہندی مسلمان کانگریس سے بھی دو قدم آگے نکل جائیں گے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ کانگریس کی رہنمائی کرنے لگے۔ لیکن یہ دس سال کا زمانہ بہت ہی اہم زمانہ تھا، جنگ عظیم اسی زمانہ میں شروع ہوئی۔ اور دنیا کو تباہی اور بربادی کے عالم میں چھوڑ کر اسی زمانہ میں ختم بھی ہوئی۔

بہرکیف سطحی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو سر ویلنٹائن چرول نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، اس کے لئے بھی معقول وجوہ موجود تھے۔ آغا خاں نے مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے ظہور فرمایا تھا اور اسی ایک واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمان ابھی تک قدیم منصب داری نظام کی روایات سے وابستہ تھے اس لئے کہ آغا خاں، نوروڈا، لیڈر تو کسی صورت میں نہیں کہے جا سکتے تھے۔ آغا خاں ایک متمول امیر و کبیر ہیں، اور ایک مذہبی فرقہ کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں۔ برطانوی نقطۂ نظر سے تو مقربین بارگاہ میں ان کا شمار کیا جاتا ہے اس لئے کہ برطانیہ کے حکمراں طبقہ سے ان کے نہایت گہرے تعلقات ہیں، وہ ایک نہایت شائستہ اور وسیع المشرب آدمی ہیں، ان کا قیام زیادہ تر یورپ میں رہتا ہے۔ جہاں ان کی طرز معاشرت اور بود و باش بالکل وہی ہے جو ایک فارغ البال اور سیر و تفریح میں وقت گذارنے والے انگریز رئیس کی بالعموم ہوا کرتی ہے چنانچہ جہاں تک فرقہ وارانہ اور مذہبی مسائل اور معاملات کا تعلق ہے، آغا خاں خود ذاتی طور پر تنگ نظری سے بہت دور ہیں۔ لیکن ان کی قیادت کے معنی یہ تھے، کہ مسلمانوں میں زمیندار طبقہ مسلمان نوروڈا طبقہ دونوں برطانوی حکومت کی حمایت میں صف بستہ

ہو جائیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ محض ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اس پر
ظاہرا طور پر اس لئے زور دیا جاتا تھا کہ اصل مقصد حاصل ہو سکے۔ ملٹن
جے ڈل لکھتے ہیں کہ آغا خاں نے وائسرائے لارڈ منٹو کو بتلا دیا تھا کہ تقسیم بنگالہ
سے جو سیاسی صورت حال پیدا ہوئی۔ اس کے متعلق مسلمانوں کا نقطۂ نظر کیا
ہے۔ تاکہ ہندوؤں کے ساتھ کوئی ایسی سیاسی مراعات کہیں رواداری میں
نہ کر دی جائیں جن سے ہندو اکثریت کے اقتدار حاصل کرنے کے لئے راستہ
صاف ہو جائے۔ کہ یہ بات برطانوی حکومت کے استحکام اور مسلم اقلیت
کے مفاد کے لئے جس کی رواداری میں اب کسی شک و شبہ کی گنجائش
نہیں رہی تھی، یکساں طور پر خطرناک تھی۔

برطانوی حکومت کے ساتھ اس سطحی حمایت کے پیچھے دوسری
قوتیں بھی کام کر رہی تھیں، ناگزیر طور پر جدید مسلم بورژوا طبقہ روز بروز
موجودہ حالات سے غیر مطمئن ہو کر تحریک وطنیت کی طرف کھنچتا جا رہا تھا،
خود آغا خاں کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اور انہوں نے محتاط الفاظ میں
برطانیہ کو متنبہ بھی کیا، انہوں نے جو ایک ٹائمز کے انٹرویو میں (یعنی
جنگ سے بہت پہلے) یہ لکھا تھا اور حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ ہندو اور مسلمان
کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا طرز عمل ترک کر کے دونوں مذاہب کے
معتدلین کو ایک مشترکہ محاذ پر جمع کرنا چاہیئے۔ تاکہ ہندوستان کے نوجوان ہندو
اور مسلمان دونوں کے انتہا پسند قومی میلانات کا مقابلہ کیا جائے۔ اس
سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفاد کا اتنا زیادہ خیال
نہ تھا، جتنا کہ ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو روکنے کا۔

لیکن قومیت کی تحریک کی طرف مسلم بورژوا طبقہ کے ناگزیر میلان کو

نہ تو آغا خان روک سکے اور نہ حکومت برطانیہ۔ عالمگیر جنگ نے اس عمل میں اور زیادہ تیزی پیدا کر دی۔ اور جیسے جیسے نئے رہنما پیدا ہوتے۔ آغا خان کنارہ کش ہوتے گئے یہاں تک کہ علی گڑھ کالج کا رنگ بھی بدلا۔ نئے رہنماؤں میں سب سے زیادہ سر بر آوردہ علی برادران تھے۔ اور یہ دونوں علی گڑھ ہی کے تعلیم یافتہ تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور متعدد دوسرے لیڈروں نے مسلمانوں کے سیاسی معاملات میں بہت اہم حصہ لینا شروع کیا۔ اسی طرح مسٹر محمد علی جناح آگے بڑھے۔ لیکن ذرا زیادہ اعتدال کے ساتھ۔ گاندھی جی ان میں سے اکثر مسلم لیڈروں کو (مسٹر جناح کو چھوڑ کر) اور مسلمانوں کو بالعموم تحریک ترک موالات میں اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئے۔ اور ان لوگوں نے سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۳ء تک تمام واقعات میں بہت نمایاں حصہ لیا۔

اس کے بعد ردعمل شروع ہوا۔ ہندو اور مسلمان دونوں جماعتوں کے فرقہ پرست اور رجعت پسندی لوگ جو مجبوراً کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے تھے نکلنا شروع ہو گئے اس عمل کی رفتار بہت سست تھی لیکن مسلسل جاری رہی۔ چنانچہ ہندو مہا سبھا کو پہلی بار کچھ شہرت حاصل ہوئی لیکن یہ شہرت زیادہ تر فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے تھی۔ ورنہ سیاسی حیثیت سے وہ کانگریس کو کچھ زیادہ مرعوب نہ کر سکی۔ اسلامی فرقہ وارانہ انجمنوں کو البتہ عام مسلمانوں میں اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے میں نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی لیکن اس کے بعد بھی مسلمان رہنماؤں کی ایک قومی جماعت برابر کانگریس کے ساتھ رہی۔ اسی اثنا میں حکومت برطانیہ نے ان تمام فرقہ پرست مسلم لیڈروں کی بہت امداد اور حمایت کی، جو سیاسی حیثیت سے بالکل رجعت پسند واقع ہوئے تھے

ان رجعت پسندوں کی کامیابی کو دیکھ کر ہندو مہاسبھا نے بھی رجعت پسندی میں ان کا تعاقب شروع کیا اور اس امید پر کہ حکومت کی خوشنودی اس طریقہ سے حاصل ہو جائے گی مہاسبھا کے ترقی پسند عناصر یا تو نکال باہر کئے گئے یا آپ اپنی مرضی سے علیحدہ ہوگئے اور مہاسبھا روز بروز اعلیٰ متوسط طبقہ کی طرف اور بالخصوص ساہوکاروں اور مہاجنوں کی طرف جھکتی چلی گئی۔

دونوں طرف کے فرقہ پرست سیاسی جو کونسلوں کی نشستوں کی تقسیم پر برابر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، اگر کچھ سوچتے تھے تو بس یہ کہ حکومت میں اقتدار حاصل ہونے سے ان کو ہم قوموں کی سرپرستی کے مواقع ملیں گے غرض یہ سارا جھگڑا صرف متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ملازمتوں کے لئے تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ اتنی ملازمتیں تو تھیں نہیں، جو سب کو مل سکیں۔ اس لئے ہندو مسلم فرقہ پرست اسی لئے جھگڑتے تھے۔ اور اول الذکر کے قبضہ میں چونکہ اکثر ملازمتیں تھیں اس لئے وہ ان کا تحفظ کرنا چاہتے تھے۔ اور آخر الذکر برابر اور زیادہ چھیننے کی فکر میں تھے۔ ملازمتوں کے لئے اس جھگڑے کے پیچھے ایک اور بھی بہت زیادہ اہم معاملہ تھا، جو ٹھیک ٹھیک فرقہ دارانہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن فرقہ دارانہ امور پر اس کا اثر ضرور پڑتا تھا مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو پنجاب، سندھ اور بنگال میں ہندو زیادہ مالدار، زیادہ قرض دینے والے اور زیادہ تعداد میں شہر کے رہنے والے ہیں۔ برخلاف اس کے ان صوبوں میں مسلمان زیادہ غریب، زیادہ مقروض اور زیادہ تر دیہات کے رہنے والے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کی لڑائی زیادہ تر معاشی ہے لیکن ہمیشہ اس کو فرقہ دارانہ رنگ دیا گیا۔ اور ادھر کچھ عرصے سے تو مختلف صوبجات کی کونسلوں میں اور بالخصوص پنجاب کونسل میں جہاں دیہی قرضوں

کی تحفظ کا مسودہ قانون پیش ہوا۔ تو بحث مباحثوں میں یہ کیفیت صاف طور پر ظاہر تھی۔ اور ہندو مہاسبھا کے نمائندوں نے ہمیشہ اس قوانین کی مخالفت کی اور ساہوکار طبقہ کا ساتھ دیا ہے۔

ہندو مہاسبھا جب کبھی مسلمانوں کی فرقہ پرستی پر نکتہ چینی کرتی ہے تو اپنی اس خالص وطنیت کا ادعا بھی کرتی ہے جسے کوئی انکار نہیں سکتا یہ بات کہ مسلم اکثروں نے اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر فرقہ پرست ظاہر کیا ہے، ہر شخص پر عیاں ہے، لیکن ہندو مہاسبھا کی فرقہ پرستی اتنی آشکارا نہیں ہے اس لئے کہ وہ وطنیت کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ اس کی وطنیت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے۔ جب کسی جمہوری اور قومی نصب العین سے اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کے مفاد کو نقصان پہنچے کا اس کو اندیشہ ہو اور اس وقت اس امتحان میں مہاسبھا بار بار ناکام ثابت ہو چکی ہے۔ یہی وجہ تو ہے کہ اکثریت کی مرضی کے خلاف اور اقلیت کے معاشی مفاد کی خاطر یہ لوگ ہمیشہ سندھ کی علیحدگی کی مخالفت کرتے رہے۔

لیکن فرقہ پرست ہندو اور مسلمان دونوں کی طرف سے وطن پرستی کی مخالفت اور رجعت پسندی کی غیر معمولی مائش گول میز کانفرنس میں ہوئی برطانوی حکومت نے چن چن کر صرف فرقہ پرست مسلمانوں کو نامزد کرنے پر اصرار کیا تھا۔ اور یہ لوگ آغا خان کی قیادت میں بڑے سے بڑے رجعت پسندوں سے جا کر مل گئے۔ جو نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام ترقی پسند جماعتوں کے نقطۂ نظر سے برطانیہ کی سیاسی زندگی میں سب سے خطرناک عناصر سمجھے جاتے ہیں۔ آغا خان اور ان کی جماعت کا لارڈ لائڈ اور انکی جماعت کے ساتھ اتنا گہرا میل جول دیکھ کر یوں ہی تعجب ہوتا تھا، لیکن

یہ لوگ تو ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور انہوں نے گول میز کانفرنس میں یورپین ایسوسی ایشن کے نمائندوں کے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے نمائندوں کے ساتھ جاکر عہدو پیمان کر لئے۔ یہ بات بہت زیادہ تکلیف دہ اس لئے تھی کہ یہ ایسوسی ایشن (انجمن) ہندوستان میں ملکی آزادی کی سب سے بڑی مخالف اور دشمن ہمیشہ سے رہا ہے۔ اور آج بھی ہے۔

ہندو مہاسبھا کے نمائندوں نے اس کے جواب میں یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص پنجاب کی خود اختیاری پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کی جائیں۔ یعنی ایسے تحفظات رکھے جائیں جو برطانیہ کے حق میں مفید ہوں۔ انہوں نے کوشش کی کہ برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے میں مسلمانوں سے بھی آگے بڑھ جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ تو کچھ لگا نہیں، البتہ اپنے ہی مقدمہ کو نقصان پہنچایا اور تحریک آزادی کے ساتھ غداری کی مسلمانوں نے کم از کم وقار کے ساتھ تقریریں کی تھیں لیکن فرقہ پرست ہندوؤں کے پاس یہ بھی نہ تھا۔

سب سے زیادہ نمایاں حقیقت مجھے تو یہ نظر آتی ہے کہ دونوں طرف کے فرقہ پرست لیڈر کس طرح صرف ایک چھوٹے سے اعلیٰ طبقہ سے رجعت پسند گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور کس طرح یہ لوگ بھی اپنے اغراض کے لئے عوام کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ دونوں طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اصل معاشی مسئلہ پر غور و فکر کی خواہش کو دبا دیا جائے۔ اور اس سے احتراز کیا جائے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب ان امور کو اور زیادہ نہ دبایا جا سکے گا۔ اور اس وقت پھر دونوں طرف کے فرقہ پرست لیڈروں کی رائیں

آغاخان کی بیس برس پہلے والی تنبیہ کی آواز بازگشت آئے گی کہ معتدلین ایک
مشترکہ محاذ پر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر انقلابی میلانات کے مقابلہ کے لئے مجتمع ہو جائیں۔
کسی حد تک تو یہ بات پہلے ہی ظاہر ہونے لگی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرقہ پرست
خواہ عام جلسوں میں ایک دوسرے کی مخالفت کریں، لیکن اسمبلی میں اور دوسری
جگہوں پہ رجعت پسند قوانین منظور کرتے ہیں۔ اور حکومت کی امداد کے لئے ایک دوسرے
کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ معاہدہ اوٹاوہ بھی اسی قسم کا ایک رشتہ تھا
جس نے تینوں کو متحد کر دیا تھا۔

یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ کنزرویٹو جماعت کے انتہائی رجعت پسند
لوگوں کے ساتھ آغا خان کا گہرا تعلق اب بھی قائم ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں برطانوی
بحری افواج کی لیگ کے ڈنر میں آغا خان بطور خاص مہمان کے مدعو تھے۔
جس میں لارڈ لائیڈ نے صدارت کی تھی۔ اور انہوں نے دل و جان سے
ان تجاویز کی تائید کی تھی۔ جو برطانوی بحری بیڑے کو اور زیادہ مضبوط کرنے
کے لئے لارڈ لائیڈ نے کنزرویٹو کانفرنس میں پیش کی تھیں۔ چنانچہ ایک
ہندوستانی لیڈر کو اتنی زیادہ فکر برطانوی سلطنت اور بالخصوص انگلستان
کی حفاظت کی تھی۔ کہ برطانوی افواج و اسلحہ کے اضافہ کے معاملہ میں مسٹر
بالڈون اور نیشنل گورنمنٹ سے بھی وہ آگے جانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب
کچھ صرف قیام امن کی خاطر کر رہے تھے۔

اس کے بعد دوسرے مہینہ نومبر ۱۹۳۳ء میں یہ خبر ملی کہ ایک تصویر (فلم)
نئی طور پر لندن میں دکھلائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ "اسلامی دنیا کے
مستقل دوستانہ تعلقات کا رشتہ تاج برطانیہ کے ساتھ قائم کیا جائے"۔ ہم
لوگوں کو خبر دی گئی کہ اس موقع پر خاص مہمان آغا خان اور لارڈ لائیڈ تھے۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ آغا خان اور لارڈ لائڈ سلطنتی معاملات میں اسی طرح ایک دوسرے سے متحد اور ایک جان دو قالب ہوگئے ہیں جیسے ہماری قومی سیاسیات میں سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر ایم آر جیکر ہیں اور یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ ابھی چند مہینے کے عرصہ میں جب یہ دونوں ایک دوسرے سے مار مار سار کر رہے تھے - لارڈ لائڈ کمر روٹو (قدامت پسند) جماعت کی باضابطہ قیادت پر اور اپنی نیشنل گورنمنٹ پر تلخ اور ناگوار حملے بھی کر رہے تھے اور یہ الزام دے رہے تھے کہ حکومت ہندوستان کو ضرورت سے زیادہ دے کر گویا کمزوری دکھلا رہی ہے [1]

ادھر کچھ عرصہ سے بعض فرقہ پرست لیڈروں کے بیانات اور تقریروں میں ایک دلچسپ بات اور پیدا ہوگئی ہے - اس کی کوئی خاص اہمیت تو نہیں لیکن مجھے شبہ ہے کہ اور لوگوں کا بھی یہی خیال کہیں نہ ہو، بہرکیف فرقہ پرستی کی ذہنیت تو اس سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کو بہت زیادہ اہمیت بھی دی گئی ہے پہلے تو ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تمدن پر اور ہندو تمدن پر اور اسلامی تمدن کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے (گو اس کو بھونڈے طریقہ پر نہیں پیش کیا جاتا) کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں تمدنوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کرسکے -

---

[1] کچھ عرصہ ہوا - برطانوی امراء ( ) اور ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کونسل قائم کی گئی ہے، جو ان دو انتہا پسند رجعت پسند عناصر کو متحد کرے - اور اس اتحاد کو اور زیادہ فروغ دے -

تھوڑے سے فرقہ پرست ہندو لیڈر بھی ٹھیک اسی قسم کے خیالات
رکھتے ہیں فرق بس اتنا ہے کہ چونکہ وہ اکثریت میں ہیں' اس لئے انہیں
توقع ہے کہ 'ہندو تمدن' بالآخر غالب آجائے گا۔

ہندو اور مسلم تمدن اور ملت اسلامی' ان الفاظ سے ماضی کے کیسے
کیسے دل پسند تاریخی واقعات اور موجودہ اور آئندہ کے متعلق کیسی کیسی امیدوں
کے باب کھل جاتے ہیں لیکن ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا
مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم (موجود ہے)
جو دکھائی نہیں دیتی' منتشر ہے' مبہم ہے اور غیر متعین ہے اس سیاسی نقطۂ نظر
سے اگر دیکھا جائے۔ تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے' اور معاشی نقطۂ نظر
سے یہ بہت دور از کار ہے۔ اور بمشکل قابل توجہ کہا جا سکتا ہے بہرکیف
اس ذہنیت کے سمجھنے میں اس سے تھوڑی مدد ملے گی جو اس کے پیچھے کام
کر رہی ہے۔ اس قسم کی چند قوموں کا وجود عہد وسطیٰ میں اور اس کے بعد
بھی پایا جاتا ہے۔ جو ایک دوسرے سے علیحدہ تھیں' اور گھل مل سکتی تھیں'
سلاطین عثمانی کے ابتدائی عہد کے قسطنطنیہ میں اس قسم کی ہر قوم علیحدہ وجود
رکھتی تھی۔ اور اس کو کسی حد تک خود مختاری حاصل تھی۔ مثلاً لاطینی عیسائی ارتھو
ڈاکس عیسائی اور یہودی وغیرہ یہ گویا ابتداءً اپنے وطن کے علاوہ دیگر ممالک
سے رشتہ 'اخوت جوڑنے کی' جو اس زمانہ میں اکثر مشرقی ممالک کے لئے بہت
ہی پریشان کن خواب بن گیا اس لئے مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں
کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں صرف مذہبی اخوت کا رشتہ ایک چیز ہے
اور اس لئے کوئی قوم (جدید مفہوم میں) ترقی نہ کرنے پائے اس کا
مطلب یہ ہے کہ جدید تہذیب و تمدن کو ترک کر کے ہم لوگ عہد وسطیٰ

کے طریقوں کو پھر اختیار کریں۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنا چاہیئے۔ یا دیسی حکومت' اور آخر میں تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں' کہ یہ ذہن کی محض ایک جذباتی کیفیت ہے۔ اور محسوس یا غیر محسوس طریقہ پر یہ خواہش کہ حقائق سے بالخصوص معاشی حقائق سے کسی طرح دوچار ہونا نہ پڑے۔ حقیقت کے سامنے مطلق اندھی ہوجاتی مگر محض اس وجہ سے کہ وہ غیر معقول ہوتے ہیں ہم انہیں نظر انداز نہیں کرسکتے 'مسلم قوم' کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے۔ تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد بھی ہوتا' تو بھی حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہوجاتا۔

یہی حال ہندو اور مسلم تمدنوں کے تخیل کا ہے۔ اب تو قومی تمدن کا زمانہ بھی بہت تیزی کے ساتھ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اور پوری دنیا ایک تمدنی وحدت بنتی جارہی ہے۔ قوموں کو یہ حق ہے اور آئندہ بھی ایک عرصہ تک یہ حق رہے گا کہ اپنی خصوصیات کو مثلاً زبان' عادات' اور طریق فکر کو باقی اور محفوظ رکھیں لیکن سائنس اور کلوں کا یہ زمانہ اور تیزی سے سفر کرنے کی سہولتیں' اخبار عالم کا مسلسل ملتا رہنا' ریڈیو اور سینما وغیرہ کی ترقی کی وجہ سے روز بروز دنیا میں یک رنگی پیدا ہوتی جائے گی۔ اس ناگزیر رحجان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا اگر اس کو کوئی روک سکتا ہے تو بس ایک ایسی عالمگیر تباہی جو جدید تہذیب اور تمدن ہی کو تہ و بالا کر دے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو اور مسلم طرز زندگی میں بہت سے روایتی اختلافات موجود ہیں' لیکن یہ اختلافات مشکل ہی سے نظر آسکتے ہیں جب کہ ان دونوں کا مقابلہ زندگی کے متعلق جدید

علمی اور تجارتی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ اسلئے کہ اس آخرالذکر اور اول الذکر دونوں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج موجود ہے۔ آج ہندوستان میں اصل کش مکش ہندو تمدن اور مسلم تمدن کے درمیان نہیں ہے، بلکہ ایک طرف یہ دونوں ہیں۔ اور دوسری طرف تہذیب جدید کا مارچ، علمی و حکمی تمدن۔ جو لوگ مسلم تمدن کا، خواہ اس کا مطلب جو کچھ بھی ہو، تحفظ چاہتے ہیں، انہیں ہندو تمدن کے متعلق فکر کرنے کی بجائے مغرب کے اس دیو کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ذاتی طور پر مجھے تو اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ جدید علمی اور تجارتی تمدن کے مقابلہ کے لئے جتنی بھی کوشش کی جائے گی، خواہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا ہندوؤں کی طرف سے، ان کا حشر ناکامی ہوگا۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں بغیر کسی تأسف کے اس ناکامیابی کا تماشہ خوشی سے دیکھوں گا۔ جس دن ریلیں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں یہاں آئیں۔ ہماری پسند کا فیصلہ تو اسی دن بالکل غیر محسوس طریقہ پر اور بلا کسی خواہش کے ہوگیا تھا۔ سر سید احمد خاں نے بھی ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے اپنی پسند کا فیصلہ اسی دن کر لیا تھا جس دن علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی گئی لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم میں سے کسی کی پسند کا کوئی دخل ہی نہ تھا اگر تھا بھی تو اس کی مثال وہی ہے۔ کہ جب آدمی ڈوبنے لگتا ہے، تو وہ تنکے کا سہارا پکڑتا ہے۔ کہ شاید وہی اس کی جان بچائے۔

لیکن یہ "مسلم تمدن" ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے۔ جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں۔ مجھے نہیں اتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی، یا اسلامی آرٹ کا ذکر کرتا

جو حمل دور ماموں نے ہندی مسلمانوں کے خیالات واحکام پر اثر ڈالا ہے۔ وہ عربی اور بالخصوص ایرانی زبان سے لیکن ایرانی زبان کے اثر میں کوئی تبدیلی عنصر شامل نہیں ایرانی زبان اور بہت سی ایرانی رسوم اور روایات ہزار ہا سال کے عرصہ میں ہندوستان میں آئیں اور پورے شمالی ہند پر اپنا نقش قائم کیا ایران گویا مشرق کا فرانس تھا۔ جو اپنی زبان اور اپنے تمدن کو تمام پردیس کے ملکوں میں پھیلاتا تھا۔ اور یہاں ایک ایسا گراں قدر ورثہ ہے جس میں ہم تمام ہندوستانی برابر کے شریک ہیں۔

مسلم اقوام اور ممالک کے تاریخی کارناموں پر فخر کرنا غالباً ایک بہت ہی مضبوط اسلامی رشتہ سمجھا جاتا ہے لیکن کیا کوئی شخص مختلف اقوام کے عظیم الشان کارناموں پر فخر کرنے سے مسلمانوں کو روکتا ہے۔ جب تک وہ ان کی یاد کو تازہ دکھائیں گے اس وقت تک کوئی شخص انہیں اس سے محروم نہیں کر سکتا۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ تاریخی کارنامے بہت بڑی حد تک ہم سب لوگوں کے لئے بھی ایک مشترکہ ورثہ ہیں۔ اس لئے کہ ایشیائی ہونے کی وجہ سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے درمیان بھی ایک رشتہ ہے۔ جو یورپ کی دست درازیوں کے خلاف ہمیں متحد کرتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جب کبھی میں نے اسپین میں یا صلیبی جنگوں میں عربوں کی لڑائیوں کا ذکر پڑھا ہے تو میری ہمدردی ہمیشہ انہیں کے ساتھ رہی ہے میں کوشش کرتا ہوں کہ جانب داری نہ کروں۔ اور صرف واقعات پر بحث کروں۔ لیکن چاہے جتنی کوشش کروں جہاں ایشیائی لوگوں کا تعلق ہوتا ہے میری ایشیائیت کا اثر میری قوت فیصلہ پر ضرور پڑتا ہے۔

میں نے اسلامی تمدن کا مطلب سمجھنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن میں

تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں صرف ایک مسلمان متوسط طبقہ کے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، جن پر ایرانی زبان اور ایرانی روایات کا اثر ہے۔ اور اگر عوام پر نظر ڈالی جائے تو اسلامی تمدن کی نشانی بظاہر یہ ہے (۱) ایک خاص قسم کا پاجامہ جو نہ زیادہ لمبا ہو اور نہ زیادہ اونچا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کی تراش خراش اور داڑھی کا رکھنا، اور ایک لوٹا جس میں ایک خاص قسم کی ٹونٹی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوؤں میں رواج ہے دھوتی پہنے کا سر پر چوٹیا رکھنے کا اور ذرا مختلف قسم کا زنار رکھنے کا۔ درحقیقت یہ اختلافات بھی زیادہ تر شہری ہیں۔ اور رفتہ رفتہ غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ ورنہ ایک ہندو اور ایک مسلمان کسان اور کاریگر کے درمیان بمشکل ہی سے کوئی تمیز کی جا سکتی ہے۔ مسلمان تعلیم یافتہ شاذ و نادر داڑھی رکھتے ہیں البتہ علی گڑھ والے ابھی تک سرخ ٹوپی کے فریفتہ ہیں (یہ ٹوپی ترکی کہلاتی ہے۔ حالانکہ ترکی کو اب اس سے کوئی سروکار نہیں ہے) مسلمان عورتیں ساری پہننے لگی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ پردے سے بھی نکل رہی ہیں۔ میرا اپنا مذاق ان میں سے بعض عادات اور خصائل سے میل نہیں کھاتا، اور مجھے نہ داڑھی پسند ہے، نہ مونچھیں نہ چوٹیا، لیکن مجھے اس کی بھی خواہش نہیں ہے کہ اپنے مذاق کے اصول و قوانین دوسروں پر عائد کروں۔ جہاں تک داڑھیوں کا تعلق ہے 'امان اللہ خاں نے کابل میں جب سرسری طور پر ان کا صفایا کرنا شروع کیا تو مجھے خوشی ضرور ہوئی تھی۔

ان ہندوؤں اور مسلمانوں کی حالت بھی حد درجہ دردانگیز ہے۔ جو ہمیشہ ماضی کی طرف نظر رکھتے ہیں اور ہمیشہ انہیں چیزوں کو پکڑتے ہیں، جو ان کی گرفت سے نکلتی چلی جا رہی ہیں۔ میں نہ ماضی کو برا کہتا ہوں، نہ اس کو رد کرتا ہوں،

اس لئے کہ ہمارے ماضی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جو حسن و جمال میں یکتا ہیں۔ اور ملا شبہ یہ باقی رہنے والی بھی ہیں۔ لیکن یہ لوگ اس حسن و جمال کو باقی رکھنے کے آرزو مند نہیں ہیں۔ بلکہ ایسی چیزوں کے پیچھے پڑے ہیں جو آئندہ رکھنے کے قابل ہی نہیں، بلکہ مُضر ہیں۔

اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہنچے ہیں۔ اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی، پاش پاش ہوگئے۔ اسلام کے غازی مرد ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کردیا۔ جس کے لئے ہندوستان سنہ ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا۔ بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں۔ جو مذہب سے اس کو دور ہٹائے جاتے ہیں۔ ترکی کے جدید دستور اساسی میں ایک دفعہ تھی کہ ترکی اسلامی ریاست ہے لیکن اس اندیشہ سے کہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہوجائے۔ کمال پاشا نے سنہ ۱۹۲۷ء میں اعلان کیا کہ" دستور اساسی کی یہ دفعہ کہ ترکی ایک اسلامی ریاست ہے محض مصلحتہ کے طور پر داخل کی گئی ہے۔ اور مقصد یہ ہے کہ اولیں موقع ملتے ہی اس کو خارج کردیا جائے گا" میرا خیال ہے کہ جو اتاترک نے کیا تھا اس پر بعد میں اس نے عمل بھی کیا۔ مصر بھی اسی راستے پر جارہا ہے۔ مشابہت زیادہ احتیاط کے ساتھ۔ اور مذہب سے سیاست کو بالکل علیحدہ رکھتا ہے یہی حال عربی ممالک کا ہے۔ سوائے ملک عجم کے جو بہت زیادہ پیچھے ہے ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیاء کے لئے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں غرض ہر جگہ مذہب پس پشت ڈالا جارہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظہور پذیر ہورہی ہے۔ وطنیت کے پیچھے پیچھے اور بہت سے مسلک ہیں جو معاشرتی اور معاشی زبان میں

گویا ہیں۔ ہاں "مسلم قوم" اور "مسلم تمدن" کا کیا ہوگا؟ کیا یہ آئندہ صرف
شمالی ہند میں سرکار دولتمدار برطانیہ کے زیر سایہ پھلے پھولے گا؟
اگر ترقی کے معنی یہی ہیں، کہ سیاست میں وسعت نظر سے کام
لیا جائے۔ تو آخر میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمارے فرقہ پرستوں نے، اور
حکومت نے جاں توجہ کرا دو متواتر اس کے بالمقابل تنگ نظری کو اپنا
مقصود نظر قرار دیا ہے۔

(۵۷)
تعطل

دوبارہ گرفتاری اور سزایابی کا امکان مجھے برابر پریشان کرتا رہا۔ یہ امکان اس لئے اور بھی قوی تھا کہ ملک پر آرڈی ننس اور اسی نوع کے دیگر قوانین کا راج تھا۔ اور خود کانگریس ایک خلاف قانون جماعت قرار دی جا چکی تھی۔ برطانوی حکومت کی آئینی ساخت اور اپنی طبیعت کو دیکھتے ہوئے میری گرفتاری ناگزیر معلوم ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں کوئی کام اطمینان کے ساتھ ختم نہیں کر سکتا تھا۔ یہی فکر تھی، کہ جتنا زیادہ کام ہوسکے جلد نبٹا دیا جائے۔

پھر بھی میں خواہ مخواہ کی گرفتاری مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اور حتی الوسع ایسی کارروائیوں سے احتیاط کرتا تھا جن سے میری گرفتاری عمل میں آئے۔ اپنے صوبہ کے اکثر مقامات سے اور باہر سے بھی بہت سی دعوتیں آئیں، کہ میں دورہ پر نکلوں لیکن میں نے ان سب کو مسترد کر دیا۔ اس لئے کہ تقریر کرنے کی غرض سے اس قسم کا دورہ ایک اندھا دھند دھاوے کی صورت اختیار کر لیتا، جو یقین تھا، کہ بیچ ہی سے یکایک ختم کر دیا جائے گا۔ مگر میرے لئے کوئی اور درمیانی راستہ بھی نہ تھا۔ میں جب کبھی کسی دوسرے کام سے مثلاً گاندھی جی سے اور اراکین ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کرنے کہیں باہر گیا تو میں نے عام جلسوں میں نہایت آزادی سے تقریریں کیں۔ جبل پور میں

ایک بڑا جلسہ ہوا اور نہایت شاندار جلوس نکلا اور دہلی کا احتجاج تو ان
بڑے سے بڑے مجمعوں کے مقابلہ کا تھا جو میں نے وہاں دیکھے ہیں اور فی الحقیقت
ان جلسوں کی کامیابی ہی سے یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ حکومت بار بار
اس قسم کے جلسوں کا انعقاد گوارا نہ کرے گی۔ بلکہ دہلی میں تو جلسہ کے بعد ہی
میری گرفتاری کی افواہ بہت گرم تھی۔ لیکن بچ گیا۔ اور الہ آباد واپس چلا آیا
البتہ راستہ میں مسلم یونیورسٹی کے طلباء کے سامنے تقریر کرنے کے
لئے علی گڑھ بھی اتر گیا۔

جب حکومت یوں ہر قسم کے مفید سیاسی کاموں کو روکنے کی
کوشش کر رہی ہو، تو اس وقت غیر سیاسی پبلک کاموں میں حصہ
لینے کا خیال مجھے بہت برا لگتا تھا۔ میں نے کانگریسیوں میں شدت کے
ساتھ یہ میلان دیکھا کہ کانگریس کے کام سے جان بچا کر ایسے اسٹ منٹ
کاموں میں لگتے جا رہے تھے۔ جو اگرچہ بجائے خود پسندیدہ سہی مگر ہماری
جدوجہد سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ میلان طبعاً قدرتی تھا لیکن میں
نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کو تقویت نہ دینا چاہیئے۔

وسط اکتوبر ۱۹۳۳ء میں صورت حال پر غور کرنے اور آئندہ کے لئے
... کار کا فیصلہ کرنے کی غرض سے ہم لوگوں نے صوبہ متحدہ کے کارکنان
... یس کے جلسے الہ آباد میں منعقد کئے صوبہ کانگریس کمیٹی ایک غیر قانونی
... ت تھی اور ہم لوگوں کا منشا صرف مشاورت کرنا تھا، نہ کہ قانون کی
... ف ورزی کرنا۔ اس لئے ہم نے اس کمیٹی کو باقاعدہ طلب بھی نہیں کیا
... نے صرف ان تمام اراکین کمیٹی کو جو جیل سے باہر تھے پرائیویٹ اور منتخب
... ں کو ایک غیر رسمی جلسہ میں مدعو کر لیا تھا۔ یہ جلسے بالکل نجی تھے مگر ان کے

متعلق کوئی کاروائی بھی نہیں کی گئی تھی چنانچہ آخر وقت تک ہم لوگوں کی زیادہ توجہ واقعات عالم پر مبذول رہی۔ مثلاً شدید کساد بازاری جرمنی میں نازی تحریک اور کمیونزم وغیرہ وغیرہ ہم چاہتے تھے کہ ہمارے ساتھی ہندوستان کی جد و جہد کا مطالعہ ان واقعات کے تعلق سے کریں جو دیگر ممالک میں پیش آ رہے ہیں۔ ناگور کانفرس نے ایک اشتراکی قرارداد منظور کی جس میں ہمارے نصب العین کی توضیح اور تعریف کی گئی تھی۔ اور یہ اعلان کیا کہ کانفرس سول نافرمانی بند کر دینے کی مخالف ہے ہم میں سے ہر شخص یہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وسیع پیمانہ پر سول نافرمانی کرنے کا اس وقت کوئی امکان نہیں۔ بلکہ انفرادی سول نافرمانی بھی یا تو بہت جلد ختم ہو جائے گی یا بہت ہی محدود پیمانے پر جاری رہے گی۔ لیکن جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے۔ سول نافرمانی جاری رکھنے سے کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس لئے کہ حکومت کی طرف سے حملے اور قوانین آرڈی ننس کا نفاذ برابر جاری تھا۔ چنانچہ اور کسی غرض سے نہیں، صرف اپنی طرز عمل کو ظاہر کرنے کی خاطر ہم نے رسمی طور پر سول نافرمانی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم نے اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ اپنے کسی کام کو چھوڑ کر گرفتار ہونے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ اپنا معمولی کام کئے جائیں۔ اور اگر اس سلسلہ میں گرفتار ہو جائیں۔ تو خندہ پیشانی سے اس کو قبول کر لیں۔ انہیں خصوصیت کے ساتھ یہ ہدایت البتہ کی گئی کہ دیہاتی علاقوں سے اپنے تعلقات اور واسطہ دوبارہ قائم کریں۔ اور یہ معلوم کریں کہ تخفیف لگان اور حکومت کے تشدد سے کسانوں کا حال کیسا ہے۔ اس وقت عدم ادائیگی لگان کی تحریک کوئی سوال نہ تھا یہ تحریک تو پونا کانفرس کے بعد ہی باقاعدہ روک

دی گئی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت حالات ایسے سے تھے، کہ اس کو دوبارہ شروع کیا جاتا۔

یہ پروگرام بہت ہی بے ضرر اور مہم قسم کا تھا۔ اور اس میں بظاہر کوئی بات ایسی خلاف قانون بھی نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہم جانتے تھے، کہ اس کی وجہ سے بھی گرفتاریاں کی جائیں گی۔ چنانچہ جوں ہی ہمارے کارکن دیہاتوں میں گئے، ان کو گرفتار کر کے یہ الزام بالکل غلط طور پر لگایا گیا، کہ وہ عدم ادائیگی لگان کا پرچار کرتے ہیں (جو آرڈی ننس کے مطابق جرم قرار دیا گیا تھا) اور وہ سزایاب ہوئے۔ بہت سے رفقاء کار کی گرفتاری کے بعد میرا مقصد بھی دیہاتی علاقوں میں جانے کا تھا۔ لیکن بعض اور کاموں میں لگ گیا۔ اور مجھے اپنا دورہ ملتوی کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ اس کا وقت ہی نکل گیا۔

ان چند مہینوں کے دوران میں دو مرتبہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین پورے ہندوستان کی صورت حال پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ خود کمیٹی کا تو کوئی وجود نہ تھا۔ اور یہ اس لئے کہ وہ ایک خلاف قانون جماعت تھی، بلکہ اس لئے کہ گاندھی جی کے ایما سے پونا کے فیصلہ کے بعد تمام کانگریس کمیٹیاں اور ان کے دفاتر بند کر دئے گئے تھے۔ میری حیثیت بھی اس وقت سے کچھ عجیب ہو گئی تھی اس لئے کہ جیل سے نکلنے کے بعد میں نے خود کو دلیے ادیر یہ پابندی عائد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے آپ کو کانگریس کا جنرل سکریٹری کہنے پر مصر تھا لیکن اپنے فرائض منصبی صرف ہوائی طور پر ادا کر سکتا تھا نہ تو کوئی دفتر تھا نہ عملہ قائم مقام صدر گاندھی جی صلاح و مشورہ کیلئے ضرور موجود تھے، مگر وہ سارے ملک کا ایک

عظیم الشان دورہ کرنے میں مشغول تھے - اور اس مرتبہ ان کا یہ دورہ برکی تحریک کے لئے تھا - اس دورہ میں بھی ہم لوگوں نے کسی نہ کسی طرح جبل پور اور دہلی جاکر انہیں پکڑا - اور ان کے ساتھ ورکنگ کمیٹی کے اراکین سے صلاح و مشورہ کیا ان ملاقاتوں میں مختلف اراکین کا اختلاف رائے بھی بہت صاف صاف ظاہر ہوگیا - اور ایک تعطل سا پیدا ہوگیا - کوئی ایسی سبیل نہیں نکلتی تھی جو سب کے لئے قابل قبول ہوتی - جو لوگ سول نافرمانی بند کرنا چاہتے تھے - اور جو اس کے مخالف تھے - ان دونوں کے درمیان فیصلہ کن ذات بس گاندھی جی کی تھی اور چونکہ وہ اس وقت آخرالذکر گروہ کی رائے سے متفق تھے اس لئے معاملات جس طرح تھے - بدستور جاری رہے -

مجالس واضع قانون کے انتخابات میں کانگریس کی طرف سے مقابلہ کرنے کے مسئلہ پر کارکنان کانگریس میں کبھی کبھی بحثیں ہوا کرتی تھیں - مگر ورکنگ کمیٹی کے اراکین کو اس وقت اس مسئلہ سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ سوال اس وقت کسی طرح پیدا بھی نہیں ہوتا تھا مگر اس وقت اس مسئلہ پر بحث کرنا بدیہی طور پر قبل از وقت تھا - اصلاحات کا نفاذ کم از کم آئندہ دو تین سال تک ہوتا نظر نہیں آتا تھا - اور نہ اسوقت اسمبلی کے لئے جدید انتخاب کا کوئی تذکرہ تھا - ذاتی طور پر الکشن لڑنے کے خلاف مجھے کوئی اصولی اعتراض نہ تھا اور مجھے اس امر کا پورا یقین تھا کہ جب وقت آئیگا تو کانگریس کو حصہ لینا ہی پڑیگا - لیکن اس وقت اس سوال کو پیدا کرنے کے معنی یہ تھے کہ توجہ دوسری طرف ہو جائے - میرا خیال یہ تھا کہ اگر ہم اپنی جد و جہد جاری رکھیں تو جو مسائل درپیش ہیں وہ صاف اور واضح ہو جائیں گے اور اپنے اصولوں کو چھوڑ کر سمجھوتہ کرنے والے لوگوں کو موافقت

سرحادی ہونے سے روکا جاسکے گا۔

اس دوران میں برابر میں مضامین اور بیانات اخبارات کو بھیجتا رہا۔ کسی حد تک مجھے اپنی تحریروں کو نرم اور ملائم بنانا پڑا۔ اس لئے کہ وہ اشاعت کی غرض سے لکھی گئی تھیں، اور ادھر سنسر صاحب موجود تھے اور مختلف لسٹے قوانین تھے جن کی گرفت octopus کے پنجوں کی طرح بہت دور تک پہنچتی تھی۔ اور میں اگر ان خطرات میں پڑنے کے لئے تیار بھی ہوتا تو طابع اور ناشر اور مدیر اس کے لئے آمادہ نہ تھے۔ بہر حال مجموعی حیثیت سے اخبارات نے مجھ پر عنایت کی، اور بہت سی باتیں میری تائید میں لکھیں لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات میرے بیانات اور مضامین کے حصے کے حصے حذف کردیئے جاتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو میرا ایک پورا اور طویل مضمون جس کو میں نے بڑی محنت سے لکھا تھا شائع ہی نہیں ہوا۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں جب میں کلکتہ میں تھا، تو ایک مقتدر روزنامہ کے مدیر صاحب مجھ سے ملنے تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے آپ کا ایک بیان کلکتہ کے جملہ اخبارات کے مدیر خصوصی کے پاس استصواب رائے کے لئے بھیجا تھا۔ اور چونکہ انہوں نے اس کو مسترد فرمادیا۔ اس لئے وہ شائع نہیں کیا گیا یہ مدیر خصوصی" کلکتہ گورنمنٹ پریس کے سنسر صاحب تھے۔

میں نے اپنے بعض بیانات میں اور اخبارات کے نمائندوں سے گفتگو کے دوران میں چند افراد اور جماعتوں پر نکتہ چینی کی تھی اس پر اظہار ناراضگی کیا گیا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی، کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا اور گاندھی جی نے بھی اس خیال کو ابتداء میں مدد دی تھی یہ کہ کانگریس

بلاخوف انتقام ہر طرح کے حملے کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ خود گاندھی جی نے اس کی ایک مثال قائم کر دی تھی۔ اور بعض سربرآوردہ کانگریسی بھی حسب مراتب ان کا اتباع کیا کرتے تھے، اگرچہ سب نہیں۔ وجہ یہ تھی، کہ کانگریسی ہم لوگ مبہم اور ذو معنی باتیں کیا کرتے تھے۔ جس سے ہمارے نکتہ چینوں کو موقع ملتا تھا کہ غلط استدلال اور موقع پرستی کی چال بازیوں سے ہماری باتوں کو لے اڑیں اور پھر دونوں طرف سے اصل مسائل پر بحث کرنے سے گریز کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے بحث و مباحثے خود بات داری سے کئے جائیں۔ اور جن میں موقع بموقع وار اور بچاؤ کی نوبت بھی آئے شاذ و نادر ہی ہوتے تھے۔ جیسے کہ ان مغربی ممالک میں ہوا کرتے تھے جہاں تحریکِ "آشرم" رائج نہیں ہوئی ہے۔

ایک خاتون دوست نے جن کی رائے کی میں قدر کرتا ہوں، مجھے لکھا تھا کہ اخبارات میں تمہارے بعض مضامین کا زور دیکھ کر مجھے ذرا تعجب سا ہوا، کہ تم تو بالکل کٹ کھنے ہوتے جاتے ہو۔ میں نے سوچا کہ کیا یہ کیفیت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ مجھے مایوسیاں ہوئی ہیں۔ شاید کسی حد تک تو یہ بات صحیح ہے اس لئے کہ قومی حیثیت سے تو ہم سب ہی لوگ مایوسی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اور انفرادی طور پر بھی میرے نزدیک یہ بات صحیح ہو گی لیکن خود مجھے اس کا پورا پورا احساس نہ تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ ذاتی طور پر مجھے اپنی ناکامی یا درماندگی کا مطلق کوئی خیال ہی نہیں پیدا ہوا۔ سیاسی حیثیت سے گاندھی جی کا میرا ساتھ جب سے ہوا ہے میں نے کم از کم ایک بات ان سے ضرور سیکھی ہے، کہ نتائج کے ڈر سے اپنے خیالات کو اپنے دل میں دبائے نہ رکھوں، سیاسی میدان میں اس عادت سے دوسرے میدانوں

میں توکم ازکم اس پر عمل کرنا زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں مجھے بسا اوقات بڑی مشکلوں
کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن ساتھ ہی اس سے بڑا اطمینان بھی ملا ہے اور میرا خیال ہے
کہ اسی عادت کی بدولت ہم میں سے اکثر لوگ بہت تکلیف اور رنج سے اور بہت قسم
کی مایوسیوں سے بچ گئے ہیں، یہ معلوم کرکے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کسی سے
محبت کرتی ہے بڑا تسکین بخش اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور احساس شکست اور
مایوسی کے مرض کے لئے یہ بڑا تریاق بھی ہے میرے خیال میں سب سے زیادہ تکلیف
دہ احساس انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے، اور سبھوں نے اس کو
فراموش کردیا ہے۔

اس سب کے باوجود انسان کو اس رنج و غم کی عجیب و غریب دنیا میں
کھلا احساس مایوسی سے کس طرح مفر ہو سکتا ہے۔ بارہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر
کام غلط ہو رہا ہے اور اگرچہ کام جیسے تیسے جاری رہتا ہے پھر بھی جب ہم اپنے اردگرد
کی انسانی خلقت کے حقائق پر نظر ڈالتے ہیں، تو طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے
ہیں بسا اوقات مختلف واقعات اور حالات پر بلکہ اشخاص اور جماعتوں پر بھی غصہ
اور غم کے جذبات مجھ پر طاری ہوتے ہیں اور اب کچھ عرصہ سے تو میرا غصہ اور بھی
زیادہ بڑھتی جاتی ہے جب میں زندگی کے متعلق لوگوں کے آرام طلب طرز عمل
دیکھتا ہوں نیز یہ کہ کس طرح اہم ترین امور نے ختم پوشی کی جاتی ہے بلکہ ان کا ذکر
اس لئے نامناسب خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا اثر یا لوگوں کی حیثیت پر پڑتا ہے
رغوب خاطر تعصبات پر لیکن باوجود ان غصہ اور برہمی کے اور باوجود مایوسیوں
اور اپنے "کٹ کھنے" ہونے کے اپنے متعلق مجھے یہ حس طرح ضرور ہے کہ خود
اور دوسروں کی حماقتوں پر ہنسنے اور قہقہے لگانے کی بنیادی قابلیت مجھ
سے مفقود نہیں ہوئی ہے۔

ایک رحیم و کریم خدا پر لوگوں کا ایمان دیکھ کر مجھے بعض اوقات بہت
تعجب ہوتا ہے کہ پیہم دھچکوں کے بعد بھی یہ کس طرح قائم رہتا ہے اور کس طرح
جو ناکامیاں اور بربادیاں اور ایسی باتیں جن سے صفت رحیمی کا بطلان ہو [illegible]
ایمان اور اعتقاد کی پختگی جانچنے کے لئے بس آزمائشیں سمجھی جاتی ہیں، حررڈبا۔
یکلس کے ان سحر انگیز اشعار کی صدائے بازگشت اکثر قلوب محسوس کرتے ہوں گے۔

"اے میرے مولا! اگر میں تیرے ساتھ تکرار کرتا ہوں تو حق تیری طرف
ہے، لیکن جس بات کے لئے میں لڑتا ہوں وہ بھی تو حق بجانب ہے!
آخر تیرے گنہگار بندوں کے طور طریقے اس دنیا میں کیوں کامیاب
ہوتے ہیں۔ اور میری تمام سعی اور کوششیں مایوسی اور ناکامی پر
کیوں ختم ہو جاتی ہیں تو جو میرا دم ساز ہے اگر تو بھی میرا دشمن ہوتا تو
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تو اس سے زیادہ اور کونسی برائی میرے
ساتھ کرتا جو تو مجھے شکست دینے اور کامیابی سے روکنے کے لئے کرتا ہے!
افسوس! کہ شراب میں مدہوش رہنے والے اور ہوا و ہوس کے بدمست
بندے فارغ اوقات میں زیادہ جوش اور اطمینان سے رہتے ہیں جتنا
کہ یہ عاجز بندہ جو تیری راہ میں اپنی ساری عمر گنوا رہا ہے۔"

اعتقاد خواہ ترقی پر ہو، خواہ کسی تحریک اور نصب العین پر یا انسان کی نیکی
اور انسانی تقدیر پر، کیا یہ سب قریب قریب اعتقاد الٰہی سے ملتے جلتے نہیں ہیں؟ اگر ہم
ان کی توجیہ عقل سے اور منطق سے کرنا چاہیں تو فوراً مشکلات میں گرفتار ہو جاتے
ہیں، لیکن ہمارے سینوں میں کوئی چیز ہے جو اس اعتقاد اور آس کو پکڑے رہتی
ہے ورنہ اگر زندگی اس سے بھی محروم کر دی جائے تو پھر وہ ایک ایسے دشت ویران
کے مانند ہو جائے جس میں کوئی نخلستان تک نہ ہو۔

میرے اشتراکی پروپیگنڈے کا جو اثر ہوا اس سے میرے ورکنگ کمیٹی کے رفقائے کار بھی گھبرا گئے۔ میں تو کئی سال سے یہ پروپیگنڈا کر رہا تھا اور اب تک جس طرح وہ سہاتے رہے آئندہ بھی غالباً بلا کسی شکایت کے وہ سہاتے رہتے لیکن اب میں نے کسی حد تک ملک کے سرمایہ داروں کو خوف زدہ کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے میری کارروائیوں کو اب اور زیادہ عرصہ تک بے ضرر نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ میرے کچھ ساتھی اشتراکی نہیں ہیں لیکن میرا یہ ہمیشہ سے خیال تھا کہ کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے بھی مجھے پوری آزادی حاصل ہے کہ کانگریس کو کسی طرح پابند کئے بغیر اشتراکی پروپیگنڈا جاری رکھ سکتا ہوں اس لئے مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ بعض اراکین ورکنگ کمیٹی کی رائے میں مجھے یہ آزادی حاصل نہ تھی اور وہ برہم تھے کہ میں ان کے متعلق بھی غلط فہمی پیدا کر رہا ہوں لیکن میں اس کے علاوہ اور کیا کرتا تو میں اس چیز کو ترک نہیں کر سکتا تھا جس کو میں اپنے کام کا سب سے زیادہ اہم جزو سمجھتا تھا بلکہ اگر ان دونوں میں کوئی تصادم ہوتا تو میں شاید یہ گوارا کرتا کہ ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو جاؤں۔ لیکن میں استعفیٰ کیسے دیتا جب کہ ورکنگ کمیٹی خلاف قانون جماعت تھی اور باقاعدہ طور پر اپنے فرائض منصبی تک ادا نہیں کر تی تھی

یہی دشواری ایک بار پھر بعد میں پیش آئی۔ غالباً دسمبر کا یہ آخری زمانہ تھا جب گاندھی جی نے مجھے مدراس سے خط لکھا۔ اور اخبار "مدراس میل" کا ایک تراشہ بھیجا جس میں ان کی وہ گفتگو نقل کی گئی تھی جو اخبار مذکور کے نمائندے سے انھوں نے کی تھی۔ نمائندے نے میرے متعلق ان سے دریافت کیا تھا اور انھوں نے جواب میں میری کارروائیوں کے متعلق تو بے اظہار افسوس کیا تھا لیکن میری دیانتداری کے متعلق اپنا پورا اعتماد ظاہر کیا تھا کہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کانگریس کو

ان جدید طریقوں کا پاسدار نہیں۔ میرے متعلق جو کچھ انھوں نے کہا اس پر حضوت کے ساتھ مجھے کوئی گلہ نہیں مگر لیکن جس بات نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا وہ یہ تھی کہ اس گفتگو کے دوران میں آگے چل کر گاندھی جی نے بڑی بڑی زمینداریوں کے نظام کی حمایت کی تھی ان کے خیال معلوم ہوتا تھا کہ یہ نظام ہماری دیہی اور قومی معیشت کا ایک مفید حصہ ہے مجھے اس سے سخت حیرت ہوئی اس لئے کہ آج کل بڑی زمینداریوں اور تعلقداروں کے حامی بہت کم ملیں گے؛ دنیا بھر میں ان کا خاتمہ ہوچکا ہے اور ہندوستان میں بھی اکثر لوگ یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ زیادہ عرصے تک یہ باقی نہیں رہ سکتی خود زمیندار اور تعلقدار خوش ہوں گے اگر یہ نظام ختم کردیا جائے بشرطیکہ انہیں اس کا معقول معاوضہ ملے؛[1]

واقعہ یہ ہے کہ یہ نظام خود اپنے ہی بوجھ سے دب کر ڈوب رہا ہے پھر بھی گاندھی جی اس کے حامی ہیں اور اس کی تولیت وغیرہ کے متعلق گفتگو کرتے رہتے ہیں! میں نے

---

[1] مسٹر پی، ان ٹیگور صدر مجلس استقبالیہ آل بنگال زمیندار کانفرنس نے اپنے خطبہ صدارت میں ۲۳ دسمبر ۱۹۳۳ء کو کہا تھا کہ ذاتی طور پر مجھے اس دن بالکل افسوس نہ ہوگا جب زمینداروں کو مناسب معاوضہ دے کر جائدادیں قومی ملک بنالی جائیں جیسا کہ آئرستان میں کیا گیا تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بندوبست استمراری کی وجہ سے بنگال کے زمیندار دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں جہاں بندوبست استمراری نہیں ہے زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ لیکن مسٹر پی، این ٹیگور کے خیالات زمینوں کو قومی ملکیت بنانے کے متعلق بہت مبہم معلوم ہوتے ہیں۔

پھراس بات پر غور کیا کہ ان کا طمع نظر مجھ سے کس حد تک مختلف ہے اور اس فکر میں پڑ گیا کہ آئندہ کہاں تک میرا اور ان کا اشتراک عمل ہو سکے گا کیا ورکنگ کمیٹی میں میرا برابر دستور ضروری ہے؟ اس وقت تو اس کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا اور چند ہفتہ بعد میرے جیل میں واپس جانے کی وجہ سے یہ سوال ہی بے محل ہو گیا۔

خانگی معاملات نے میرا بہت سا وقت برباد کیا والدہ کی صحت رو بہ ترقی رہی مگر بہت آہستہ آہستہ وہ اب بھی صاحب فراش تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ میں اپنے مالی معاملات کی طرف متوجہ ہوا جو ایک عرصہ سے بالکل ابتری میں پس پشت پڑے ہوئے تھے۔ ہم لوگ اپنی استطاعت سے بہت زیادہ خرچ کرتے چلے جا رہے تھے اور اخراجات کم کرنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی کہ اخراجات آمدنی کے مطابق ہو جائیں۔ بلکہ میں تو خوشی کے ساتھ اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب میرے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ جدید دنیا میں روپیہ پیسہ اور املاک مفید ضرور ہیں لیکن اکثر اوقات اس شخص کے لئے جو ایک طول طویل سفر کی ٹھان رہا ہو یہ بار بھی بن جاتے ہیں۔ روپے پیسے والے لوگوں کے لئے ایسے کاموں میں حصہ لینا بہت مشکل ہو جاتا ہے جن میں خطرات ہوں انھیں ہمیشہ اپنے مال و اسباب کے ضائع ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے، ایسے زر و مال اور جائداد سے فائدہ ہی کیا حکومت جب چاہے اس پر قبضہ کر لے اور زبردستی اسے بحق سرکار ضبط کر لے! اس لئے جو کچھ تھوڑا بہت میرے پاس ہے اس سے گویا میں چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہم لوگوں کی ضرورتیں بہت تھوڑی تھیں اور مجھے اپنا اعتماد

تھا کہ میں اپنی قابلیت سے اتنا کما سکتا ہوں مجھے صرف اتنی فکر تھی کہ والدہ
کو اخیر عمر میں کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے اور ان کے معیار زندگی میں
کوئی نمایاں فرق نہ ہونے پائے۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ میری لڑکی کی تعلیم میں
جس کے لئے یورپ کا قیام میرے خیال کے بموجب ضروری تھا، کوئی
رکاوٹ نہ پیدا ہو، اس کے علاوہ روپیہ کی کوئی خاص ضرورت نہ مجھے
تھی نہ میری بیوی کو، یا یوں کہا جائے کہ ایسا ہم لوگوں کا خیال تھا اس
لئے کہ صحیح معنوں میں کبھی روپے پیسے کی تکلیف اٹھانے کے ہم لوگ عادی
نہیں رہے تھے، چنانچہ مجھے یقین ہے کہ جب وہ وقت آجائے گا کہ ہم کو
روپے کی قلت محسوس ہو تو ہم اس سے خوش نہ ہوں گے۔ اور
ایک اسراف جس کو میں نے ابھی تک جاری رکھا ہے اس کو ترک
کرنا میرے لئے بہت مشکل ہو جائے گا اور یہ کتابوں کی خریداری ہے۔

اپنی مالی حالت پوری طور پر درست کرنے کی غرض سے یہ فیصلہ
کیا گیا کہ بیوی کے زیورات، چاندی کی یا اسی قسم کی اور چیزیں جو
ہمارے پاس تھیں اور اس کے علاوہ کئی سیکڑوں طرح مختلف قسم کا
سامان گرہستی فروخت کر دیا جائے۔ زیورات علیٰحدہ کر دینے کی تجویز کملا کو
پسند تھی حالانکہ گذشتہ دس بارہ سال سے اس نے ایک زیور بھی
نہیں پہنا تھا، سب بنک میں رکھے ہوئے تھے، لیکن اس کی یہ آرزو
تھی کہ یہ سب اپنی بیٹی کے حوالے کر دے۔

یہ جنوری سنہ ۳۲ء کا زمانہ تھا ضلع الہ آباد کے دیہاتوں میں ہمارے
کارکنوں کے بے ضرر مشاغل کے باوجود ان کی مسلسل گرفتاریوں کا
تقاضا یہ تھا کہ ہم لوگ بھی ان کے نقش قدم پر جائیں اور انھیں دیہاتو

کا دورہ کریں۔ صوبہ متحدہ کی صوبہ کانگریس کمیٹی کے بہت ہی کام کرنے والے سکریٹری رفیع احمد قدوائی بھی جیل میں تھے، ۲۶ جنوری کو یوم آزادی بھی قریب آرہا تھا، اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا؛ اس لئے کہ باوجود آرڈی نینس اور امتناعی احکام کے ۱۹۳۰ء سے یہ دن ہر سال پابندی کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں منایا گیا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس معاملہ میں رہنمائی کون کرے! اور پھر یہ کہ لوگوں کو ہدایت کس بات کی دی جائے، میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا جو آل انڈیا کانگریس کے عہدہ دار کی حیثیت سے عمل سبھی نظری طور پر بھی یہ فرض ادا کر رہا ہو۔ میں نے چند احباب سے مشورہ کیا اور تقریباً سب اس بات پر متفق تھے کہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہئے، لیکن کیا کیا جائے، اس پر اتفاق نہ تھا۔ عام رجحان خیال میں نے یہ دیکھا کہ ایسی کارروائیوں سے اجتناب کیا جائے جن کی وجہ سے وسیع پیمانہ پر گرفتاریاں عمل میں آئیں؛ بالآخر یوم آزادی منانے کے متعلق میں نے ایک مختصر اپیل شائع کی اور یہ معاملہ کہ کس صورت سے یہ دن منایا جائے۔ مقامی طور پر ہر علاقہ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا۔ خود الٰہ آباد میں ہم لوگوں نے تمام ضلع میں وسیع پیمانہ پر یوم آزادی منانے کا اہتمام کیا۔

ہم لوگوں کا خیال تھا کہ جشن یوم آزادی کے منتظمین اس دن گرفتار ہوجائیں گے۔ اس لئے قبل اس کے کہ میں جیل جانہ واپس جاؤں، میں بنگال کا ایک دورہ کرنا چاہتا تھا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اپنے قدیم رفقائے کار سے وہاں ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن اصل غرض یہ تھی کہ گذشتہ چند سال سے

اہلِ بنگال جو مصائب برداشت کر رہے ہیں اس کی داد دی جائے اور
اس طریقے سے اعتراف کیا جائے۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی اعانت
اور مدد کے لئے میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے اور محض اظہار ہمدردی اور
شرکت غم سے کچھ بہت فائدہ نہیں پہنچتا تاہم یہ بھی غنیمت ہے اور اس وقت
بنگال خصوصیت کے ساتھ اپنی کس مپرسی کو محسوس کر رہا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ
مصیبت کے وقت میں پورے ہندوستان نے اسے فراموش کر دیا۔ ان کا
یہ خیال صحیح تو نہ تھا مگر بہرحال وہ سمجھتے یہی تھے۔

مجھے کملا کے ساتھ کلکتہ اس لئے بھی جانا تھا کہ وہاں اس کے علاج کے متعلق
ڈاکٹروں سے مشورہ کروں۔ اس کی حالت کسی طرح بھی قابل اطمینان نہ تھی
لیکن ہم دونوں نے ایک حد تک اس کی کوئی پرواہ نہ کی تھی۔ اسے کلکتہ
یا کسی دوسری ایسی جگہ جانے کا خیال ملتوی کر رکھا تھا کہ جہاں زیادہ مدت
تک علاج کے لئے ٹھہرنا پڑے۔ جیل خانہ کے باہر میری تھوڑے دنوں کی رہائی
کے زمانہ میں ہم دونوں چاہتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کے ساتھ
رہیں۔ پھر جب میں جیل خانہ چلا جاؤں گا تو ڈاکٹروں سے مشورہ اور علاج
کے لئے اس کو بہت کافی وقت ملے گا۔ اور اب چونکہ گرفتاری کا وقت ظاہر
قریب آ گیا تھا اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کلکتہ جا کر اپنی موجودگی میں کم از کم
ڈاکٹروں کو دکھلا دیا جائے باقی بعد میں ہوتا رہے گا۔

چنانچہ میں نے اور کملا نے ۱۵ جنوری کو کلکتہ جانا طے کیا اور یہ ارادہ تھا
ٹھیک وقت پر واپس آ جائیں کہ یوم آزادی کے جلسوں میں شریک ہو سکیں۔

زلزلہ

۵ار جنوری ۱۹۳۴ء کو سہ پہر کے وقت میں الہ آباد میں اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑا کسانوں کی ایک جماعت سے باتیں کر رہا تھا۔ سالانہ ماگھ میلہ شروع ہو چکا تھا اور دن بھر ہمارے یہاں ملنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ دفعتاً میرے پیر لڑکھڑانے لگے۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا اور قریب کے ایک کھمبے کا سہارا لینا پڑا۔ جا بجا کھڑکے کواڑ دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔ سوراج بھون قریب ہی تھا وہاں سے ایک گڑگڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی اس لئے کہ بہت سے کھپریل لڑھک لڑھک کر چھت سے نیچے گر رہے تھے۔ مجھے زلزلہ سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا اس لئے پہلے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر پھر فوراً یہی خیال آیا کہ یہ زلزلہ ہے مجھے اس نئے تجربے میں ایک طرح کا لطف آ رہا تھا۔ میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا اور کسانوں کو زلزلہ کا حال بتانے لگا۔ میری بوڑھی چچی کچھ دور سے چلائیں کہ بھاگ کر باہر چلے جاؤ مگر مجھے یہ بات مہمل معلوم ہوئی۔ میں نے زلزلے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اپنی بوڑھی ماں کو جو کوٹھے پر بستر علالت پر پڑی ہوئی تھیں اور اپنی بیوی کو جو علالت ہی میں سامان سفر باندھ رہی تھی چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی فکر کرتا۔ کچھ در تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا پھر ختم ہو گیا۔ چند منٹ زلزلہ کے موضوع پر گفتگو رہی اس کے بعد قریب قریب سب سے بھول گئے۔ اس وقت ہمیں اس کا گمان بھی نہ تھا کہ ان چند لمحوں میں بہار اور دوسرے مقامات میں لاکھوں آدمیوں پر کیا کچھ گذر گئی۔

اسی دن شام کو میں اور کملا کلکتہ روانہ ہو گئے۔ رات کو ہم نے سحری کی حالت میں

قانون کی قدر و قیمت مجھے مشکوک نظر آتی ہے جو سلطنتیں اور حکومتیں رعایا پر نافذ کرتی ہیں بعض اوقات اس کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ قانون کے معنی ہیں غالب طبقہ کی مرضی اور نظم نتیجہ ہے اس عام خوف کا جو سب پر طاری ہے۔ سچ پوچھئے تو بعض اوقات اس نام نہاد نظم و آئین کو بے نظمی اور بے آئینی کہا زیادہ صحیح ہے جس کا دار و مدار کی بنیاد عام خوف و دہشت پر ہو اس کو ذرا مشکل سے پسندیدہ کہا جا سکتا ہے اور جو اس حکومت کے آلات جبر پر مبنی ہو اور بغیر ان کے قائم نہ رہ سکتا ہو وہ مقابلۃً آئینی حکومت کے وحشی تسلط سے زیادہ شاندار ہے۔

راج ترنگنی ایک ہزار سال کی پرانی اور کلہاں شاعر کی لکھی ہوئی راجتری تاریخی نظم ہے۔ اس میں جو الفاظ نظم و قانون کے معنی میں بار بار آتے ہیں جن کا قائم رکھنا حکمران اور حکومت کا فرض قرار دیا گیا ہے وہ دھرم اور انصاف ہیں یعنی راست بازی اور بے خوفی یہاں قانون محض قانون سے برتر چیز ہے اور نظم رعایا کی بے خوفی کا نام ہے لوگوں کو خوف زدہ کر کے نظم قائم کرنے کے بجائے بے خوفی کی تلقین کرنے کا خیال کیا گیا ہے۔

کلکتے میں ہم لوگوں کے ساڑھے تین دن صرف ہوئے اور اس عرصے میں میں نے تین عام جلسوں میں تقریریں کیں پہلے کی طرح اب مرتبہ بھی میں نے تحریک کی مذمت کی اور اس کے جواب دلائل پیش کیے۔ اس کے بعد ان تدابیر کی جو صوبہ بنگال میں حکومت نے اختیار کی تھیں۔ میں نے بڑے جوش میں تقریر کی کیونکہ اس صوبے میں جو واقعات پیش آ چکے تھے ان کے حالات سن کر میں بہت متاثر تھا مجھے اس طرز عمل سے حد درجہ تعجب ہوئی کہ انسانوں کے گروہ کے گروہ بلاتفریق بھیڑ بکری کی طرح باڑوں میں بند کر دیے گئے یہ انسانی وقار کی توہین تھی۔ سیاسی مسئلہ کتنا ہی اہم ہو مگر یہ انسانی مسئلہ اس وقت اس سے زیادہ اہم تھا یہی تین تقریریں تھیں جن کی بنا پر بعد کو مجھ پر کلکتہ میں مقدمہ چلایا گیا اور وہ سزا جو آج میں کاٹ رہا ہوں انہیں کی وجہ سے ہوئی۔

کلکتہ سے ہم لوگ راسبہ رابندر ناتھ ٹیگور سے ملنے شانتی نکیتن گئے۔ ان سے مل کر ہمیشہ طبیعت کو فرحت ہوتی تھی اس لئے اس قدر قریب آجانے کے بعد ہمارا جی نہ مانا کہ ان سے ملے بغیر چلے جائیں۔ اس سے پہلے میں دو بار شانتی نکیتن آچکا تھا کملا پہلے پہل آئی تھی اور خاص طور پر اس مدرسے کو دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ ہم لوگ یہ ارادہ کر رہے تھے کہ اپنی لڑکی کو وہاں بھیج دیں۔ اندرا کچھ دنوں میں میٹریکولیشن کے امتحان میں شریک ہونے والی تھی اور اس کی آئندہ تعلیم کا مسئلہ ہمیں پریشان کر رہا تھا۔ میں اس کے بالکل خلاف تھا کہ وہ کسی باقاعدہ سرکاری یا نیم سرکاری یونیورسٹی میں داخل ہو کیونکہ ان یونیورسٹیوں کو میں ناپسند کرتا تھا۔ ان کا ماحول بالکل سرکاری، افسرانہ اور کم پست ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گزشتہ زمانہ میں ان یونیورسٹیوں نے بڑے بڑے قابل مرد اور عورتیں پیدا کی ہیں اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔ لیکن یہ چند مستثنیات ان یونیورسٹیوں کو اس الزام سے نہیں بچا سکتیں کہ وہ نوجوانوں کے لطیف احساسات کو کچل دیتی ہیں۔ شانتی نکیتن نے اس استبداد سے بچنے کی صورت نکالی تھی اس لئے ہم نے اسی کو منتخب کیا، اگرچہ بعض باتوں کے لحاظ سے وہ دوسری یونیورسٹیوں سے پیچھے تھا۔

واپسی پر ہم پٹنہ میں ٹھہرے کہ زلزلے کے مصائب سے نجات دلانے کے سلسلے میں راجندر بابو سے مشورہ کریں۔ وہ ابھی جیل سے چھوٹے تھے اور غیر سرکاری طور پر امدادی کام کا انتظام کرنے کو فوراً ہی کمر بستہ ہو گئے۔ ہم لوگوں کا وہاں پہنچنا بالکل خلافِ توقع تھا اس لئے کہ ہمارا کوئی تار انہیں نہیں پہنچا تھا۔ جس مکان میں ہم کملا کے بھائی کے ساتھ ٹھہرنے والے تھے وہ ایک کھنڈر بن گیا تھا۔ یہ بہت بڑا پختہ دو منزلہ مکان تھا۔ اس لئے ہم لوگوں نے بھی اور بہت سے لوگوں کی طرح میدان ہی میں قیام کیا۔

دوسرے دن میں مظفرپور دیکھنے گیا۔ زلزلے کو پورے سات روز گذر چکے تھے لیکن سوائے چند خاص خاص سڑکوں کے اور دوسرے مقامات سے ملبہ اٹھانے کا

بہت تھوڑا کام کیا گیا تھا۔ ان سڑکوں کی صفائی کے وقت لاشیں برآمد ہوتی تھیں بعض لاشوں سے عجیب و غریب انداز نمایاں تھا گویا وہ گرتی ہوئی دیوار یا چھت کو اپنے جسم سے علیٰحدہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بربادی کا یہ منظر نہایت موثر اور ہولناک تھا جو لوگ بچ رہے تھے انھیں ان دلدوز تجربات نے بالکل پست کر دیا تھا۔

الہ آباد واپس پہنچنے کے بعد روپے اور سامان کی فراہمی کا انتظام فوراً شروع کر دیا گیا اور ہم سب خواہ کانگریسی ہوں یا غیر کانگریسی اس میں سرگرمی سے شریک ہو گئے میرے بعض ساتھیوں کی رائے تھی کہ زلزلہ کی وجہ سے یوم آزادی منانا ملتوی کر دینا چاہیئے لیکن دوسرے ساتھیوں کو اور خود مجھے اس کی کوئی معقول وجہ نظر نہ آئی کہ زلزلہ کی وجہ سے ہم اپنا پروگرام بدل دیں چنانچہ ۲۶ جنوری کو ضلع الہ آباد میں دیہات میں متعدد جلسے ہوئے اور ایک جلسہ شہر میں بھی ہوا ان سب میں ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ بہت سے لوگوں کو یہ توقع تھی کہ پولیس مداخلت کرے گی اور گرفتاریاں عمل میں لائے گی۔ چھوٹے پیمانہ پر کچھ مداخلت ہوئی تھی لیکن ہم لوگوں کو اس سے بہت تعجب ہوا کہ جلسے کے بعد ہم لوگ کس طرح گرفتاری سے بچ گئے۔ ہمارے یہاں کے بعض گاؤں میں اور بعض اور شہروں میں کچھ گرفتاریاں ہوئیں بھی۔

بہار سے واپسی کے بعد ہی زلزلہ کے بارے میں میں نے ایک بیان شائع کیا جس کے آخر میں سرمایے کی فراہمی کی درخواست تھی۔ اس بیان میں میں نے حکومت بہار کے اس تساہل پر نکتہ چینی کی جو اس نے زلزلہ کے بعد ابتدائی چند دنوں میں کیا میرا منشا ان احکام کی نکتہ چینی کرنا تھا جو زلزلے کے علاقوں میں موجود تھے۔ ان کو ایسے سخت اور مشکل حالات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا جس سے مضبوط سے مضبوط طبیعت کا آدمی بھی گھبرا جاتا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے بعض الفاظ کا یہ مطلب بھی نکل سکتا تھا لیکن اس کا مجھے یقیناً دلی صدمہ تھا۔ بہار کے اعلیٰ حکام نے ابتداءً کچھ زیادہ قابلیت کا

ثبوت نہیں دیا خاص کر ملبے کے ہٹانے میں، کیونکہ اگر وہ ہٹا دیا جاتا تو بہت سی جانیں بچ جاتیں۔

اکیلے مونگیر شہر میں ہزاروں آدمی مر گئے اور تین ہفتے گذرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ملبہ ایک بہت بڑی مقدار میں اب بھی پڑا ہوا ہے جس میں ہاتھ تک نہیں لگایا گیا حالانکہ چند ہی میل کے فاصلے پر جمال پور میں کئی ہزار ریلوے مزدوروں کی بستی موجود تھی جس سے اس حادثے کے چند ہی گھنٹے بعد یہ کام لیا جا سکتا تھا۔ زلزلے کے بارہ دن بعد بھی آدمی زندہ برآمد ہوئے ہیں۔ حکومت نے جائداد کی حفاظت کی پوری تدابیر اختیار کیں لیکن جو لوگ دبے پڑے ہوئے تھے ان کی جانیں بچانے میں اتنی عجلت نہیں کی میونسپلٹیوں کا کام ان علاقوں میں بالکل بند تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرا اعتراض بالکل ٹھیک تھا اور بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ زلزلے کے رقبہ میں رہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس سے متفق تھی لیکن چاہے یہ نکتہ چینی صحیح ہو یا غلط ایمانداری سے ضرور کی گئی تھی اور اس کا مقصد حکومت پر الزام لگانا نہ تھا۔ بلکہ اس کام میں تیزی پیدا کرنا تھا۔ کسی نے حکومت پر یہ الزام نہیں لگایا کہ اس نے قصداً غلط طریقے سے کام کیا یا جان بوجھ کر غفلت برتی۔ یہ ایک بالکل نیا اور بہت سخت موقع تھا اس لئے یہ غلطیاں درگذر کے قابل تھیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے (کیونکہ میں جیل میں تھا) حکومت نے بعد کو محنت اور قابلیت سے زلزلے کی تباہ کاریوں کی تلافی کا کام انجام دیا۔

لیکن میری نکتہ چینی سے ناراضگی پیدا ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بہار کے لوگوں نے حکومت کی حمایت میں ایک بیان شائع کر دیا جو میرے اعتراضات کا گویا جواب تھا۔ اس میں زلزلے اور اس کی ضرورتیں ان کے لئے محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی تھیں یہ بھی کہ حکومت کی نکتہ چینی کی گئی تھی اس لئے وفادار رعایا کا فرض تھا کہ اس کی

منافی پیش کرتے۔ یہ ایک دلچسپ مثال ہے اس عجیب و غریب چیز کی جو ہندوستان میں بہت عام ہے یعنی حکومت پر نکتہ چینی کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ مغربی ممالک میں یہ معمولی بات ہے۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو نکتہ چینی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ بادشاہ کی طرح ہندوستان میں حکومت برطانیہ اور اس کے تمام اعلیٰ حکام خطاسے بالاتر قرار دیئے گئے ہیں ایسی کسی بات کی طرف اشارہ بھی کرنا بغاوت سمجھا جاتا ہے۔

اس کا ایک عجیب و غریب پہلو یہ بھی ہے کہ حکومت پر ظلم و جور کا الزام لگانا اتنا زیادہ برا نہیں مانا جاتا جتنا نا اہلی اور نا قابلیت کا الزام لگانا۔ ظلم و جور کا الزام لگانے والے تنگ خیال سمجھا دیا جا سکتا ہے لیکن حکومت اس قسم کے الزامات کی عادی ہو چکی ہے اس لئے اصل میں اس کا زیادہ خیال نہیں کرتی۔ ایک حیثیت سے یہ تمام باتیں ایک حکمراں قوم کی صفات میں سمجھی جا سکتی ہیں لیکن اگر اسے نا قابل اور بودا کہا جائے تو تکلیف پہنچتی ہے کیونکہ اس سے اس کی خود پسندی کی جڑیں ہل جاتی ہیں اور ہندوستان کے انگریز حکام کا دماغ بھی باطل ہو جاتا ہے۔ ان کی مثال کلیسائے انگلستان کے اس اسقف کی سی ہے جو نے دینی کے الزام کو صبر و تحمل سے برداشت کرتا تھا لیکن جب کوئی اس کو احمق اور نا قابل کہتا تو وہ ناراض ہوتا اور سختی سے جواب دیتا۔

انگریزوں کا عام عقیدہ ہے جس کا اعلان اکثر اس طور سے کیا جاتا ہے گویا یہ ایک ناقابل انکار کلیہ ہے کہ اگر ہندوستان کی حکومت میں کوئی ایسا تغیر کیا گیا جس سے برطانوی اثر کم یا زائل ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت اور زیادہ ابتر اور خراب ہو جائے گی۔ انتہا پسند اور علی الخصوص انگریز اس عقیدے کے باوجود جوش ہمدردی میں ہندوستانیوں کی حمایت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اچھی حکومت اپنی حکومت کا بدل کبھی نہیں ہو سکتی اور اگر ہندوستانی اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی مارنا چاہتے ہیں تو ان کو ایسا کرنے دیا جائے مجھے نہیں معلوم کہ برطانوی اثر کے زائل ہو جانے کے بعد ہندوستان

کیا حشر ہوگا۔ اس کا دار و مدار زیادہ تر اس پر ہے کہ برطانیہ کس صورت سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور اس وقت ہندوستان پر کس طبقہ کی حکومت ہوتی ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی قومیں اور بین الاقوامی امور قابل لحاظ ہیں۔ بالکل قرین قیاس ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی مدد سے ایسی حکومت قائم ہو جو موجودہ حکومت سے بدتر ہو، جس میں موجودہ حکومت کی تمام خرابیاں ہوں اور خوبیاں کوئی نہ ہوں مگر اس سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ہندوستان کا نظم بالکل بدل جائے اور وہ اہل ہند کے نقطۂ نظر سے موجودہ نظم سے کہیں بہتر اور مفید تر ہو شاید اس وقت حکومت کے جابرانہ آلات اتنے کارگر نہ ہوں اور اس کی انتظامی مشینیں میں یہ چمک دمک نہ ہو مگر یہ یقینی بات ہے کہ دولت کی پیداوار اور اس کا صرف بہت بہتر ہوگا اور ان امور میں ترقی ہوگی جو عوام لوگوں کے جسمانی، روحانی اور تمدنی معیار کو بلند کرتے ہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ خود اختیاری حکومت ہر ملک کے لئے اچھی ہے لیکن میں اس کے لئے تیار نہیں کہ اگر غیروں کی حکومت سچ مچ اچھی ہو تو اسے مٹا کر اپنی بری حکومت قائم کروں۔ اگر حکومت خود اختیاری کو اپنی فوقیت ثابت کرنا ہے تو لازمی طور پر اس کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ معاد عامہ کے لئے بہتر ثابت ہو۔ مجھے دل سے یقین ہے کہ برطانوی حکومت کا استحقاق عہد ماضی میں جو کچھ بھی رہا ہو موجودہ زمانہ میں وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتی کہ عام لوگوں کے لئے اچھی حکومت ثابت ہو اور ان کے معیار زندگی کو بلند کر سکے۔ اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دن پورے ہو چکے اور کے فوائد جتنے کچھ بھی تھے، ختم ہو گئے۔ سچ پوچھئے تو ہندوستان کے دعوائے آزادی کی اساس اسی امید پر ہے کہ آزاد حکومت بہتر حکومت ہوگی، عوام کے معیار زندگی کو بلند کر دے گی، ملک کی صنعت اور تہذیب کو ترقی دے گی اور اس خوف اور دہشت کی فضا کو دور کر دے گی، جو ہمیشہ غیر ملکی شہنشاہی حکومت کے جلو میں ہوتی ہے۔ حکومت برطانیہ اور اس کی سول سروس چاہے اتنی قوی ہو کہ اپنا حکم ہندوستان سے منوا لے لیکن اس میں اہلیت

اور قابلیت نہیں ہے کہ ہندوستان کے آئندہ مسائل تو ایک طرف موجودہ مسائل کو بھی
حل کر سکے اس لئے کہ اس کی مبادیں اور اس کے تصورات سراسر غلط ہیں اور وہ حقیقی
حالات کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ ایک حکومت یا حکمراں طبقہ جس میں کافی قابلیت نہیں ہے یا
جس کی مبادیں پائدار نہیں ہیں زیادہ عرصے تک جبر سے بھی کام نہیں چلا سکتا

الٰہ آباد میں جو انجمن بہار کے مصیبت زدوں کی امداد کے لئے قائم ہوئی تھی اس نے
مجھے متعین کیا کہ میں زلزلے کے علاقے کا معائنہ کروں اور وہاں جو طریقے امداد پہنچانے کے
اختیار کئے گئے تھے ان کی بابت رپورٹ پیش کروں۔ میں فوراً ہی تنہا چل کھڑا ہوا اور دس
دن تک برابر برباد شدہ علاقے میں پھرتا رہا۔ یہ بڑی محنت کا کام تھا اور مجھے اس عرصے میں
کوئی دیر سونا بھی نصیب نہیں ہوا۔ ۵ بجے صبح سے لے کر قریب قریب آدھی رات تک ہم لوگ دوڑ
دھوپ کیا کرتے تھے کبھی موٹر میں سوار ہو کر ٹوٹی پھوٹی سڑکوں سے گزرتے تھے کبھی چھوٹی چھوٹی
کشتیوں میں بیٹھ کر ان مقامات کو پار کرتے تھے جہاں پل منہدم ہو گئے تھے اور سڑکیں سطح کے زیر
بالا ہو جانے سے بیکار ہو گئی تھیں۔ شہروں اور قصبوں کا پس منظر کچھ کم ہیبت ناک نہ تھا۔ اونچے کھنڈر
دور دور تک پھیلے ہوئے تھے سڑکوں میں شگاف پڑ گئے تھے اور اس قدر الٹ پلٹ گئی تھیں کہ
معلوم ہوتا تھا کسی دیو نے پکڑ کر ہاتھ سے انہیں توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے۔ بڑے بڑے شگافوں سے پانی
اور ریت پھوٹ نکلی تھی اور سیلاب کا زور آدمیوں اور جانوروں کو بہا لے گیا تھا مگر ان نقصانات
سے بھی زیادہ شمالی بہار کے میدانوں میں جنہیں گلشن بہار کہا جاتا تھا، ویرانی اور تباہی کے
آثار نمایاں تھے۔ میلوں تک ریت ہی ریت نظر آتی تھی۔ رقبے کے رقبے زیر آب تھے زمین میں
جا بجا بڑے بڑے شگاف اور بے شمار چھوٹے چھوٹے آتش فشاں سے بن گئے تھے جن سے یہ
ریت اور پانی نکلا تھا۔ چند برطانوی افسر جو اس علاقے پر ہوائی جہازوں میں پرواز کر چکے تھے
کہتے تھے کہ یہ علاقہ کچھ اس شکل سے مشابہت رکھتا ہے جو دوران جنگ میں یا اس کے فوراً بعد
شمالی فرانس کے میدان جنگ کی ہو گئی تھی۔

یہ تجربہ کس قیامت کا ہوگا، لوگوں سے معلوم ہوا کہ پہلے تو زلزلے کی لہر ایک دوسری جانب گذر گئی اور جتنے آدمی کھڑے تھے سب گر گئے۔ پھر ایک بالا ڈولا آیا اور ایک گڑگڑاہٹ اور گرج پیدا ہوئی جیسے بہت سی توپیں چھٹ رہی ہوں یا سیکڑوں ہوائی جہاز اڑ رہے ہوں۔ تے شمار مقامات پر بڑے بڑے تنگ دراز دریاؤں سے پانی اُبل اُبل کر دس بارہ فٹ اونچا جانے لگا۔ یہ حالت غالباً تین منٹ یا اس سے کچھ ہی زیادہ رہی لیکن یہ تین منٹ قیامت کے تھے۔ کوئی تعجب نہیں اس واقعے کے بہت سے دیکھنے والے یہ سمجھے کہ اب دنیا کا خاتمہ ہے شہروں میں مکانات کے گرنے کا شور برپا تھا، پانی روروں میں بہ رہا تھا اور فضا گرد و غبار سے مکدر تھی جس کی وجہ سے چند گز کے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی۔ دیہاتی علاقوں میں گرد زیادہ نہیں تھی اس لئے وہاں دور تک نظر پہنچ سکتی تھی مگر اس وقت کون تھا جو اطمینان سے یہ تماشا دیکھتا جو بچ گئے تھے وہ زمین پر پڑے تھے اور دہشت سے مرے جاتے تھے۔

شاید مظفرپور میں ایک بارہ سال کا کمسن لڑکا دس دن بعد کھود کر زندہ نکالا گیا وہ سخت متحیر تھا جس وقت گرتے ہوئے ملبے نے اس کو گرا کر قید کر دیا تو وہ سمجھا کہ دنیا کا خاتمہ ہو گیا ہے اور ایک وہی بچ رہا ہے۔

اسی مظفرپور میں زلزلے کے وقت جب مکانات گر رہے تھے اور ہر طرف سیکڑوں آدمی مر رہے تھے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ناتجربہ کار نوجوان سخت پریشان تھے اور ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ماں اور لڑکی دونوں صحیح سلامت ہیں۔ زلزلے کی یادگار میں لڑکی کا نام کمپودیوی رکھا گیا۔

ہمارے دورے میں آخری مقام شہر مونگیر تھا۔ ہم لوگ بہت دور دور پھرے تھے اور قریب قریب نیپال کی سرحد تک پہنچ گئے تھے۔ ہم نے بہت سے عبرت ناک سین دیکھے تھے اور ہماری آنکھیں تباہی اور بربادی کے نظارے کی عادی ہو چکی تھیں مگر جب مونگیر جیسے مردانگی شہر کی کامل ویرانی پر نظر پڑی تو ہم مرگ دہشت سے کانپ اٹھے مجھے وہ خوفناک منظر کبھی نہ بھولے گا۔

زلزلے کے علاقے میں ہر جگہ، خواہ شہر ہوں یا دیہات، باہمی مدد اور اپنی آپ
مدد کرنے کا جذبہ بالکل مفقود تھا۔ غالباً شہر کے اوسط طبقے اس بارے میں سب سے زیادہ
قصوروار تھے۔ وہ سب انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے کہ حکومت یا کوئی غیر سرکاری
امدادی جماعت پہنچ کر ان کی مدد کے لئے کچھ کرے۔ بعض لوگ جنھوں نے امدادی کاموں
کے لئے اپنی خدمات پیش کی تھیں یہ سمجھتے تھے کہ کام سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کو حکم دیا جائے
کہ ایسا کرو ایسا کرو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بے بسی کچھ اس وجہ سے بھی پھیلی ہوئی تھی کہ زلزلے
کی دہشت نے سب کو بدحواس کر دیا تھا اور یہ حالت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی ہوگی۔

اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کی ہمت اور مستعدی خاص طور پر نمایاں تھی جو
امداد رسانی کا کام کرنے کے لئے بہار کے دوسرے ضلعوں اور غیر صوبوں سے کثرت آ رہے تھے
ان نوجوان مردوں اور عورتوں کے جذبہ خدمت اور کارکردگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور
باوجود اس کے کہ متعدد امدادی جماعتیں جدا جدا کام کر رہی تھیں ان میں بڑی حد تک اتحاد
عمل تھا۔

میں نے مونگیر میں کوشش کی کہ ملبہ کھودنے میں لوگ اپنی مدد آپ کریں اور
اس تحریک کو ابھارنے کے لئے ایک نمائشی حرکت کی میں نے کسی قدر جھجکتے ہوئے یہ قدم
اٹھایا مگر اس میں پوری کامیابی ہوئی۔ سب امدادی جماعتوں کے رہنما پھاوڑے اور ٹوکرے
لے کر پہنچ گئے اور دن بھر کھدائی کا کام کرتے رہے۔ ہم لوگوں نے ایک کمسن لڑکی کی لاش کھود
کر نکالی۔ میں تو اسی دن مونگیر سے چلا آیا لیکن کھدائی ہوتی رہی اور بہت سے مقامی لوگوں
نے اس کام کو اٹھا لیا جس سے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

تمام امدادی جماعتوں میں سب سے زیادہ اہم مرکزی امدادی جماعت تھی جس کے
صدر راجندر پرشاد تھے۔ یہ خالص کانگریسی جماعت نہیں تھی۔ بڑھتے بڑھتے یہ آل انڈیا یا پورے
ہندوستان کی جماعت بن گئی جس میں مختلف گروہوں اور تنظیموں کے نمائندے شامل

تھے۔ ایک خاص آسانی اس کو یہ تھی کہ وہ دیہاتی علاقوں میں کانگریس کمیٹیوں سے کام لے سکتی تھی ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے میں، سوا گجرات یا بعض اضلاع ممالک متحدہ کے، کانگریسی کارکنوں کا اتنا زیادہ گہرا تعلق اور ربط ضبط کسانوں سے نہیں ہے میں نے صوبہ بہار میں دیکھا بلکہ اصل میں کانگریس کے زیادہ تر کارکن کسان ہی تھے۔ صوبہ بہار کسانوں کا صوبہ ہے۔ اور اس صوبے کے متوسط طبقے کے لوگ بھی کسانوں میں شامل ہیں کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے مجھے بار بار بہار کی صوبہ کانگریس کمیٹی کے دفتر کا معائنہ کرنے کا اتفاق ہوا اور میں نے بعض اوقات سخت الفاظ میں اس ابتری اور سستی پر اعتراض کیا جو مجھے دفتر کے کام میں نظر آئی۔ لوگ کھڑے رہنے سے زیادہ بیٹھے اور بیٹھے سے زیادہ لیٹنے کی طرف مائل نظر آتے تھے۔ میں نے اس سے زیادہ کوئی دفتر ساز و سامان سے خالی نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ لوگ کوشش کرتے تھے کہ بہت سی ایسی چیزوں کے بغیر کام چلائیں جو دفتر کے معمولی لوازم میں داخل ہیں مگر باوجود ان اعتراضات کے میں اچھی طرح جانتا تھا، کہ کانگریس کے نقطۂ نظر سے یہ صوبہ ملک بھر میں سب سے زیادہ مستعد اور رواداری تھا۔ وہاں کانگریس اپنے کام کی کوئی نمائش نہیں کرتی تھی لیکن اس کو کسانوں کی زبردست تائید حاصل تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں بھی بہار کے ممبر شاذ و نادر ہی کسی معاملہ میں پیش قدمی کرتے تھے بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں تعجب ہو کہ ہم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ لیکن سول نافرمانی کی دونوں تحریکوں میں بہار نے نمایاں کارنامے دکھلائے اور بعد کی انفرادی سول نافرمانی میں بھی اچھا کام کیا۔

کانگریس کی اس عمدہ تنظیم کی بدولت امدادی کمیٹی نے کسانوں تک پہنچنے کی صورت نکالی دیہاتی علاقوں میں نہ کوئی دوسری جماعت اور نہ خود حکومت اتنی مفید ہو سکتی تھی امدادی کمیٹی و نیز صوبہ بہار کی کانگریس دونوں کے صدر راجندر بابو تھے جو بہار کے مسلمہ لیڈر ہیں سرزمین بہار کے بسنے والوں کی تمام معلومات ان میں

نمایاں ہیں۔ ان کی صورت کسانوں کی سی ہے اور پہلی نظر میں دیکھنے والا کچھ زیادہ متاثر
نہیں ہوتا۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد ان کی آنکھیں جن سے تیزی اور صاف دلی اور
ان کا چہرہ جس سے حق اور خلوص ٹپکتا ہے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ کوئی شخص جس نے ان
آنکھوں کو اور اس چہرے کو ایک بار دیکھ لیا ہے انھیں کبھی نہیں بھول سکتا اس لئے کہ
ان میں صداقت کا جلوہ نظر آتا ہے جس میں کھوٹ کا نام تک نہیں۔ کسانوں کی سی
طبیعت ہونے کی وجہ سے شاید ان کا زاویۂ نظر کسی قدر محدود ہے اور آج کل کے معیار
سے وہ سیدھے سادے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی نمایاں قابلیت، ان کی کامل
راست بازی، ان کا حسن عمل، ان کا ہندوستان کی آزادی کیلئے جان لڑا دینا،
اوصاف ہیں جنھوں نے ان کو صرف اپنے صوبے میں بلکہ سارے ہندوستان میں محبوب
بنا دیا ہے۔ رہنمائی کا جو مسلمہ مرتبہ راجندر بابو کو بہار میں حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی
صوبے میں کسی شخص کو حاصل نہیں ہے۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جن کی بات یہ
کہا جاسکے کہ انھوں نے گاندھی جی کے پیام کی حقیقی روح کو اس سے زیادہ جذب کیا ہے۔

بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان جیسا آدمی بہار کے امدادی کام کی رہنمائی کرنے کیلئے
مل گیا اور یہ اس اعتماد کا نتیجہ تھا جو لوگ ان پر رکھتے تھے کہ ہندوستان بھر سے اس قدر
کثیر رقم امداد میں روپیہ ملا۔ ان کی صحت کمزور تھی مگر وہ امدادی کام میں جٹ گئے۔ انھیں
حد سے زیادہ کام کرنا پڑا اس لئے کہ ساری جد و جہد کا مرکز انھیں کی ذات تھی اور ہر شخص
انھیں سے ہدایت اور مشورہ لیتا تھا۔

جب میں زلزلے کے علاقے میں دورہ کر رہا تھا یا شاید وہاں جانے سے ایک آدھ
روز پہلے مجھے گاندھی جی کا یہ بیان پڑھ کر سخت صدمہ ہوا تھا کہ زلزلہ اچھوت چھات کی سزا ہے۔
انھوں نے یہ ایسی بات کہی کہ آدمی سر پکڑ کر بیٹھ جائے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کا جو
جواب دیا وہ مجھے بہت پسند آیا اور میں اس سے لفظ بلفظ متفق ہوں۔ سائنس کے نقطۂ نظر

سے یہ بات اس قدر بعید تھی کہ اس سے بعید تر کوئی چیز تصور میں نہیں آسکتی یہ مانا کہ مدرکہ
کیفیات یا نفسی واردات کا جو اثر مادے پر پڑتا ہے اس کے متعلق سائنس صحیح حکم لگانے
کا دعویٰ نہیں کرسکتی ممکن ہے کہ دماغی صدمے کے اثر سے انسان کو بدہضمی ہو جائے یا اس کے
جسم پر اس سے بھی زیادہ اثر پڑے لیکن یہ کہنا کہ انسانی رسوم یا کوتاہیوں کے کوئی اثرات
سطح ارضی کی حرکت پر پڑیں گے سخت حیرت ناک ہے، گناہ، غضب الٰہی اور نظام کائنات میں
انسان کی اہمیت کا تخیل ہم کو چند صدی پیچھے دھکیل کر اس زمانے میں لے جاتا ہے جب
یورپ میں کلیسا کے احتساب کا دور دورہ تھا۔ گیلیو، ژانو اور برونو کو علمی تحقیقات کے جرم میں ملحد
قرار دے کر جلا دیا گیا تھا اور بہت سی عورتیں سحر کے الزام میں آگ میں جھونک دی جاتی تھیں
امریکا میں اٹھارہویں صدی میں بھی بوسٹن کے سربرآوردہ پادریوں نے میسا چوسٹس کے
زلزلے کا سبب اس بدعت کو ٹھیرایا تھا کہ عمارتوں پر برق ساسلاخیں نصب کی گئی تھیں

اگر زلزلے کو عذاب الٰہی تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ ہم کو کیسے معلوم ہو کہ ہمارے کس
گناہ کی سزا ہم کو دی جا رہی ہے۔ کیونکہ افسوس ہمارے گناہ لاتعداد ہیں ہر شخص اپنے اپنے
مذاق کے مطابق اس کی توجیہہ کرسکتا ہے ممکن ہے کہ یہ سزا ہم کو اس لئے دی گئی ہو کہ ہم
ایک غیر ملکی حکومت کی غلامی پر راضی ہیں یا اس لئے کہ ہم ایک ظالمانہ سماجی نظام کو برداشت
کر رہے ہیں۔ مہاراجہ دربھنگہ کو جو ایک بہت بڑے زمیندار ہیں، مالی حیثیت سے زلزلے
کی وجہ سے بہت بڑا نقصان پہنچا اس لئے ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام زمینداری کے
لئے تازیانہ عبرت ہے۔ مگر اس سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ بہار کے کم وبیش بے گناہ لوگوں
کو جنوبی ہند والوں کی چھوت چھات کے گناہ کی سزا ملی۔ یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ آخر
خود چھوت چھات کی سرزمین پر زلزلہ کیوں نہیں آیا؟ یا حکومت برطانیہ کہہ سکتی ہے کہ یہ عذاب
سول نافرمانی کی وجہ سے نازل ہوا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ شمالی بہار کے جس حصے نے زلزلے سے بہت
زیادہ نقصان پہنچا آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

غرض ہم اس طرح کی بے شمار قیاس آرائیاں کرسکتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم قضا و قدر کے کاموں میں دخل ہی کیوں دیں اور اپنی انسانی جدوجہد سے عذابِ الٰہی کے نتائج کو ہلکا کرنے کی کوشش کیوں کریں؟ پھر ہم اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ قدرت نے یہ ستم ظریفی ہمارے ساتھ کیوں روا رکھی کہ ہمیں اگر صدا اور خطاکار بنایا، ہماری راہ میں قدم قدم پر پھندے لگا دیے، دنیا کو مصیبت اور ظلم سے معمور کر دیا، شیر اور بھیڑیے کو پیدا کیا اور پھر ہمیں کو سزا بھی دیتی ہے۔

جب ستاروں نے اپنی شعاعوں کے نیزے پھینک دیے،
اور آسمان کو اپنے آنسوؤں سے تر کر دیا،
تو کیا وہ اپنی مخلوق کو دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے؟
کیا تجھے بھی اسی نے پیدا کیا ہے جو میمنے کا پیدا کرنے والا ہے؟

میں اپنے پٹنے کے قیام کی آخری شب میں بہت رات گئے تک اپنے رفیقوں اور دوستوں سے گفتگو کرتا رہا جو امدادی کام میں شریک ہونے کے لئے مختلف صوبوں سے آکر جمع ہو گئے تھے۔ ممالک متحدہ کی نمائندگی کمالی تھی اور ہمارے بعض چیدہ کارکن وہاں موجود تھے۔ ہم لوگ ایک اہم مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ وہ یہ تھا کہ ہم زلزلے کے امدادی کام میں کسی حد تک حصہ لینا چاہیے کیونکہ اسی حد تک ہمیں سیاسی کام سے علیحدہ ہونا پڑتا۔ امدادی کام بہت محنت طلب تھا اور سرسری طور پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر ہم اسی کے ہو رہتے تو ایک بڑی مدت تک عملی سیاسی جدوجہد سے الگ رہنا ضروری تھا اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ سیاسی حیثیت سے ہمارے صوبہ پر اس کا برا اثر پڑتا۔ یوں تو کانگریس کے کارکنوں کی کمی رہتی تھی لیکن ایسے لوگ جن کی شرکت اور دوام شرکت کا اثر پڑتا ہے ہمیشہ تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں اور ان کے بغیر کام چلانا مشکل تھا۔ تاہم زلزلے کے مصیبت زدوں کے تقاضے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا جو میرا یہ ارادہ

نہیں تھا کہ میں صرف امدادی کام میں ہی کھو کر رہ جاؤں۔ میں یہ محسوس کرتا
تھا کہ اس کام کے لئے تو بہت سے آدمی مل جائیں گے مگر دوسرا کام ذرا خطرناک ہے
اس کے لئے بہت کم آدمی ہیں۔

ہم لوگ بہت دیر تک یہی گفتگو کرتے رہے۔ پھر گذشتہ یوم آزادی کا ذکر چھڑ
گیا کہ ہمارے فلاں فلاں ساتھی گرفتار ہو گئے اور ہم بچ گئے ہیں۔ میں نے ان لوگوں سے،
ہنسی میں کہا کہ میں نے ایسی ترکیب معلوم کر لی ہے کہ آدمی جارحانہ سیاست کے
باوجود گرفتاری سے بچا رہے۔

۱۱ر فروری کو میں الہ آباد واپس آیا۔ اس دورے کے بعد تھک کر چور ہو چکا
تھا دس دن کی سخت محنت سے میں بیمار پڑ گیا تھا اور میرے اعزا کو میری صورت
دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ میں نے الہ آباد کی امدادی انجمن کے لئے رپورٹ لکھنے کی کوشش
کی لیکن نیند غالب آ گئی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں سے کم از کم بارہ گھنٹے میں نے سونے
میں گزار دیئے۔

دوسرے دن شام کے قریب میں اور کملا جانے ہی والے تھے اور پرشوتم داس
ٹنڈن ہم سے ملنے کے لئے آ رہے تھے۔ ہم لوگ برآمدے میں کھڑے تھے کہ ایک موٹر آ کر
رکی اور اس میں سے ایک پولیس کا افسر اترا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ میرا وقت آ گیا ہے
میں نے اس کے پاس جا کر کہا کہ "بہت دنوں سے آپ کا انتظار تھا" وہ کسی قدر
عذر خواہی کے انداز میں بولا کہ میرا قصور نہیں ہے یہ وارنٹ کلکتے سے آیا ہے

پانچ مہینے تیرہ دن باہر رہنے کے بعد میں پھر اپنے گوشۂ تنہائی میں واپس گیا
اصل میں میرے لئے کوئی مشکل نہ تھی۔ مصیبت بے چاری عورتوں یعنی میری بیمار
بیوی اور ماں کی تھی اور اب کیا ہمیشہ ہی ہوتی تھی۔

(۵۹)
علی پور جیل

"میں اس حالت اور کیفیت سے اب کتنی دور ہوں، کیا میں اب بھی اس تھارٹی دار درخت کی لٹوں کی طرح تنا کسی رکاوٹ کے ان ہلکی ہلکی ہواؤں میں اُڑ تا ہوں۔ جہاں راستہ دکھانے والا کوئی دم دار ستارہ نہیں ہے۔" (رابرٹ براؤننگ)

اسی رات مجھے کلکتہ لے گئے اور ہوڑا اسٹیشن سے ایک بہت بڑی اور سیاہ رنگ کی کار یا گاڑی میں لال بازار پولیس کی چوکی پر پہنچا دیا۔ کلکتے کے اس مشہور صدر تھانہ کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا تھا اس لئے ذرا دلچسپی کے ساتھ میں نے ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ پوربیں سارجنٹ اور تھانہ داروں کی بہت بڑی تعداد نظر آئی، جتنی تبائی ملک کے کسی صدر تھانہ میں نہیں ہوتی۔ سپاہی تقریباً تمام صوبہ بہار کے یا علاوہ ازیں دیگر مشرقی اضلاع کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ جیل خانہ کی بڑی لاری میں متعدد بار مجھے جیل خانہ سے عدالت آنا جانا پڑا یا اگر جیل خانہ سے دوسرے جیل خانہ جانا ہوا تو ان سپاہیوں میں سے کچھ لوگ اندر بیٹھ کر میرے ہمراہ ہوتے تھے۔ یہ لوگ بہت رنجیدہ نظر آتے تھے، اپنی نوکری سے بیزار تھے اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ میرے ساتھ انہیں بڑی ہمدردی تھی اور کبھی کبھی ان کی آنکھیں نم بھی ہو جاتی تھیں۔ ابتداءً مجھے پریسیڈنسی جیل میں رکھا گیا۔ وہاں سے چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کے لئے مجھے لے جاتے تھے۔ یہاں مجھے عجیب و غریب تجربہ

ہوا۔ عدالت کا کمرہ اور پوری عمارت کی ظاہری شکل و صورت بجائے کھلی ہوئی کچہری کے ایک محصور قلعہ کی سی معلوم ہوتی تھی سوائے چند اخباری نمائندوں اور وکیلوں کے جو وہاں ہوتے ہی ہیں کسی اور آدمی کو کہیں آس پاس آنے کی اجازت نہیں تھی۔ پولیس کے سپاہی البتہ خاص تعداد میں موجود تھے، لیکن یہ انتظامات بظاہر خاص طور پر میری وجہ سے نہیں کئے گئے تھے، یہ وہاں روزانہ کا دستور تھا جب مجھے عدالت والے کمرے میں لے گئے تو کمرہ کے اندر ایک لمبے راستہ سے مجھے گزرنا پڑا جس کے اوپر اور ادھر اُدھر دونوں طرف تاروں کی جالی لگی ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پنجرے میں چل رہے ہیں۔ ملزم کا کٹہرا مجسٹریٹ کی کرسی سے بہت دور تھا اور عدالت کا کمرہ پولیس کے سپاہیوں اور وکیلوں سے بھرا تھا جو سیاہ کوٹ اور جبے پہنے ہوتے تھے۔

عدالتی مقدموں کا میں عادی تھا۔ میرے بہت سے مقدمات جیل خانہ کے اندر ہی ہوتے تھے، لیکن ہمیشہ کچھ دوست عزیز اور وہاں یہاں کے لوگ موجود ہوتے تھے، جس سے یہ پوری فضا اتنی زیادہ مکدر معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہاں پولیس کے سپاہی بھی بالعموم ذرا علیحدہ رہتے تھے اور پنجرے کی شکل کی کوئی چیز آس پاس نہیں ہوتی تھی، لیکن یہاں حالت بالکل مختلف تھی، اور میں گھور گھور کر اجنبی اور ناواقف لوگوں کی طرف دیکھتا تھا جن میں اور مجھ میں کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ مجمع کچھ زیادہ دلکش بھی نہ تھا اور میرا تو خیال ہے کہ جو کالا جبہ پہن کر اکٹھے ہو جاتے ہیں تو یہ اجتماع کچھ زیادہ حسین بھی نہیں معلوم ہوتا اور پولیس کی مخصوص عدالتوں کے وکلاء تو حد درجہ کے ساتھ ایک مہیب شکل اختیار کر لیتے ہیں آخر کار میں نے کسی طرح ایک وکیل کی صورت

پہچانی جو کیمپ کی قطاروں میں تھے، لیکن پھر وہ بھی اس مجمع میں گم ہو گئے۔

مقدمہ شروع ہونے سے قبل جب میں باہر کی طرف برآمدہ میں بیٹھا تھا تو مجھے اپنی تنہائی اور سب لوگوں سے علیحدگی بہت محسوس ہوئی۔ اس وقت میری نبض کی حرکت بھی یقیناً تیز ہو گئی ہو گی اور اندرونی طور پر طمانیت قلب بھی اتنی نہ تھی جتنی کہ اس سے پہلے مقدمات کے دوران میں رہا کرتی تھی۔ اس وقت مجھے یہ بات کھٹکی کہ اگر مجھ سا آدمی جو اتنے مقدمات اور سزاؤں کا تجربہ حاصل کر چکا ہے ایسے حالات میں غیر معمولی طور پر گھبرا سکتا ہے تو پھر نوجوان اور ناتجربہ کار لوگوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔

ملزم کے کٹہرے کے اندر جا کر پھر میری حالت ذرا بہتر ہو گئی۔ حسب معمول نہ میں نے کوئی صفائی پیش کی اور نہ پیروی کی، صرف ایک مختصر سا بیان پڑھ کر سنا دیا دوسرے دن ۵ر فروری کو مجھے دو برس کی سزا دے دی گئی اور ساتویں مرتبہ میری قید کی مدت شروع ہوئی۔

اب جو میں ساڑھے پانچ ماہ کے جیل سے باہر کے قیام پر نظر ڈالتا تھا تو مجھے اطمینان اور خوشی ہوتی تھی کہ میرا وقت اچھی طرح صرف ہوا اور میں نے اس عرصہ میں بعض مفید کام کئے۔

والدہ نے بیماری پر قابو پا لیا تھا اور فوری طور پر کوئی خطرہ ان کے لئے نہ تھا، میری چھوٹی بہن کرشنا کی شادی ہو گئی تھی میری لڑکی کی آئندہ تعلیم کا بندوبست ہو گیا تھا، میں نے اپنی بعض خانگی اور مالی دشواریوں کو بھی درست کر لیا تھا اور بہت سے ذاتی معاملات جنہیں میں نے ایک عرصے سے نظر انداز کر رکھا تھا ان کا بھی کچھ انتظام ہو ہی گیا، سیاسی امور کا جہاں تک تعلق ہے میں جانتا تھا کہ اس وقت کوئی شخص کچھ زیادہ کام نہیں کر سکتا تھا میں نے کم از کم اتنا کیا کہ

کانگریس کے طرز عمل کو تھوڑا اور کس دیا اور ایک حد تک اس کو معاشرتی اور
معاشی نقطۂ نظر سے غور وفکر کرنے کی طرف مائل کیا۔ پہلے تو گاندھی جی کے ساتھ
میری پھر ادالی خطوط وکتابت سے اور اس کے بعد میرے مضامین سے جو اخبارات
میں شائع ہوئے، کچھ فرق پیدا ہوا۔ فرقہ وارانہ مسئلے پر میرے مضامین سے بھی
کچھ فائدہ ضرور ہوا، اس کے علاوہ تقریباً دو برس کے بعد میں گاندھی جی سے اور دوسرے
دوستوں اور ساتھیوں سے مل لیا اور اس ملاقات سے میں نے ذہنی رگوں میں اور
اپنے جذبات میں ایک نئی قوت ایک مدت کے لئے اور حاصل کرلی تھی۔

صرف ایک بات البتہ میرے لئے پریشان کن رہی اور وہ کملا کی علالت تھی
اس وقت مجھے اس کا اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ کتنی علیل ہے، اس لئے کہ اس کی
عادت ہے کہ جب تک بالکل گر ہی نہ پڑے کام چلاتی رہتی ہے۔ بہرحال میں متفکر
اور پریشان تھا، لیکن اس کے باوجود توقع تھی کہ اب چونکہ میں جیل خانہ میں ہوں
اس کو فرصت ملے گی کہ اپنے علاج کی طرف توجہ کرے جب تک میں باہر رہا اس
وقت تک اس کے لئے یہ ذرا دشوار تھا اس لئے کہ وہ مجھے زیادہ عرصہ تک چھوڑنے
کے لئے کسی طرح راضی نہیں ہوتی تھی۔

ایک بات کا مجھے اور بھی افسوس تھا کہ میں نے ایک بار بھی ضلع الہ آباد کے
دیہاتی علاقہ کو جا کر نہیں دیکھا، میرے بہت سے نوجوان ساتھی جو وہاں ہم لوگوں
کی ہدایت کے مطابق کام کرنے گئے تھے، گرفتار ہوگئے تھے، اور ان کے پیچھے ضلع کے
اندر دیہاتوں میں نہ جانا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ بے وفائی
کرنا ہے۔

ایک بار پھر سیاہ رنگ کی قیدیوں کی گاڑی مجھے جیل خانہ واپس
لے گئی راستہ میں ہم لوگ ایک بہت بڑی فوج کے پاس گذرے جو ستیں

گی، فوجی موٹر کار وغیرہ وغیرہ کے ساتھ قدم سے
گاڑی کے اندر چھوٹے چھوٹے روشندانوں سے جھا
اپنے دل میں سوچنے لگا کہ فوجی موٹر کار اور ٹی
ان کو دیکھ کر مجھے قرون قبل تاریخ کے جیسے
دوسرے جانور یاد آگئے ۔

مجھے ریذیڈنسی جیل سے علی پور مرکز
وہاں مجھے ایک کوٹھڑی ملی جس کی لمبائی چوڑائی
اس کے سامنے ایک برآمدہ اور ایک چھوٹا سا
دالان بھی تھی، تقریباً ۔ فٹ کی ہوگی۔ اس کے
مجھے نظر آیا۔ ہر قسم کی عجیب عجیب عمارتیں تھیں
کوئی دو منزلہ کوئی گول ہے تو کوئی مستطیل
یہ عمارتیں ہر چہار طرف کھڑی تھیں، ان میں
عمارتوں سے اونچی تھیں، ایسا معلوم ہوتا
کھڑی ہوتی گئیں، اور کچھ اس طرح ایسی
بھی رقبہ تھا وہ سب پوری طرح کام میں آجا
گورکھ دھندا ہو یا کبھی استقبالی، معتزر
مجھے یہی سمجھایا گیا کہ یہ عمارتیں ترتیب سے بنائی گئی
ہے جو عیسائی قیدیوں کے لئے گرجا کا کام دیتا
چھوٹ نکلتی ہیں۔ چونکہ جیل خانہ شہر پر
بہت محدود تھا اور اس کے چپہ چپہ
میں اپنے اردگرد کی ان لفاہر عجیب

ادباپریہ درشنی

دیکھ کر مشکل اپنے حواس درست کرسکا تھا کہ ایک اور ہیبت ناک منظر دکھائی دیا، میری کوٹھری اور اس کے صحن کے ٹھیک سامنے دو چمنیاں تھیں جس میں سے سیاہ اور کثیف دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے اور کبھی کبھی ہوا اس دھوئیں کو میری طرف اڑا لاتی تھیں جس سے دم گھٹنے لگتا تھا۔ یہ چمنیاں جیل کے باورچی خانہ کی تھیں۔ میں نے بعد میں سپرنٹنڈنٹ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ اس حملہ کی مدافعت کے لئے گیس کے نقاب فراہم کرنا چاہئیے۔

جیل کی زندگی کی یہ ابتدا کچھ زیادہ دلچسپ نہ تھی اور مستقبل بھی زیادہ خوش آئندہ نہ تھا یعنی علی پور جیل کی سُرخ اینٹوں والی عمارتوں کے غیر متغیر منظر سے لطف اندوز ہوتے رہنا اور اس کے باورچی خانہ کی چمنیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو نگلنا اور سانس کے ساتھ اندر لینا۔ میرے صحن میں نہ کوئی درخت تھے نہ سبزہ، پورا کا پورا فرش پختہ، پکا اور صاف ستھرا رہتا تھا، دوسرے اس کوٹھے کے جو دھوئیں کی وجہ سے ہر روز بہرحال کرتا تھا، لیکن وہ بھی بالکل خالی اور ویران تھا۔ پاس کے صحن میں ایک یا دو درختوں کی پھنگیاں مجھے دکھائی دیں، لیکن میں جس زمانہ میں پہنچا ان میں نہ کوئی پتی نہ پھول۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک پراسرار تبدیلی ان میں ہوئی اور ان کی تمام شاخوں پر ہری ہری کونپلیں پھوٹ کر نکلنے لگیں، کونپلوں سے پتیاں نکلیں اور جلدی جلدی بڑھ کر انھوں نے سر سبز شاخوں کو اپنے خوش گوار سبزہ سے چھا لیا۔ یہ ایک ایسی خوش گوار تبدیلی تھی جس سے علی پور جیل میں بھی رونق اور زندگی معلوم ہونے لگی۔

انھیں میں سے ایک درخت میں چیل کا ایک گھونسلا تھا جس سے مجھے دلچسپی ہوگئی۔ میں اکثر اس کی طرف دیکھا کرتا تھا چیل کے بچے بڑے ہو رہے تھے۔

اور اپنے کاروبار کے گر بھی سیکھ رہے تھے! کبھی کبھی وہ نہایت تیز رفتاری اور نشانہ کی حیرت انگیز صحت سے نیچے جھپٹتے اور قیدی کے ہاتھ سے روٹی بلکہ منہ سے نوالہ تک جھپٹ کر لے جاتے تھے۔

غروب آفتاب کے وقت سے لے کر طلوع آفتاب تک دکم وبیش) ہم لوگ اپنی کوٹھڑیوں میں مقفل رہتے تھے، اور جاڑوں کی طویل شام کا کاٹنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ساعت بہ ساعت جب میں لکھتے لکھتے یا پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو اپنی کوٹھڑی کے اندر ٹہلنا شروع کرتا تھا، اور وہ بھی کیا! چار پانچ قدم آگے جاتا اور پیچھے لوٹتا۔ اس وقت مجھے جانور گھر کے ریچھ یاد آتے تھے جو کٹہرے میں بند آگے پیچھے ٹہلتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات جب میرا جی بہت زیادہ اکتا جاتا تھا تو میں اپنا مرغوب علاج (سرسنگ آسن، سر کے بل کھڑے ہو کر) کیا کرتا تھا۔

رات کے ابتدائی حصہ میں کچھ خاموشی رہتی تھی اور شہر کی کچھ آوازیں اندر آجایا کرتی تھیں مثلاً ٹرام گاڑی کا شور، گراموفون کی آواز، یا کہیں دور سے کسی شخص کے گانے کی آواز، دور سے دھیمی دھیمی موسیقی کی آواز مسکّن ذرا فرحت ہوتی تھی، لیکن کچھ رات گزرنے کے بعد پھر زیادہ آرام نہیں ملتا تھا اس لئے کہ پہرے کے سپاہی ادھر سے ادھر ٹہلتے رہتے تھے۔ اور ہر گھنٹہ گھنٹہ کوئی نہ کوئی معائنہ ہوتا رہتا تھا، بعض افسر لالٹین لے کر آتے تھے یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ ہم لوگ بچ کر بھاگ تو نہیں گئے، ہر روز یا یوں کہنا چاہیئے کہ ہر رات کو تین بجے ایک بڑا شور اور مٹی سے برتن ملنجھے اور رگڑنے کا عمل ہوا کرتا تھا۔۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ باورچی خانہ میں کام شروع ہو گیا۔

محافظ، پہرہ دار، افسر اور منشی بہت بڑی تعداد میں پریسیڈنسی میں

میں بھی متعین تھے اور علی پور جیل میں بھی ان دونوں جیل خانوں کی آبادی اور میری
جیل کی آبادی تقریباً برابر تھی یعنی ۲۲۰۰ سے ۲۳۰۰ تک لیکن ان میں سے ہر جیل
خانہ کا عملہ میری جیل کے عملے سے دُگنا تھا ان میں بہت سے یورپین وارڈر اور ہندوستانی فوج
کے پنشن یافتہ افسر تھے۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ بہ نسبت صوبہ متحدہ کے کلکتہ
میں حکومت برطانیہ کا انتظام زیادہ زوردار اور زیادہ مسرفانہ ہے۔ سلطنت برطانیہ
کی قوت اور جبروت کی ایک نشانی اور مستقل طور پر یاد دہانی کرنے والی ایک آواز
اور یہ تھی کہ جب اعلیٰ افسر قیدیوں کے قریب آتے تھے۔ تو قیدیوں کو ایک
نعرہ ضرور لگانا پڑتا تھا۔ یہ نعرہ "سرکار سلام" کا ہوتا تھا جو ذرا لمبی
آواز ایک خاص جسمانی حرکت کے ساتھ ادا کیا جاتا تھا اس نعرہ کی آوازیں
دن میں کئی بار میرے صحن کی دیوار کے اس طرف سے آیا کرتی تھیں اور
بالخصوص اس وقت جب سپرنٹنڈنٹ صاحب وہاں سے روزانہ گزرتے تھے
میں سات فٹ کی اونچی دیوار کی دوسری طرف ایک بہت بڑے شاہی چتر
کا صرف اوپر کا حصہ دیکھ سکتا تھا۔ جس کے سایہ میں یہ سپرنٹنڈنٹ صاحب چلا کرتے تھے۔

معلوم نہیں "سرکار سلام" کا یہ غیر معمولی نعرہ اور جس انداز سے یہ لگایا
جاتا تھا زمانہ قدیم کی ایک یادگار ہے یا کسی ذہین انگریز افسر کی ایجاد ہے۔ لیکن
میرا گمان ہے کہ کسی انگریز افسر ہی کی یہ ایجاد ہو گی۔ اس کی آواز میں ایک خاص
اینگلو انڈین لہجہ پایا جاتا تھا خوش قسمتی سے صوبہ متحدہ کی جیلوں میں اور غالباً علاوہ
بنگال اور آسام کے اور کسی صوبہ میں یہ نعرہ رائج نہیں ہے۔ جس طریقہ سے یہ
زبردستی کا سلام سرکار کی عظمت و جبروت کے سامنے کیا جاتا تھا مجھے باعث تذلیل
معلوم ہوتا تھا۔

البتہ علی پور جیل میں ایک اصلاح دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ معمولی قیدیوں کا

کھانا ممالک متحدہ کے جیل کے کھانے سے بہت زیادہ بہتر تھا اور جہاں تک جیل کی
خوراک کا تعلق ممالک متحدہ بہت سے صوبوں سے گیا گزرا ہے۔

جاڑوں کا مختصر زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ بہار کے دن بھی یوں ہی گزر گئے
اور گرمیاں شروع ہوئیں اور روز بروز گرمی بڑھتی گئی۔ مجھے کلکتہ کی آب و ہوا
کبھی پسند نہ تھی۔ تھوڑے دن بھی اس آب و ہوا میں رہنا ہوتا تو طبیعت پژمردہ
اور پست ہو جاتی تھی۔ جیل میں حالات قدرتاً اور بھی ابتر تھے اور جیسے جیسے دن گزرتے
گئے میری صحت اچھی نہ رہی غالباً اس وجہ سے کہ ورزش کے لئے جگہ نہ تھی۔ اور
دیر تک اس آب و ہوا میں مقفل رہنا پڑتا تھا میری صحت پر کسی قدر اس کا برا اثر
پڑا۔ اور میرا وزن تیزی سے کم ہونے لگا، مجھے تالوں اور چٹخنیوں سے، لوہے ۔
سیخوں اور دیواروں سے بڑی نفرت پیدا ہونے لگی۔

علی پور جیل میں ایک مہینے کے بعد مجھے اپنے صحن سے باہر کچھ ورزش کرنے
کی اجازت ملی۔ یہ ایک خوشگوار تبدیلی تھی۔ اور اب میں اصل دیوار کے نیچے صبح و شام
ٹہل لیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں علی پور جیل اور کلکتہ کی آب و ہوا کا عادی ہو گیا۔ اور
باورچی خانہ اور اس کا دھواں ایک شور و غل بھی ایک قابل برداشت مصیبت بن
گیا۔ اب دوسرے معاملات میرے دماغ میں سمانے لگے۔ دوسری پریشانیوں میں
مبتلا ہو گیا۔ کیونکہ باہر کی خبریں کچھ خوش کن نہ تھیں۔

---

(۴۰)

مشرقی اور مغربی جمہوریت کا مقابلہ

علی پور جیل میں مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ سزایابی کے بعد پھر مجھے کوئی روزانہ اخبار منگانے کی اجازت نہ ہوگی۔ جب تک میرا مقدمہ زیر سماعت رہا کلکتہ کا روزنامہ اسٹیٹسمین مجھے مل جاتا تھا۔ لیکن جس دن مقدمہ ختم ہوا اس کے دوسرے ہی دن سے یہ اخبار بھی بند ہو گیا۔ ہمارے صوبہ متحدہ میں ۱۹۳۲ء سے برابر ایک روزنامہ اخبار (جس کو حکومت پسند کرے) درجۂ الف یا درجہ اول قسم کے قیدیوں کو دیے جانے کی اجازت تھی۔ یہی حال اکثر دوسرے صوبوں میں تھا۔ اور اسی وجہ سے غالباً میرا یہ گمان تھا کہ یہی قاعدہ بنگال میں بھی ہوگا۔ بہرکیف بجائے روزنامہ اسٹیٹسمین کے اب ہفتہ وار اسٹیٹسمین مجھے دیا جانے لگا۔ ظاہر ہے کہ یہ اخبار صرف ان انگریز افسروں کے لئے ہوتا ہے جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں یا ان تاجروں کی دلچسپی کے لئے ہوتا ہے جو انگلستان واپس چلے گئے ہوں۔ اس میں ایسی ہی خبروں کا خلاصہ دیا جاتا ہے جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی بیرونی خبریں اس میں بالکل نہیں دی جاتی تھیں اور چونکہ میں ان خبروں کو بالالتزام پڑھنے کا عادی تھا اس لئے ان کا نہ ہونا بہت محسوس ہوتا تھا مگر خوش قسمتی سے پھر ہفتہ وار مانچسٹر گارڈین منگانے کی مجھے اجازت مل گئی اور اس کے ذریعہ میں یورپ اور بین الاقوامی معاملات سے باخبر رہنے لگا۔

فروری میں جب میری گرفتاری اور مقدمہ ہوا اسی زمانہ میں یورپ میں بڑے تلخ

جھگڑے لڑائیاں اور ہنگامے ہوئے۔ اس میں ہنگاموں کا نتیجہ فاشسٹی طوروں کی صورت
میں ظاہر ہوا۔ اور ایک قومی حکومت کی تشکیل ہوئی۔ اس سے کہیں زیادہ ابتر حالت
آسٹریا میں تھی جہاں چانسلر ڈالفس نے مزدوروں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر اشتراکی جمہوریت کا
قلع قمع کر دیا۔ آسٹریا میں خونریزی کی خبروں نے مجھے بہت ہی افسردہ کیا۔ یہ دنیا بھی کیسی
گرمی اور مصیبت کی جگہ ہے اور انسان بھی کتنا وحشی ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنے مستقل
اغراض کی حفاظت کرنے پر تل جائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام یورپ اور امریکہ میں فاشزم
پھیلتا جا رہا ہے۔ جرمنی میں جب ہٹلر کا اقتدار ہوا تو میرا خیال تھا کہ اس کی حکومت زیادہ
عرصہ تک نہیں رہے گی اس لئے کہ جرمنی کی مالی مشکلات کا اس نے کوئی حل پیش نہیں کیا
تھا۔ اسی طرح جہاں کہیں اور فاشزم پھیلا میں نے اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دی کہ سرمایہ
داری کا یہ آخری مورچہ ہے اور اس کے بعد یقیناً وہ وقت آئیگا کہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ
جائیں گی لیکن پھر سوچتا تھا کہ یہ میرے خیالات ہیں یا میری آرزوئیں۔ کیا یہ واقعی اتنی ہی آسان
بات ہے کہ فاشزم کی روح اس قدر آسانی اور تیزی سے سرد ہو جائے گی۔ اور اگر فاشسٹی
مطلق العنانی (ڈکٹیٹرشپ) کے لئے حالات بالکل ناقابل برداشت بھی ہو جائیں تو ایسی
حالت میں کیا وہ لوگ اپنے ملکوں کو تباہ کن جنگوں میں پھنسا دیں گے۔ بجائے اس کے کہ خود
ہار مان لیں؟ اور پھر اس کشمکش کا آخر حشر کیا ہوگا؟

اسی اثنا میں قسم قسم کا فاشزم دنیا میں پھیلا۔ اسپین جہاں لبرل خیالات کے لوگوں کی جمہوری
حکومت کا جدید نظام قائم ہوا تھا اس کے متعلق کسی نے خوب کہا کہ بس گویا ہو ہر حکومتوں کا
میجر گارجین ہے وہ بھی بری طرح رجعت پسندی کی طرف واپس لوٹ گیا تھا۔ وہاں کے ایماندار
لبرل رہنماؤں کی اچھی اچھی باتوں کے باوجود اس کو پیچھے کی طرف پھسلنے سے نہیں روکا جا سکا۔
ہر جگہ لبرل تحریک جدید حالات کا مقابلہ کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئی وہ لوگ بس لفاظی اور
حلوے کے پیچھے پڑے رہے اور نادانی سے یہ سمجھتے رہے کہ باتیں بنانا اور کام کرنا برابر ہے چاہے حرکت کی

موقع آیا تو وہ اسی طرح چپ چاپ غائب ہو گئے جیسے کسی فلم کے آخری حصّے کا اختتام ہوتا ہے۔

آسٹریا کے المناک حالات پر مسٹر گارڈین کا مقالہ افتتاحیہ میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا اور اس کو پسند کیا۔ اس نے لکھا تھا کہ معلوم نہیں اس خونریز جھگڑے کے بعد اب آسٹریا کی کیا صورت ہوگی؟ کیا آسٹریا پر اب یورپ کے سب سے زیادہ رحمت پسند لوگ مندر توپوں اور مشین گنوں کے ذریعے حکومت کریں گے؟" لیکن اگر انگلستان آزادی کا حامی ہے تو آخر اس کے وزیر اعظم کی زبان اتنی خاموش کیوں ہو گئی ہے؟ ہم نے ان کی زبان سے ڈکٹیٹرشپ کی تعریفیں سنی ہیں ہم نے انھیں یہ کہتے سنا ہے کہ اس کی بدولت قوموں کی روح کیسے زندہ ہو تی ہے۔ اور ایک نیا نقطۂ نظر اور نئی جان پیدا ہو جاتی ہے" اس لئے انگلستان کے وزیر اعظم کو ان بے رحمیوں اور سفاکیوں کے متعلق بھی کچھ اظہار خیال کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ کسی ملک سے تعلق رکھتی ہوں، جو اکثر جسموں کو قتل کرتی ہیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ روح کو موت کا منہ دکھاتی ہیں۔ اور اس سے کہیں بری موت کا"

لیکن خود مسٹر گارڈین اگر آزادی کا حامی ہے تو جب ہندوستان میں آزادی کا سر کچلا جاتا ہے اس وقت اس کی زبان سے کچھ کیوں نہیں نکلتا؟ ہم لوگوں نے کئی طرح جسمانی تکالیف برداشت کی ہیں مگر اس سے کہیں زیادہ وہ مصیبت ہے جو ہماری روح نے جھیلی ہے۔

"آسٹریا کی جمہوریت تباہ کر دی گئی۔ گو اس نے آخر دم تک مقابلہ کیا جس سے اس کی عظمت اور شان ہمیشہ قائم رہے گی اور ایک ایسی داستان باقی رہے گی جس سے شاید آئندہ پھر کبھی یورپ کی آزادی کی چنگاری روشن ہو جائے!!

"یورپ اب آزادی کی سانس نہیں لے سکتا۔ اس لئے کہ وہ اب آزاد نہیں رہا۔ وہاں صحیح قسم کے جذبات اور خیالات کا اظہار اور تبادلہ مفقود ہے رفتہ رفتہ دم گھٹنے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور اب سوائے اس کے کہ کوئی شدید لڑائی کی کیفیت یا انقلاب

ہی اندر سے کوئی تشنجی کیفیت ظاہر ہوا اور خود بخود دائیں بائیں ہر طرف ہاتھ مارنا شروع
کر دیا جائے تو شاید اس دلدل سے بچ سکے جو دماغ پر گرنے والا ہے، دریائے رائن سے
لے کر یورال تک یورپ ایک بہت بڑا قید خانہ ہے"

یہ وہ دل ہلانے والی عبارتیں تھیں جن کی صدائے بازگشت میرے دل سے
بھی اٹھی لیکن اسی کے ساتھ میں حیرت سے سوچتا تھا کہ آخر ہندوستان کے متعلق کیا
ہو گیا ہے؟ ہمیشہ کا رخین یا آزادی کے دوسرے حامی جن کا وجود انگلستان میں یقینا
ہے ہماری حالت کی طرف سے ایسے بے خبر کیوں ہیں، جس بات کو دوسری جگہ وہ اس
قدر جوش سے برا کہتے ہیں اس کی طرف سے یہاں کیسے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ایک بہت
بڑے انگریز لبرل لیڈر نے جن کی تعلیم و تربیت اور پرورش انیسویں صدی کے احول
اور روایات میں ہوئی تھی جو طبعاً بہت محتاط اور بہت سنبھل کر گفتگو کرنے والے آدمی
تھے۔ بیس سال ہوئے جنگ عظیم شروع ہونے سے قبل کہا تھا کہ "بجائے اس کے کہ میں جابر قوت
کے ساتھ قانون کے مقابلہ میں قدرت کی اس افسوسناک کامیابی کا نظارہ دیکھوں۔
میں یہ پسند کروں گا کہ ہمارا یہ ملک صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے" یہ ایک
بہادرانہ خیال تھا جو نہایت فصاحت سے بیان کیا گیا اور انگلستان کے لاکھوں جانباز
نوجوان اس کے تحفظ کے لئے نکل کھڑے ہوئے لیکن آج اگر کوئی ہندوستانی مسٹر اسکوئتھ
کی طرح کوئی بیان دینے کی جرأت کرے تو معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہو۔

قوموں کی نفسی کیفیت بھی کس قدر پیچیدہ ہوتی ہے اپنے متعلق ہم میں سے
اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں۔ کہ ہم لوگ تو حق و انصاف پر ہیں باقی دوسرے لوگ اور دوسرے
ملک غلطیاں اور بے انصافیاں کرتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح ہمیں اس کا یقین ہو جاتا ہے
ہم دوسروں کی طرح نہیں ہیں کچھ فرق ضرور ہے لیکن آداب شرافت کا تقاضا ہے کہ اس پر
زیادہ زور نہ دیا جائے اور اگر خوش قسمتی سے ہم لوگ ایک حکمراں قوم ہونے کی حیثیت سے

دوسرے ممالک کی قسمتوں کے مالک ہوں تو پھر تو یہ یقین ہر کر مشکل ہو جاتا ہے کہ اس
بہترین دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یہی سب سے بہتر ہے اور جو لوگ اس کے خلاف شور
کرتے ہیں وہ یا تو خود غرض ہیں یا فریب خوردہ احمق جو ہماری بخشی ہوئی نعمتوں اور برکتوں
کی ناشکری کرتے ہیں۔

برطانوی لوگ ایک جزیرے کی رہنے والی قوم ہیں اور مسلسل کامیابی اور دولت
کی وجہ سے وہ تمام دوسرے لوگوں کو حقیر اور ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ کسی نے ان کے متعلق کہا
ہے کہ ان کے خیال میں تو حبشیوں کی بستی کیلے سے شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ الفاظ
بہت زیادہ عام ہیں غالباً برطانیہ کے اعلیٰ طبقوں کی نظر سے دنیا کو تو تقریباً حسب ذیل درجوں
میں تقسیم کیا جائے گا (۱) برطانیہ۔ اس کے بعد بہت جگہ چھوڑ کر (۲) برطانوی نوآبادیات (صرف
گورے رنگ کی آبادیاں) اور امریکہ لیکن صرف اینگلو سیکسن۔ باقی دوسرے یورپی ممالک
کے مہاجر اس میں شامل نہیں (۳) مغربی یورپ (۴) یورپ کا باقی حصہ (۵) جنوبی امریکہ
(لاطینی اقوام) اس کے بعد پھر بہت جگہ چھوڑ کر (۶) ایشیا اور افریقہ کی سانولے، زرد
اور سیاہ رنگ کی اقوام سب کو کم و بیش ایک ہی طبقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

ہم آخری درجے والے ان طبقوں سے کتنے دور ہیں جہاں ہمارے حکمران رہتے
ہیں! پھر کیا کوئی تعجب کی بات ہے کہ جب کبھی وہ ہماری طرف نظر کرتے ہیں تو انہیں سب
دھندلا دھندلا دکھائی دیتا ہے اور پھر جب ہم لوگ کہتے ہیں آزادی جمہوریت کی بات چیت
کرے تو انہیں اس سے چڑ ہوتی ہے۔ یہ الفاظ (آزادی و جمہوریت) شاید ہم لوگوں کے لئے نہیں
ہے ہیں ایک بہت بڑے لبرل مدبر جان مارلے نے کیا یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ مستقبل بعید
میں بھی وہ ہندوستان کے لئے جمہوری نظام حکومت کا تصور کبھی نہیں کر سکتے کناڈا کے ناپ
والے لبادے کی طرح ہندوستان کی آب و ہوا کے لئے جمہوری نظام حکومت موزوں اور
مناسب ہی نہیں ہے اور بعد میں برطانیہ کے مزدوروں کی جماعت نے جو تحریک اشتراکیت کی

علمبردار اور غریبوں کی حامی اور مددگار سمجھی جاتی ہے یہی فتح و کامیابی کے جوش میں ہم لوگوں کو سنہ ۱۹۲۴ء میں جو کچھ زیادہ سنگال آرڈی نینس کی تجدید کی صورت میں تھا اور ان کے دوسرے دور حکومت میں ہماری قسمت پہلے سے بھی زیادہ کھوٹی نکلی مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے بدخواہ نہیں ہیں اور جب وہ اپنے واعظانہ انداز میں ہمیں مخاطب کر کے کہتے ہیں "پیارے اور محبوب ماتحتو" تو ان کا دل نیکی کے احساس سے یقیناً معمور ہوتا ہے۔ لیکن بہر حال ہم ان کی نگاہوں میں وہ نہیں ہو سکتے جو وہ خود ہیں اور نہیں دوسرے ہی معیاروں سے جانچا جا سکتا ہے جب ایک انگریز اور ایک فرانسیسی لسانی اور تمدنی اختلافات کی وجہ سے ہم خیال نہیں ہو سکتے تو پھر ایک انگریز اور ایک ایشیائی میں کتنا زبردست فرق ہوگا۔

حال ہی میں ہندوستان کے اصلاحات کے مسئلے پر دارالامرا میں بحث و مباحثے ہو رہے تھے اور متعدد امراء نے بڑی بصیرت افروز تقریریں کیں۔ ان میں سے ایک تقریر لارڈ ولنگڈن کی تھی جو ہندوستان کے ایک صوبے میں سالہا سال گورنر رہ چکے ہیں اور جنھوں نے کچھ عرصے تک وائسرائے کی قائم مقامی بھی کی تھی۔ ان کے متعلق اکثر کہا گیا ہے کہ وہ آزاد خیال اور بہت ہمدرد گورنر تھے بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "مجموعی حیثیت سے حکومت ہندوستان کی اس سے کہیں زیادہ نمائندگی کرتی ہے جتنی کہ سیاسئین حکومت نمائندگی کر سکتی ہے۔ حکام کی طرف سے اور اہل پولیس کی طرف سے، والیان ریاست کی طرف سے اور ہندو، مسلمان دونوں کی طرف سے۔ برخلاف اس کے کانگریس کے سیاسئین جمہور قوم میں کسی ایک فرقے کی نیابت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔" آگے چل کر انھوں نے اپنے مطلب کو اور زیادہ واضح کر دیا کہ "جب میں ہندوستان کی رائے عامہ کا ذکر کرتا ہوں۔ تو میرے ذہن میں وہ لوگ ہیں جن کے تعاون عمل پر مجھے بھروسا کرنا پڑا تھا اور آئندہ بھی وائسرائے اور گورنروں کو جن کے تعاون پر بھروسہ کرنا پڑے گا"

له دارالامراء، ۱۰ دسمبر [illegible]ء

اس تقریر سے دو بہت دلچسپ باتیں نکلتی ہیں، ایک تو یہ کہ ہندوستان سے مطلب صرف وہ ہندوستان ہے جو برطانیہ کی مدد کرتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں سب سے زیادہ نمائندہ جماعت ہے اس لئے اس ملک میں سب سے زیادہ جمہوری ادارہ یہی ہے چونکہ یہ دلیل سنجیدگی سے پیش کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر موقع کے اس پار انگریزی الفاظ کے معنی کچھ تبدیل ہو جاتے ہیں چنانچہ اس دلیل کے بعد بظاہر دوسرا دعویٰ یہ کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ بادشاہ ہر شخص کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے مطلق العنان حکومت سب سے زیادہ نمائندہ اور جمہوری ہوتی ہے اور اس صورت سے ہم لوگ ایک بار پھر اس نظریئے پر پہنچ جاتے ہیں کہ بادشاہ مامور من اللہ ہوتا ہے اور "ریاست کیا ہے میں ہی ریاست ہوں"۔

واقعہ یہ ہے کہ حال ہی میں خالص مطلق العنانی کی حمایت بھی ایک بہت ہی ممتاز شخص نے کی ہے۔ انڈین سول سروس کے مایۂ ناز رکن سر میلکم ہیلے نے بحیثیت گورنر صوبہ جات متحدہ نومبر ۱۹۳۶ء کو بنارس میں تقریر کرتے ہوئے دیسی ریاستوں میں مطلق العنانی کی حمایت کی تھی۔ حالانکہ اس قسم کی نصیحت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس لئے کہ کوئی دیسی ریاست خود اپنی مرضی سے مطلق العنانی کو ترک کرنے والی نہیں معلوم ہوتی اور ایک دلچسپ بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ مطلق العنانی کی حمایت کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یورپ میں جمہوریت ناکام ثابت ہو رہی ہے۔ ریاست میسور کے دیوان سر مرزا اسمٰعیل نے تعجب ظاہر کیا ہے کہ ایک طرف پارلیمنٹری جمہوریت ہر جگہ روبہ زوال پذیر ہے اور دوسری طرف کایا پلٹ دینے والی اصلاحات کی تائید کی جا رہی ہے "اور مجھے یقین ہے کہ اس ریاست کا ہر ضمیر گواہی دیگا کہ ہمارا موجودہ دستور اساسی ہماری تمام ضروریات کے لئے عملاً کامل طور پر جمہوری ہے"[1]

ریاست میسور کا ضمیر غالباً مہاراجہ اور دیوان کے لئے ایک مابعد الطبیعی تصور ہے۔ میسور

---

[1] میسور، ۲۱ جون ۱۹۳۴ء، ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲۴ کا حاشیہ۔

میں جس قسم کی جمہوریت اس وقت رائج ہے اس میں اور مطلق العنانی میں کوئی فرق نہیں
اگر ہندوستان کے لئے جمہوری نظام حکومت موزوں نہیں ہے تو یہ ظاہر ہے مصر
کے لئے بھی اسی طرح یہ نظام جمہوری ناموزوں ہوگا۔ میں نے اخبار اسٹیٹسمین میں ایک
کرہ اخبار موجودہ جیل میں مجھے دیا جاتا ہے، قاہرہ کا ایک طویل مراسلہ پڑھا ہے جس میں بتایا گیا
ہے کہ وزیر اعظم نسیم پاشا نے "وفد" دار حلقوں میں اپنے اس اعلان سے کچھ کم خطرہ نہیں پیدا کیا
ہے کہ انہیں توقع ہے کہ تمام سیاسی جماعتوں سے اور بالخصوص وفد جماعت سے اشتراک
عمل حاصل ہوگا اور یا تو ایک مقامی کانفرنس ہوگی یا
کے لئے انتخابات ہوں گے۔ لیکن بہر صورت ایک جدید دستور اساسی کی تشکیل کی جائے گی
اس کا مطلب بالآخر صرف یہ ہوگا کہ ایک جمہوری نظام حکومت کی طرف پھر عود کیا جائے۔
حالانکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے لئے یہ طرز عمل ہمیشہ شاہ کن ثابت ہوا اس لئے کہ مصر
میں اس سلسلے ہمیشہ عوام الناس کے خراب سے خراب جذبات کا پاس ملحوظ رکھا گیا جو شخص بھی
مصری سیاست کی اندرونی حالت سے کچھ واقف ہے اس کو ایک لمحہ کے لئے اس میں کوئی
شبہ نہیں ہے کہ انتخابات میں ایک بار پھر وفد جماعت اکثریت کے ساتھ منتخب ہوگی۔ اس لئے
اگر اس طریق کار کو روکنے کے لئے کوئی تدابیر اختیار کی گئی تو کچھ عرصہ کے بعد ایک بار ہمارے
سر ایک ایسی حکومت ڈالی جائے گی جو ضرورت سے زیادہ جمہوری پردیسیوں کی مخالف انتہائی
حکومت ہوگی"

یہ تجویز کی گئی ہے کہ انتخابات اس طرح کرائے جائیں کہ وفد جماعت کے توڑ کے لئے
حکومت کے اثر واقتدار سے کام لیا جائے لیکن بدقسمتی سے وزیر اعظم کا دماغ اتنا زیادہ قانونی
واقع ہوا ہے کہ وہ اس قسم کی کوئی بات نہیں کر سکتے اس کے علاوہ دوسری صورت یہ
باقی رہ گئی ہے کہ برطانیہ بالکل مداخلت کرے۔ اور یہ تہیہ کرلے کہ اس قسم کی حکومت

لے ۹ دسمبر ۱۹۳۴ء

کو وہ دوبارہ برداشت نہ کرے گا۔

اس میں یہ نہیں کہ وائٹ ہال اس معاملے میں کوئی کارروائی کرے گا یا نہیں یا مصر میں کیا ہوگا؟[1] لیکن اس دلیل سے جو غالباً ایک حریت پسند انگریز نے پیش کی ہے ہمیں ہندوستان اور مصر کے حالات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں کسی قدر مدد ضرور ملے گی۔ اسپنسر ہیمن نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ "عراق کی حقیقت یہ رہی ہے کہ مصری رائے دہندے کا طرز زندگی اور زاویہ نگاہ اس طرز زندگی اور زاویہ نگاہ سے مطابقت نہیں رکھتا جس سے جمہوریت کی نشوونما ہوتی ہے" اس عدم مطابقت کی مثال آگے چل کر دی گئی ہے "یورپ میں بالعموم جمہوریت کا خاتمہ اس لئے ہوا کہ وہاں بہت زیادہ جماعتیں تھیں۔ اور مصر میں یہ مشکل درپیش ہے کہ وہاں صرف ایک ہی جماعت ہے یعنی وفد"

ہندوستان میں ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری فرقہ وارانہ تقسیم ہماری جمہوری ترقی میں حائل ہے اور اس لئے اس ناقابل تردید منطق کی وجہ سے ان تقسیموں کو مستقل طور پر قائم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم لوگ پورے طور پر متحد نہیں ہیں۔ مصر میں کوئی فرقہ وارانہ اختلافات نہیں ہیں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مکمل سیاسی اتحاد قائم ہے۔ اس کے باوجود یہی اتحاد آزادی اور جمہوریت کی کی راہ میں ایک روڑا سمجھا جاتا ہے سچ یہ ہے کہ جمہوریت کا راستہ بالکل سیدھا اور تنگ ہے ایک مشرقی ملک کے لئے جمہوریت کے معنی صرف یہ معلوم ہوتے ہیں۔ کہ وہاں برسراقتدار سلطنت کے احکام کی تعمیل کی جائے اور اس کے مفاد کو نہ چھوا جائے صرف اس ایک شرط کے بعد جمہوری آزادی بلا روک ٹوک یہاں پھل پھول سکتی ہے۔

---

[1] نومبر ۱۹۳۵ء میں برطانوی تسلط کے خلاف مصر بھر میں بلوے ہو رہے تھے۔

(٦١)

اوداسی

”اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنا سر اس جگہ رکھ دوں جہاں گئی ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی اور خوشگوار ہو۔ اے ماں یہ تھکا ہوا بچہ تیرے
قدموں میں پڑا ہے۔ اس کے سامنے جواب اس کے دل سے محو ہو گئے ہیں“

اپریل کا مہینہ آگیا باہر کے واقعات کی کچھ اڑتی اڑتی خبریں ہی بند محل کی کوٹھری میں میرے کانوں تک پہنچیں۔ اور یہ خبریں بہت ناخوشگوار اور پریشان کن تھیں۔ ایک روز جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اور باتوں کے سلسلے میں مجھ سے یہ کہا کہ مسٹر گاندھی نے تحریک سول نافرمانی کو روک دیا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ یہ خبر میرے لئے صدمہ کی تھی اور مجھے اس تحریک کے ختم ہو جانے کا قلق ہوا۔ جس میں میں نے اپنے آپ کو کئی سال سے محو کر دیا تھا۔ پھر بھی اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ اس کا خاتمہ تو بہر حال ہونا ہی تھا۔ میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی نہ کسی وقت سول نافرمانی کو کم از کم کچھ مدت کے لئے بند کرنا ہی پڑے گا۔ افراد تو بے شک تاریخ کی پروا کئے بغیر ایک غیر محدود مدت تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن قومی ادارے اس طریقے سے کام نہیں کرتے ہیں مجھے اس بارے میں مطلق شک نہ تھا۔ کہ گاندھی جی نے تمام ملک کی اور اکثر کانگرسی کارکنوں کی ذہنی کیفیت کا صحیح اندازہ کیا ہے اس لئے ہر چند کہ یہ جدید تبدیلی ناخوشگوار تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

میں نے یہ افواہ بھی سنی کہ کونسلوں میں جانے کی غرض سے سوراج پارٹی
کو دوبارہ زندہ کرنے کی ایک نئی تحریک اٹھائی گئی ہے۔ یہ خبر بھی ناگریسی معلوم
ہوتی تھی اور ایک عرصے سے میری یہ رائے تھی کہ کانگریس آئندہ انتخابات سے کنارہ
کشی نہیں اختیار کر سکتی۔ جیل جانے سے باہر پہلے کی آزادی کے زمانے میں میں نے اس
رجحان کو روکنے کی کوشش کی تھی اس لئے کہ میں اسے قبل از وقت سمجھتا تھا اور مجھے یہ
اندیشہ تھا کہ اس کی وجہ سے عملی جدوجہد ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ اور پھر عام کانگریسیوں میں سماجی
تبدیلیوں کے متعلق جو نئے نئے خیالات کا خمیر اٹھ رہا ہے اس کی طرف سے توجہ ہٹ جائے گی
میں سمجھتا تھا کہ جتنی دیر تک یہ کشمکش جاری رہے گی اتنے ہی زیادہ یہ خیالات عوام میں اور تعلیم
یافتہ طبقوں میں بھی پھیلیں گے اور ہماری سیاست اور معیشت کی تہ میں جو حقائق ہیں وہ
صاف صاف ظاہر ہو جائیں گے۔ جیسا کہ لینن نے کسی جگہ کہا ہے "ہر قسم کی سیاسی کشمکش مفید
ہوتی ہے اس لئے اس کی وجہ سے چھپی ہوئی باتیں کھل جاتی ہیں اور میدان سیاست میں جو
اصل قوتیں کارفرما ہیں وہ ظاہر ہو جاتی ہیں واقعات منظر عام پر آجاتے ہیں اور لوگ حقیقت
کے سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں" مجھے بھی یہ توقع تھی کہ اس طریقے سے کانگریس کے خیالات سلجھ
جائیں گے۔ اس کی منزل مقصود واضح ہو جائے گی۔ اور اس کا شیرازہ زیادہ مضبوطی
سے بند ہو جائے گا۔ غالباً کچھ کمزور عناصر اس میں سے نکل جائیں گے لیکن اس سے
کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور جب وہ وقت آئے گا کہ اصولی حیثیت سے بھی عملی جدوجہد کے
طریقے کو ترک کر کے آئینی اور قانونی طریقوں کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ تو کانگریس کا
ترقی پسند اور کام کرنے والا عنصر ان طریقوں کو بھی اپنے اصل مقصد کے وسیع نقطہ
نظر سے استعمال کر سکے گا۔

بہ ظاہر تو وہ وقت اب آ گیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ جو
کانگریس کے مؤثر کام اور سول نافرمانی کی تحریک کے روح رواں سمجھے جاتے تھے

وہ تو پیچھے ہٹ رہے تھے اور دوسرے حضرات جنھوں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا
بر سر اقتدار ہوتے جاتے تھے

کچھ روز بعد ہفتہ وار اسٹیٹس مین میرے پاس آیا اور اس میں گاندھی جی کا وہ
بیان تھا جو انھوں نے تحریک سول نافرمانی واپس لیتے وقت شائع کیا تھا۔ میں نے اسے
حیرت سے پڑھا اور مجھے اس قدر رنج ہوا کہ دل بیٹھنے لگا۔ میں نے اس کو بار بار پڑھا اور
سول نافرمانی اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو مقصد تھا غائب ہو گیا اور اس کی جگہ
شکوک و شبہات اور خیالات کی کشمکش نے لے لی۔ گاندھی جی نے لکھا تھا کہ ستیہ گرہ آشرم
کے رہنے والوں سے ایک رفیق کی بات چیت اس بیان کی محرک ہوئی۔ ایک گفتگو کے دوران
میں مجھے یہ عبرت انگیز اطلاع ملی کہ ایک قابل قدر قدیم رفیق نے جیل جانے کو مقررہ
کام پورا کرنے میں تامل کیا اور اپنے کتب بینی کے شغل کو اس پر ترجیح دی۔ یہ
بات ستیہ گرہ کے اصول کے خلاف ہے لیکن اپنے اس عزیز دوست کی خامی سے بھی زیادہ
مجھے خود اپنی خامیوں کا اتنا احساس ہوا تھا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرے
دوست نے کہا کہ وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کی کمزوریوں سے واقف ہوں۔ لیکن میں اندھا تھا
اور ایک قائد کا اندھا ہونا کبھی قابل معافی نہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فی الحال صرف مجھی
کو سب کی طرف سے سول نافرمانی کرنی چاہیے۔"

گاندھی جی کے ان دوست کی خامی یا قصور اگر اسے قصور کہا جا سکتا ہے۔ ایک
بہت ہی معمولی سی بات تھی۔ میں خود اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے بارہا یہ جرم سرزد
ہوا ہے۔ اور مجھے اس کا مطلق افسوس اور پچھتاوا نہیں ہے لیکن اگر یہ معاملہ سنگین
بھی تھا تو کیا ایک اتنی وسیع قومی تحریک کو جس میں بیسیوں ہزار آدمی بلا واسطہ اور لاکھوں
آدمی بالواسطہ شریک تھے محض اس لئے بند کر دینا چاہیے تھا کہ فرد سے کوئی غلطی سرزد
ہو گئی۔ مجھے تو یہ بات بالکل خلاف عقل اور منافی اخلاق معلوم ہوئی میں یہ کہنے کی جرات

نہیں کرسکتا۔ کہ کونسی بات ستیہ گرہ کے مطابق ہے اور کون سی نہیں ہے! لیکن ہی
سانوں کے لائق ہیں نے بھی بعض اصولوں کی پیروی کی کوشش کی ہے اور گاندھی جی
کے اس بیان سے یہ سارے اصول درہم برہم ہوگئے۔ میں جانتا تھا کہ عموماً گاندھی جی
اپنے وجدان کے مطابق عمل کرتے ہیں میں اسے "صدائے باطن" یا دعاؤں کے جواب
کے بجائے وجدان ہی کہوں گا، اور اکثر ان کا وجدان صحیح بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے بار
بار یہ ثابت کردیا ہے کہ عوام کی ذہنیت کو سمجھنے اور ترتیب کے وقت کام کرنے کا انھیں ایک
خاص ملکہ حاصل ہے۔ بعد میں وہ اپنے عمل کی جو توجیہیں کرتے ہیں وہ عموماً نکتہ بعد
از وقوع کی حیثیت رکھتی ہیں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی کو مطمئن کرسکیں
ہر لیڈر یا عملی آدمی کو نازک موقعوں پر ہمیشہ تحت شعوری پر کام کرنا پڑتا ہے۔ اور
پھر وہ اپنے عمل کی توجیہیں تلاش کرتا ہے۔ میں یہ سمجھتا تھا۔ کہ سول نافرمانی کو ملتوی
کرنے میں گاندھی جی نے وہی کیا جو قرین مصلحت تھا لیکن جو دلیل انھوں نے دی وہ
میرے نزدیک عقل و فہم کے لئے باعث توہین تھی اور ایک قومی تحریک کے لیڈر
سے بہت بعید تھی۔ انھیں پورا حق حاصل تھا کہ اپنے آشرم والوں کے ساتھ جو جی چاہے
کرتے ان حضرات نے طرح طرح کے عہد کئے تھے۔ ایک خاص ضابطے کی پابندی کا اقرار
کیا تھا۔ لیکن کانگریس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اور نہ میں نے کیا تھا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ہم
س طرح چلائے جائیں ان وجوہ کی بنا پر جو میرے نزدیک تصوف یا مابعد الطبیعیات
تعلق رکھتے ہیں اور جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں کیا یہ تصور میں آسکتا ہے کہ کوئی
یاسی تحریک اس بنیاد پر چل سکتی ہے؟ میں نے اسی خوشی سے ستیہ گرہ کے
قی پہلو کو جہاں تک کہ میں اس کو سمجھ سکتا تھا بعض شرائط کے ساتھ تسلیم کیا
س کا بنیادی اصول مجھے پسند تھا۔ اور میں سمجھتا تھا کہ وہ سیاست کو
تر اور برتر سطح پر پہنچا دے گا۔ میں یہ ماننے کیلئے تیار تھا کہ اچھے مقصد کے

لئے بُرے ذرائع اختیار کرنا جائز نہیں لیکن اس ہی تاویل کے نتائج بہت دور تک پہنچے تھے اور اس میں ایسے پہلو نکل سکتے تھے جن سے مجھے طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو گئے۔

اس پورے بیان نے مجھے سخت تردد اور پریشانی میں ڈال دیا۔ آخر میں کانگریس والوں کو نصیحت کی گئی تھی کہ انھیں لازم ہے کہ ایثار اور اختیاری افلاس کی خوبیوں کو سمجھیں اور اس کی عادت ڈالیں۔ انھیں چاہئے کہ قومی تعمیر کے کاموں میں لگ جائیں یعنی خود چرخہ کات کر اور کپڑا اس کر کھدر کو رواج دیں زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کر کے مختلف فرقوں میں قلبی اتحاد پیدا کریں۔ اپنی ذات سے چھوت چھات کو خواہ وہ کسی شکل میں ہو دور کر دیں۔ ان لوگوں پر جو نشے کے عادی ہیں ذاتی اثر ڈال کر اور خود ہر لحاظ سے پاک صاف زندگی بسر کر کے ترک منشیات کی تلقین کریں۔ ان خدمات کے ذریعہ انسان اتنا کما سکتا ہے کہ غریبوں کی سی زندگی گزارے۔ لیکن جو لوگ اس قدر عسرت سے بسر نہیں کر سکتے انھیں چاہئے کہ ان چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو جو قوم کے لئے مفید ہیں اور جن میں زیادہ آمدنی کی گنجائش ہے اختیار کریں۔

یہ وہ سیاسی پروگرام تھا جس پر ہم لوگوں کو عمل کرنا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے اور گاندھی جی کے درمیان ایک بہت بڑا خلیج حائل ہو گیا۔ درد کی ایک ٹیس کے ساتھ میں نے یہ محسوس کیا۔ اطاعت اور وفاداری کے جن رشتوں نے سالہا سال سے مجھے ان کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گئے۔ ایک عرصہ سے میرے اندر ایک ذہنی کشمکش جاری تھی گاندھی جی کی بہت سی باتیں یا تو میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ یا مجھے پسند نہیں آتی تھیں۔ ان کے ساتھ، تحریک سول نافرمانی کے زمانے میں جب ان کے ساتھی لڑائی میں مصروف تھے ان کے دوسرے مسائل

میں شریک ہونا ان کی ذاتی اور خود پیدا کی ہوئی پابندیاں تھیں جن کی بدولت انہیں
یہ عجیب روش اختیار کرنی پڑی کہ جیل کے چھوٹنے کے بعد بھی اپنے عہد کی رُو سے
سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتے تھے ان کا پرانے تعلقات اور عہد و پیمان کو
نظرانداز کر کے اور ان کاموں کو جو بہت سے رفیقوں کے ساتھ مل کر شروع کئے
تھے نا تمام چھوڑ کر نئے تعلقات اور نئے عہد و پیمان میں الجھنا، ان سب
باتوں سے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔

مجھے اپنی رہائی کے مختصر زمانے میں یہ اور دوسرے اختلافات پہلے سے بھی
زیادہ محسوس ہوئے تھے۔ گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ میرے اور ان کے مزاج
میں اختلاف ہے لیکن شاید یہ اختلافات اختلاف مزاج سے کچھ سوا تھے اور میں یہ
دیکھتا تھا کہ اکثر معاملات کے متعلق میں ایک صاف اور صریح رائے رکھتا ہوں تو ان کی
رائے کے ہی السبب اس کے باوجود میں نے یہ کوشش کی تھی کہ جہاں تک ہو سکے
اپنے خیالات کو اس بڑے مقصد یعنی قومی آزادی کے تابع رکھوں جس کے لئے کانگریس
کام کر رہی تھی میں اپنے لیڈر اور اپنے رفیقوں کا وفادار رہا اس لئے کہ میرے اصول
اخلاق میں وفاداری بہت بلند درجہ رکھتی ہے چنانچہ جب یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرے
عقیدے کی کشتی کا لنگر ٹوٹا جاتا ہے تو مجھے سخت روحانی کشمکش کا سامنا ہوتا تھا مگر
میں کسی نہ کسی طرح مفاہمت کر لیا کرتا تھا شاید میں نے غلطی کی، اس لئے کہ کسی شخص
کے لئے جائز نہیں کہ اپنے عقیدے کا لنگر ٹوٹ جانے دے بہرحال مقاصد کی کشمکش میں
اپنے رفیقوں کی وفاداری پر قائم رہا اور یہ یقین کرتا رہا کہ واقعات کی پر زور رفتار
اور ہماری جدوجہد کی ترقی ان ساری مشکلات کو جو میری راہ میں حائل ہیں دور
کر دیگی اور میرے رفیقوں کو میرے نقطۂ نظر سے قریب تر کر دیگی
مگر سوال یہ تھا کہ اب کیا کروں؟ یکایک مجھے علی پور جیل کی اس کوٹھری میں

شدید تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ زندگی ایک وحشت ناک صحرا کی طرح سنسان نظر آنے لگی مجھ پر
اس تلخ ترین حقیقت کا انکشاف ہوا کہ کسی اہم معاملہ میں دوسرے پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ انسان
کو زندگی کا سفر تنہا طے کرنا چاہیئے دوسروں پر بھروسا کرنے سے دل ٹوٹ جاتا ہے

میرے دل میں جو غصہ بھرا ہوا تھا وہ میں مذہب اور خدا پرست مذہب پر اتارنے لگا۔ میں
نے سوچا کہ یہ فصاحت خیال اور استقامت رائے کا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ اس کی بنیاد محض
عقیدہ اور جوش پر ہے۔ اسے روحانیت کا دعویٰ ہے مگر حقیقت میں یہ روحانیت سے کوسوں
دور ہے اسے تو بس دوسری دنیا کی فکر ہے۔ انسانی مقاصد، سماجی مقاصد اور سماجی انصاف
سے کوئی واسطہ نہیں یہ اپنے من مانے عقائد میں مگن رہتا ہے اور زندگی کی حقیقت کی طرف
سے آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ کہیں یہ ان عقائد سے ٹکرا نہ جائے۔ اس نے اپنی بنیاد حق
پر رکھی ہے لیکن اس گھمنڈ میں کہ اس نے حق کی کامل معرفت حاصل کر لی ہے وہ تلاش حق
کی زحمت نہیں گوارا کرتا اور اب اس کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ دوسروں کو تلقین کرے
حق پرستی اور عقیدہ پرستی میں زمین آسمان کا فرق ہے مذہب امن کا وعظ کہتا ہے لیکن اس کے
باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دار و مدار ظلم پر ہے وہ تلوار کے جبر و تشدد کو برا کہتا
ہے لیکن اس جبر و تشدد کو نہیں دیکھتا جو خاموشی کے ساتھ امن کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور
کروڑوں غریبوں کو فاقوں مار ڈالتا ہے اور اس سے بدتر یہ کہ بظاہر کوئی جسمانی تکلیف پہنچائے
بغیر ذہن کو شل کر دیتا ہے، روح کو کچل دیتا ہے اور دل کو توڑ دیتا ہے

اور اس کے بعد مجھے پھر اس شخص کا خیال آیا جو میرے اندر یہ ہیجان برپا کرنے کا
باعث تھا گاندھی جی بھی کس قدر عجیب و غریب آدمی ہیں ان میں ایک حیرت انگیز کشش
اور ایک پر اسرار تاثیر ہے ان کی تحریروں سے اور ان کے اقوال سے کوئی ان کی
ذات کو نہیں سمجھ سکتا ان کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ بلند ہے جتنا ان چیزوں
سے اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کی انہوں نے کس قدر زبردست خدمت کی

ہے۔ انہوں نے اس ملک کے باشندوں میں ہمت اور مردانگی استقلال اور تحمل کی صفات
پیدا کیں، انہیں مقصد کی خاطر قربانی کرنا سکھایا اور اپنے عجز و انکسار کے باوجود ان کے
دلوں کو فخر و تمکنت سے معمور کر دیا۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ سیرت کی محکم بنیاد صرف ایک ہی ہے
یعنی ہمت بغیر ہمت کے نہ اخلاق کوئی چیز ہے نہ مذہب اور نہ محبت۔ جب تک انسان
ڈرتا ہے اس وقت تک نہ وہ حق کی پیروی کر سکتا ہے نہ محبت کی راہ پر چل سکتا ہے۔
تشدد سے اس قدر بیزار ہونے کے باوجود انہوں نے بتایا تھا کہ "بزدلی ایسی چیز ہے جو
تشدد سے بھی زیادہ قابل نفرت ہے" اور "استقلال اس کی دلیل ہے کہ انسان جو کچھ کہتا ہے
وہ کر دکھائے گا۔ ایثار، استقلال اور ضبط نفس کے بغیر فلاح کی امید ہے اور نہ نجات
کی صورت جب تک استقلال نہ ہو صرف ایثار و قربانی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا"
بظاہر یہ خالی خولی الفاظ میں یا افادہ معلوم ہوتے ہیں لیکن ان الفاظ کے پیچھے ایک قوت
تھی اور سارا ہندوستان یہ جانتا تھا کہ یہ چھوٹا سا انسان جو کچھ کہتا ہے وہ کر دکھائے گا۔

ان کی ذات ہندوستان کی نمائندہ اور اس قدیم اور مظلوم ملک کی روح کی مظہر
بن گئی گویا وہ مجسم ہندوستان تھے اور ان کی تمام کمزوریاں ہندوستان کی کمزوریاں
تھیں اگر ان کی کوئی توہین کرے تو یہ ایک محض ذاتی معاملہ نہیں بلکہ سارے ملک
کی توہین تھی اور وائسرائے یا دوسرے حضرات جو ان کے ساتھ حقارت کا اظہار کرتے تھے
نہیں جانتے تھے کہ اس کے نتائج کس قدر خطرناک ہیں مجھے یاد ہے کہ دسمبر ۱۹۳۱ء میں گول میز
کانفرنس سے واپسی کے وقت جب پاپائے اعظم نے گاندھی جی سے ملاقات کرنے سے
انکار کیا تو مجھے کتنا رنج ہوا تھا۔ میرے نزدیک اس کے انکار سے ہندوستان کی توہین
ہوئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انکار قصداً کیا گیا تھا اگرچہ غالباً اس سے ان
کی توہین مقصود نہ تھی کیتھولک کلیسا اپنے حلقے کے باہر مہاتماؤں اور سنیاسیوں
کی بزرگی تسلیم نہیں کرتا اور چونکہ چند پروٹسٹنٹ پادریوں نے گاندھی جی کو ایک

بہت مذہبی آدمی اور سچا عیسائی تھا تو اس لئے کلیسائے روم کے لئے پیار اور ہمدردی
ہو گیا کہ اس الحاد سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرے۔

اسی زمانے میں یعنی اپریل ۱۹۱۶ء میں میں نے علی پور جیل کے اندر برنارڈ شا کے
نئے ڈرامے پڑھے اور "چٹانوں کے اوپر" کا دیباچہ اور اس میں حضرت مسیح اور
پائلٹ کا مباحثہ مجھے بہت پسند آیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے زمانے پر صادق
آتا ہے کہ ایک اور سلطنت کا ایک مذہبی آدمی سے مقابلہ ہے۔ اس دیباچہ میں حضرت مسیح
پائلٹ سے کہتے ہیں کہ میں تمہیں کہتا ہوں کہ تو خوف کو ترک کر دے روم کی عظمت کے متعلق
بکواس مت کر۔ جسے تو روم کی عظمت کہتا ہے وہ سوائے خوف کے اور کچھ نہیں ماضی کا
خوف مستقبل کا خوف غریبوں کا خوف امیروں کا خوف دستوں کا خوف ذی علم
پیروں اور یہودیوں کا خوف وحشی گالوں کا عقلمندوں کا خوف اس کا تیج کا خوف جسے تم نے سولی
پر مار دیا کہ تم اس سے ڈرتے تھے اور سب سے بڑھ کر خود اپنے تراشے ہوئے بت قیصر
روم کا خوف۔ اور مجھ جیسے غریب کے کس کا خوف جو در بدر دھکے کھاتا پھرتا
ہے غرض خوف ہر چیز کا سوائے خوف خدا کے۔ اور کسی چیز پر ایمان نہیں سوائے کوڑوں
اور لوہے اور سونے کے تم جو روم کی حمایت کیلئے کھڑے ہو دنیا بھر کے بزدل ہو اور میں
جو سلطنت الہٰی کی حمایت کے لئے کھڑا ہوا ہوں ہر مصیبت کا مقابلہ کیا سب کچھ
کھو دیا اور ایک ابدی تاج حاصل کر لیا۔

لیکن اس وقت گاندھی جی کی عظمت یا ان کی ملکی خدمات یا ان کے بے شمار
احسانات کا جو انہوں نے مجھ پر کئے ہیں کوئی سوال نہ تھا ان تمام باتوں کے
باوجود یہ ممکن تھا کہ بعض معاملات میں وہ سراسر غلطی پر ہوں میں اس الجھن میں تھا
کہ آخر ان کا مقصد کیا ہے؟ سالہا سال سے بہت ان کے قریب تعلقات میں لیکن آج تک

ان کا مقصد صاف طور پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور مجھے شبہ ہے کہ شاید وہ خود بھی اسے
صاف طور پر نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے لئے بس ایک قدم کافی ہے۔ وہ مستقبل کے
متعلق غور کرتے ہیں اور نہ کوئی واضح مقصد اپنے سامنے رکھتے ہیں وہ بار بار کہا کرتے
ہیں کہ تم وسائل اور ذرائع کی فکر کرو مقصد اپنی فکر آپ کرے گا۔ اپنی انفرادی زندگی کو
نیک سانچے میں ڈھالو سب کچھ خود بخود ہو جائے گا لیکن یہ طرز خیال نہ سیاسی ہے اور نہ علمی اور
نہ عاماً اخلاقی ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک تنگ نظرانہ ناصحانہ انداز ہے اور اس سے
یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "نیکی کیا ہے؟ یہ محض انفرادی چیز ہے یا اجتماعی؟" گاندھی جی
سیرت پر سارا زور دیتے ہیں اور ذہنی تربیت اور نشوونما کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے۔
اس میں شک نہیں کہ ذہنی قابلیت بغیر اخلاقی سیرت کے خطرناک ہوتی ہے لیکن سیرت بغیر
ذہنی قابلیت کے کیا معنی رکھتی ہے؟ آخر سیرت کی نشوونما کیونکر ہوتی ہے؟ گاندھی جی
کو قرون وسطیٰ کے عیسائی ولیوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور ان کے بہت سے اقوال
ان لوگوں کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہیں۔ لیکن موجودہ نفسیاتی تجربات اور
طریقوں کے ساتھ یہ باتیں کسی طرح نہیں کھپ سکتیں

لیکن اور جو کچھ بھی ہو مقصد کا مبہم رہنا میرے خیال میں بہت افسوسناک ہے اگر
عمل کو بار آور بنانا ہے تو ایک معین اور واضح مقصد سامنے ہونا چاہئے یہ سچ ہے کہ زندگی سراسر
منطق کی پابند نہیں اور وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے مقصد میں
تبدیلی کرنا پڑے گی لیکن کوئی نہ کوئی مقصد ہمیشہ صریحی طور پر مد نظر رہنا ضروری ہے۔
غالباً مقصد کے متعلق گاندھی جی کے خیالات اتنے زیادہ مبہم نہیں ہیں جتنے بظاہر
معلوم ہوتے ہیں ان کے سامنے ایک خاص مقصد ہے اور وہ دل و جان سے اسے حاصل
کرنے کی آرزو رکھتے ہیں لیکن اس مقصد اور دور حاضر کے حالات اور خیالات میں بھی
پورا اختلاف ہے اور وہ اب تک ان دونوں چیزوں میں مطابقت نہیں پیدا کر سکے اور

ان وسائل کو سوچ سکے جن سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات مبہم معلوم ہوتے ہیں اور وہ خود انہیں واضح کرنے سے بچتے ہیں لیکن ان کا عام رجحان چوتھائی صدی سے بالکل صاف اور واضح رہا ہے جب سے کہ انہوں نے جنوبی افریقہ میں اپنے فلسفے کو ترتیب دینا شروع کیا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب بھی ان کے وہی خیالات ہیں جو ان ابتدائی تحریروں سے ظاہر ہوتے ہیں شاید اب ان میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے مگر پھر بھی ان تحریروں سے ان کے خیالات کی بنیاد کا پتہ چلتا ہے ۱۹۰۹ء میں انہوں نے لکھا تھا کہ "ہندوستان کی نجات اس پر موقوف ہے کہ گذشتہ پچاس سال کے اندر اس نے جو کچھ سیکھا ہے اس کو بھلا دے ریلیں، تار، ہسپتال، وکلاء، ڈاکٹر اور اس قسم کی تمام چیزیں ختم ہو جانی چاہییں اور خواندہ طبقے کہلاتے ہیں انہیں شعوری اور ارادی طور پر خوشی اور خلوص کے ساتھ کسان کی سادہ زندگی اختیار کرنی چاہیئے یہ جان کر کہ حقیقی مسرت اسی زندگی سے حاصل ہو سکتی ہے" "جب جب میں ریل گاڑی یا موٹر میں سوار ہوتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے عقیدے پر ظلم کر رہا ہوں" "استعداد کی مصنوعی اور تیز رفتار سواریوں کے ذریعے دنیا کی اصلاح کی کوشش کرنی طلب محال سے کم نہیں"

میرے نزدیک یہ تمام اصول بالکل غلط مضر اور ناقابل حصول ہیں ان کی تہہ میں غربت اور ناہموار زندگی کی محبت اور قدر پوشیدہ ہے جو گاندھی جی کے دل میں ہے ان کے نزدیک ترقی اور تہذیب بلند معیار زندگی پر احتیاجات کی کثرت کا نام نہیں بلکہ اس پر موقوف ہے کہ ہم انسان بالقصد اور خوشی سے اپنی احتیاجات کو محدود کریں اسی سے حقیقی خوشی اور قناعت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے خدمت کرنے کی صلاحیت ترقی کرتی ہے؛ اگر یہ مقدمات ایک بار تسلیم کر لئے جائیں تو پھر گاندھی جی کے بقیہ خیالات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور ان کے عمل کی نوعیت بھی زیادہ واضح ہو جاتی

ہے لیکن ہم میں سے اکثر لوگ ان کے ان اصولوں کو تو تسلیم نہیں کرتے اور توقع یہ رکھتے ہیں کہ ان کا عمل ہماری پسند کے مطابق ہو اور جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر شکایت کرتے ہیں
ذاتی طور پر میں افلاس اور مسکینیت کی تعریفوں کو برا سمجھتا ہوں میرے نزدیک دونوں چیزیں ہرگز پسندیدہ نہیں ہیں اور ان کا خاتمہ کر دینا چاہیئے اسی طرح میں راہبانہ زندگی کو اجتماعی مقصد کی حیثیت سے پسند نہیں کرتا اگرچہ ممکن ہے کہ وہ بعض افراد کے لئے موزوں ہو۔ سادگی، مساوات اور ضبط نفس کا میں بھی قائل ہوں مگر نفس کشی کا نہیں میرے خیال میں جس طرح ورزش کرنے والے کو جسم کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح نفس اور عادتوں کی تربیت کرنا اور انہیں قابو میں لانا بھی ضروری ہے یہ توقع کرنا حماقت ہوگی کہ ایک شخص جو بہت آرام طلب ہے وہ تیغ پر مجبت تکلیفیں اٹھا سکے گا غیر معمولی ضبط نفس سے کام لے سکے گا یا کوئی بہادری کا کام کر سکے گا اخلاقی صحت کے لئے کم ازکم اتنی ہی تربیت اور محنت کی ضرورت ہے جتنی جسمانی صحت کے لئے مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ رہبانیت اور نفس کشی اختیار کی جائے

اور مجھے یہ پسند ہے کہ کسان کی سادہ زندگی کو اس قدر بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے مجھے تو اس زندگی سے وحشت ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ میں خود اس کو اختیار کروں میں چاہتا ہوں کہ کسانوں کو اس سے نجات دلاؤں اس کے معنی نہیں کہ دیہات کو شہر بنا دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ دیہاتی علاقوں میں شہری تمدنی آسائش بہم پہنچائی جائیں یہ زندگی بجائے اس کے کہ اس زندگی سے مجھے مسرت حاصل ہو میرے لئے قید سے کم نہ ہوگی "پھاوڑا چلانے والے آدمی" میں کون سی ایسی خوبی ہے کہ اس کی اس قدر تعریف کی جائے؟ وہ پشتہا پشت سے اس قدر لوٹا اور کچلا گیا ہے۔ کہ جن جانوروں کے ساتھ وہ رہتا ہے ان میں اور اس میں بہت تھوڑا سا فرق رہ گیا ہے۔

ان مسائل کو سوچ سکے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات
مبہم معلوم ہوتے ہیں اور وہ خود انہیں واضح کرنے سے بچتے ہیں لیکن ان کا عام
رجحان چوتھائی صدی سے بالکل صاف اور واضح رہا ہے جب سے کہ انہوں نے
جنوبی افریقہ میں اپنے فلسفے کو ترتیب دینا شروع کیا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب بھی
ان کے وہی خیالات ہیں جو ان ابتدائی تحریروں سے ظاہر ہوتے ہیں شاید اس
میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے مگر پھر بھی ان تحریروں سے ان کے خیالات کی بنیاد کا پتہ چلتا ہے
۱۹۰۹ء میں انہوں نے لکھا تھا کہ ”ہندوستان کی نجات اس پر موقوف ہے کہ
گذشتہ پچاس سال کے اندر اس نے جو کچھ سیکھا ہے اس کو بھلا دے ریلیں، تار، ہسپتال،
وکلاء، ڈاکٹر اور اس قسم کی تمام چیزیں ختم ہو جانی چاہئیں اور جو اچھے طبقے کہلاتے ہیں
انہیں شعوری اور ارادی طور پر جوش اور خلوص کے ساتھ کسان کی سادہ زندگی اختیار
کرنی چاہیئے۔ یہ جان کر کہ حقیقی مسرت اسی زندگی سے حاصل ہو سکتی ہے“ ”ہر مرتبہ جب
میں ریل گاڑی یا موٹر میں سوار ہوتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے عقیدے پر
ظلم کر رہا ہوں“ ”انتہا درجے کی مصنوعی اور تیز رفتار سواریوں کے ذریعے دنیا کی
اصلاح کی کوشش کرنی طلب محال سے کم نہیں“

میرے نزدیک یہ تمام اصول بالکل غلط مضر اور ناقابل حصول ہیں ان کی تہ میں افلاس
مصیبت اور ناہموار زندگی کی محبت اور قدر پوشیدہ ہے جو گاندھی جی کے دل میں ہے
ان کے نزدیک ترقی اور تہذیب بلند معیار زندگی پر احتیاجات کی کثرت کا نام نہیں
بلکہ اس پر موقوف ہے کہ ہم انسان بالقصد اور خوشی سے اپنی احتیاجات کو محدود کریں
اسی سے حقیقی خوشی اور قناعت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے خدمت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی
ہے“ اگر یہ مقدمات ایک بار تسلیم کر لئے جائیں تو پھر گاندھی جی کے بقیہ خیالات
کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور ان کے عمل کی نوعیت بھی زیادہ واضح ہو جاتی

ہے لیکن ہم میں سے اکثر لوگ ان کے ان اصولوں کو تو تسلیم نہیں کرتے اور توقع یہ رکھتے ہیں
کہ ان کا عمل ہماری پسند کے مطابق ہو اور جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر شکایت کرتے ہیں
ذاتی طور پر میں افلاس اور مصیبت کی تعریفوں کو ریا سمجھتا ہوں میرے نزدیک دونوں
چیزیں ہرگز پسندیدہ نہیں ہیں اور ان کا خاتمہ کر دینا چاہیئے اسی طرح میں راہبانہ
زندگی کو اجتماعی مقصد کی حیثیت سے پسند نہیں کرتا اگرچہ ممکن ہے کہ وہ بعض افراد
کے لئے موزوں ہو سادگی مساوات اور ضبط نفس کا میں بھی قائل ہوں مگر نفس کشی کا
نہیں میرے خیال میں جس طرح ورزش کرنے والے کو جسم کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے
اسی طرح نفس اور عادتوں کی تربیت کرنا اور انہیں قابو میں لانا بھی ضروری ہے یہ توقع کرنا
حماقت ہوگی کہ ایک شخص جو بہت آرام طلب ہے موقع پڑنے پر تکلیفیں اٹھا سکے گا غیر معمولی
ضبط نفس سے کام لے سکے گا یا کوئی بہادری کا کام کر سکے گا اخلاقی صحت کے لئے کم
از کم اتنی ہی تربیت اور محنت کی ضرورت ہے جتنی جسمانی صحت کے لئے مگر اس کے یہ
معنی ہرگز نہیں کہ رہبانیت اور نفس کشی اختیار کی جائے۔

اور مجھے یہ پسند ہے کہ کسان کی سادہ زندگی کو اس قدر بڑھا چڑھا کر
دکھایا جائے مجھے تو اس زندگی سے وحشت ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ میں
خود اس کو اختیار کروں میں چاہتا ہوں کہ کسانوں کو اس سے نجات دلاؤں اس کے
یہ معنی نہیں کہ دیہات کو شہر بنا دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ دیہاتی علاقوں میں شہر کی تمدنی آسائیں
بہم پہنچائی جائیں یہ زندگی بجائے اس کے کہ اس زندگی سے مجھے مسرت حاصل ہو
میرے لئے قید سے کم نہ ہوگی " پھاوڑا چلانے والے آدمی" میں کون سی ایسی
خوبی ہے کہ اس کی اس قدر تعریف کی جائے؟ وہ پشت ہا پشت سے اس قدر
لوٹا اور کچلا گیا ہے کہ جن جانوروں کے ساتھ وہ رہتا ہے ان میں اور اس
میں بہت تھوڑا سا فرق رہ گیا ہے۔

کہ اس کا ایمان ہے کہ دنیا صرف انہی قاعدوں کے مطابق چلتی رہی ہے اور ہمیشہ چلتی رہے گی۔" اس کے باوجود دنیا کی اصلاح کے لئے تیار کر رہے ہیں لیکن ان کے پیشِ نظر انفرادی اصلاح ہے یعنی حیات اور جذبات پر جن کا پورا کرنا گناہ ہے قابو حاصل کرنا چاہا۔ وہ آزادی کی اس تعریف سے اتفاق کریں گے جو ایک قابل رومن کیتھولک مصنف نے ماتھرزم کے متعلق اپنی کتاب میں کی ہے: "آزادی اس کے سوا کچھ نہیں کہ گناہ کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے۔" لندن کے لاٹ پادری نے جو الفاظ اس سے دو سال پہلے لکھے تھے وہ اس سے بہت ملتے جلتے ہیں: "عیسائیت جو آزادی بخشتی ہے وہ آزادی ہے گناہ کی زنجیروں سے، شیطان سے اور انسان کے جذباتِ شہوانی اور ناجائز خواہشات کی حکومت سے۔" [1]

اگرچہ معاصر لٹریچر کو ذرا اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جنسی تعلقات کے متعلق گاندھی جی کا طرزِ خیال کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اگرچہ وہ آج کل کے عام آدمیوں کو عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک "اگر اولاد کی خواہش مفقود ہو تو مباشرت ہر قسم کا جرم ہے" اور "منعِ حمل کے مصنوعی طریقے اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ نامردی اور اعصاب کی کمزوری ہوگا۔ ایسے عمل کے نتائج سے بچنے کی کوشش کرنا خلافِ اخلاق ہے اس کے لئے یہ برا ہے کہ شہوانی خواہشات کو دل کھول کر پورا کرے اور ان کے نتائج سے بچنے کے لئے مقویات اور دوسری دواؤں کا استعمال کرے اور یہ اس سے بھی بدتر ہے کہ اپنی خواہشوں کو نہ روکے مگر اپنے فعل کے فطری نتیجے یعنی حمل کو روکنے کی کوشش کرے۔"

میں ذاتی طور پر اس طرزِ خیال کو خلاف اور خوفناک سمجھتا ہوں اگر وہ ٹھیک کہتے ہیں تو میں ایک مجرم ہوں اور عنقریب نامردی اور اعصابی۔

---

[1] یہ خط پہلے صفحہ ۱۶۰ پر نقل کیا جا چکا ہے۔

کمزوری میں مبتلا ہونے والا ہوں۔ رومن کیتھولک مذہب والوں نے بھی بہت شدت سے ضبط تولید کی مخالفت کی ہے لیکن وہ منطقی استدلال کی اس انتہا تک نہیں پہنچے جہاں گاندھی جی پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے مصلحت سے کام لیا ہے اور انسانی فطرت کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھی ہے[1] لیکن گاندھی جی نے اپنے دلائل کو آخر تک پہنچا دیا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی جماع کے جواز اور ضرورت کو تسلیم ہی نہیں کرتے سوائے اس کے کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی غرض سے کیا جائے بلکہ وہ تو اس سے بھی انکار کرتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان کوئی فطری جنسی کشش ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ "مجھ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اصول ناقابل عمل ہے اور میں نے اس فطری کشش کا لحاظ نہیں رکھا جو مرد اور عورت میں ہوتی ہے میں اسے ہرگز نہیں مانتا کہ جس شہوانی کشش کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ کسی صورت میں بھی فطری کہی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر ہماری تباہی یقینی ہے عورت مرد کا فطری تعلق اور کشش تو وہ ہے جو بھائی بہن، ماں بیٹے، باپ بیٹی کے درمیان ہوتی ہے، اور یہی فطری کشش ہے جس سے دنیا قائم ہے۔" اور اس سے بھی زیادہ پرزور الفاظ میں "نہیں میں اپنی پوری قوت کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ شوہر اور بیوی کے درمیان شہوانی کشش خلاف فطرت ہے"

---

[1] پاپائے اعظم پائس یازدہم اپنے فرمان میں، جو عیسائیوں کے نکاح کے متعلق ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء کو جاری کیا تھا فرماتے ہیں "یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شادی شدہ لوگ قانون فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں اگر وہ اپنے حقوق کا استعمال فطری اور معقول وجوہ کی بنا پر کریں، چاہے اس صورت میں وقت کے حالات یا کسی نقص کی وجہ سے بچہ پیدا ہونے کا امکان نہ بھی ہو۔" "وقت کے حالات" کا اشارہ صریحی طور پر اس "بے خطر" زمانے کی طرف ہے جب استقرار حمل کا احتمال نہ ہو۔

اس زمانے میں جب اڈیپس گرنتھی[1] اور فرائڈ اور تحلیل نفسی کا دور دورہ ہے
یہ عقیدہ جو اس زور شور سے ظاہر کیا گیا ہے عجیب اور دور از کار معلوم ہوتا ہے دونوں
صورتوں میں یا تو انسان اس عقیدے پر ایمان لاتے یا اس سے انکار کر دے کوئی
درمیانی راہ اختیار کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ یہ عقل کا نہیں بلکہ عقیدے کا سوال ہے
جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی اس معاملہ میں سراسر غلطی پر ہیں۔
ممکن ہے کہ بعض خاص صورتوں کے لئے ان کا مشورہ موزوں ہو لیکن اگر یہ عام اصول
قرار دیا جائے تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر مایوسی، نفسی رکاوٹ، خلل اعصاب اور طرح طرح
کی جسمانی اور اعصابی بیماریاں ہوں گی۔ ضبط نفس یقیناً پسندیدہ چیز ہے لیکن مجھے یہ شبہ
ہے کہ گاندھی جی کے اصول کی پابندی سے ضبط نفس کا فروغ پانا دشوار ہے
یہ اصول بے حد سخت ہے اور اکثر لوگ یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس پر عمل کرنا ان کی
قدرت سے باہر ہے اس لئے یا تو وہ اپنے پرانے طریقے پر قائم رہتے ہیں یا پھر میاں
بیوی میں ان بن ہو جاتی ہے۔ بظاہر گاندھی جی کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ ضبط تولید
کا منشا لازمی طور پر نفس پرستی اور بے اعتدالی ہے۔ اور اگر عورت و مرد کے درمیان
جنسی کشش کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہر مرد ہر عورت کے پیچھے اور ہر عورت ہر مرد کے پیچھے
دوڑتی پھرے گی۔ لیکن یہ دونوں نتیجے بے انصافی پر مبنی ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا
کہ گاندھی جی کے ذہن پر جنسی مسئلہ، وہ کتنا ہی اہم سہی کیوں اس قدر مسلط ہو گیا ہے ان
کے نزدیک تو "سیاہ و سفید" کا سوال ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں کوئی اور رنگ ہو
ہی نہیں سکتا وہ ضبط نفس اور نفس پرستی دونوں کو انتہائی صورت میں پیش کرتے ہیں۔
جو میرے نزدیک غیر طبعی اور خلاف فطرت ہے شاید یہ ان جنسیات کی کتابوں کا رد عمل ہو جو
آج کل سیلاب کی طرح امڈ رہی ہیں میرا اپنے متعلق یہ خیال ہے کہ میں ایک طبعی انسان

---

[1] تحلیل نفسی کا یہ نظریہ کہ ماں بیٹے اور باپ بیٹی کے درمیان جنسی کشش ہوتی ہے۔

ہوں۔ میری زندگی میں جنسی جذبات کو کبھی دخل نہیں لینے دیتا کبھی جیسے بس پرستانہ تھے اور ان کی وجہ
سے میرے دوسرے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔ یہ محض ایک جسمانی حیثیت رکھتے تھے
اصل میں ان کی رو میں ایک تارک الدنیا راہب کی سی بے جو زندگی کی نفی کرتا ہے اور
اس کو شخص سمجھتا ہے۔ ایک راہب کے لئے تو یہ ایک قدرتی بات ہے لیکن اس اصول
کو دنیا دار مردوں اور عورتوں میں جو زندگی کا اثبات کرتے ہیں اور اس سے لطف
اٹھانا چاہتے ہیں ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے اس طرح ایک برائی سے بچ نکلنے بہت
سی دوسری برائیوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ شدید ہیں
بات میں بات نکل آئی اور میں اپنے موضوع سے دور ہو گیا لیکن علی پور جیل میں ان
مصیبت کے دنوں میں میرے دل پر ان خیالات کا ہجوم تھا اور وہ بھی ربط اور سلسلے
کے ساتھ نہیں بلکہ بے حد بے ترتیبی اور پریشانی کی حالت میں جس سے مجھے سخت الجھن اور
کوفت تھی ۔۔ پھر تنہائی اور اداسی کا احساس تھا جس میں جیل اور اس کال کوٹھری
کی دم گھونٹنے والی فضا نے اور اضافہ کر دیا تھا۔ اگر میں جیل کے باہر ہوتا تو اس صدمے
کا شور زیادہ دیر تک نہ رہتا کیونکہ میں بہت جلد نئے حالات سے نمٹ لیتا اور اظہار
خیال اور عمل سے تسکین حاصل کرتا مگر جیل میں اس قسم کی تسکین کی کوئی صورت
نہ تھی اور مجھے کچھ دن بڑی مصیبت اور تکلیف میں گذارنے پڑے۔ خوش قسمتی سے
میری طبیعت میں اتنی لچک ہے کہ مجھے مایوسی کے دورے سے بہت جلد افاقہ
ہو جاتا ہے چنانچہ میری یہ افسردگی رفتہ رفتہ دور ہونے لگی اور اس کے بعد
جیل میں کملا سے میری ملاقات بھی ہوئی اور اس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی اور
تنہائی کا احساس جاتا رہا۔ میں نے سوچا کہ جو کچھ بھی ہو کم سے کم ہم دونوں ایک
دوسرے کا ساتھ دے کو موجود ہیں۔

متضاد باتیں

جو لوگ گاندھی جی سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں اور صرف ان کی تحریروں کو پڑھتے ہیں وہ غالباً یہ خیال کرتے ہوں گے کہ گاندھی جی اسی قسم کے آدمی ہیں جیسے میکیاویلی اکثر ہوتے ہیں یعنی روکھی صورت، بسورتی شکل کے زاہد خشک، کہ لوئیلا کے پیرووں کی طرح ترش اور زندہ دلی کے دشمن، ان پادریوں سے کچھ کچھ مشابہ جو سیاہ چغے پہنے ہوئے پیدل پھرا کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تحریریں ان کی غلط تصویر پیش کرتی ہیں اور ان کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ دلکش ہے۔ یہ بڑی بے انصافی ہوگی کہ ہم صرف ان کی تحریروں کو سامنے رکھ کر ان پر تنقید کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوئیلا کے پادریوں کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کی مسکراہٹ دل کو لبھاتی ہے۔ ان کی ہنسی روتوں کو ہنساتی ہے۔ ان کی ذات فرحت و انبساط کا سرچشمہ ہے۔ ان میں بچوں کا سا بھولاپن ہے جس میں ایک عجیب دلکشی ہے۔ جب کسی کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے تازہ ہوا کا جھونکا آگیا جس نے فضا کی کثافت کو دور کر دیا۔

وہ ایک عجیب مجموعہ اضداد ہیں اور میرا خیال ہے کہ سب بڑی شخصیتیں کسی حد تک ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سالہا سال سے میں اس الجھن میں ہوں کہ آخر اس محبت اور ہمدردی کے باوجود جو انہیں غریبوں کے ساتھ ہے وہ کیوں ایک ایسے نظام کی حمایت کرتے ہیں جو خود ہی لوگوں کو مفلس بناتا ہے اور پھر

سکتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ عدم تشدد کی اس قدر جوش
خروش سے تلقین کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسے سیاسی
اور معاشرتی نظام کے حامی ہیں جس کی بنیاد جبر و تشدد پر ہے۔ لیکن شاید
یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ کہ وہ اس نظام کے حامی ہیں۔ اصل میں وہ ایک
قسم کے نراجی فلسفے کے قائل ہیں۔ لیکن چونکہ نراجی ریاست کا قیام ابھی
بہت دور ہے اور اس کا آسانی سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے وہ چاروناچار
موجودہ نظام کو قبول کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سماجی نظام کو تشدد کے ذریعے
سے بدلنے پر انہیں جو اعتراض ہے وہ محض وسائل تک محدود نہیں ہے اس لئے
کہ وسائل سے قطع نظر کرکے اس کے نظام کو بدلنے کا ایک ایسا نصب العین
مقرر کیا جا سکتا ہے جو مستقبل قریب میں حاصل ہو سکے۔

کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں لیکن وہ اس لفظ کو ایک
خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں جو انہیں کے ذہن میں ہیں اور ان کی اشتراکیت
کو سوسائٹی کے اس معاشی نظام سے کوئی تعلق نہیں جو بالعموم اشتراکیت کے
نام سے مشہور ہے۔ ان کی تقلید میں بہت سے ممتاز کانگریسیوں نے بھی اس لفظ
کا استعمال شروع کر دیا ہے اور اس سے ان کی مراد ایک قسم کی اخلاقی
ہمدردی ہے۔ سیاسی اصطلاحوں کا یہ مبہم استعمال انہیں حضرات
کے لئے مخصوص نہیں بلکہ بہت بڑے بڑے آدمی، ان کے ساتھ شریک ہیں چنانچہ
ان کے سامنے برطانیہ کی نیشنل گورنمنٹ کے وزیر اعظم کی مثال موجود ہے۔ میں

۱؎ اپنے ایک پیام میں جو قدامت پسند اور اتحادی پارٹی کی متحدہ انجمن کو جس کا جلسہ جون
۱۹۳۳ء میں اوٹرگ میں ہوا بھیجا گیا تھا مسٹر ریمزے میکڈانلڈ (بقیہ صفحہ ۴۰۷پر)

جانتا ہوں کہ گاندھی جی اس موضوع سے ناواقف نہیں رہے انہوں نے معاشیات اشتراکیت بلکہ مارکس کے فلسفے پر بھی متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور اس پر دوسروں سے بحث اور تبادلۂ خیال کر چکے ہیں لیکن میرا روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ اہم معاملات میں عقل و دماغ بجائے خود ہماری کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے ڈیم ہیں نے لکھا ہے "اگر ہمارا دل رہا ہے تو یقیناً تمہارا دماغ تمہیں کبھی قائل نہیں کر سکتا جذبات ہمارے تصور زندگی پر حاوی ہیں اور دماغ پر حکومت کرتے ہیں ہماری گفتگو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا معاشی اصل میں جذبات اور وجدان ان پر مبنی ہوتی ہے، جیسا کہ شوپنہار نے کہا ہے "انسان جو ارادہ کرے وہ کر سکتا ہے مگر ارادہ اس کے اختیار میں نہیں"

جنوبی افریقہ کے ابتدائی دور میں گاندھی جی کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوئی جس نے انہیں بے حد متاثر کیا اور ان کا سارا تصور زندگی بدل دیا۔ اس وقت سے ان کے خیالات ایک خاص معیار پر قائم ہو گئے ہیں اور ان کا دماغ نئی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے جو لوگ نئی تجویزیں پیش کرتے ہیں ان کی باتوں کو وہ بہت صبر و سکون اور توجہ سے سنتے ہیں، لیکن اس دلچسپی کے باوجود جو وہ اخلاقاً ظاہر کرتے ہیں سننے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کے دل کا دروازہ بند ہے وہ اس مضبوطی سے بعض خیالات پر قائم ہیں کہ ان کے

بقیہ صفحہ ۴۰۶ کا بقیہ فرماتے ہیں "زمانے کی مشکلات ہر قوم کو متحد ہونے اور ایک مرکز پر جمع ہونے پر مجبور کر رہی ہیں، یہی حقیقی اشتراکیت ہے یہی حقیقی قومیت بھی ہے بلکہ یہی حقیقی انفرادیت بھی ہے"

اور وہ مزدوری بڑھانے کے لئے کوئی ایسی دلیل نہ پیش کر سکتے جس کا ثبوت آسان ہوتا کیا ان کے لئے شراب نوشی، جوا کھیلنا، تماشا کو جانا ضروری ہے؟ یہ کوئی جواب نہیں کہ کلوں کے مالک بھی یہی سب حرکتیں کرتے ہیں۔ اور پھر بھی غالب رہتے ہیں، اگر مزدور سرمایہ داروں سے بہتر ہونے کا دعوےٰ نہیں کرتے تو انہیں دنیا کی ہمدردی جائے کا کیا حق ہے؟ یہی کہ سرمایہ داروں کی تعداد میں اور اضافہ ہو اور سرمایہ داری کو قوت حاصل ہو جائے؟ ہم سے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی حمایت کرو اس لئے کہ جب اس کا دور دورہ ہوگا تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائے گی یہ ہو کہ ہم انہیں برائیوں کو جو سرمایہ دار اور سرمایہ داری کی طرف منسوب کی جاتی ہیں بہت زیادہ پہلے پیدا کر دیں"۔ [1]

جب میں اس کو پڑھ رہا تھا تو فاقہ کش مزدور کان کنوں، ان کی بیویوں اور بچوں کے اترے ہوئے چہرے میری آنکھوں میں پھر گئے جن کو میں نے ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں بے بسی کی حالت میں ایک ایسے خوفناک نظام کا مقابلہ کرتے دیکھا تھا جو انہیں کچلے ڈالتا تھا۔ گاندھی جی کے بیان کردہ واقعات بھی صحیح نہیں ہیں اس لئے کہ کان کن مزدوری میں اضافے کا مطالبہ نہیں کر رہے تھے بلکہ اس لئے لڑ رہے تھے کہ ان کی مزدوری کم کر دی گئی تھی اور وہ کام سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ بہرحال اس وقت ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں اور نہ اس سے غرض ہے کہ آیا کن مزدور ضبط تولید کے طریقے استعمال کریں یا نہ کریں اگرچہ اس میں شک نہیں کہ صنعتی جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے یہ ایک غیر معمولی تحریر ہے۔

میں نے گاندھی جی کے جواب سے یہ ٹکڑا اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ انداز

---

[1] ضبط نفس اور نفس پرستی حصہ اول کے گاندھی سے یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔

ہوسکے کہ مزدوروں کے مسائل اور ان کے معیار زندگی کو سمجھا جائے۔ اس بارے میں
ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ یہ نقطہ نظر اشتراکیت بلکہ سرمایہ داری کے نقطہ نظر
سے بھی کچھ زیادہ درست ہے۔ اگر کہا جائے کہ سائنس اور صنعتی تنظیم آج ہر
شخص کے کھانے پینے، رہنے سہنے کا معقول بندوبست کر سکتی ہے اور
ان کے معیار زندگی کو بہت بلند کر سکتی ہے بشرطیکہ مستقل حقوق رکھنے والے
اس میں مداخلت نہ کریں تو اس سے انہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ
وہ لوگوں کے معیار زندگی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کے قائل ہی نہیں۔
چنانچہ اشتراکیت سے جو امیدیں ہیں وہ ان کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتیں
بلکہ ان کے نزدیک سرمایہ داری پھر بھی ایک حد تک قابل برداشت ہے اس لئے
کہ وہ عیش پرستی کے گناہ کو ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود رکھتی ہے۔ انہیں
ان دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں لیکن فی الحال وہ سرمایہ داری سے سمجھوتہ کر
رہے ہیں اس لئے کہ یہ آتی رہتی ہیں اور پھر یہ ایک امر واقعہ کی حیثیت رکھتی
ہے جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا

ممکن ہے کہ میں یہ خیالات ان کی طرف منسوب کرنے میں غلطی کرتا ہوں
لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ذہن کا عام رجحان یہی ہے اور ان کی تحریر و تقریر
میں جو الجھن اور پیچیدگی نظر آتی ہے اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ ان کے
خیال کی بنیاد ہی دوہری ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ روز افزوں آرام و آسائش
اور راحت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیں بلکہ ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی
زندگی کو سدھارنے کی فکر کریں بری عادتوں کو ترک کریں خواہشات کو کم کرتے
ہیں اور اس طریقے سے اپنی انفرادی اور روحانی اصلاح کریں، اور جو لوگ
عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کا کام یہ نہیں ہے کہ ان کی مادی [illegible]

کریں بلکہ خود ان کی سطح پر اتر آئیں اور مساوی حیثیت سے ان کے ساتھ میل جول پیدا کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو لازمی طور پر عام لوگوں کی سطح زندگی کسی قدر بلند ہو جائے گی۔ یہی گاندھی جی کے نزدیک حقیقی جمہوریت ہے۔ اس بیان میں جو انہوں نے ۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء کو شائع کیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ "بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میری مخالفت کرنا بیکار ہے اس لئے کہ میرے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ میرے جیسے پیدائشی جمہوریت پسند کے لئے یہ انکشاف باعث شرم ہے۔ اگر وہ شخص جس نے اپنے آپکو غریب لوگوں میں کھپا دیا ہے جس کی یہ آرزو ہے کہ انہیں کی سی زندگی بسر کرے اور اسی کے ساتھ پوری کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس سطح پر پہنچ جائے، جمہوریت پسندی کا دعویٰ کر سکتا ہے تو میں یہ دعویٰ کرتا ہوں۔

اس استدلال سے غالباً موجودہ زمانے کا کوئی جمہوریت پسند یا سرمایہ دار یا اشتراکی اتفاق نہیں کرے گا مگر اس تک کہ یہ بات معیوب اور نامناسب ہے کہ ہم عام لوگوں سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کرلیں اور اپنے تعیشات اور بلند تر معیار زندگی کی نمائش ان بے شمار آدمیوں کے سامنے کریں جو ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت کی چیزوں کے بھی محتاج ہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو قدیم مذہبی نقطۂ نظر رکھتا ہے شاید کسی حد تک اس سے متفق ہو اس لئے کہ دونوں اپنے جذبات کے اعتبار سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ہر چیز کو ماضی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں انہیں اس کی زیادہ فکر ہے کہ کیا ہو چکا ہے بہ نسبت اس کے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ ان لوگوں میں جو ذہنیاتی حیثیت سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ان میں جو مستقبل پر نظر رکھتے ہیں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قدیم زمانے میں عام لوگوں کی معاشی سطح کو بلند کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غریبوں کا وجود لازمی تھا محض چند دولتمند آدمی اس زمانے میں سماج کے روح رواں تھے اور ان کا جو نظام دولت آفرینی کے

لئے سر پرستی تھا اس لئے اخلاقی حلقوں "مصلحوں" اور اہل دل نے ان کے وجود کو جائز رکھا لیکن اس کے ساتھ انہیں یہ تلقین کرتے رہے کہ ان کے حاجتمند بھائیوں کا بھی ان پر کچھ حق ہے۔ وہ غریبوں کے امانت دار ہیں، انہیں خیرات کرنا چاہیئے۔ چنانچہ خیرات کا شمار ان بڑی نیکیوں میں ہونے لگا جس کی مذہب نے تاکید کی ہے۔ گاندھی جی بھی ہمیشہ اس نظریہ پر زور دیتے ہیں کہ راجہ مہاراجہ بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار غریبوں کے امانت دار ہیں ان سے پہلے بہت سے مذہبی آدمی بھی کہتے آتے ہیں پاپائے اعظم نے یہ اعلان کیا ہے "امیروں کو یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ وہ خدا کی طرف سے خدمت خلق پر مامور ہیں۔ اور اس کی دولت کے خازن اور قاسم ہیں اور خود حضرت مسیح نے غریبوں کی قسمت ان کے سپرد کی ہے" ہندو دھرم اور اسلام کا عام عقیدہ بھی یہی ہے۔ یہ دونوں امیروں کو خیرات کی تاکید کرتے ہیں۔ جس کی تعمیل میں یہ حضرات مندر، مسجد، دھرم شالے بنواتے ہیں۔ اپنی وافر دولت میں سے تانبے کے پیسے اور چاندی کے روپے غریبوں کو خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک اور دیندار ہیں۔

ویسے قدیم مذہبی نقطہ نظر کی ایک نمایاں مثال پاپائے اعظم لیو سیزدہم کا مشہور فرمان "ریرم نووارم" ہے جو مئی ۱۸۹۱ء میں جاری کیا گیا تھا۔ وہ جدید صنعتی حالات کا اندازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مصیبت سہنا اور تکلیف اٹھانا نوع انسان کی قسمت میں لکھا ہے۔ انسان چاہے جتنی کوشش کرے کوئی طاقت اور کوئی تدبیر انسانی۔ زندگی کو اس درد و الم سے نجات دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی جو اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف دعوی کرتے ہیں، اور مصیبت زدہ لوگوں کو یہ امید دلاتے ہیں کہ انہیں رنج و الم سے نجات مل جائے گی۔ اور دائمی راحت و عشرت نصیب ہو گی، دھوکا دے رہے ہیں اور سبز باغ دکھاتے ہیں۔ ان کے یہ جھوٹے وعدے۔۔۔ اور زیادہ ابتری پیدا کر دیں گے۔ انسان کی

علاج اسی میں ہے کہ وہ دنیا کو اس کی اصلی حالت میں دیکھے اور ان مصیبتوں کا علاج
کہیں اور تلاش کرے۔

آگے چل کر بتایا جاتا ہے کہ یہ کہیں اور کا اشارہ کدھر ہے "اس دنیا کو۔ تو ہم
اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اس کی صحیح قدر کر سکتے ہیں جب تک اس زندگی کا لحاظ
رکھیں جو آنے والی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی جس حقیقت عظمیٰ کا سبق خود
فطرت نہیں دیتی ہے وہی عیسائی مذہب کا عظیم الشان عقیدہ ہے جس پر مذہب کی
بنیاد قائم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری اصلی زندگی اس وقت شروع ہوگی جب
موجودہ زندگی ختم ہو جائے گی خدا نے ہمیں اس دنیا کی آنی جانی چیزوں
کے لئے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ ان آسمانی چیزوں کے لئے جو ہمیشہ رہنے والی
ہیں اس نے اس دنیا کو ہمارے لئے عارضی جلا وطنی کی جگہ بنایا ہے نہ کہ
ہمارا حقیقی وطن، روپیہ پیسہ اور دوسری چیزیں جنہیں لوگ اچھا اور پسندیدہ
سمجھتے ہیں خواہ ہمارے پاس افراط سے ہوں یا بالکل نہ ہوں، جہاں تک ہماری
ابدی راحت و مسرت کا تعلق ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔"

یہ مذہبی طرز خیال اس قدیم زمانے سے وابستہ ہے، جب موجودہ مصیبتوں سے
نجات پانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ آنے والی زندگی کا سہارا ڈھونڈا جائے۔
لیکن باوجود اس کے کہ حالات بدل گئے اور انسان کی مادی خوشحالی کی
سطح اتنی بلند ہو گئی جو زمانہ قدیم میں انسان کے خواب خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی
لیکن ماضی کے خیالات اب بھی ہم پر مسلط ہیں البتہ اب زیادہ زور چند مبہم روحانی قدروں
پر دیا جاتا ہے جن کے جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں کیتھولک عیسائی ہمیشہ بارہویں اور
تیرہویں صدی کے خیال میں مگن رہتے ہیں (یہ وہی زمانہ ہے جسے دوسرے لوگ عہد
ظلمت کہتے ہیں) اور اسے عیسائیت کا عہد زریں سمجھتے ہیں جب اولیا کا دور دورہ

تو عیسائی دنیا میں، دو صلیبی لڑائیاں لڑنے کو جایا کرتے تھے اور گوتھک طرز کے بڑے بڑے گرجے تعمیر ہو رہے تھے، ان کے خیال میں یہ زمانہ سچی عیسائی جمہوریت کا تھا جو پیشروؤں کی کوششوں کے ماتحت ترقی کے اس درجہ پر پہنچ گئی تھی جس پر اس سے پہلے کبھی پہنچ سکی اور نہ اس کے بعد۔ مسلمان بڑی حسرت سے ابتدائی عہد خلافت کی "اسلامی جمہوریت" اور اس دور کی حیرت انگیز فتوحات کو یاد کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی ویدوں کے عہد اور رامائن اور مہابھارت کے زمانے کی دھن میں رہتے ہیں اور "رام راج" کا خواب دیکھتے ہیں۔ مگر تاریخ ہمیں یہی بتلاتی ہے۔ کہ اسی عہد ماضی میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد انتہائی مصیبت کی حالت میں زندگی بسر کرتی تھی اور اسے پیٹ بھر کھانا اور زندگی کی ادنیٰ ترین ضروریات بھی میسر نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ چھوٹے سے حکمراں طبقہ کو فرصت اور فراغت حاصل ہو گئیں جہاں تک زندگی کا لطف اٹھانے سے اور لوگوں کا تعلق ہے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ وہ "فاقہ قوت لایموت" کی جدوجہد میں لگے رہنے کے اور بھی کچھ کر سکتے تھے اس شخص کے لئے جو بھوکوں مر رہا ہو کسی قسم کی تمدنی اور روحانی ترقی ممکن نہیں اسے تو بس ایک ہی فکر ہو گی کہ کسی طرح کھانے کو روٹی مل جائے

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لایا ہے جس پر فوراً ہماری نظر پڑتی ہے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں خصوصاً ان حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ ہوا ہے، اس نے مادی خوش حالی کی ایک ایسی بنیاد قائم کر دی ہے جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے تمدنی اور روحانی ترقی آسان ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہمیں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اس لئے کہ یہاں صنعتی ترقی سے فائدے کی جگہ نقصان پہنچا ہے ہمیں تو صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی اور

مگر یہ پوری کمائے اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ بغیر محنت کے کھاتے ہیں وہ چور ہیں؟

دنیائے جدید کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اس وقت کے قدیم طریقوں
اور اصولوں سے کام لینا جب ان ہی مسائل کا وجود نہ تھا اور ان کا ذکر قیاسی
الفاظ میں کرنا محض الجھن پیدا کرتا ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا حق
واقعی ملکیت کا تخیل جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنیادی تخیلات میں ہے بہت تبدیل
ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں غلام بھی املاک میں شامل تھے اور یہی حال عورتوں اور
بچوں کا تھا اس کے علاوہ جاگیردار ہر دولہن کی شب عروسی کا، سڑکوں، مسڑ دل
کشتیوں، ملوں، مفاد عامہ کی چیزوں کا، زمین اور ہوا کا مالک تھا، حالانکہ آج بھی پالنے
والوں کی ملک سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض ملکوں میں ملکیت کے حقوق قانوناً
محدود کر دیئے گئے ہیں، جنگ کے زمانے میں سارے حقوق ملکیت میں دست اندازی
کی جاتی ہے املاک روز بروز غیر مرئی صورت اختیار کرتی جاتی ہے مثلاً کمپنی کے حصے
اعتبار وغیرہ۔ جیسے جیسے ملکیت کا تصور تبدیل ہوتا جاتا ہے حکومت کی مداخلت
بڑھتی جاتی ہے رائے عامہ برابر جائداد والوں کے لامحدود حقوق کو محدود کرنے
کا مطالبہ کرتی رہتی ہے اور قانون اس مطالبے کو پورا کرتا رہتا ہے طرح طرح کے
بڑے بڑے محصول لگائے جاتے ہیں جنہیں ایک طرح کی ضبطی سمجھنا چاہیئے۔ اور
اس طرح مفاد عامہ کی خاطر حقوق ملکیت کم ہوتے جاتے ہیں مفاد عامہ کا خیال
پبلک پالیسی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ مفاد عامہ کے خلاف
کوئی کام کرے، خواہ اس کی غرض اپنے حقوق ملکیت کا تحفظ ہو اور پرانے زمانے میں
تو اکثر لوگ حقوق ملکیت سے محروم بلکہ خود دوسروں کی ملکیت تھے آج بھی یہ حقوق
صرف تھوڑے لوگوں کو حاصل ہیں "ہم مستقل حقوق" کا ذکر بہت سنتے آئے ہیں۔
لیکن آج کل ایک نیا "مستقل حق" اور تسلیم کر لیا گیا ہے اور وہ یہ ہے۔

کو ہر فرد اور ہر جماعت کو یہ حق ہے کہ زندہ رہے، محنت کرے، اور اپنی محنت کا پھل
پائے۔ ان نظریوں کی رو سے املاک اور سرمایہ معدوم نہیں ہو جاتے۔ بلکہ
بہت سے لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ان کے چند اشخاص کے ہاتھ میں
جمع ہو جانے سے ان اشخاص کو دوسروں پر جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا اسے
سماج ان سے واپس لے لیتی ہے۔

گاندھی جی کے پیش نظر افراد کی باطنی، اخلاقی، اور روحانی اصلاح ہے اور
اس کے ذریعہ سے وہ خارجی ماحول کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ
لوگ بری عادتوں کو اور لذتوں کو ترک کریں اور پاکباز بن جائیں، وہ اس پر بھی زور
دیتے ہیں کہ مجامعت اور شراب اور تمباکو کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ ممکن ہے
اس بارے میں اختلاف رائے ہو کہ ان میں کون چیز زیادہ بری ہے اور کون کم
کیا اس میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی نقطۂ نظر سے بھی، اور اس سے زیادہ
سماجی نقطۂ نظر سے ان ذاتی کمزوریوں سے بدرجہا بدتر لالچ، خود غرضی، زرپرستی
افراد کا ذاتی نفع کے لئے جھگڑنا، طبقوں اور جماعتوں کی وحشیانہ کشمکش، ایک
طبقے کا دوسرے کو بے دردی سے لوٹنا اور کچلنا، قوموں کی ہولناک لڑائیاں
ہیں۔ ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان تمام وقت آوریں جھگڑوں سے اور ہر قسم کے
تشدد سے نفرت کرتے ہیں لیکن کیا یہ چیزیں آج کل کی زبردست سماج کی
فطرت میں داخل نہیں ہیں جس کا قانون یہ ہے کہ زبردست کمزور کو ستاتے اور
جس کا عمل اس پرانے مقولے پر ہے "جس میں طاقت ہو وہ چھین لے اور جو رکھ
سکے وہ رکھے"۔ نفع کی خواہش آج کل لازمی طور پر جھگڑا پیدا کرتی ہے، اور
سارا نظام انسان کی غارت گرانہ جبلتوں کی سرپرستی کرتا ہے اور اسے ان سے
کام لینے کا پورا پورا موقع دیتا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ بعض پسندیدہ جذبات

کو بھی ابھارتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ انسان کے کمینے جذبات کو وہ تقویت دیتا ہے کامیابی کے معنے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ دوسروں کو پیچھے گرا کر ان کی جگہ لے لی جائے جب ہماری سماج ایسے اداروں اور حوصلوں کی ہمت افزائی کرتی ہے ہمارے بہترین آدمی ان کی طرف کھنچ جاتے ہیں تو کیا کوئی بھی یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ اس ماحول میں انسان کی اخلاقی تکمیل کا مقصد حاصل کر لیں گے؟ وہ لوگوں میں مروت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چند افراد کو متاثر کرنے میں اس میں ضرور کامیابی ہوگی لیکن جب تک سماج ان لوگوں کو جو دوسروں کو لوٹ کر ترقی کرتے ہیں کامیابی کا نمونہ بنا کر پیش کرے گی اور ذاتی نفع کی خواہش کو عمل کا محرک قرار دے گی اس وقت تک بہت بڑی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہے گی

لیکن یہ مسئلہ محض اخلاق اور فلسفہ اخلاق کا نہیں ہے بلکہ آج کل کے عملی اور ضروری مسائل میں سے ہے۔ دنیا سخت مشکل میں گرفتار ہے اور اس کا حل کوئی نہ کوئی دن حل کرنا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈکنس کے مکاپر کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا اور نہ معیانہ طرز اختیار کرنے سے کام چل سکتا ہے کہ سرمایہ داری، اشتراکیت اور اشتمالیت وغیرہ کے حسنات پہلوؤں کی نکتہ چینی کرتے رہیں اور دھندلی سی امید کا سہارا لیں کہ کوئی بہترین درمیانی طریقہ خود بخود نکل آئے گا۔ بہ نہیں ماضی اور حال کے سب طریقوں کی خوبیاں جمع کرنی ہوں گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ مرض کی تشخیص کی جائے۔ علاج تجویز کیا جائے۔ اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔ یہ یقینی بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم موجودہ حالات پر نہیں رہ سکتے یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا ہے یا آگے بڑھنا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو پیچھے ہٹنے کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

۔ گر گاندھی جی کی اکثر کارروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اس
محدود قومی معیشت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں جس میں صرف قوم اور قوموں
سے لے کر ہر گاؤں اور گاؤں والوں سے معاشی حیثیت سے بے نیاز ہو۔ بس قدیم زمانے
کی طرح ہر گاؤں ایک مستقل معاشی حیثیت رکھتا تھا، اپنا کھانا کپڑا اور دوسری
ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معیار زندگی
بہت ہی پست ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی یہ حالت صرف عارضی طور پر چاہتے
ہیں کیونکہ مستقل طور پر یہ چل ہی نہیں سکتی بعض ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا
اس صورت میں زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا اور وہ یہ ہرگز گوارا نہ کریں گے کہ عسرت
اور فاقے کی زندگی کی طرف لوٹیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں
جہاں ہمارا موجودہ معیار زندگی بے حد پست ہے، دیہی صنعتوں کی ترقی سے عام
لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے لیکن اور ملکوں کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے
ملکوں سے وابستہ ہیں اور میرے خیال میں ان سے قطع تعلق کرنا ناممکن ہے
اس لیے ہمیں ان مسائل پر ساری دنیا کے نقطہ نظر سے غور کرنا چاہئے اور
اس نقطۂ نظر سے محدود قومی حیثیت کا کوئی سوال ہی نہیں اور میں تو ذاتی طور پر
اسے ہر پہلو سے ناپسند کرتا ہوں۔

ہر پھر کر ہم ایک چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلے کا اور کوئی
حل ہی نہیں یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام پہلے قومی دائرے کے اندر اور پھر
ساری دنیا میں جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد
عامہ کے لیے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقے سے ہونا چاہیے۔ یہ ایک جداگانہ
سوال ہے۔ لیکن یہ بات اصل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم یا کل نوع انسان
کی بھلائی موجود ہو محض اس وجہ سے نہیں روکی جا سکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام

سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تبدیلی کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا سماجی ادارے
اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیئے۔ ان چیزوں کی خاطر ایسے
مفید اور پسندیدہ مقصد کو قربان کرنا بہت بڑی غداری ہوگی۔ ممکن ہے کہ دنیا کے
عام واقعات کسی حد تک اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں یا اس کی رفتار کو تیز
کرنے میں مدد دیں۔ لیکن جب تک ملک کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت راضی
نہ ہو جائے یہ انقلاب مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ اس لئے ان لوگوں کو سمجھانا ہوگا۔ ایسا
ہم خیال ساتھ ہے ایک چھوٹی سی جماعت کی سازش اور تشدد سے کام نہیں
چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ان لوگوں کو بھی
اپنا ہم خیال بنالیں جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر یہ بہت بعید از قیاس
ہے کہ ہم ان میں سے کچھ زیادہ لوگوں کو قائل کر سکیں گے

کھادی کی تحریک یعنی ہاتھ سے کاتنا اور بننا جس سے گاندھی جی کو خاص
شوق ہے ایک ایسی چیز ہے جو دولت آفرینی کے انفرادی طریقے کو تقویت پہنچاتی
ہے۔ اور ہمیں قبل صنعتی عہد کی طرف واپس لے جاتی ہے۔ آجکل کے کسی اہم مسئلے کو
ان طریقوں سے حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ ان سے ایک ایسی ذہنیت پیدا
ہو جاتی ہے جو ترقی کی صحیح راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میں اس بات کو تسلیم کرتا
ہوں کہ ایک وقتی اور عارضی تدبیر کی حیثیت سے اس تحریک سے بہت فائدہ پہنچا ہے
اور غالباً اس وقت تک پہنچتا رہے گا جب تک خود حکومت زرعی اور صنعتی مسائل کا
کوئی معقول حل تلاش کرنے کی خود بیڑا اٹھانے پر سارے ملک میں جاری کیا
جا سکے۔ ہندوستان میں اس وقت لاکھوں کروڑوں بے روزگار ہیں جن کا کوئی
ریکارڈ نہیں اور اس سے بھی زیادہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دیہاتی علاقوں
میں سال کے ایک حصہ میں بیکار رہتے ہیں۔ حکومت نے بے روزگاری کو دور کرنے

یاے روزگاروں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش اب تک شروع نہیں کی ہے
اس لئے معاشی حیثیت سے کھادی کی تحریک نے ان لوگوں کی تھوڑی
بہت مدد کی جو بالکل بے روزگار ہیں یا کچھ عرصے بیکار رہا کرتے ہیں اور جو کچھ
ترقی خود اپنی کوشش سے ہوتی ہے اس لئے ان لوگوں کی خودداری بڑھ گئی اوران
میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ مگر اصل میں جو نمایاں تبدیلی ان لوگوں
میں پیدا ہوئی ہے وہ نفسیاتی تبدیلی ہے۔ کھادی نے کسی حد تک اس فصل کو
دور کیا جو شہر اور دیہات میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اوسط طبقے کے تعلیمیافتہ
لوگوں کو کسانوں سے قریب تر کر دیا۔ اس لباس کا پہنے والوں اور دیکھنے
والوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ اوسط طبقے میں کھادی کے
اس سے سادگی آگئی ہے، نمود و نمائش اور بے مذاقی کم ہو گئی ہے اور عام
لوں سے میل جول کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اوسط طبقے کے لوگ اب نہ تو لباس
معاملہ میں امیروں کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں۔ اور نہ سستی پوشاک
میں ذلت و شرم محسوس کرتے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو یہ لوگ کھادی
لباس کو جامہ وقار سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کے مقابلے میں جو اب بھی
اور سائش نہیں کراتے ہیں، اپنی قومیت کا احساس رکھتے ہیں غریب
غریب لوگوں میں بھی یہ خودداری اور وقار کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔
پہننے والوں کے بڑے مجموعوں میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ کہ کون غریب
اور کون امیر اور اس سے برادری کے جذبے کو ترقی ہوئی۔ اس میں
نہیں ہے کہ عام لوگوں تک پہنچنے میں کانگریس کو کھادی سے بڑی مدد
کو لوگ قومی آزادی کی وردی سمجھنے لگے۔

ملوں کے مالکوں کے اس رجحان کو بھی کہ اپنے مال کی قیمت بڑھانے

چلے جائیں کھادی ہی سے روکا جا سکتا ہے۔ پہلے ان کی روک تھام ۔ سیاسی اور خصوصاً
لنکاشائر کے مقابلے کی وجہ سے دشوار تھی اور جب کبھی یہ مقابلہ سست ہوا
مثلاً جنگ عظیم کے زمانے میں تو کپڑے کی قیمتیں بہت دستاویز بھر میں غیر معمولی
طور پر بڑھ گئیں، اور ہندوستانی ملوں نے کروڑوں روپیہ کمایا
سودیشی کی تحریک اور ودیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے آگے چل کر
ان ملوں کو بڑی مدد ملی، لیکن کھادی کی تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں اب
اتنی زیادہ نہیں بڑھ سکتیں۔ ان ملوں نے اور جاپان نے بھی کھادی کی
ہر دلعزیزی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس قسم کا کپڑا تیار کیا کہ اس میں
اور ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے کپڑے میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ اگر آج کوئی
غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے مثلاً جنگ چھڑ جائے جس سے باہر کے کپڑے کی
درآمد بند ہو جائے تو غالباً ہندوستان کے مل کے مالک بیوپاریوں کو اتنا
نہیں لوٹ سکیں گے جتنا ۱۹۱۴ء کی جنگ کے زمانے میں لوٹتے رہے۔ کھادی
کی تحریک اس کو روکے گی اور کھادی کی تنظیم میں آج کل جیسی سستی ہے تو تھوڑی
سی مدت کے اندر بہت پھیل جائے۔

ان تمام فوائد کے باوجود جو اس وقت ہندوستان کو کھادی کی تحریک
سے حاصل ہیں میرے خیال میں یہ محض عارضی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعد میں بھی
ایک سیاسی تحریک کی حیثیت سے باقی رہے تاکہ اس مدت میں جو ایک نئے
معاشی نظام کے اختیار کرنے میں لگ جائے گی اس سے کام چلتا رہے لیکن
آئندہ ہماری اصل کوشش یہ ہو گی کہ بڑی صنعتی اور مشینری کی تنظیم کی جائے اور
صنعت کو ترقی دی جائے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ آج کل کے نظام میں صنعتی ترقی
کے لیے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کی جائیں اور طرح طرح کے کمیشن مقرر کر کے ان پر

لاکھوں روپیہ صرف ہوا۔ وہ کچھ اوپری چیزوں کی اصلاح کر دیں۔ ہمارا نظام آراضی دیکھتے ہی دیکھتے بیٹھ رہا ہے اور موجودہ صورت میں دولت کی پیدائش اور تقسیم اور بڑے پیمانے پر معقول طریقہ سے کام کرنے میں حائل ہے۔ حالیہ ۱۹۴۸ء کے حالات کے لحاظ سے بغیر اس بنیادی تبدیلی کے کام نہیں چل سکتا۔ چھوٹی چھوٹی زمینیں اسائیٹ کو بانٹنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ مستقل طور پر امداد باہمی کے اصول کے مطابق، اجتماعی کاشت شروع کی جائے تاکہ سب سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ زراعت ہماری ساری آبادی کبھی نہیں کھپا سکتی۔ بڑے پیمانے پر کاشت کرنے سے زمین کا کہنا ہی کیا ہے، زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ باقی لوگوں میں سے بعض شاید چھوٹی گھریلو صنعتوں میں کھپ جائیں مگر ان کی بہت بڑی تعداد کو بڑے پیمانے کی اشتراکی سماجی ریاست کے کاموں میں لگانا پڑے گا۔

یقیناً بعض علاقوں کو کھادی کی تحریک سے تھوڑی بہت مدد ملی ہے لیکن اسی کامیابی میں جو اس کو حاصل ہوئی ہے خطرے کا ایک عنصر موجود ہے یعنی یہ تحریک ایک زوال پذیر نظام آراضی کو سہارا دے رہی ہے اور اس حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں کہ اس سے کوئی نمایاں فرق پیدا ہو لیکن یہ رجحان اس میں بہرحال موجود ہے کہ مالوں یا کاشتکاروں یا زمینداروں کو زمین کی پیداوار کا حصہ جو ملتا ہے وہ اس کے لئے بھی کافی نہیں ہے کہ جب بیت رہا سطح پر وہ رہ گئے ہیں اسی پر قائم رہ سکیں اس لئے ان کو اپنی قلیل آمدنی میں اضافے کی صورتیں تلاش کر لینی پڑتی ہیں۔ ورنہ لگان یا مالگذاری کی ادائیگی کے لئے ادھر قرض لینا پڑتا ہے۔ اگر اتفاق سے بعض کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو اس سے

زمیندار یا حکومت کو اپنا مطالبہ وصول کرنے میں مدد ملتی ہے جو سنایا معمولی حالت میں نہ وصول ہو سکتا اگرچہ اوپر کی آمدنی کچھ زیادہ ہو تو لگان اتنا ہی اور بڑھا دیا جاتا ہے موجودہ نظام کے ماتحت کاشتکاروں کی زائد محنت اور کفایت شعاری کی کوشش سے اصل فائدہ زمین کے مالک ہی کو پہنچتا ہے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہنری جارج نے اپنی کتاب ترقی اور عسرت میں اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے۔ اور بہت سی مثالیں دی ہیں۔ جو زیادہ تر آئرستان کی ہیں۔

دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی جو کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں وہ اصل میں کھادی کے پروگرام ہی کی توسیع ہے اس سے وقتی طور پر ضرور فائدہ ہوگا جس میں سے کچھ کم و بیش مستقل ہوگا مگر زیادہ تر محض وقتی ہمیں سے دیہاتیوں کی موجودہ تکلیفوں میں کچھ کمی ہو جائے گی اور ہماری تہذیب کے بعض خوشنما مونے تو مٹ رہے تھے محفوظ ہو جائیں گے لیکن جہاں تک کہ اس کا مقصد کلوں کی اور صنعتی نظام کی مخالفت ہے اس میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی گاندھی جی نے حال میں "ہریجن" میں دیہی صنعتوں پر ایک مضمون لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں "کلوں کو رواج دینا اس وقت مفید ہوتا ہے جب کام بہت ہو اور کرنے والے تھوڑے ہوں لیکن جب ضرورت سے زیادہ آدمی کام کرنے کے لئے موجود ہوں جیسا کہ ہندوستان میں ہے تو یہ چیز مضرات ہوتی ہے ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے لئے جو دیہات میں رہتے ہیں فرصت کا وقت نکالا جائے سوال یہ ہے کہ ان کے خالی وقت کو جو سال میں چھ مہینے سے کم نہیں کس طرح کام میں لگایا جائے" یہ اعتراض کچھ فرق کے ساتھ ان تمام ملکوں پر وارد ہوتا ہے جو

سے روزگاری میں مبتلا ہیں۔ لیکن اصل میں دقت کام کی کمی کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ منافع حاصل کرنے کے موجودہ نظام کے ماتحت آدمیوں کو کام میں خاطرخواہ نفع نہیں ہوتا۔ کثرت سے ایسے کام موجود ہیں، جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آؤ اور ہمیں کرو۔ مثلاً سڑکوں اور مکانوں کی تعمیر، آب پاشی کی اسکیم، حفظانِ صحت، نقل و رسائل، صنعت و حرفت اور برقی قوت کی ترقی، سماجی اور تمدنی خدمات، تعلیم، اور ان بیسیوں ضروری اشیا کی فراہمی جن کی لوگوں کو ضرورت ہے۔ ہمارے یہ کروڑوں آدمی آئندہ پچاس سال تک سخت محنت کرتے رہیں۔ تب بھی کام ختم نہ ہوگا لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کام کی محرک نفع کی خواہش نہیں، بلکہ سماجی ترقی کی خواہش ہو، اور سماج کی تنظیم مفادِ عامہ کو پیش نظر رکھ کر کی جائے۔ روس کی سوویٹ یونین میں اور چاہے جو نقائص ہوں، لیکن وہاں بے روزگاری مطلق نہیں ہے۔ ہمارے یہاں لوگ کام نہ ہونے کی وجہ سے بیکار نہیں ہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے لئے کام کرنے کی اور تمدنی اصلاح و ترقی کی کوئی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ اگر بچوں سے کام لینا بند کر دیا جائے، ایک معقول عمر تک لازمی تعلیم کا بندوبست ہو جائے، تو لڑکے مزدوروں، اور بے روزگاروں کے زمرے سے خارج ہو جائیں گے۔ اور مزدوروں کی منڈی کئی کروڑ آدمیوں کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی

گاندھی جی نے اس بات کی کوشش کسی قدر کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ چرخے اور تکلی میں اصلاح و ترمیم کی جائے۔ اور ان کی قوت پیداوار بڑھائی جائے۔ یہ بھی تو اوزار اور کل کو ترقی دینے کی کوشش ہے اور اگر یہ ترقی اسی طرح جاری رہی، تو بہت ممکن ہے گھریلو صنعتوں میں بھی

بجلی کی قوت سے کام لیا جانے لگے) تو مانع کی خواہش پھر نمودار ہو جائے۔
اور اس کی وجہ سے وہی چیز پیدا ہو گی، جس کو ضرورت سے زیادہ پیداوار اور
بے روزگاری کہتے ہیں۔ اگر دیہی صنعتوں میں جدید صنعتی طریقوں سے کام نہ
لیا گیا، تو وہ ان ضروری، مادی اور تمدنی اشیاء کو بھی تیار نہیں کر سکتیں،
جو ہمیں اس وقت درکار ہیں۔ اور پھر وہ کلوں کے ساتھ مقابلہ کیونکر کریں گی؟
کیا ہندوستان میں بڑی بڑی کلوں کے رواج کو روکنا مفید ہے۔ اور فرض
کیجئے کہ مفید ہو، تو کیا یہ ممکن بھی ہے؟ گاندھی جی نے بار بار یہ کہا ہے کہ وہ سب
سے کلوں کے مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت
ہندوستان کے لئے ان کا استعمال موزوں نہیں، پھر میں یہ سوچتا ہوں، کہ
کیا بنیادی صنعتیں مثلاً لوہے اور فولاد کی صنعت یا اس سے کم درجے کی صنعتیں
جو پہلے سے موجود ہیں، مثلاً [illegible]
یہ بات صریحی طور پر ناممکن ہے۔ جب ہمارے یہاں ریلیں، ڈیل، نقل و
حمل کے وسائل وغیرہ موجود ہیں، تو یا تو ہم یہ چیزیں خود پیدا کریں، یا دوسروں
کے محتاج رہیں، اس کے علاوہ اگر ہم چاہتے ہیں، کہ ملک کی حفاظت اور مدافعت
کے وسائل ہمارے پاس ہوں، تو ہمیں نہ صرف بنیادی صنعتوں کی، بلکہ ایک
نہایت ترقی یافتہ صنعتی نظام کی ضرورت ہے۔ آج کوئی ملک جو صنعتی حیثیت
سے ترقی یافتہ نہیں ہے۔ نہ حقیقی معنوں میں آزاد ہے، اور نہ بیرونی حملے کی مدافعت
کر سکتا ہے۔ اشکال یہ ہے کہ ایک بنیادی صنعت کی مدد اور تکمیل کے لئے دوسری
بنیادی صنعتیں درکار ہیں۔ اور پھر کلیں بنانے کی صنعت ضروری ہوتی ہے جب یہ
بنیادی صنعتیں قائم ہو جائیں تو پھر لازمی طور پر دوسری صنعتیں بھی پھیل جاتی ہیں،
غرض یہ سلسلہ کسی طرح رک نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ صرف ہماری مادی

اور تمدنی ترقی بلکہ ہماری آزادی کا بھی اسی پر انحصار ہے۔ جوں جوں بڑے پیمانے کی صنعت پھیلتی جائے گی۔ چھوٹی چھوٹی دیہاتی صنعتوں کو اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہوتا جائے گا۔ اشتراکی نظام میں ان کے لئے پھر بھی کچھ موقع ہے۔ مگر نظام سرمایہ داری میں ان کی مطلق گنجائش نہیں۔ اشتراکی ریاست میں بھی وہ گھریلو صنعتوں کی حیثیت سے باقی رہ سکتی ہیں جن میں وہ چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ جو بڑے پیمانے پر تیار نہ کی جا سکیں۔

کانگریس کے بعض لیڈر صنعت کی ترقی سے خوف زدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صنعتی ممالک کی تمام موجودہ مشکلات اور پریشانیاں بڑے پیمانے پر مال تیار کرنے کی وجہ سے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی ہے[۱]۔ اگر عام لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس میں کیا بُرائی ہے کہ وہ کافی مقدار میں تیار کی جائے؟ کیا لوگ اس کو ترجیح دیں گے، کہ خواہ ان کی ضرورت پوری نہ ہو، لیکن بڑے پیمانے پر چیزیں نہ تیار کی جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دولت آفرینی کے طریقے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ تقسیم دولت کا موجودہ نظام بہت ناقص اور مہمل ہے۔

ایک اور مشکل جس کا دیہی صنعت کے حامیوں کو سامنا کرنا ہے۔ یہ ہے کہ ہماری زراعت دنیا کی منڈی کی پابند ہے کسان اس پر مجبور ہے کہ ابھی

[۱] ۳ جنوری سنہ ۳۸ء کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا، کہ "حقیقی اشتراکیت دیہاتی صنعتوں کی ترقی پر موقوف ہے۔ ہم اپنے ملک میں وہ ابتری پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ جو مغربی ملکوں میں بڑے پیمانے کی پیداوار کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے"۔

چیزوں کی کاشت کرے جن کی بازار میں مانگ ہے اور وہی قیمتیں رکھے جو اور ملکوں میں ہیں قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں اور اس کو اپنا مقررہ لگان یا مالگزاری نقد کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے اس لئے کسی نہ کسی طرح اس کو یہ روپیہ فراہم کرنا پڑتا ہے۔ ماکم سے کم وہ اس کی کوشش ضرور کرتا ہے اس لئے وہ ایسی چیز بوتا ہے۔ جو اس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت ہوگی۔ وہ ان چیزوں کی کاشت نہیں کر سکتا۔ جن کی اس کو خود ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اور اس کے بال بچے کم سے کم کھانے کے معاملہ میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔

حال ہی احساس خوردنی اور دوسری چیزوں کی زرعی قیمتیں یکبارگی گر جانے کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو خصوصاً صوبہ متحدہ اور بہار میں مجبوراً "گنے" کی کاشت کرنی پڑی ماہر کی شکر پر محصول لگ جانے کی وجہ سے شکر کے کارخانے برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہوگئے۔ اور "گنے" کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ لیکن بہت جلد رسد طلب سے کہیں زیادہ ہوگئی۔ کارخانوں کے مالکوں نے بڑی بے رحمی سے کسانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اور "گنے" کی قیمت گر گئی۔

ان تمام امور اور ان کے علاوہ اور بہت سی باتوں کی وجہ سے نہ یہ مناسب ہے اور نہ ممکن ہے کہ ہمارے زرعی اور صنعتی مسائل محدود ملکی مصلحتوں کے مطابق حل کئے جا سکیں۔ اور یہی صورت ہماری قومی زندگی کے ہر پہلو کی ہے۔ ہم مبہم اور جذبات انگیز فقروں میں پناہ نہیں لے سکتے۔ بلکہ ہمیں زندگی کے واقعات کا سامنا کرنا ہے اور ان سے مطابقت پیدا کرنا ہے تاکہ ہم تاریخ کی بساط کے شاطر نہیں اس کے مہرے بن کر نہ رہ جائیں۔

پھر مجھے اس مجموعہ اضداد دیسی گاندھی جی کا خیال آجاتا ہے[1] باوجود اپنی سیر چشمی اور مظلوموں کے جوش حمایت کے وہ کیوں اس زوال پذیر نظام کی حمایت کرتے ہیں، جو موجودہ مصیبت اور اسراف کا ذمہ دار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس مصیبت سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن کیا ماضی کی راہ قطعاً مسدود نہیں ہو چکی ہے، ایک طرف تو وہ راہ کی تلاش میں مصروف ہیں اور دوسری طرف پرانے نظام کے پیچھے کھچے آثار جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ مثلاً دیسی ریاستیں بڑی بڑی زمینداریاں اور تعلقہ داریاں اور موجودہ سرمایہ داری کا نظام، ان سب پر اپنا دست شفقت رکھے ہوئے ہیں کیا امانت داری کے اس نظریے کو عقل تسلیم کر سکتی ہے، کہ ایک فرد کو غیر محدود دولت اور اختیارات دے دیئے جائیں۔ اور پھر اسی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس کو مفاد عامہ

---

(۱) ۱۹۳۱ء میں لندن کی گول میز کانفرنس کے جلسے میں گاندھی جی نے فرمایا تھا "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگریس اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ہندوستان کے کروڑوں بے زبان نیم فاقہ کش غریبوں کی نمائندہ ہے جو ملک کے طول و عرض میں سات لاکھ گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ برطانوی ہند کے ہوں، یا ہندی ہند کے جن جن گروہوں کی اغراض کانگریس کے نزدیک قابل حمایت ہیں۔ ان میں سب پر مقدم ان بے زبانوں کی فلاح ہے اکثر یہ اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتی نظر آتی ہیں اگر سچ مچ ایسا ہو کہ مختلف گروہوں کی اغراض ٹکرا جائیں۔ تو میں بے دھڑک کہتا ہوں، کہ کانگریس ہر گروہ کی اغراض کو ان کروڑوں بے زبانوں کی فلاح پر قربان کر دے گی۔"

کے لئے استعمال کرے گا؟ کیا ہم میں سے بہتر سے بہتر لوگ بھی اخلاقی تکمیل کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ ان پر اس طریقہ سے اعتماد کیا جا سکے؟ افلاطون کے فلسفی بادشاہ بھی مشکل ہی سے اس لوحہ کے اٹھانے کے اہل ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ کیا دوسروں کے لئے یہ اچھا ہوگا کہ یہ شفیق مافوق الانسان ان پر مسلط کر دئیے جائیں۔ لیکن دنیا میں نہ تو کوئی مافوق الانسان ہے، نہ کوئی فلسفی بادشاہ یہاں تو ناقص انسان بستے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ذاتی مفاد میں اور ان کے خیالات کے نتیجے میں ساری قوم کا بھلا ہے۔ اس خیال کی بدولت خاندانی شرافت اور دولت کا اقتدار ہمیشہ کے لئے قائم ہو جاتا ہے۔ جس کے نتائج ہر طرح مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ اس وقت میں اس مسئلے پر غور نہیں کر رہا ہوں، کہ سماجی نظام کی تبدیلی کس طرح عمل میں آئے۔ اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ کیونکر دور کی جائیں۔ جبر سے یا خیالات پر اثر ڈالنے کے ذریعے سے تشدد سے، یا عدم تشدد سے، اس پہلو سے میں بعد میں بحث کروں گا۔ بہرحال تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ اور اس کو صاف الفاظ میں بیان کر دینا چاہئے جب تک سیاسی اور دینی رہنما اس بات کو وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھتے۔ اور صاف صاف بیان نہیں کرتے۔ اس وقت تک وہ یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنا ہم خیال بنا سکیں گے۔ یا لوگوں میں وہ ذہنیت پیدا کر سکیں گے جس کی ضرورت ہے، اس میں شک نہیں، کہ واقعات خود سب سے بہتر معلم ہوتے ہیں، لیکن اگر ان واقعات کی صحیح اہمیت کو ظاہر کرنا ہے اور ان سے مناسب کام لینا ہے تو اس کی ضرورت ہے، کہ ہم خود انہیں اچھی طرح سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔

کبھی کبھی میرے احباب اور رفقا میری باتوں سے چڑ کر پوچھتے ہیں، کہ کیا آپ نے کبھی کوئی کریم النفس رئیس، مخیر زمیندار، نیک نیت اور با مروت سرمایہ داران تک نہیں دیکھا۔ بیشک میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں۔ بلکہ میں خود اس طبقے سے ہوں، جو زمینداروں اور دولت مندوں سے میل جول رکھتا ہے۔ میں خود ایک نمونہ کا "بورژوا"[1] ہوں۔ اسی ماحول میں میری تربیت ہوئی اور اسی کے حالات نے ابتدا میں مجھے متاثر کیا۔ بعض اشتمالیوں نے مجھے "پیٹی بورژوا"[2] کہا تھا۔ اور بالکل ٹھیک کہا تھا۔ غالباً اب وہ مجھے اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا "بورژوا" کہیں گے لیکن یہاں اس سے کچھ بحث نہیں، کہ میں کیا ہوں، یہ بالکل مہمل بات ہے۔ کہ قومی، بین الاقوامی، معاشی اور سماجی مسائل پر غور کرتے وقت افراد کی ذاتی حیثیت کو اہمیت دی جائے، وہی احباب مجھ پر اعتراض کرتے ہیں، سراسر یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا جھگڑا گناہ سے ہے، نہ کہ گنہگار سے۔ میں اتنا بڑا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ میرا جھگڑا ایک نظام سے ہے۔ نہ کہ افراد سے۔ مگر ہر نظام بڑی حد تک افراد اور جماعتوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور جو شخص نظام کو بدلنا چاہتا ہے اسے ان افراد اور جماعتوں سے لڑنا ہے۔ یا نہیں ایسا ہم خیال ساتھی بنانا ہے۔ اگر کوئی نظام اب ہمارے لئے مفید نہیں رہا۔ اور ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ تو وہ مٹ کر رہے گا اور جو طبقے اور جماعتیں اس سے وابستہ ہیں ان کو بھی اپنی کایا پلٹ کرنی پڑے گی اس عمل تعمیر میں جہاں تک ہو سکے تکلیف کے عنصر کو کم کرنا چاہیئے لیکن قسمتی سے صورت کچھ ایسی ہے کہ لوگوں کو تکلیف پہنچا اور معاملات کا درہم برہم ہونا ناگزیر ہے۔

---

(۱) اوسط طبقہ کا شہری (۲) نیچے اوسط طبقہ کا شہری

دیکھنے والا ماضی کے تصور میں ڈوب جاتا ہے، اور بچپن کے خواب اس کی نظروں میں ابھرنے لگتے ہیں طرح دار جوان زرہ بکتر سے آراستہ، حسین لڑکیاں مینار دار قلعے سورماؤں کا زمانہ، سیا بیابہ آں ماں بے نظیر شجاعت اور جاں بازی، خصوصاً اگر وہ راجپوتانہ کے علاقے میں ہے، جو رومان اور مہم جوئی کے کارناموں کا گھر ہے۔

لیکن بہت جلد یہ تصور دھندلا پڑ جاتا ہے، اور ہوا کی کثافت سے دم گھٹنے لگتا ہے، سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے دھیرے دھیرے بہنے والے تالاب کی تہہ میں بند پانی کی سڑاند محسوس ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر طرف سے گھرا ہوا ہے۔ اور اس کا جسم اور دماغ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے ایک طرف پرجا کی انتہائی پستی اور مصیبت اور دوسری طرف راجا کے محل کے ٹھاٹ کو دیکھ کر دل پر عجیب اثر پڑتا ہے ریاست کی دولت کا کتنا بڑا حصہ محل میں رئیس کے تعیشات اور ذاتی ضروریات کی مد ہوتا ہے۔ اور کتنا تھوڑا حصہ عام لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ یہ رئیس ریاست کو بڑے مہنگے پڑتے ہیں، ان پر اتنا خرچ کر کے اس کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟

ان ریاستوں پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہے، اخبار وہاں پنپنے نہیں دئے جاتے زیادہ سے زیادہ ایک ادبی یا نیم سرکاری ہفتہ وار اخبار چل سکتا ہے بیرونی اخبارات کا داخلہ اکثر بند کر دیا جاتا ہے سوائے چند بڑی ریاستوں کے مثلاً ٹراونکور اور کوچین وغیرہ، (جہاں پڑھے لکھوں کی تعداد برطانوی علاقے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے) اور ریاستوں میں عام تعلیم بہت کم ہے سب سے اہم خبریں جو ریاستوں سے آتی ہیں، وہ یہ ہوتی ہیں۔
وائسرائے کی تشریف آوری کا تزک و احتشام، دربار، ایک دوسرے

لیکن پارلیمنٹی جمہوریت کی ناکامی کی وجہ یہ نہیں ہے۔ کہ وہ بہت آگے بڑھ گئی ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ زمانے کی رفتار سے پیچھے رہ گئی ہے۔ یہ جمہوریت ناقص تھی اس لئے کہ اس نے معاشی جمہوریت کو نظرانداز کر دیا۔ اس کا طریق کار بہت سست اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے لئے بالکل ناموزوں تھا۔"

دیسی ریاستیں جانا آج دنیا میں مطلق العنانی کا نمونہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ برطانیہ کی محکوم ہیں لیکن برطانوی حکومت ان کے معاملات میں صرف اسی حد تک دخل دیتی ہے جہاں تک برطانوی مفاد کا تقاضا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ قدیم جاگیرداری نظام کے نمونے جو چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح غیر ملکی حکومت کے سمندر میں گھرے ہوئے ہیں۔ کیونکر بغیر کسی تغیر اور تبدیلی کے بیسویں صدی تک باقی رہے۔ وہاں اب تک جمود اور بھاری ہے۔ پانی دھیرے دھیرے بہتا ہے۔ اور ایک نووارد جو تبدیلی اور حرکت کا عادی ہے مگر شاید اس سے کسی قدر گھبراتا ہوتا ہے وہاں پہنچ کر اونگھنے لگتا ہے اور ہر ایک جادو کی سی کیفیت چھا جاتی ہے ایک ساکن تصویر سی نظر آتی ہے۔ جو وقت کی حرکت سے محروم ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتی ہے۔ تقریباً بالکل غیر محسوس طریقے پر

(بقیہ نوٹ ۴۳۳) کہ کسی نہ کسی طرح حکومت سے دست بردار ہو جائیں اور اگر بدقسمتی سے کبھی ایسا وقت آگیا کہ تاج برطانیہ نے ہندوستانیوں کے سراتھ کے مطابق دیسی ریاستوں کی حمایت نہ کی تو رئیس اور ریاستیں مرتے دم تک میدان سے ہٹنے والی نہیں؛

دیکھنے والا ماضی کے تصور میں ڈوب جاتا ہے، اور دلچسپ خواب اس کی نظروں میں بھرنے لگتے ہیں طرح دار جوان زرہ بکتر سے آراستہ، حسین لڑکیاں، مینارہ دار قلعے سورماؤں کا زمانہ، سپاہیانہ آن بان، بے نظیر شجاعت، اور جاں بازی، خصوصاً اگر وہ راجپوتانہ کے علاقے میں ہے، جو دیومالا اور مہا بھارت کے کارناموں کا گھر ہے۔

لیکن بہت جلد یہ تصور دھندلا پڑ جاتا ہے، اور ہوا کی کثافت سے دم گھٹنے لگتا ہے، سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے دھیرے دھیرے بہنے والے تالاب کی تہہ میں صدیوں کی سڑاند محسوس ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر طرف سے گھرا ہوا ہے۔ اور اس کا جسم اور روح زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک طرف پرجا کی انتہائی پستی اور مصیبت اور دوسری طرف راجا کے محل کے ٹھاٹ کو دیکھ کر دل پر عجیب اثر پڑتا ہے ریاست کی دولت کا کتنا بڑا حصہ محل میں رئیس کے تعیشات اور ذاتی ضروریات کی مد میں جاتا ہے۔ اور کتنا تھوڑا حصہ عام لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ رئیس ریاست کو بڑے مہنگے پڑتے ہیں، ان پر اتنا خرچ کر کے اس کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟

ان ریاستوں پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہے، اخبار وہاں پہنچنے نہیں دئے جاتے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ادبی یا نیم سرکاری ہفتہ وار اخبار چل سکتا ہے بیرونی اخبارات کا داخلہ اکثر بند کر دیا جاتا ہے سوائے چند جنوبی ریاستوں کے، مثلاً ٹراونکور اور کوچین وغیرہ، (جہاں پڑھے لکھوں کی تعداد برطانوی علاقے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے) اور ریاستوں میں عام تعلیم بہت کم ہے بس سب سے اہم خبریں جو ریاستوں سے آتی ہیں، وہ یہ ہوتی ہیں۔

وائسرائے کی تشریف آوری کا تزک و احتشام، دربار، ایک دوسرے

کی تقریب میں تقریریں، رئیس کی شادی یا سالگرہ کا پُر تکلف جشن، یا پھر کسانوں کی تورتی۔ جو برطانوی ہند میں رئیسوں کو لوگوں کی نکتہ چینی سے محفوظ رکھنے کے لئے خاص قوانین بنائے گئے ہیں۔ اور ریاست کے اندر تو معمولی سے معمولی تنقید بھی نہایت سختی کے ساتھ دبا دی جاتی ہے، عام جلسے قریب قریب معدوم ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جلسے بھی جو کسی معاشرتی مقصد سے کئے جائیں، اکثر روک دئے جاتے ہیں۔[1] اکثر باہر کے سربرآوردہ قومی کارکنوں کا داخلہ ریاستوں میں روک دیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۲ء کے وسط میں مسٹر آر داس بہت بیمار تھے اور انہوں نے صحت حاصل کرنے کی غرض سے کشمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس میں کوئی سیاسی غرض نہیں تھی۔ مگر کشمیر کی سرحد پر پہنچنے کے بعد وہ آگے بڑھنے سے روک دئے گئے۔ مسٹر جناح کو بھی حیدرآباد میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی اور مسز نائیڈو جن کا گھر خاص حیدرآباد شہر میں

---

(۱) حیدرآباد کی ایک اخباری اطلاع مورخہ ۳ر اکتوبر ۱۹۳۲ء مظہر ہے کہ گاندھی جی کی سالگرہ منانے کے لئے جو عام جلسہ دویک دروی تھیٹر میں ہونے والا تھا وہ نہیں ہوسکا جلسے کا انتظام حیدرآباد سٹی میوک مسٹگھ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس انجمن کے سکریٹری نے اخبارات کے نام ایک خط میں بیان کیا ہے کہ جلسے کے وقت سے ۲۴ گھنٹے پہلے حکام نے یہ اطلاع دی کہ جلسہ کرنے کی اجازت صرف اس شرط پر دی جائیگی کہ دو ہزار روپے کی نقد ضمانت داخل کی جائے اور یہ وعدہ کیا جائے کہ سیاسی نوعیت کی تقریر نہ کی جائے گی۔ اور حکام ریاست کے کسی سرکاری عمل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی جائے گی چونکہ اتنا وقت نہ تھا کہ اعلیٰ حکام سے مل کر معاملات طے کر سکتے۔ اس لئے جلسہ کا خیال مجبوراً ترک کر دیا گیا۔

ہے ایک مدت تک وہاں نہیں جانے پائیں۔

جب ریاستوں کی یہ حالت تھی تو ظاہر ہے کہ کانگریس کو ریاست کے باشندوں کے بنیادی حقوق کی حمایت اور ان کی پامالی پر نکتہ چینی کرنی چاہیے تھی لیکن گاندھی جی نے ریاستوں کے متعلق ایک انوکھی پالیسی ایجاد کی۔ یعنی "ریاستوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت" اس "چپ چپ" کی پالیسی پر وہ ان تمام غیر معمولی اور افسوسناک واقعات کے باوجود قائم رہے۔ جو ریاستوں میں پیش آئے حالانکہ ریاستوں کی حکومتیں بے دھڑک کانگریس پر حملے کرتی رہیں بظاہر شاید یہ خطرہ ہے کہ کانگریس کی نکتہ چینی رئیسوں کو ناراض کر دے گی اور پھر ان کو ہم خیال بنانا اور زیادہ دشوار ہو جائے گا۔ گاندھی جی نے اپنے جولائی ۱۹۳۴ء کے خط میں جو انہوں نے ریاستوں کی رعایا کی کانفرنس کے صدر مسٹر این سی کیلکر کے نام لکھا تھا۔ اپنے اس خیال کو دہرایا کہ عدم مداخلت کی پالیسی بالکل صحیح اور دانشمندانہ ہے ان ریاستوں کی آئینی اور قانونی حیثیت کے متعلق جو خیال انہوں نے ظاہر کیا وہ عجیب و غریب تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ "یہ دیسی ریاستیں برطانوی قانون کے مطابق بالکل آزاد حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ہندوستان کے اس حصے کو جو برطانوی ہند کہلاتا ہے۔ ان ریاستوں کی پالیسی کی تشکیل کا اس سے زیادہ اختیار نہیں، حتیٰ کہ مثلاً افغانستان اور سیلون کی پالیسی میں دخل دینے کا" چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دیسی ریاستوں کی رعایا کی نرم اور اعتدال پسند کانفرنس اور لبرل پارٹی نے بھی ان کی اس رائے اور مشورے پر اعتراض کیا لیکن یہ خیالات رئیسوں کو بہت پسند آئے انہوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ایک ہی مہینے کے اندر حکومت ٹراونکور نے اپنے حدود میں تمام کانگریس کو ممنوع قرار دے دیا۔ اس کے تمام جلسوں کو اور ممبر بنانے کی

تحریک کو روک دیا اس کارروائی کے ساتھ اس نے یہ اعلان کیا کہ ذمہ دار
لیڈروں نے خود ہی یہ مشورہ دیا ہے (صریحاً یہ اشارہ گاندھی جی کے بیان کی طرف تھا)
یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ ممانعت اس وقت کی گئی جب برطانوی ہند میں سول نافرمانی
موقوف ہو چکی تھی (ریاستوں سے اسے کوئی تعلق نہ تھا) اور حکومت ہند نے
کانگریس کو دوبارہ مطابق قانون قرار دے دیا تھا یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی
کہ حکومت تراونکور کے مشیر قانونی اس وقت سر سی پی راماسوامی آئر تھے۔
(اور اب تک ہیں) جو ایک زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے
جنرل سکریٹری تھے۔ آگے چل کر لبرل بن گئے اور حکومت ہند اور حکومت
مدراس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے

کانگریس کی پالیسی اور گاندھی جی کے مشورہ کے مطابق حکومت تراونکور نے
اس بے وجہ حملے کے جواب میں جو اس کے زمانے میں کانگریس پر کیا گیا اس کی طرف
سے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا[1] حالانکہ بعض لبرل حضرات نے بڑے زور و شور سے اس
کے خلاف احتجاج کیا۔ حقیقت میں ریاستوں کے معاملے میں گاندھی جی نے لبرلوں سے بھی
سے کہیں زیادہ اعتدال اور احتیاط کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ سربرآوردہ قومی
لیڈروں میں شاید صرف پنڈت مدن موہن مالوی ایک ایسے شخص ہیں جو بہت سے
رئیسوں سے گہرے تعلقات رکھنے کی وجہ سے اس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں اور اس
کا لحاظ رکھتے ہیں کہ والیان ریاست کے جذبات کو ٹھیس نہ لگنے پائے

---

[1] سردار بلبھ بھائی پٹیل نے ۹ جنوری ۱۹۳۴ء کو بڑودہ میں تقریر کرتے ہوئے اسی عدم
مداخلت کی پالیسی پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ریاستوں کے کارکنوں کو چاہیے کہ ریاست کی
قائم کی ہوئی پابندیوں کے دائرہ میں رہ کر اپنا کام کریں۔ اور ریاست کے کام پر نکتہ چینی کرنے
کے بجائے یہ کوشش کریں کہ رعایا اور راعی کے درمیان عمدہ تعلقات قائم کریں۔

گاندھی جی پہلے رئیسوں کے معاملے میں اتنے زیادہ محتاط نہ تھے ۱۹۱۶ء میں ایک مشہور موقع پر جب بنارس میں ہندو یونیورسٹی کی افتتاحی رسمیں ادا ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ایک جلسے میں تقریر کی تھی۔ جس کے صدر ایک مہاراجہ تھے اور جس میں بہت سے اور رئیس شریک تھے۔ وہ نئے نئے افریقہ سے واپس آئے تھے۔ اور ہندوستان کی ریاست کا بوجھ ہو ان کے کاندھوں پر نہ تھا۔ سچے مصلحانہ جوش سے انہوں نے ان حضرات کو ہدایت کی، کہ اپنے اطوار کو درست کریں۔ اور خود پسندانہ عیش و عشرت، اور شان و شوکت کو چھوڑ دیں۔ انہوں نے کہا۔ "رئیسو جاؤ اور اپنے زیور اور جواہرات کو بیچ ڈالو" زیورات اور جواہرات تو دہ کیا بیچتے، مگر چلے ضرور گئے، سراسیمگی کی حالت میں ایک ایک دو دو کر کے سب رئیس وہاں سے اٹھ گئے۔ یہاں تک کہ جناب صدر بھی مقرر کو تنہا چھوڑ کر چل دئے۔ مسز بسنٹ بھی جو اس وقت وہاں موجود تھیں۔ گاندھی جی کی باتوں سے خفا ہو گئیں۔ اور جلسے کو چھوڑ کر چلی گئیں۔

ایک خط میں جو گاندھی جی نے مسٹر کیلکر کے نام لکھا تھا۔ وہ فرماتے ہیں میں چاہتا ہوں، کہ ریاستیں اپنی رعایا کو خود اختیارانہ حکومت عطا کریں اور رئیس اپنے آپ کو جمہور کا امانت دار سمجھیں؛ اگر واقعی اس "امانت داری" کے نظریئے میں کوئی بات ہے، تو ہم پھر برطانوی حکومت کے اس امانت پر کیوں اعتراض کرتے ہیں کہ "وہ ہندوستان کی حکومت کی امانت دار ہے" بجز اس کے کہ وہ بدیسی ہے اس میں اور ہندوستانی رئیسوں میں کیا فرق ہے؟ اور رنگ، نسل، اور تہذیب کا اختلاف تو خود ہندوستان کے لوگوں میں بھی موجود ہے۔

گذشتہ چند سال سے ریاستوں میں تیزی کے ساتھ برطانوی حکام
ٹھونسے جاتے ہیں۔ رئیس عموماً اس کے مخالف ہیں۔ مگر وہ بالکل بے بس ہیں۔
یوں تو حکومت ہند ہمیشہ سے ریاستوں پر تسلط رکھتی ہے، مگر اب ریاستیں
اندر سے بھی جکڑ دی گئیں۔ چنانچہ جب کبھی ریاستوں کی زبان سے کچھ نکلتا ہے،
تو اصل میں یہ حکومت ہند کی دبی ہوئی آواز ہوتی ہے۔ جو جاگیرداری نظام
کے پردے سے بولتی ہے

میں سمجھ سکتا ہوں کہ ریاستوں میں ہمیشہ اس قسم کی جدوجہد نہیں
برطانوی ہند میں ہوتی ہیں لیکن، خود برطانوی ہند کے مختلف صوبوں کی
اجتماعی سطح، فرقہ وارانہ اور انتظامی حالت میں بھی بہت فرق ہے۔ اس لئے
یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی پالیسی سب کہیں قابل عمل ہو، لیکن جدوجہد کے
طریقے میں حالات کے لحاظ سے اختلاف ہونا اور دامت ہے۔ ہماری عام
پالیسی مختلف علاقوں میں مختلف نہیں ہونی چاہئے۔ اور جو چیز ایک جگہ بری
سمجھی جاتی ہے، وہ دوسری جگہ بری سمجھی جانی چاہیئے ورنہ ہم پر یہ الزام
لگایا جائے گا، اور لگ یا جا چکا ہے کہ ہم کوئی مستقل پالیسی اور اصول نہیں
رکھتے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف قوت اور اقتدار حاصل کرنا ہے۔

مختلف ملتوں اور دوسری اقلیتوں کو جداگانہ حق انتخاب دینے کے
خلاف کافی طور پر بہت کچھ نکتہ چینی کی جاتی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ
جمہوریت کے ساتھ کسی طرح نہیں کھپ سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب حلقہ ہائے
انتخاب مذہبی جماعتوں میں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوں تقسیم کر دیئے
جائیں۔ تو جمہوریت یا ذمہ دار حکومت کے قائم ہونے کا کوئی امکان نہیں
لیکن جو لوگ اس پر بڑے زور شور سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔ مثلاً پنڈت مدن موہن مالوی

یا ہندو سبھا کے لیڈر، تعجب ہے کہ وہ ریاستوں کے حالات سے مطمئن ہیں اور بظاہر اس پر آمادہ ہوگئے ہیں کہ استبدادی ریاستوں اور جمہوری برطانوی ہند (یہ حضرات اسے جمہوری کہتے ہیں) کے درمیان وفاقی اتحاد ہوجائے۔ اس سے زیادہ بے تکا اور نامعقول اتحاد مشکل سے تصور میں آسکتا ہے۔ لیکن ہندو سبھا کے حامیاں جمہوریت وقومیت بے تکلف اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہیں بات یہ ہے کہ ہم زبان سے تو مطلق صحت اور استقامت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ہمارے عمل کا بنیادی محرک اب تک خدشات کے سوا کچھ نہیں۔

غرض ریاستوں کے متعلق کانگریس کا رویہ ایک عجیب معمّا ہے۔ مجھے ٹامس پین کا ایک جملہ یاد آگیا جو اس نے تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوئے برک کے متعلق کہا تھا کہ انہیں پروں پر ترس آتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ چڑیا مری جاتی ہے۔ گاندھی جی مرتی ہوئی چڑیا کو تو دیکھتے ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پروں کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہیں۔

کم وبیش یہی صورت تعلقہ داروں اور بڑی زمینداریوں کے نظام کی ہے۔ اس معاملہ میں تو اس کسی دلیل دحکت کی ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی کہ یہ جاگیرداری نظام فرسودہ ہوگیا ہے اور دولت آفرینی اور عام ترقی کی راہ میں حائل ہے خود سرمایہ داری کے ترقی پذیر نظام کے ساتھ اس کا نباہ ممکن نہیں چنانچہ قریب قریب دنیا کے سب ملکوں میں بڑی بڑی زمینداریاں غائب ہوتی جاتی ہیں اور کاشتکاران زمینداروں کی جگہ لے رہے ہیں میرا تک یہی خیال تھا کہ ہندوستان میں اگر کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ جن زمینداروں سے زمین چھینی جائے انہیں اس کا کوئی معاوضہ دیا جائے لیکن سال گذشتہ مجھے یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ گاندھی جی موجودہ تعلقہ داری نظام کو

ہی نقطہ پسند کرتے ہیں اور اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ جولائی ۱۹۳۶ء میں انہوں نے کانپور میں کہا تھا "زمیندار اور کسان کے دل میں ایک دوسرے کی محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو ان کے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔ پھر دونوں امن اور سلوک سے رہ سکتے ہیں۔ میں ہرگز تعلقہ داری اور زمینداری نظام کو مٹا دینے کا حامی نہیں ہوں اور جو لوگ اسی کو مٹانا چاہتے ہیں وہ خود اپنے خیالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے" (یہ انہوں نے بڑی بے انصافی کی بات کہی)

آگے چل کر انہوں نے فرمایا "میں ہرگز اس کوشش میں شریک نہیں ہوں گا کہ املاک رکھنے والے طبقے سے اس کی املاک چھین لی جائے۔ میرا مقصد آپ کے دلوں پر اثر ڈالنا اور آپ کو اپنا ہم خیال بنانا ہے (وہ بڑے بڑے زمینداروں کے ایک وفد سے مخاطب تھے) تاکہ آپ اپنی ذاتی املاک کو رعایا کی امانت کے طور پر رکھیں اور اس کا اصل مصرف ان کی فلاح و بہبود کو سمجھیں۔ اگر بے انصافی سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ آپ کی جائداد آپ سے چھین لی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ میں آپ کی طرف سے لڑوں گا۔ مغرب کی اشتراکیت اور اشتمالیت کی بنیاد ایسے تصورات پر ہے جو بنیادی طور پر ہمارے تصورات سے مختلف ہیں۔ ان میں سے ایک ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل ہے اس لئے ہماری اشتراکیت اور اشتمالیت کی بنیاد عدم تشدد پر اور مزدور اور سرمایہ دار، زمیندار اور کاشتکار کے ہم آہنگ تعاون پر ہونی چاہئے"۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مشرق اور مغرب کے بنیادی تصورات میں اس قسم کا اختلاف ہے یا نہیں، ممکن ہے کہ ہو مگر اس رسالے میں تو مرکزی اختلاف یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستانی سرمایہ دار اور زمیندار، مزدوروں اور

کسانوں کے ساتھ سے مغربی سرمایہ داروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ غفلت
اور بے پروائی برتتے ہیں ہندوستان کے زمیندار نے کبھی اس کی کوشش نہیں
کی کہ کسانوں کی فلاح وبہبود کے کاموں میں دلچسپی لیں۔ ایک یو۔ پی۔ مسٹر ایچ[1]
این بریلسفورڈ نے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرکے یہ خیال ظاہر کیا ہے
کہ ہندوستانی ساہوکار اور زمیندار ایسی خون چوسنے والی جونکیں ہیں جن کی مثال
کسی موجودہ سماجی نظام میں نہیں مل سکتی۔ لیکن غالباً ہندوستانی زمیندار کی
اس میں کوئی خطا نہیں ہے وہ خود زمانے کے حالات سے مجبور ہیں اس کی
حالت گرتی چلی جاتی ہے اور اب ایسی شکل میں پڑ گیا ہے جس سے نجات
پانا اس کے بس کی بات نہیں مہاجنوں نے اکثر زمینداروں کی جائداد پر
قبضہ کرلیا ہے اور چھوٹے زمیندار اس حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ کہ اسی زمین پر
جس کے وہ کسی زمانے میں مالک تھے، کاشتکار کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ بہتر
کے مہاجنوں نے جائدادیں رہن رکھیں اور روپیہ وقت پر ادا نہ ہونے سے فائدہ
اٹھاکر ان پر قبضہ کرلیا اس طرح وہ زمیندار بیٹھے گاندھی جی کے قول کے
مطابق یہ لوگ امانت دار ہیں ان غریبوں کے حق سے انہوں نے خود زمینیں چھینی
ہیں اور ان سے یہ توقع ہے کہ اپنی آمدنی کا اصل مصرف اسامیوں کی فلاح
وبہبود کو سمجھیں گے۔

اگر واقعی تعلقہ داری نظام اچھا ہے تو اسے سارے ہندوستان میں کیوں نہ
رائج کیا جائے؟ ہندوستان میں بڑے بڑے علاقے ہیں جہاں کسان حق ملکیت رکھتا
ہے کیا گاندھی جی اسے پسند کریں گے کہ گجرات میں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار پیدا کئے

---

[1] ملکیت یا امن؟ مصنفہ ایچ این بریلسفورڈ

جائیں؛ میرے خیال میں تو ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ موجودہ متحدہ
یا ہمارا شمال کے لئے ترکی اور نظام اجیاجو اور گجرات یا پنجاب کے لئے کوئی اور
حالانکہ شمالی اور جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان کے لوگوں میں کچھ بہت
زیادہ فرق نہیں ہے اور ان کے بنیادی تصورات ایک ہی ہیں۔ مطلب اصل میں
یہ ہے کہ جو چیز جیسی ہے ویسی ہی رہے؟ حالت موجودہ میں کوئی تغیر کیا جائے
نہ کسی معاشی تحقیقات کی ضرورت ہے کہ کون سی چیز لوگوں کے لئے مناسب ہے
زیادہ مناسب اور مفید ہے اور کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی۔ ضرورت صرف اس
کی ہے کہ لوگوں کے دل میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی جائے۔ یہ زندگی اور
اس کے مسائل پر غور کرنے کا خالص مذہبی نقطۂ نظر ہے اور اسے سیاسیات، معاشیات
اور اجتماعیات سے ذرا بھی لگاؤ نہیں مگر گاندھی جی مذہب کے دائرے سے آگے
بڑھ کر سیاسی اور قومی معاملات میں بھی اس سے کام لینا چاہتے ہیں۔

اس قسم کے متضاد حالات اور خیالات آجکل ہندوستان کے سامنے ہیں
ہم نے اسی دوران میں بہت سی گتھیاں ڈالی ہیں جن کو سلجھائے بغیر آگے بڑھنا ناممکن
ہے مگر یہ جذبات کی مدد سے نہیں سلجھ سکتیں۔ اس سے بہت پہلے اپلیور نے یہ سوال
کیا تھا کہ کون سی چیز بہتر ہے؟ علم اور عقل کے ذریعے آزادی حاصل کرنا یا جذبات کی
زنجیروں میں جکڑے رہنا؟ اس نے پہلی صورت کو ترجیح دی تھی۔

(۶۳)

خیالات پر اثر ڈالنا بہتر ہے یا جبر سے کام لینا

سولہ برس گذرے گاندھی جی نے ہندوستان پر اپنے اہنسا کے اصول کا سکہ بٹھا دیا تھا اس وقت سے اب تک ہندوستانی سیاست پر اس کا تسلط رہا ہے بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہوں نے بغیر سمجھے بوجھے اس کی تائید کی بعض نے اسے بڑی کش مکش کے بعد متردد یا غیر متردد طور پر قبول کیا اور بعض نے کھلم کھلا اس کا مذاق اڑایا ہماری سیاسی اور سماجی زندگی پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور ہندوستان کے باہر بھی دوسرے ممالک میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ یوں تو یہ اصول اس وقت سے چلا آتا ہے جب سے انسان میں قوت فکر پیدا ہوئی۔ لیکن غالباً گاندھی جی پہلے آدمی ہیں۔ جنہوں نے اس سے بڑے پیمانے پر سیاسی اور سماجی تحریکوں میں کام لیا ابتدا میں یہ ایک انفرادی چیز تھی اور اس وجہ سے اس کی حیثیت در اصل مذہبی تھی۔ اس کا مقصد انفرادی ضبط نفس ہوتا تھا اور اس کے ذریعہ سے انسان داتی اغراض سے بری اور دنیاوی کش مکش سے بلند ہو کر ایک قسم کی شخصی آزادی اور نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس میں یہ مقصد پیش نظر نہیں رکھا گیا تھا کہ اس کے ذریعے بڑے بڑے سماجی مسائل کو حل کیا جائے اور سماجی حالات میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ ہاں بالواسطہ اس کا کتنی قدر سماجی زندگی پر پڑتا تھا۔ اصل میں موجودہ سماجی نظام اور اس کی بے انصافیوں اور عدم مساوات کو لوگ اٹل سمجھ کر بے چون و چرا تسلیم کرتے تھے گاندھی جی نے یہ کوشش کی کہ شخصی نصب العین کو بدل کر

ایک اجتماعی نصب العین بنا دیں۔ وہ سیاسی اور سماجی حالات دونوں میں انقلاب پیدا
کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے بالارادہ اس اہنسا کے طریقے
کو اس وسیع اور نئے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جو لوگ انسانوں کے
احوال اور ان کے حالات زندگی میں کوئی اہم تبدیلی کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کے
سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ سوسائٹی میں ایک ذہنی ہیجان پیدا کریں۔ اس کے دو ہی
طریقے ہو سکتے ہیں یا تشدد اور جبر سے کام لیا جائے یا اہنسا پر عمل کیا جائے۔ جبر کا دباؤ
انسان کے جسم پر پڑتا ہے اور اس سے کام لینے والا خود ذلیل ہوتا ہے اور دوسرے کو
پست کرتا ہے لیکن اہنسا کا دباؤ خود تکلیف اٹھا کر مثلاً فاقہ کشی کے ذریعے ڈالا جائے
اس سے بالکل مختلف اثر پیدا کرتا ہے یہ جن لوگوں کے خلاف استعمال کیا جائے ان کے
جسم پر نہیں بلکہ ان کی اخلاقی قوتوں پر اثر ڈالتا ہے اور انہیں تقویت پہنچاتا ہے۔[1]
یہ خیال ایک حد تک ہندوستانی ذہنیت سے ہم آہنگ ہے۔ اس لئے لوگوں نے
اس کو کسی نہ کسی طور پر بہت جوش کے ساتھ قبول کر لیا۔ بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ تھا
کہ اس کے نتائج کتنی دور تک پہنچتے ہیں اور جنہیں تھا انہوں نے بھی اس کے نظری
پہلو کو چھوڑ کر محض عقیدے اور عمل کے دامن میں پناہ لی۔ مگر جب عمل کا جوش کم ہوا تو
لوگوں کے ذہن میں بے شمار سوالات پیدا ہوئے جن کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔ ان کا
کوئی خاص اثر اس موجودہ سیاسی طرز عمل پر نہیں پڑا بلکہ یہ دراصل اس تمام فلسفۂ
حیات سے متعلق تھا جس پر اس قسم کے ترک و مقابلے کی بنیاد ہے۔ سیاسی
نقطۂ نظر سے اس تحریک کو اصلی کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندوستان ملک کو

---

(۱) یہ اقتباس گاندھی جی کے ایک بیان سے لیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے ایک
مقدمے کے موقع پر دسمبر ۱۹۲۲ء کو دیا تھا۔

سہنا یت کے بیج میں گرفتار ہے۔ سماجی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس سے ابھی کسی زبردست سماجی انقلاب کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا۔ مگر باوجود اس کے اگر کوئی شخص میں تھوڑی سی نظر بھی ہے تو دیکھ سکتا ہے کہ اس کی بدولت ہندوستان کے کروڑوں باشندوں میں کس قدر زبردست تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ انہوں نے ان میں سرت کی یک جہتی، قوت اور خود اعتمادی پیدا کر دی ہے اور یہ ایسی صفات ہیں جن کے بغیر سیاسی اور سماجی ترقی حاصل کرنا یا اس کا قائم رکھنا بہت دشوار ہے۔ اس کا فیصلہ آسانی سے نہیں ہو سکتا کہ یہ فوائد کہاں تک اہنسا کے اصول کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں اور کہاں تک ہماری سیاسی کشمکش کا لازمی نتیجہ ہیں۔ بہت سی قوموں کو اکثر موقعوں پر یہ تمام فوائد ایسی کشمکش سے بھی حاصل ہوئے ہیں جس میں تشدد کو دخل تھا۔

لیکن میرے خیال میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس اعتبار سے عدم تشدد (اہنسا) کا طریقہ ہمارے ملک کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اسی کی وجہ سے ہمیں سوسائٹی میں وہ "ذہنی ہیجان" پیدا کرنے میں مدد ملی ہے جس کی طرف گاندھی جی نے اشارہ کیا تھا۔ گو یہ واقعہ ہے کہ وہ ہیجان بعض بنیادی حالات اور اسباب کا نتیجہ ہے اس نے عام لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جو ہر انقلاب کی تمہید ہوا کرتی ہے۔

اہنسا کی یہ خوبی تو کھلی ہوئی ہے مگر یہ بجائے خود کافی نہیں۔ اصل شبہات اس سے دور نہیں ہوتے۔ بدقسمتی سے خود گاندھی جی سے اس مسئلے کے حل میں کچھ زیادہ مدد نہیں ملی۔ انہوں نے اس موضوع پر بے شمار موقعوں پر تقریریں کی ہیں اور مضامین لکھے ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے انہوں نے کبھی پبلک میں اس کے تمام فلسفہ اور عملی نتائج پر روشنی نہیں ڈالی[1]۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ذرائع مقصد سے

---

(۱) رچارڈ بی گریگ نے اپنی کتاب "عدم تشدد کی قوت" میں اس مسئلے پر علمی بحث کی ہے۔ ان کی کتاب بہت دلچسپ اور محرکِ فکر ہے۔

زیادہ اہم ہیں کہ روحانی اثر صرف بہترین افراد کا انتخاب معلوم ہوتا ہے کہ لعینا
کرتی اور جیسے تعبیر کریں کہ وہ اکثر انہیں ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال
کرتے ہیں۔ ایک رجحان یہ بھی ہے کہ ان سب لوگوں کو جو اس اصول سے
اتفاق نہ کریں حلقہ خاص میں شامل نہ کیا جائے اور وہ قانون اخلاق کی
خلاف ورزی کے مجرم قرار دے جائیں۔ گاندھی جی کے بعض حلقوں پر اس کا
لازمی طور پر یہ اثر ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہت مقدس سمجھنے لگے ہیں لیکن ہم
میں سے جو لوگ اس قدر عقیدت نہیں رکھتے انہیں بہت سے شکوک اور شبہات
ہیں۔ ان شکوک کا تعلق جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں فوری ضروریات سے نہیں
بلکہ اس ذہنی ضرورت سے ہے کہ حل کے لئے کوئی ایسا کیرکٹ فلسفہ اختیار کیا
جائے جو انفرادی نقطۂ نظر سے اخلاقی قدر بھی رکھتا ہو اور سماجی لحاظ سے بھی
مفید اور مؤثر ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے دل میں ابھی یہ شکوک باقی ہیں
اور اس مسئلے کا کوئی تشفی بخش حل سمجھ میں نہیں آتا۔ میں جبر اور تشدد کو سخت
ناپسند کرتا ہوں۔ لیکن خود مجھ میں تشدد موجود ہے اور میں جان اٹھا کر یا بے جانے
دوسرے پر جبر کرتا رہتا ہوں اور پھر یہ سوال ہے کہ اس ذہنی جبر
سے زیادہ اور کیا جبر ہو سکتا ہے۔ جس سے گاندھی جی اپنے خاص پیرووں
اور معتقدوں کے دماغ کو معطل کر دیتے ہیں۔

مگر اصل سوال یہ ہے کہ آیا قومیں اور جماعتیں اہنسا کے اس انفرادی
اصول کو پوری طرح اختیار کر بھی سکتی ہیں کیونکہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جس
طرح انسان بحیثیت مجموعی محبت اور نیکی کی بلند ترین سطح پر پہنچ جائے یہ صحیح ہے کہ ہمارا اصلی
نصب العین یہی ہونا چاہئے کہ انسانوں کو اس بلندی پر پہنچائیں اور نفرت، تشدد اور
خود غرضی کو مٹائیں۔ یہ امر کہ ایسے خود کت طلب ہے کہ کبھی ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں

لیکن اس امید کے بغیر زندگی ایک بے معنی چیز بن جائے گی جو کسی دیوانے کی کہانی
جس میں شور ہی شور ہے مطلب کچھ نہیں؟ کیا اس مقصد کے حاصل کرنے کا یہی طریقہ
ہے کہ ہم براہ راست ان اخلاقی خوبیوں کی تلقین کریں اور ان رکاوٹوں کا مطلق خیال
نہ کریں جو اس کے راستے میں حائل ہیں اور اس کے مخالف رجحانات کو تقویت پہنچاتی
ہیں؟ یا یہ بہتر ہوگا کہ پہلے ان رکاوٹوں کو دور کرکے ہم ایک زیادہ موزوں اور
سازگار ماحول تیار کریں جس میں محبت، حسن اور خیر نشو و نما پا سکیں؟ یا ان
دونوں طریقوں کو ملانے کی ضرورت ہے؟

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا تشدد اور عدم تشدد (روحانی) اثر اور جبر کی
حد فاصل اس قدر صاف اور واضح ہے جیسا عام طور پر کہا جاتا ہے۔ بعض دفعہ اخلاقی
قوت کا جبر جسمانی تشدد سے کہیں زیادہ سخت ہوتا ہے کیا اہنسا اور حق ایک ہی
چیز نہیں؟ حق کیا ہے؟ اس قدیم سوال کے ہزاروں جواب دئے گئے ہیں اور پھر بھی
یہ سوال آج تک حل نہیں ہوا۔ لیکن خواہ اس کی اہمیت کچھ بھی ہو اس کو اہنسا کا اہم
جز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تشدد بجائے خود بری چیز ہے لیکن لازمی طور پر خلاف اخلاق
نہیں۔ اس کی بہت سی شکلیں اور بہت سے مدارج ہیں اور ممکن ہے کہ بعض حالات میں
یہ اور طریقوں پر قابل ترجیح ہو۔ گاندھی جی نے خود کہا ہے کہ تشدد بزدلی، خوف اور
غلامی سے بہتر ہے اور اس فہرست میں اور بھی بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا جا سکتا
ہے۔ صحیح ہے کہ عام طور پر تشدد کا تعلق نفرت اور بدخواہی سے ہوتا ہے، لیکن کم کم
نظری طور پر یہ کوئی لازمی تعلق نہیں۔ یہ بات قیاس میں آ سکتی ہے کہ تشدد کی بنیاد
خیر خواہی پر ہو (مثلاً ایک سرجن کا تشدد) اور جو چیز خیر خواہی پر مبنی ہو وہ اصولاً خلاف
اخلاق نہیں ہو سکتی۔ اخلاق کا اصل معیار نیت کا اچھا یا برا ہونا ہے۔ لہٰذا اگرچہ تشدد
اکثر اوقات اخلاقاً ناجائز ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کو خطرناک سمجھا جاتا ہے

لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔

زندگی میں جبر اور تشدد کا دور دورہ ہے یہ صحیح ہے کہ عموماً تشدد کا نتیجہ تشدد ہی ہوتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کو بالکل ترک کر دینے کے معنی یہ نہیں کہ ایک بالکل ہی ملسیانہ رویہ اختیار کیا جائے جو زندگی سے سراسر بے تعلق ہے۔ موجودہ حکومت اور نظام معاشرت کی بنیاد تمام تر تشدد پر ہے۔ ریاست کے تشدد کے بغیر نہ ٹیکس وصول ہو سکتے ہیں نہ زمینداروں کو ان کا لگان مل سکتا ہے نہ ذاتی ملکیت قائم رہ سکتی ہے قانون وہی قوت کی امداد سے ایک شخص کو دوسرے کی ذاتی ملکیت میں دخل دینے سے روکتا ہے خود قومی ریاست کی بنیاد جارحانہ دماغی تشدد اور مدافعانہ تشدد پر قائم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی کا اہنسا کا اصول محض ایک منفیانہ نظریہ نہیں ہے یہ عدم مدافعت نہیں بلکہ یہ تشدد و مقاومت پر جو اس سے مختلف اور ایک مثبت اور موثر طریق کار ہے یہ ان لوگوں کے لئے نہیں جو موجودہ حالات کو سے چوں و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ تو جاری ہی اس مقصد سے کیا گیا تھا کہ سوسائٹی میں ایک ہیجان برپا کیا جائے اور اس طرح موجودہ حالات میں تبدیلی کی جائے۔ خواہ یہ روحانی اثر ڈالنے کی نیت سے جاری کیا گیا ہو مگر عملاً یہ جبر کا ایک پر زور آلہ ثابت ہوا ہے اگرچہ یہ جبر بہت ہی مہذب اور معقول قسم کا تھا یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ خود گاندھی جی نے اپنی ابتدائی تحریروں میں "جبر" کا لفظ استعمال کیا ہے حالانکہ ۱۹۱۲ء میں لارڈ چیمزفورڈ وائسرائے ہند کی اس تقریر پر نکتہ چینی کرتے ہوئے جو انہوں نے پنجاب میں مارشل لا کے مظالم کے متعلق کی تھی وہ لکھتے ہیں:۔

ہز ایکسلنسی نے کونسل کی افتتاح کے موقع پر جو تقریر کی اس سے ایک ایسا ذہنی رجحان ظاہر ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی خوددار شخص کے لئے ان کے پاس

کی حکومت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھا گیا نہیں پنجاب کے متعلق جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی تلافی کرنے کو تیار نہیں ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہم مستقل ترتیب کے مسائل پر اپنی پوری توجہ صرف کریں' ہمارے لئے مستقل کا فوری مسئلہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کو مجبور کریں کہ اس نے جو کچھ پنجاب میں کیا ہے اس پر پچھتائے اور اس کی تلافی کرے مگر اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے ۔ خلاف اس کے ہندوستانی ممبروں کو جواب دینے سے بچنا چاہتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان تمام اہم مسائل میں جن کا تعلق ہندوستان کی قومی خودداری سے ہے۔ ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ وہ تمام معاملات کو تاریخ کے فیصلے پر چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ میری رائے میں اس قسم کے الفاظ سے ہندوستانیوں کو اور زیادہ اشتعال ہوگا۔ تاریخ کا فیصلہ ان غریبوں کے کس کام آئے گا جن پر ظلم کیا گیا ہے اور جو اب تک ایسے حکام کے پنجۂ غصب میں گرفتار ہیں - جنہوں نے اپنے آپ کو اعتبار اور ذمہ داری کے عہدوں کا سراسر نااہل ثابت کیا ہے ؟ پنجاب کے ساتھ انصاف کرنے سے صریحاً انکار کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ تعاون عمل کی دعوت دینا سراسر ریاکاری ہے ؟"

یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ حکومتوں کا قیام تشدد پر منحصر ہے اور یہ تشدد محض وہی قوت کا کھلا ہوا تشدد ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک اور چھپا ہوا تشدد ہوتا ہے جس میں جاسوسوں' مخبروں' حکومت کے گرگوں سے کام لیا جاتا ہے مدرسوں اور اخباروں وغیرہ کے ذریعے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے مذہب اور دوسری قوتوں کا دباؤ ڈالا جاتا ہے' افلاس اور فاقہ کشی سے کمر توڑ دی جاتی ہے جہاں تک حکومتوں کے باہمی معاملات کا تعلق ہے' یہ بات مسلمہ ہے کہ نہ صرف جنگ کے زمانے میں بلکہ صلح کے زمانے میں بھی ہر قسم کا جھوٹ اور دغابازی جائز ہے

لئے طلبیدہ پوشیدہ رہے۔ تین سو برس گزرے سر ہنری ووٹن نے خوش فہمی اور
ریاکاری سے بھی نے سفیر کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی کہ وہ دیانت دار آدمی ہوتا ہے
ملک کی خاطر جھوٹ بولنے کے لئے دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے آج کل سفیروں
کے ساتھ بہت سے فوجی، بحری اور تجارتی مددگار ہوتے ہیں جن کا کام ہی یہ ہے کہ وہ
ان ملکوں میں جاسوسی کریں جہاں وہ تعینات ہیں۔ ان کی مدد کے لئے خفیہ پولیس کا
وسیع نظام ہوتا ہے جس کی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کا جال دور دور تک پھیلا
ہوتا ہے جس کے اپنے جاسوس الگ ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے جاسوسوں
کی کاٹ کرنے والے الگ جس میں جرائم پیشہ لوگوں سے کام لیا جاتا ہے اور جن کے
ذریعہ انسانی فطرت ذلیل کی جاتی ہے۔ اور لوگ پوشیدہ طور پر قتل کرائے جاتے ہیں
یہ چیزیں امن کے زمانے میں بھی کچھ کم نہیں ہوتیں لیکن جنگ میں ان کی اہمیت اور بڑھ
جاتی ہے اور اس کا تماشہ کہ اثر ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں جو جھوٹا پروپیگنڈا
کیا گیا، مخالف ملکوں کے متعلق جو غلط خبریں پھیلائی گئیں اور اس کام پر اور محکمہ جاسوسی
پر جتنے اور جو رقمیں صرف ہوئیں ان کا حال پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن آج کل امن
بھی محض دو جنگوں کے درمیان کے وقفے اور جنگ کی تیاری کا نام ہے اور اس زمانے
میں بھی اقتصادی میدان اور دوسرے میدانوں میں لڑائی جاری رہتی ہے۔ حاکموں
اور محکوموں، شہنشاہی حکومتوں اور ان کی نوآبادیوں، لوٹنے والوں اور لٹنے والوں
میں برابر ایک کشمکش رہتی ہے۔ غرض اس نام نہاد صلح میں بھی ایک حد تک جنگ کی
مصالح اپنے زور میں فریب و تشدد کے قائم رہتی ہے اور فوجی اور ملکی ملازموں کو بھی
کی تربیت دی جاتی ہے۔ لارڈ ڈارلی نے اپنی کتاب "فیلڈ سروس کی پاکٹ بک" میں
لکھا ہے ہم اس عقیدے کو ہمیشہ دہراتے رہیں گے کہ دیانت داری سب سے بہتر پالیسی ہے اور
جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ یہ جملے ایک بچے کی کتاب پر بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں

لیکن جو شخص جنگ میں ان اصولوں پر عمل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے بہتر ہے
کہ وہ ہمیشہ کے لئے اپنی تلوار میان میں رکھ لے۔

آج کل قوموں اور جماعتوں میں جو اختلافات اور کشمکش ہیں ان کی وجہ سے
سیاسی زندگی کا تشدد اور جھوٹ کی بنیاد پر قائم ہونا تقریباً ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے
جو قومیں اور جماعتیں دوسروں سے زیادہ حقوق رکھتی ہیں وہ اپنے حقوق کو قائم رکھنا
اور دوسروں کی انتہا کے مواقع کو روکنا چاہتی ہیں لہٰذا وہ اس پر مجبور ہیں کہ تشدد
جبر اور جھوٹ سے کام لیں۔ اس کا امکان ضرور ہے کہ جب رائے عامہ کا اثر زیادہ
بڑھ جائے اور لوگ ان جماعتوں اور قوموں کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں
تو اس تشدد میں کمی ہو جائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حال میں جو کچھ تجربہ اس بارے میں
ہوا ہے اس سے برعکس نتیجہ نکلتا ہے اور جوں جوں موجودہ اداروں پر زیادہ زور
کے ساتھ حملہ کیا گیا ان کا تشدد اور بڑھتا گیا۔ اگر کھلے ہوئے تشدد میں کچھ کمی ہوئی
تو اس سے زیادہ خطرناک اور پوشیدہ شکلیں اختیار کر لیں تشدد کا یہ رجحان۔ تو
اقلیت کی انتہا سے رک سکا اور نہ مذہب و اخلاق سے۔ مسلک بعض افراد
نے انسانیت کے مدارج میں ترقی کی ہے اور اعلیٰ درجے کے۔ یہی گر اوسط درجے
کے لوگ پہلے سے بہت زیادہ ہیں۔ اس لحاظ سے سماج نے ترقی کی ہے اور ایک
حد تک قدیم وحشیانہ حملوں پر قابو پانے کی کوشش بھی شروع ہو گئی ہے لیکن یہ افراد
تک محدود ہے۔ جماعتوں اور گروہوں کے طرز عمل میں کوئی خوشگوار تغیر نہیں ہوا
افراد کے مہذب ہو جانے سے ان کے بہت سے ابتدائی جذبات اور برائیاں
جماعت کی طرف منتقل ہو گئی ہیں اور چونکہ تشدد کو ہمیشہ وہی لوگ پسند کرتے ہیں جو
اخلاقاً کمتر درجے کے ہوں اس لئے ان جماعتوں کے لیڈر ان کے بہترین اشخاص
نہیں ہو سکتے لیکن اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ تشدد کی مذہبی صورتیں رفتہ رفتہ دور

ہو جائیں گی اس وقت بھی ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ حکومت اور سماجی زندگی دونوں کے قیام کے لئے جبر کی ضرورت ہے۔ سماجی زندگی کے لئے کسی قسم کی حکومت ضروری ہے اور جو لوگ زیر حکومت ہیں وہ اس پر مجبور ہیں کہ وہ ان تمام انفرادی اور اجتماعی رجحانات کی روک تھام کریں جو سرکش خود غرضی پر مبنی ہیں اور جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے عموماً وہ اس معاملے میں ضرورت کی حد سے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ حکومت اور قوت کا خاصہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس کے اخلاق کو خراب اور پست کر دیتی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خواہ ان لوگوں کو آزادی کتنی ہی محبت ہو اور وہ جبر کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ سرکشوں پر جبر کریں اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک ملک کے تمام افراد اخلاقی حیثیت سے کامل، بے غرض، بے نفس اور دل و جان سے فلاح عامہ کے طالب نہ بن جائیں حکومت کے اراکین کو ان بیرونی جماعتوں کے خلاف بھی جبر و تشدد سے کام لینا پڑے گا جو ملک پر حملہ کریں یعنی انہیں قوت کے مقابلے میں قوت استعمال کر کے اپنی مدافعت کرنی پڑے گی۔ اس کی ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک ایک عالمگیر سلطنت قائم نہ ہو جائے۔

اگر قوت اور جبر بیرونی مدافعت اور اندرونی نظم و استحکام دونوں کے لئے ضروری ہے تو اس کی حدود کس طرح قائم کی جائیں؟ جب کہ رائی ہولڈ نائی بور[1] نے کہا ہے "جب ایک دفعہ اخلاق کی طرف سے سیاست کو جبر کی اجازت دے دی جائے اور اسے سماجی استحکام کا ایک لازمی جز تسلیم کر لیا جائے تو تشدد آمیز اور بے تشدد جبر کے درمیان کوئی معین حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی اور حکومت کے جبر اور انقلاب پسندوں کے جبر میں بھی تمیز نہیں ہو سکتی۔"

---

(۱) اپنی کتاب "نیک فرد اور بد جماعت" میں

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر میرا خیال ہے کہ گاندھی جی اس بات کو تسلیم
کریں گے کہ اس ہندوستان میں قومی ریاست کو بھی بیرونی طاقتوں کے حملوں کی مدافعت کے
لئے تشدد سے کام لینا پڑے گا یقیناً ریاست کو اپنے ہمسایوں اور دوسری ریاستوں سے دوستانہ
اور پرامن تعلقات کی توقع کرنی چاہئے لیکن حملے کے امکان سے انکار کرنا سراسر مہمل بات
ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کو کچھ جبری اور تشدد آمیز قوانین بھی پاس کرنے پڑیں گے
یعنی ایسے قوانین جن سے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے کچھ حقوق اور مراعات ان سے
چھین لئے جائیں گے اور ان کی آزادی عمل محدود ہو جائے گی بہرکیف یہ جبر و تشدد تو
سبھی قوانین میں پایا جاتا ہے کانگریس کے کراچی والے پروگرام کے مطابق "عوام کی
محنت سے جو ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اسے ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ
ہندوستان کی سیاسی آزادی کے مفہوم میں اس ملک کی کروڑوں فاقہ کش
باشندوں کی حقیقی معاشی آزادی کو بھی شامل کیا جائے" اس مناسب خواہش کو عملی
جامہ پہنانے کے لئے ان لوگوں کو جنہیں آج ضرورت سے زیادہ مراعات حاصل
ہیں اپنے حصے میں سے بہت کچھ انہیں دینا پڑے گا جو ان مراعات سے محروم ہیں
مزید برآں اس پروگرام میں یہ بھی ہے کہ مزدوروں کو کم سے کم اتنا مزدور ملنا چاہئے
کہ ان کی زندگی بسر ہو سکے اور انہیں دوسری ضروری سہولتیں میسر آسکیں، یہ
یہ کہ جائداد پر خاصے محاصل عائد کئے جائیں گے" ریاست بنیادی صنعتوں اور
حرفتوں، معدنی ذرائع دولت، ریلوے، بندرگاہوں، جہازوں اور دوسرے ذرائع نقل و حمل
کی یا خود مالک ہوگی یا ان پر نگرانی رکھے گی" آبادی کی ایک کثیر تعداد اس کی مخالفت
کرے گی وہ اکثریت کی مرضی کو گوارا کریں گے لیکن اسی حالت میں جب ان کے
دل میں نافرمانی کے نتائج کا خوف موجود ہوگا دراصل جمہوری حکومت کے معنی ہی
یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اسے قابو میں رکھتی ہے۔

اگر اکثریت کوئی ایسا قانون پاس کرتی ہے جس سے حقوقِ ملکیت پر اثر پڑتا ہے
یا وہ بالکل منسوخ کر دئے جاتے ہیں تو کیا اس پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ یہ جبر و تشدد ہے؟
ظاہر ہے کہ اس قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی طریقہ تمام جمہوری قوانین کے پاس
کرنے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے جبر و تشدد کا الزام تو نہیں لگایا جا سکتا البتہ یہ کہا
جا سکتا ہے کہ اکثریت غلطی پر ہے یا اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ پھر یہ سوال
رہ جاتا ہے کہ جس قانون کو اکثریت نے پاس کیا ہے وہ کسی اخلاقی اصول کے
منافی تو نہیں لیکن اس کا فیصلہ کون کرے۔ اگر افراد اور جماعتوں کو یہ حق دیدیا جائے
کہ اپنے معیار کے مطابق اخلاقی قوانین کی تعبیر کر لیا کریں تو جمہوری طرز حکومت کا خاتمہ
ہو جائے گا۔ ذاتی طور پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ انفرادی ملکیت کی وجہ سے (اگر وہ
ایک مقررہ حد سے بڑھ جائے) افراد کو جماعت کے مقابلہ میں مجموعی طور پر ایک خطرناک
اقتدار حاصل ہو جاتا ہے جو جماعت کے لئے سخت مضر ہے۔ میں اس اقتدار کو
اخلاقی اصول کے خلاف اور شراب خواری سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے
زیادہ نقصان فرد کو پہنچتا ہے نہ کہ جماعت کو۔

بعض لوگ عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں کہتے ہیں کہ ذاتی ملکیت
کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس
لئے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس دلیل کو نہایت شد و مد کے
ساتھ وہ بڑے بڑے رئیس لوگ میرے سامنے پیش کرتے ہیں جنہیں اپنے لگان کو
حکومت کی امداد سے جبراً وصول کرنے میں مطلق تامل نہیں اور وہ سرمایہ دار جو
ملوں کارخانوں کے مالک ہیں اور جنہیں یہ گوارا نہیں کہ ان کے حلقہ میں
مزدور اپنی آزاد انجمن قائم کریں۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام
میں تبدیلی چاہتی ہے بلکہ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے

نقصان پہنچنے والا ہے۔ انہیں بھی راضی کر لینا چاہیئے۔ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو چند ارباب غرض حب جاہیں گے، اچھی سے اچھی تبدیلیوں کو جن کی ضرورت بالکل مسلّم ہو، روک دیں گے۔

دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔ معاشی اغراض کے مقابلے میں عقلی دلائل کارگر نہیں ہوتے نہ اخلاقی اصول کا۔ ممکن ہے افراد کے عقائد بدلے جا سکیں اور وہ اپنے امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائیں اگرچہ یہ بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے لیکن جماعتیں اور طبقے کبھی ایسا نہیں کرتے۔ اس لئے ایسی سب کوششیں جن کا مقصد یہ تھا کہ امتیازی حقوق رکھنے والے طبقے کا عقیدہ بدل دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے اقتدار اور ناجائز حقوق سے از خود دست بردار ہو جائے ہمیشہ ناکام ثابت ہوئی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ سمجھیں کہ آئندہ اس قسم کی کوششیں کامیاب ہوں گی۔ رائن ہولڈ نیبور اپنی کتاب[1] میں ان معلمین اخلاق کی تردید کرتا ہے "جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اقلیت کی ترقی یا مذہبی ہمدردی کی نشوونما سے لوگوں کی خود غرضی میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے اور انسانی جماعتوں اور گروہوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بس یہی کافی ہے کہ اسی عمل ترقی کو جاری رکھا جائے۔" وہ کہتا ہے "یہ معلمین اخلاق اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں، کہ انسانی جماعت میں انصاف قائم کرنے کے لئے سیاسی جدوجہد بھی ضروری ہے کیونکہ انہیں یہ احساس نہیں کہ انسان کے مجموعی عمل میں بعض صنفی عناصر شامل ہیں، جو کسی طور پر عقل یا ضمیر کے تابع نہیں ہو سکتے وہ اسے تسلیم نہیں کرتے، کہ جب کوئی مجموعی قوت چاہے وہ تہستاری کی شکل میں ظاہر

---

(1) Moral man & Immoral Society

ہو چاہے طبقوں کے اقتدار کی شکل میں کمزوروں سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیتی ہے تو اسکا توڑ قوت ہی سے ہو سکتا ہے" ایک جگہ اور وہ لکھتا ہے "چونکہ سماجی معاملات میں عقل ایک حد تک ہمیشہ اغراض کی تابع ہوتی ہے اس لئے سماجی انصاف محض اخلاقی اور عقلی دلیلوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کے لئے جنگ کرنا لازمی ہو جاتا ہے اور اس جنگ میں قوت کا مقابلہ قوت ہی سے کرنا پڑتا ہے"

اس لئے یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کر کے یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھار کے باہمی مخالفت دور ہو جائے گی اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یہ محض ایک خوش خیالی ہے کہ بغیر مؤثر دباؤ ڈالے ہوئے یعنی بغیر جبر و تشدد سے کام لئے ہوئے کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھا لے گی یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا

ظاہر ہے کہ گاندھی جی بھی مؤثر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ وہ اسکو جبر و تشدد نہیں کہتے۔ ان کے نزدیک یہ دباؤ خود اپنی ذات پر تکلیف اٹھا کر ڈالا جا سکتا ہے۔ اس کا سمجھنا دشوار ہے کیونکہ اس میں ایک مابعد الطبیعاتی عنصر شامل ہے۔ جو کسی مادی پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا حریف پر مرطرا زبردست اثر پڑتا ہے۔ اس سے اس کی اخلاقی مزاحمت کی قوت کمزور ہو جاتی ہے اس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس میں جو بہترین صفات ہیں وہ بیدار ہو جاتی ہیں۔ اور مصالحت کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ محبت سے پیش آنے اور اپنے اوپر تکلیف اٹھانے کا نفسیاتی اثر دشمن پر اور دیکھنے والوں پر بہت قوی ہوتا ہے اکثر شکاری اس بات سے واقف ہیں کہ ایک وحشی جانور کے نزدیک پہنچنے کے مختلف طریقوں سے کس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے جانور جارحانہ انداز کو دور سے محسوس

کر لیتا ہے۔ اس کا اثر قبول کرتا ہے۔ اگر آدمی کے دل میں خوف کا شائبہ بھی پیدا
ہو جائے وہ تو پوری طرح محسوس نہیں کرتا۔ تو جانور کو کسی نہ کسی طرح اس کا علم
ہو جاتا ہے۔ اور وہ خوفزدہ ہو کر حملہ کر دیتا ہے۔ اگر شیر کو سدھانے والے کی ہمت ایک
لمحے کے لئے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے، تو یہ خطرہ ہے کہ شیر فوراً حملہ کر دے گا۔ جو آدمی
بالکل نڈر ہوتے ہیں وحشی جانوروں سے گزند پہنچنے کا بہت کم احتمال ہوتا ہے، سوا اس کے
کہ کوئی اتفاقی حادثہ پیش آ جائے۔ اس لئے یہ بالکل فطری بات معلوم ہوتی ہے، کہ
انسان بھی ان نفسی اثرات سے متاثر ہو۔ لیکن افراد پر اثر پڑنا اور چیز ہے۔ یہ شبہ تو اس
میں ہے کہ کسی طبقے یا جماعت پر اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ جماعت من حیث الجماعت
فریق مخالف سے ذاتی اور گہرے تعلقات نہیں رکھتی۔ اور اسے جو ضرر پہنچتی ہیں
وہ یکسر شدید اور وسیع شدہ ہوتی ہیں۔ بہر حال اسے دوسرے فریق پر جو اس
کی قوت کو توڑنا چاہتا ہے، اس شدت سے غصہ آتا ہے کہ اور سب چھوٹے چھوٹے
جذبات اس غصے سے دب جاتے ہیں۔ وہ ایک مدت سے یہ سمجھنے کا عادی ہوتا ہے
کہ اس کا اقتدار اور اس کے امتیازی حقوق ملک کے مفاد کے لئے ضروری ہیں۔ اور
اگر کوئی اس سے اختلاف کرے، تو وہ اسے کفر اور الحاد معلوم ہوتا ہے۔ نظم و امن
اور موجودہ حالت کا قائم رکھنا اس کی نظر میں سب سے بڑی نیکی بن جاتا ہے اور
اس کی مخالفت سب سے بڑا گناہ۔

اس لئے جہاں تک فریق مخالف کا تعلق ہے عقائد کو بدلنے کی کوشش کچھ
زیادہ کامیاب نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض اوقات ہولے دوسروں کی نیکی اور نرمی پر
اور بھی غصہ آتا ہے۔ کیونکہ اس سے اس کا غلطی پر ہونا ظاہر ہوتا ہے اور جب
آدمی کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہی غلطی پر ہے۔ تو اس کی جھلاہٹ اور بڑھ جاتی
ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ عدم تشدد کے طریقے سے مخالفوں کے چند افراد متاثر ہوتے

ہیں۔ اور مخالفت کی مجموعی قوت کم ہو جاتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ غیر جانبدار لوگوں
کی ہمدردی حاصل ہوتی ہے اور دنیا کی رائے عامہ پر بڑا زبردست اثر پڑتا ہے۔ لیکن
یہاں بھی اس بات کا امکان ہے کہ حکمراں طبقہ خبروں کو باہر نہ جانے دے یا ان کو مسخ
کر دے۔ کیونکہ اشاعت کے جتنے ذرائع ہیں، وہ اسی کے قبضہ میں ہوتے ہیں اور وہ
یہ بھی کر سکتا ہے کہ لوگوں کو صحیح واقعات کا علم نہ ہونے دے۔ عدم تشدد کے طریقے کا
سب سے قوی اور وسیع اثر اس ملک کے ان لوگوں پر پڑتا ہے۔ جہاں یہ طریقہ اختیار کیا
جاتا ہے ان کے عقائد یقیناً بدل جاتے ہیں۔ اور وہ اکثر بہت جوش و خروش
کے ساتھ تائید کرنے لگتے ہیں۔ لیکن انہیں ہم خیال بنانا کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ
جو مقصد پیش نظر ہوتا ہے، اس سے تو وہ متفق ہوتے ہیں۔ کسی نصب العین کے لئے
تکلیفیں اٹھانا ہمیشہ اچھا سمجھا گیا ہے۔ اپنے مقصد کی خاطر سختیاں جھیلنے، ظلم و جور
کا مقابلہ کرنے پر۔ مگر ظالم سے انتقام نہ لینے میں وہ عظمت و شان ہے جو خواہ
مخواہ دل پر اثر کرتی ہے لیکن اس میں اور بے بسی کی مظلومی میں بہت ہی کم فرق ہے،
اور بے بسی کی مظلومی بہت جلد ایک مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور انسان کے
لئے باعث ذلت بن جاتی ہے۔ اگر تشدد میں اس کا خوف ہے کہ انسان کو ایذا رسانی
کا شوق نہ ہو جائے، تو عدم تشدد کی منفی صورتوں میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں لوگ ایذا
اٹھانے کا چسکا نہ پڑ جائے اور پھر اس کا بھی امکان ہے کہ عدم تشدد ایک کاہلی، اور
بزدلی کو چھپانے اور موجودہ حالت کو قائم رکھنے کا بہانہ بنا لیا جائے۔

پچھلے چند سال سے جب سے ہندوستان میں سیاسی، معاشرتی تبدیلیوں کے
خیال نے اہمیت حاصل کی ہے یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ اس قسم کی تبدیلی میں لازمی
طور پر تشدد سے کام لینا پڑے گا اس لئے اس کی حمایت جائز نہیں۔ طبقوں
کی جنگ کا (جیسے وہ آج بھی موجود ہو) نام تک نہ لینا چاہئے۔ اس لئے کہ اس سے

اس جواب میں حلل پڑتا ہے کہ ہم سب طبقوں کے اتحاد عمل سے بغیر تشدد کے
رفتہ آگے بڑھتے رہیں گے۔ اور ایک روز کسی نہ کسی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ بلکہ
سماجی مسئلے کے حل کرنے میں کسی وقت تشدد سے کام لینا ضروری ہو جائے، کیونکہ
یقینی ہے کہ حقوق رکھنے والی جماعتیں اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے تشدد کے
کرنے میں کبھی تامل نہ کریں گی؛ لیکن اصولاً اگر عدم تشدد کے طریقے سے ایک مرتب
تبدیلی کا پیدا کرنا ممکن ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس طریقے سے مساوی سماجی
پیدا کرنا ناممکن سمجھا جائے۔ اگر ہم تشدد کے ذریعے سے سیاسی آزادی حاصل
ہیں۔ اور ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا خاتمہ کر سکتے ہیں، تو اسی کے
سے جاگیرداروں اور زمینداروں کا مسئلہ اور دوسرے معاشرتی مسائل بھی
سکتے ہیں۔ اور اشتراکی ریاست بھی قائم کر سکتے ہیں یہاں اس سے بحث نہیں
کی یہ سب چیزیں عدم تشدد کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہیں یا نہیں مقصد
یہ ہے کہ یا تو عدم تشدد کے ذریعے سے دونوں مقصد حاصل ہو سکتے ہیں، یا
میں سے ایک بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ عدم تشدد
صرف ایک غیر ملکی حکمراں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے صریحی بات ہے کہ
اندرونی غرض طبقوں اور ترقی کے دشمنوں کے خلاف اسے استعمال کرنا زیادہ
ہے کیونکہ اس پر اس کا نفسیاتی اثر کہیں زیادہ قوی ہوگا البتہ جو لوگ تبدیلی
لیتے ہیں۔ ان پر اس کا اثر اتنا نمایاں نہیں ہوتا ہندوستان میں عدم تعاون
نافرمانی کے اس تیزی سے پھیل جانے سے ثابت ہو گیا کہ کس طرح ایک بے تشدد
نے ہزار آدمیوں پر زبردست اثر ڈالتی ہے۔ اور بہت سے لوگوں کو جو پہلے
تھے۔ ایسا ہم خیال بنا لیتی ہے۔ لیکن جو لوگ سرے سے اس کے مخالف تھے۔
یہ ہم خیال نہیں بنا سکتی۔ بلکہ اس تحریک کی کامیابی نے ان کے اندیشوں

میں اور اضافہ کر دیا۔ اور اں کی قالعت اور بڑھ گئی۔

اگر اس بات کو ایک دم تسلیم کر لیا جائے کہ ریاست کو اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے جبر و تشدد استعمال کرنے کا حق ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے جبر و تشدد سے کام لینا جائز نہ سمجھا جائے یہ اور بات ہے کہ تشدد کا طریقہ مصلحت کے خلاف ہو لیکن اسے ناجائز اور ممنوع نہیں کہہ سکتے محض اس سے کہ حکومت بر سر اقتدار فرقے کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کے قبضے میں ملک کی مسلح افواج ہیں، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے جبر و تشدد کے استعمال کرنے کو حق مل جاتا ہے جس سے وہ پہلے محروم تھی، اگر اس کے اقتدار کے خلاف بغاوت کی جائے تو وہ اس کا مقابلہ کس طرح کرے گی، ظاہر ہے کہ وہ تشدد کے طریقے اختیار کرنے سے پرہیز کرے گی اور اس کی پوری کوشش کرے گی کہ پرامن طریقے سے کام چلائے لیکن وہ تشدد کے استعمال کا حق تو نہیں چھوڑ سکتی جو لوگ تبدیلی کے حامی ہیں ان میں سے غیر مطمئن اور شورش پسند عناصر ہوں گے جو پہلی حالت کی طرف لوٹنا چاہیں گے۔ اگر انہیں یہ خیال ہو گا کہ ان کے تشدد کو روکنے کے لئے نئی ریاست سختی سے کام نہیں لے گی تو وہ اور دل کھول کر تشدد کریں گے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ تشدد اور عدم تشدد دونوں سے کام لینے اور عقائد پر اثر ڈالنے میں کوئی واضح حد فاصل مقرر نہیں کی جا سکتی۔ مشکل سیاسی تبدیلیوں کے مسئلے ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن جب امیروں اور غریبوں کی کشمکش کا سوال ہو تو اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستان میں آج کل یہ رجحان ہے کہ کسی مقصد یا پالیسی کو محض اس لئے برا کہا جائے کہ وہ عدم تشدد کے منافی ہے میرے خیال میں مسائل پر غور کرنے کا یہ بالکل الٹا طریقہ ہے ہم نے پندرہ سال ہوئے عدم تشدد کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ ہمارے مقصد کے حاصل کرنے کا سب سے موزوں اور موثر طریقہ معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہمارا مقصد عدم تشدد

سے جدا تھا صرف اس کا ضمیمہ یا نتیجہ نہ تھا۔ اس وقت کسی شخص کے منہ سے یہ بات
نہیں نکلی تھی، کہ آزادی اور مکمل خود مختاری کی کوشش صرف اسی صورت میں کرنی
چاہئے۔ جب یہ عدم تشدد کے طریقوں سے حاصل ہو سکیں لیکن اب تو ہمارا مقصد
عدم تشدد کے معیار پر رکھا جاتا ہے۔ اور اگر اس کے مطابق نہ نکلے تو رد کر دیا جاتا
ہے۔ غرض عدم تشدد کا تخیل ایک عدم عقیدہ مانا جاتا ہے جس پر کبھی کسی قسم کا اعتراض
کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی لئے عقل کے نزدیک اس کی روحانی کشش زائل ہوتی
جاتی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب یہ مذہب کی مثل میں تھی ہو کر داخل دفتر
کر دیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ یہ مستقل حقوق رکھنے والوں کی کشتی کے لئے لنگر کا کام
دے رہا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ موجودہ حالت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ بات بہت قابل افسوس ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ صرف ہندوستان بلکہ
تمام دنیا کے لئے عدم تشدد کا اصول اور بے تشدد جنگ کا طریق عمل بہت مفید ہے اور
گاندھی جی نے لوگوں کے خیالات اس کی طرف متوجہ کر کے زبردست خدمت انجام
دی ہے مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل بہت درخشاں ہے ہو سکتا ہے کہ بنی نوع
انسان ابھی مکمل طور پر اختیار کرنے کے لئے ابھی تک تیار نہ ہوں لیکن ڈرامے
[illegible] میں ایک شخص کہتا ہے کہ "تم اندھے کے ہاتھ میں شمع دے
ہو لیکن وہ اس سے سوٹے کے سوا اور کیا کام لے سکتا ہے؟" تو یہ ممکن ہے کہ ابھی
اس شمع کی روشنی زیادہ نہ پھیلے لیکن تمام سرچشمہ خیالات کی طرح اس کا اثر رفتہ رفتہ بڑھے گا
اور ہمارے اعمال کو زبردست متاثر کریگا۔ عدم تعاون یعنی اس حکومت یا جماعت سے
جو بری سمجھی جاتی ہے کسی قسم کا تعاون نہ کرنا بڑا قوی اور موثر اصول ہے محدود چند اخلاقی
قدر رکھنے والے اشخاص بھی عمل کریں تو اس کا اثر پھیلتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ جب
زیادہ تعداد میں لوگ اسے اختیار کر لیتے ہیں تو اس کا ظاہری اثر اور بھی نمایاں ہو جاتا

ہے لیکن بعض خارجی چیزیں اس کے اخلاقی پہلو کو دھندلا کر دیتی ہیں جب اس
کا دائرہ وسیع کیا جاتا ہے تو اس کی شدت کم ہو جاتی ہے مجموعی ذہنیت رفتہ رفتہ
شخصی ذہنیت پر غالب آجاتی ہے مگر خالص عدم تشدد پر جو زور دیا جاتا ہے اس
کی وجہ سے یہ چیز زندگی سے جدا اور دور ہو گئی ہے اور لوگ یا تو اسے آنکھ بند
کرکے مذہبی عقیدے کے طور پر قبول کر لیتے ہیں یا بالکل نہیں کرتے ذہنی عنصر بالکل
دب کر رہ گیا ہے ۱۹۲۰ء میں اس کا اس کا تحریک پسندوں پر بڑا اثر پڑا تھا ان میں سے
بہت سے اس گروہ سے نکل آئے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ بھی شبہ میں پڑ جانے کی وجہ
سے بے حس ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے تشدد آمیز مسائل کو روک رکھا تھا لیکن ان
باتوں کا یہ اثر نہیں ہوا۔ خود کانگریس کے اندر ایک اہم جماعت جس نے عدم تعاون
اور سول نافرمانی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اور ایمانداری کے ساتھ عدم تشدد
کے طریقے کی شرائط پوری کرنے کی کوشش کی اب ملحد اور منکر سمجھی جاتی ہے
اور کہا جاتا ہے کہ اسے کانگریس میں رہنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ اس کے لئے
تیار نہیں کہ عدم تشدد کو ایمان و ایقان مانے اور اس مقصد کو ترک کر دے
جو اسے دل سے عزیز ہے یعنی ایسی ریاست جس میں سب کے ساتھ یکساں انصاف
کیا جائے اور ہر شخص کو برابر کے حقوق دئے جائیں ایک منظم سوسائٹی جس کے قائم
کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ امتیازی حقوق اور ملکیت کے حقوق بہت
سے اکثر منسوخ کر دئے جائیں اس میں شک نہیں کہ ابھی تک گاندھی جی کا بہت
بڑا اثر ہے ان کے عدم تشدد میں حرکت اور جارحانہ کیفیت پائی جاتی
ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس روز وہ ملک میں پھر لہر دوڑا کر ترقی کی
جد و جہد شروع کر دیں گے وہ اپنی عظمت اور متضاد خصوصیات اور عوام میں
حرکت پیدا کرنے کی غیر معمولی قوت کی وجہ سے عام معیاروں سے بہت بلند ہیں ان کو

ہم اس پیمانے سے نہیں ماپ سکتے جس سے دوسروں کو ملتے ہیں لیکن بہت سے لوگوں
میں جو اُن کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس قسم کی کمی ملے یعنی بزدلی اور عدم مزاحمت
کی مہلک نظر آتی ہے جس کی تعلیم تالستائی نے دی تھی یا وہ ایک تنگ خیال فرقے
کے رکن بن کر رہ جاتے ہیں جنہیں زندگی اور واقعات سے لگاؤ تک نہیں اُن لوگوں
کے گرد بہت سے وہ لوگ جمع ہو جاتے ہیں جن کا مفاد موجودہ نظام کے قائم رکھنے سے
وابستہ ہے اور جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عدم تشدد کی آڑ لیتے ہیں اسی طرح
بہانہ سازی اور مصلحت پرستی کا قدم درمیان میں آ جاتا ہے مخالف کو ہم خیال بنانے
کی کوشش کا انجام عدم تشدد کی بدولت یہ ہوتا ہے کہ آدمی خود دشمن کو ہم خیال بن کر
اس کی طرف سے لڑنا شروع کر دیتا ہے جب ہمارا جوش گھٹتا ہے اور ہم کمزور دکھائی دینے
لگتے ہیں تو ہم پیچھے ہٹتے اور مصالحت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اپنا جی خوش
کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ ہم دشمن کو ہرا رہے ہیں اور بعض وقت یہ کامیابی
ہم نے پرانے رفیقوں کو قربان کر کے حاصل کرتے ہیں۔ ہم ان کی انتہا پسندیوں
اور ان کے ان بیانات کی جو ہمارے نئے دوستوں کو ناگوار ہوں۔ مذمت
کرتے ہیں اور ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے ہم میں تفرقہ ڈال دیا
ہے۔ سماجی نظام میں بنیادی تبدیلی کی جگہ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ موجودہ
نظام میں فراخ دلی اور احسان و مروت پیدا کر کے اس کی اصلاح کی جائے اور
اونچے طبقوں کے مستقل حقوق بدستور قائم رہیں میں تسلیم کرتا ہوں کہ گاندھی جی
نے وسائل کی اہمیت پر زور دے کر ہماری بہت بڑی خدمت انجام دی ہے مگر اس
کے باوجود میری یہ قطعی رائے ہے کہ مقصد کو وسائل سے زیادہ اہمیت حاصل ہونی
چاہئے۔ جب تک ہم اس بات کو نہیں سمجھیں گے اس وقت تک اس رہرو کی
طرح بھٹکتے پھریں گے جس کی کوئی منزل نہ ہو اور اپنی قوتوں کو صحیح اور غیراہم

آتے ہیں۔ دوسرے ہمارے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں۔ جو ہی قدیم زمانے سے سینہ بسینہ چلے آرہے ہیں تیسرے ہیں ان کے بارے میں یوں دریافت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے" (۱)

اگر ہم عدم تشدد اور اس کے تمام لوازمات کو مذہب کے اعلیٰ نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اس میں دلیل اور بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس کی حیثیت ایک تنگ نظر فرقے کے معتقدات کی سی ہو جاتی ہے۔ جس کا یا تو بے دلیل اقرار کیجئے ورنہ انکار کر دیجئے۔ اس میں کوئی درمیانی راہ نہیں ہے۔ اور نہ اسے موجودہ مسائل سے تعلق رہتا ہے لیکن اگر ہم موجودہ حالات کی روشنی میں اس سے بحث کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں دنیا کی از سر نو تشکیل کرنے میں اس سے بہت مدد ملے گی۔ اس صورت میں ہمیں ایک انسانی جماعت کی فطرت اور کمزوریوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کوئی تحریک جو عوام میں پھیلائی جائے، خصوصاً ایسی تحریک جس کا مقصد بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں کرنا ہو۔ صرف لیڈروں کی ذہنیت سے متاثر نہیں ہوتی بلکہ اس پر عام حالات کا اور اس سے بھی زیادہ ان لوگوں کے خیالات کا اثر پڑتا ہے۔ جن سے وہ کام لیتی ہے

تشدد کا دنیا کی تاریخ میں بہت اہم حصہ رہا ہے۔ آج بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ شاید ایک عرصے تک کم نہیں ہو گی۔ ماضی کی اکثر تبدیلیاں تشدد اور جبر کے ذریعے ہوئی ہیں۔ ڈی ویلرا[?] گاندھی اسٹوں[?] نے ایک دفعہ کہا تھا "مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس ملک کے لوگوں کی سیاسی بے چینی کے زمانے میں صرف یہی درس دیا جاتا کہ تشدد سے نفرت کرو لطف اس سے محبت کرو۔ اور صبر سے کام لو تو ملک کو کبھی آزادی نصیب ہوئی ہوتی۔"

---

(۱) The future of an Illusion

جبر و قوت کو جو اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور اب بھی حاصل ہے۔ اس سے
انکار کرنا ناممکن ہے۔ اس سے انکار کرنے کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ ہم زندگی کی حقیقتوں
کو نظر انداز کر رہے ہیں تاہم تشدد بری چیز ہے۔ اور اس سے بڑی بڑی برائیاں پیدا
ہوتی ہیں اور تشدد سے بھی بدتر لفرت، ظلم، انتقام اور مکر کے وہ جذبے ہیں جو اکثر
اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو تشدد بجائے خود ذاتی بری چیز نہیں ہے۔
جتنے اس کے یہ لوازم۔ تشدد ان جذبوں سے پاک بھی ہو سکتا ہے اس کا استعمال اچھے
مقصد کے لئے بھی کیا جا سکتا ہے، اور برے مقصد کے لئے بھی، لیکن اسے ان جذبوں سے
پاک رکھنا سخت دشوار ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے۔ اس سے پرہیز
کیا جائے، مگر تشدد سے پرہیز کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی اس سے بدتر چیزوں
کو برداشت کر لے دوسروں کے تشدد کے آگے سر جھکا نا یا کسی غیر منصفانہ نظام
حکومت کو قبول کرنا جس کی بنیاد تشدد پر قائم ہے عدم تشدد کے اصول کے قطعاً
منافی ہے عدم تشدد کا طریقہ اسی وقت جائز قرار دیا جا سکتا ہے جب اس میں حرکت ہو
اور غیر منصفانہ حکومت یا نظام جماعت کو بدلنے کی قابلیت رکھتا ہو

میں نہیں کہہ سکتا کہ عدم تشدد میں اس کی قابلیت ہے یا نہیں بہتر ہے حال میں
یہ طریقہ ہمیں ترقی کے مرحلے طے کرنے میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے مگر اس میں مجھے
شبہ ہے کہ یہ ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے بہر حال جبر کی کوئی۔ کوئی شکل
ناگزیر ہے کیونکہ جو لوگ اقتدار اور حقوق کے مالک ہوتے ہیں، وہ انہیں اس وقت
تک نہیں چھوڑتے جب تک وہ اس پر مجبور نہ کئے جائیں۔ یا جب تک ایسے حالات نہ
پیدا کر دیئے جائیں۔ کہ ان کے لئے ان حقوق کا برقرار رکھنا چھوڑنے سے زیادہ مضر ہے
سماج کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور طبقوں کی جنگ کا تصفیہ بجز جبر کے اور
کسی صورت میں ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لینا

کا کام بہت مدت سے پہلے پورا کرنا مشکل ہوگا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت
ہم خیال نہ ہو جائے۔ اس وقت تک معاشرتی تبدیلی کی کوئی تحریک مستقل طور
پر قائم نہیں ہو سکے گی لیکن اس کے بعد چند اشخاص پر جبر کرنے کی ضرورت پڑے گی
ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس بنیادی اختلاف پر پردہ ڈال دیں،
اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں، کہ اس قسم کے اختلافات کا وجود ہی نہیں ہے۔
اس سے ہم صرف حق کو چھپانے کے مجرم ہوں گے۔ بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا
کہ لوگ اصلی واقعات سے ناواقف رہیں گے۔ موجودہ نظام کو ایک سہارا مل جائے گا
۔ حکمراں طبقوں کو اپنے امتیازی حقوق کے لئے ایک اخلاقی بنیاد ہاتھ آجائے گی
جس کی وہ ہمیشہ تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک غیر منصفانہ نظام سے جنگ کرنے
کے لئے ضروری ہے کہ ان غلط مفروضات کی تردید کی جائے۔ جن پر اس کا دارومدار
ہے اور حقیقت بے نقاب کر دی جائے تحریک عدم تعاون کی ایک خوبی یہ بھی
ہے کہ وہ ان جھوٹے مفروضات کی قلعی کھول دیتی ہے۔ اور ہماری اس کوشش کو
تقویت پہنچاتی ہے، کہ ہم انہیں تسلیم کرنے اور ان سے اشتراک عمل کرنے سے انکار کر دیا
جائے۔ پیش نظر ایک ایسی سماج ہے جس میں مختلف طبقوں کا فرق مٹ جائے
معاشی معاملات میں سب کے ساتھ یکساں انصاف برتا جائے، اور سب کو یکساں موقع
دیا جائے ایک منظم سماج جس کا مقصد یہ ہو، کہ ہر نوع انسان بلند تر مادی اور
تمدنی سطح پر پہنچ سکے اور اس میں روحانی صفات یعنی اشتراک عمل، بے غرضی،
خدمت خلق حق پسندی، ہمدردی اور محبت نشوونما پا سکیں ہمارا نصب العین یہ ہے
کہ ایک دن اس طرح کا ایک عالمگیر نظام قائم ہو جائے اس راہ میں جو چیز حائل ہو،
اسے مٹانا پڑے گا اگر ممکن ہو تو نرمی سے، ورنہ مجبوراً سختی سے۔ یہ یقینی بات ہے کہ
جبر کی ضرورت اکثر پیش آئے گی لیکن اگر قوت کا استعمال کیا جائے تو وہ نفرت اور

ظلم کے جذبے کے ساتھ نہ ہو نا چاہیئے بلکہ ٹھنڈے دل سے محض رکاوٹ کو دور کرنے
کے لئے۔ ظاہر ہے اس میں سخت دشواری پیش آئے گی مسئلہ بڑی کٹھن ہے اور
قدم قدم پر شکست کا اندیشہ ہے مگر ان مشکلات کا علاج یہ نہیں کہ ہم ان کو
نظر انداز کر دیں۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم ان کی حقیقت کو سمجھیں اور بہادری سے
ان کا مقابلہ کریں۔ بظاہر یہ تمیں خیالی اور دور دراز کار معلوم ہوتی ہیں اور
یقین نہیں آتا کہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت میں یہ اعلیٰ جذبات پیدا ہو سکتے
ہیں لیکن ہمیں انہیں پیش نظر رکھنا چاہیئے اور ان پر زور دیتے رہنا چاہیئے
ممکن ہے کہ ان کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان نفرتوں اور جھگڑوں میں کمی واقع
ہو جائے جن سے ہمارے دل بھرے ہوئے ہیں۔

ہمارا طریقہ وہی ہونا چاہیئے جو ہمیں اس منزل تک پہنچا سکے اور ان
جذبات پر مبنی ہو۔ لیکن ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ انسان کی فطرت اجتماعی کی
موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے عام لوگ ہمیشہ ہماری تعلیم و تلقین پر دھیان
نہیں دیں گے۔ اور اعلیٰ اخلاقی اصول پر عمل نہ کریں گے۔ اس لئے لوگوں کے
خیالات پر اثر ڈالنے کے علاوہ ہمیں اکثر جبر سے بھی کام لینا پڑے گا۔ زیادہ
سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اس جبر کو محدود رکھیں۔ اور اس سے اس طرح کام
لیں کہ اس کی خرابیاں کم ہو جائیں۔

(۶۴)
پھر دہرہ جیل میں

علی پور جیل میں میری صحت اچھی نہیں تھی میرا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور
کلکتے کی ہوا اور گرمی سے تکلیف ہو رہی تھی۔ کچھ دن سے یہ افواہیں سننے میں آتی
تھیں کہ میری تبدیلی کسی بہتر آب و ہوا کے مقام پر ہو جائے گی ۷ مئی کو مجھے حکم
دیا گیا کہ اپنا بوریا بدھنا سنبھال کر یہاں سے چل دو۔ معلوم ہوا کہ دہرہ دون
جیل بھیجا جا رہا ہوں۔ کئی مہینے کال کوٹھری میں بند رہنے کے بعد شام کے ٹھنڈے
وقت گاڑی میں کلکتے کی گلیوں سے گزرنا بہت بھلا معلوم ہوا اور ہوڑے کے
اسٹیشن پر لوگوں کا مجمع دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

میں اس تبدیلی سے خوش تھا۔ اور مجھے دہرہ دون پہنچنے کا اشتیاق تھا جہاں
پہاڑ اس قدر قریب ہیں وہاں جا کر معلوم ہوا کہ جو حالت دو مہینے پہلے میرے
چلے جانے کے وقت تھی وہ اب نہیں ہے۔ اس بار ایک نئی کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ یہ ایک
مویشیوں کے باڑے کا سائبان تھا جس کی صفائی اور درستی کر لی گئی تھی۔

جیل کی کوٹھری کی حیثیت سے یہ اچھی خاصی تھی۔ اس سے ملا ہوا کوئی بیس
فٹ لمبا صحن بھی تھا۔ یہ اس کوٹھری سے جو مجھے دہرہ دون میں پہلی بار ملی تھی بہتر تھی۔ تو
تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس میں بہت سی خرابیاں بھی ہیں۔ چار دیواری
جو پہلے دس فٹ اونچی تھی اس کو بڑھا کر چار پانچ فٹ اور اونچی کر دی گئی تھی
پہاڑ کا منظر جس کا مجھے اس قدر اشتیاق تھا۔ بالکل چھپ گیا تھا۔ [illegible] درختوں کی

چوٹیاں نظر آتی تھیں میں چھ مہینے سے زیادہ اِس جیل میں رہا اور مجھے پہاڑوں کی ایک
جھلک تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی پہلی بار مجھے جیل کے دروازے کے سامنے ٹہلنے کی
اجازت تھی مگر اب وہ بھی نہیں رہی کوٹھری کے ساتھ کا چھوٹا سا صحن میری ورزش
کے لئے کافی سمجھا گیا۔

یہ اور اِسی قسم کی اور سختیاں بہت مایوس کن تھیں اور میں ان سے دِق آگیا
طبیعت میں ایک چڑچڑا پن سا پیدا ہو گیا اور جو تھوڑی سی میرے لئے ورزش جائز
رکھی گئی تھی اِس کے کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا مجھے کبھی تنہائی کا اور دنیا سے
الگ ہونے کا اِس قدر احساس نہیں ہوا تھا جتنا اِس مرتبہ ہو رہا تھا اس قید تنہائی
کا اثر میرے اعصاب پر پڑنے لگا اور میرے جسم اور دماغ کی قوت گھٹنے لگی میں خوب
جانتا تھا کہ دیوار کے پار صرف چند فٹ کے فاصلہ پر تازگی اور فرحت کا سماں چھایا
ہوا ہوگا۔ ہری ہری گھاس اور نرم نرم مٹی کی ٹھنڈی خوشبو آ رہی ہوگی۔ دُور دُور
تک کا منظر نظر آ رہا ہوگا مگر یہ سب چیزیں میری پہنچ سے باہر ہیں۔ اور میری آنکھیں
ان دیواروں کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں جیل کی معمولی زندگی کی چہل پہل بھی نہیں
تھی اِس لئے کہ میں اور قیدیوں سے الگ رکھا گیا تھا۔

چھ مہینے کے بعد برسات شروع ہو گئی اب ہوا کچھ اور ہی ہو گئی اور اس
میں نئی زندگی کی آہٹ سنائی دینے لگی حرارت کے کم ہونے سے جسم کو تو آرام ملا
مگر آنکھوں کو اور دل کو نہیں۔ کبھی کبھی میرے احاطے کا پھاٹک کسی پہرے والے
کے آنے جانے کے لئے کھلتا اور مجھے دم بھر کو باہر کی دنیا کی ایک جھلک نظر آجاتی
ہرے بھرے کھیتوں اور درختوں کے تروتازہ رنگ اور ان پر موتیوں کی طرح بکھرے
ہوئے شبنم کے قطرے مگر یہ صرف چند لمحے کا نظارہ ہوتا جو بجلی کی طرح کوند کر غائب
ہو جاتا پورا دروازہ شاید ہی کبھی کھلتا ہو۔ غالباً پہرے والوں کو حکم تھا کہ اگر میں

کہیں آس پاس موجود رہیں تو دروازہ ہرگز نہ کھلنے پاتے اور جب کھلے بھی تو بس تھوڑا ہی سا۔ سبزی اور شادابی کی یہ جھلک دیکھ کر مجھے تسکین نہیں ہوتی تھی بلکہ دل میں کا ہڑکا دو دن کر دل میں اٹھتا تھا یہاں تک کہ بعض اوقات دروازہ کھلتا تو اُدھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی۔

اصل میں یہ ساری اداسی جیل کی وجہ سے نہیں تھی۔ اگرچہ اس کا بھی اس میں کچھ حصہ تھا یہ باہر کے واقعات، کملا کی بیماری اور میری سیاسی پریشانیوں کا ردعمل تھا۔ مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کملا کو پرانی بیماری نے آلیا ہے اور میں اپنی بےبسی پر کڑھتا تھا کہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اسے بہت تقویت پہنچتی

برخلاف علی پور کے، دہرہ دون جیل میں مجھے ایک روزانہ اخبار پڑھنے کو ملتا تھا باہر کے سیاسی واقعات اور دوسرے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ تقریباً تین سال کے بعد (اس مدت کے بہت بڑے حصے میں وہ خلاف قانون قرار دے گئی تھی) پٹنے میں ہوا۔ اس کی کارروائی بہت مایوس کرنے والی تھی مجھے سخت تعجب تھا کہ ہندستان میں اور ساری دنیا میں اتنا کچھ ہو چکنے کے بعد اس پہلے جلسے میں صورت حال کا جائزہ لینے اور واقعات پر مفصل بحث کرکے پرانی لیکھ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ گاندھی جی دور سے دیکھنے میں اپنی قدیم حکمانہ شان میں نظر آرہے تھے۔ ان کا قول تھا "اگر تم میرے پیچھے چلنا چاہتے ہو تو تمہیں میری شرطیں ماننی پڑیں گی" یہ مطالبہ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک تھا اس لئے کہ گر انہیں ساتھ لینا تھا تو ان سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے دلی عقیدوں کے خلاف عمل کریں، مگر معلوم ہوتا تھا کہ حکم منوانے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور آپس کے مشورے سے ایک پالیسی تجویز کرنے پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ یہ بحث

بات ہے کہ گاندھی جی ۔ دوں پر اپنی رضی کا سکہ بٹھا دیتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں
کہ لوگ خود کچھ نہیں کر سکتے میرے خیال میں بہت کم شخصوں کو جمہور کی عقیدت اور
اطاعت اس حد تک نصیب ہوئی تھی جتنی انہیں حاصل ہے اور لوگوں کو اس وجہ سے
قصوروار ٹھہرانا کہ وہ ان کے اونچے معیار تک نہیں پہنچ سکتے بے انصافی ہے
پٹنے کے جلسے میں گاندھی جی آخر تک ٹھہرے بھی نہیں اس لئے کہ انہیں اپنا ہریجنوں
کی اصلاح کا دورہ جاری رکھنا تھا انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو رائے دی
کہ مستعدی سے کام کرے اور ورکنگ کمیٹی نے جو ریزولیوشن بھیجے ہیں انہیں جلدی
سے نپٹا دے یہ کہہ کر وہ چلے گئے ۔

مگر شاید زیادہ طول طویل بحث سے کچھ فائدہ نہ ہوتا ۔ کمیٹی کے ممبروں کے
خیالات الجھے ہوئے تھے اور وہ معاملات کو وضاحت سے نہیں سوچ سکتے تھے
اعتراض کرنے کو تو بہت سے لوگ تیار تھے مگر تعمیری تجویز ایک بھی پیش نہیں ہوئی
اس وقت کے حالات کے لحاظ سے یہ قدرتی بات تھی اس لئے کہ تحریک نافرمانی
کا سارا بوجھ انہیں لوگوں پر، جو مختلف صوبوں کے لیڈر تھے پڑا تھا اور ان کے
جسم اور دماغ تھکے ہوئے تھے اس بات کا ایک دھندلا سا احساس سب کو تھا
سول نافرمانی کو روک دینا چاہئے مگر سوال یہ تھا کہ اس کے بعد کیا کیا جائے؟
ان کے دو فریق ہو گئے تھے ایک تو یہ چاہتا تھا کہ کونسلوں کے ذریعے
سے آئینی جدوجہد کی جائے اور دوسرا کچھ دھندلے سے اشتراکی خیالات
رکھتا تھا ممبروں کی بہت بڑی تعداد دونوں فریقوں میں سے کسی میں شریک نہیں تھی
پرانی طریقوں کی طرف لوٹنا پسند نہیں کرتے تھے مگر اس کے ساتھ اشتراکیت سے
ڈرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ ان میں پھوٹ پیدا کر دیگی ۔ یہ لوگ کوئی
خیالات نہیں رکھتے تھے اور انہیں جو کچھ امید تھی اور جو کچھ سہارا تھا وہ

گاندھی جی کی ذات سے تھا پہلے کی طرح وہ ان کی طرف مڑ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے
چلنے لگے حالانکہ وہ ان کی رائے سے پوری طرح متفق نہیں تھے گاندھی جی کی مدد سے اعتدال
پسند اور آئین پسند حضرات کو کمیٹی میں اور کانگریس پر غلبہ حاصل ہو گیا
ان سب باتوں کی پہلے ہی سے توقع تھی۔ لیکن ان کے ردعمل سے کانگریس
اس قدر پیچھے ہٹ گئی جس کا کچھ خیال نہ تھا۔ پچھلے پندرہ سال میں یعنی ترک موالات
کی تحریک کے بعد سے کانگریس کے لیڈروں نے اس قدر آئین پسندی کا اظہار کبھی نہیں
کیا تھا یہاں تک کہ پرانی سوراج پارٹی بھی جو دراصل اس کا نتیجہ تھی ان لیڈروں
سے بہت آگے تھی اور پھر ان میں ایسی شخصیتیں بھی نہیں تھیں جیسی سوراج پارٹی میں
تھیں بہت سے لوگ جو کانگریس کی تحریک سے جب تک اس میں ستیہ گرہ شریک ہوتا
خطرناک پہلو ہوتا دور رہتے تھے اب موجود ہو گئے اور انہیں بڑی اہمیت
حاصل ہو گئی۔

گورنمنٹ نے کانگریس کو خلاف قانون قرار دینے کا حکم منسوخ کر دیا اور
وہ ایک جائز انجمن بن گئی مگر اس کی بہت سی ملحقہ اور ماتحت جماعتیں مثلاً سیوا دل،
کسان سبھائیں، تعلیمی ادارے اور نوجوان سبھائیں جن میں بچوں کی ایک انجمن
بھی شامل تھی بدستور خلاف قانون تھیں خصوصاً خدائی خدمت گار جو سرحد کے سرخ
پوش کہلاتے تھے اب تک قانون کے باغی سمجھے جاتے تھے یہ انجمن ۱۹۳۱ء میں باقاعدہ
کانگریس میں شامل کی جا چکی تھی اور صوبہ سرحد کی کانگریس کی شاخ قرار دی گئی
تھی یعنی باوجود اس کے کہ کانگریس نے عملی احتجاج بالکل ترک کر دیا اور آئینی طریقوں کی
طرف لوٹ آئی حکومت نے وہ تمام خاص قانون جو سول نافرمانی کو روکنے کے لیے
بنے تھے اسی طرح قائم رکھے بلکہ کانگریس کی اہم ماتحت جماعتوں کو خلاف قانون بنے
دیا کسانوں اور مزدوروں کی انجمنوں کو دبانے کا خاص اہتمام کیا گیا اور دلچسپ

بات یہ تھی کہ بڑے بڑے حکام نے زمینداروں کے پاس جا کر تاکید کی کہ تم اپنی تنظیم کرو۔ زمینداروں کی انجمنوں کے لیے تمام سہولتیں بہم پہنچائی گئیں حالانکہ صوبہ سندھ کی دو درگی انجمنوں کا چندہ سرکاری طور پر مال گذاری کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے۔

یوں تو میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ انجمنوں کو ہمیشہ سے ناپسند کرتا ہوں مگر ایک واقعے کی وجہ سے خاص طور پر مجھے ہندو مہاسبھا سے سخت رنج پہنچا۔ اس کے ایک سکریٹری نے یہ غضب کیا کہ بغیر کسی تعلق کے اس حکم کی تائید کر ڈالی جو سرحد کی سرخ پوش جماعت کو خلاف قانون قرار دینے کے لیے جاری کیا گیا تھا اور سرکار کو اس فعل پر شاباشی دی۔ مجھے سخت حیرت تھی کہ لوگوں سے ان کے معمولی مدنی حقوق چھیننے کی حمایت کی جا رہی ہے اور وہ بھی اس وقت جب کوئی جارحانہ تحریک موجود نہیں ہے۔ اصول کے سوال کو چھوڑ کر دیکھا جائے تب بھی ہر شخص جانتا تھا کہ سرحد والوں نے تین سال کی کشمکش میں کمال کر دکھایا اور ان کا لیڈر خان عبدالغفار خان جن کا سا بہادر اور کھرا آدمی ہندوستان میں مشکل سے نکلے گا، اب تک جیل میں ہے جہاں وہ بغیر عدالتی تحقیقات کے شاہی قیدی کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ مسٹر [illegible] فرقہ وارانہ تعصب کی اس سے بدتر مثال نہیں ہو سکتی اور مجھے توقع تھی کہ ہندو مہاسبھا کے بڑے بڑے لیڈر فوراً اسے رفیق کار کی اس رائے سے بے تعلق ہونے کا اعلان کریں گے مگر جہاں تک مجھے معلوم ہوا ان میں سے کسی نے اس معاملے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

ہندو مہاسبھا کے سکریٹری کے اس بیان سے مجھے سخت ہزیمت آئی تھی۔ یہ بجائے خود بہت بری چیز تھی مگر میرے لیے اس وجہ سے اور زیادہ تکلیف دہ تھی کہ میں اسے ملک کی موجودہ حالت کا ایک نمونہ سمجھتا تھا۔ اس دن سہ پہر کو گرمی سے نڈھال ہو گیا تو ایک عجیب خواب نظر آیا۔ میں نے دیکھا کہ خان عبدالغفار خان پر لوگ

ہر طرف سے حملہ کر رہے ہیں اور میں ان کو بچانے کے لئے لڑ رہا ہوں آنکھ کھلی تو طبیعت بہت پست اور اداس تھی اور سارا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس پر مجھے تعجب ہوا اس لئے کہ جاگتے میں کبھی میرے جذبات کا جوش اس طرح ظاہر نہیں ہوا کرتا

واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں میرے اعصاب بہت ہی کمزور ہو گئے تھے۔ سوتے میں بے چینی رہتی تھی جو میرے لئے غیر معمولی چیز تھی۔ اور طرح طرح کے بھیانک خواب نظر آتے تھے بعض وقت میں نیند میں چیخ اٹھتا تھا۔ ایک بار شاید بہت زور کی چیخ نکل گئی۔ اس لئے کہ جب میں چونک کر دیکھا پہرے والے میرے شور و غل سے پریشان میرے پاس کھڑے ہیں میں نے خواب میں یہ دیکھا تھا کہ کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے

اسی زمانے میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ایک ریزولیوشن سے بھی مجھے تکلیف ہوئی۔ اس ریزولیوشن کے پاس کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ "ذاتی املاک کی ضبطی اور طبقوں کی جنگ کی ضرورت کے متعلق بہت سی غلط باتیں مشہور کی جا رہی ہیں"۔ اور اس میں کانگریس والوں کو یہ یاد دلایا گیا تھا کہ کراچی کے ریزولیوشن میں نہ تو بغیر معقول وجہ اور مناسب معاوضے کے ذاتی املاک کی ضبطی کی تحریک ہے اور نہ طبقوں کی جنگ کی حمایت ورکنگ کمیٹی کی رائے میں املاک کی ضبطی اور طبقوں کی جنگ، کانگریس کے عقیدۂ عدم تشدد کے منافی ہے' اس ریزولیوشن کے الفاظ مبہم تھے اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ترتیب دینے والے طبقوں کی جنگ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی زد صریحی طور پر کانگریس سوشلسٹ پارٹی پر تھی، جو نئی نئی قائم ہوئی تھی سچ پوچھئے تو اس جماعت کے کسی ذمہ دار رکن نے ضبطی کا ذکر تک نہیں کیا تھا ہاں یہ بہت سے لوگوں نے کہا تھا کہ طبقوں کی جنگ اس وقت بھی موجود ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن میں یہ اشارہ پایا جاتا تھا کہ کوئی شخص جو طبقوں کی نزاع کا قائل ہو، کانگریس کا معمولی ممبر بھی نہیں ہو سکتا کانگریس پر کبھی یہ الزام نہیں

لگایا تھا کہ اس نے اشتراکیت اختیار کرلی ہے۔ یا وہ ذاتی املاک کے خلاف ہے البتہ اس کے بعض ممبر یہ خیالات رکھتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو اس ہمہ گیر قومی انجمن کے معمولی ممبروں کی صف میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔

یہ بات کئی بار کہی جا چکی تھی کہ کانگریس دعا سے لے کر یہ جاتک قوم کے ہر طبقے اور ہر جماعت کی نمائندگی کرتی ہے۔ قومی تحریکیں اکثر دعویٰ کرتی ہیں جس کے معنی مانے گئے یہ ہوتے ہیں کہ وہ بڑی اکثریت کی نمائندہ ہیں اور ان کی کوشش سب کے فائدے کے لئے ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں اس لئے کہ کوئی سیاسی انجمن متضاد اغراض رکھنے والے طبقوں کی نمائندہ نہیں ہو سکتی۔ اور اگر ہونا چاہے گی تو وہ ایک بے شکل، بے رنگ اور بے معنی جماعت بن کر رہ جائے گی کانگریس یا تو ایک سیاسی پارٹی ہے جو سیاسی قوت حاصل کرنے اور اسے قوم کے فائدے کے لئے استعمال کرنے کا ایک واضح (یا دھندلا) مقصد اور اصول رکھتی ہے یا محض ایک رفاہ عام کی انجمن ہے جو ایسے کوئی خاص خیالات نہیں رکھتی مگر ہر شخص کا بھلا چاہتی ہے اگر وہ سیاسی پارٹی ہے تو وہ صرف انہیں لوگوں کی نمائندہ کہلائے گی جو مجموعی طور پر اس کے مقصد اور اصول سے اتفاق رکھتے ہیں جو اس مقصد کے مخالف ہیں۔ وہ اس کے نزدیک قوم کے بجائے سماج کے مخالف اور رجعت پسند قرار پائیں گے اور ان کے اثر کو روکنا یا توڑنا اس کے اصول کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھا جائے گا۔

کانگریس کی تحریک شہنشاہی کے خلاف اٹھی ہے اور اسے سماج کی باہمی نزاع سے تعلق نہیں ہے اس لئے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں بہت سے لوگوں کے اتفاق رائے کی گنجائش ہے اسی لئے اسے ہندوستانیوں کی بہت بڑی اکثریت کی نمائندگی کم و بیش حد تک حاصل ہو گئی ہے اور اس میں مختلف خیالات کی جماعتیں شریک ہو گئیں جو صرف ایک چیز یعنی شہنشاہی کی مخالفت میں متحد تھیں اور ان کی

اس مخالفت میں بھی دونوں کا فرق تھا وہ لوگ جو شہنشاہی کی مخالفت کے بنیادی مسئلے میں کانگریس کے ہم رائے نہیں تھے اس سے الگ ہو گئے اور کم و بیش برطانوی حکومت کا ساتھ دینے لگے غرض کانگریس کی جماعتوں کی متحدہ انجمن کی جن میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا مگر سب کی سب ایک مشترک مقصد اور گاندھی جی کی با اقتدار شخصیت کے رشتے میں مربوط تھیں۔

بعد میں ورکنگ کمیٹی نے طبقوں کی جنگ کے متعلق ایسے ریزولیوشن کی تاویل کی کوشش کی پاس ریزولیوشن کے الفاظ کی یا اس اصول کی جو اس میں بیان کیا گیا تھا اس قدر اہمیت نہیں تھی جتنی اس بات کی کہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریس کی پالیسی کس سمت جا رہی ہے بالکل کھلی ہوئی بات تھی کہ یہ ریزولیوشن کانگریس کی نئی کونسل پارٹی کے ایسے پاس ہوا ہے جو اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں سرمایہ داروں کی مدد حاصل کرنا چاہتی تھی ان کے کہنے سے کانگریس رفتہ رفتہ رجعت پسندی کی طرف سرکتی جاتی تھی اور ملک کی اعتدال پسندوں اور رجعت پسندوں کو رجھانے کی فکر کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ جو لوگ پہلے کانگریس کے دشمن تھے اور مارشل لا کے زمانے میں حکومت کا ساتھ دے چکے تھے ان سے بھی میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی تھیں۔ شور مچانے والے اور نکتہ چینی کرنے والے انتہا پسندوں کی پارٹی اس تالیف قلوب میں سدِ راہ سمجھی جاتی تھی ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن اور کئی حضرات کے شخصی بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ کانگریس کے ارباب اختیار انتہا پسندوں کے اعتراضات کی وجہ سے ایک ماہ سے جلتے والے ہیں اور اگر یہ شرارت سے باز نہ آئے تو سزا پائیں گے اور کانگریس سے نکال دیئے جائیں گے۔

کانگریس کے لیڈروں میں گاندھی جی کے علاوہ اور بھی بہت سے مشہور

بزرگ تھے جنہوں نے قومی آزادی کی جنگ میں بڑے بڑے کارنامے دکھائے تھے اور اپنی دیانت داری اور بہادری کی وجہ سے سارے ملک میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مگر نئی پالیسی کی وجہ سے کانگریس کی دوسری بلکہ پہلی صف میں بعض ایسے لوگ پہنچ گئے جو کسی طرح اصول پرست نہیں کہے جا سکتے۔ یوں تو کانگریس کے حلقوں میں اب بھی اصول پرستوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ مگر اب مطلب پرستوں کے لئے اس میں داخل ہونا اتنا سہل ہو گیا جتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ گاندھی جی کی پراسرار شخصیت کے علاوہ جو سب پر چھائی ہوئی تھی۔ کانگریس کے دو گروہ نظر آتے تھے ایک تو خالص سیاسی گروہ جس نے ایک خفیہ تنظیم کی شکل اختیار کرلی تھی یعنی چند آدمی مل کر ہر معاملے کا فیصلہ کرلیتے تھے اور اسے کانگریس سے منوالیتے تھے، اور دوسرا مذہبی گروہ جس میں ایک پارسا منڈلی کی مثال تھی اور بہت تقوے اور رقت قلب کا جوش تھا۔

حکومت کے یہاں فتح کے شادیانے بج رہے تھے کیونکہ اس کے خیال میں نافرمانی کی تحریک اور اس کی ساتھیوں کو کچلنے کی پالیسی پوری طرح کامیاب ہو گئی تھی آپریشن بخیر و خوبی ہو گیا تھا مریض مرتا ہے یا جیتا ہے اس سے فی الحال بحث نہیں تھی اگرچہ کانگریس اس وقت کسی حد تک ہموار ہو گئی تھی مگر حکومت نے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ وہی پالیسی جاری رکھی اسے معلوم تھا کہ جب تک اصل مسئلہ طے نہ ہو قومی پالیسی میں اس طرح کے تغیرات محض عارضی ہیں اور اگر ذرا ڈھیل دی گئی تو پھر آگ بھڑک اٹھے گی شاید اس کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ کانگریس کے کسانوں اور مزدوروں کی حمایت کے انتہا پسندوں پر سختی کرنے سے ان کانگریسی لیڈروں کو کچھ زیادہ شکایت نہ ہوگی جو احتیاط کی راہ پر چل رہے ہیں۔

میرے خیالات دہرہ دون جیل میں کچھ اس قسم کے تھے سچی بات یہ ہے

کہ میں دور بند ہے کی۔ جن واقعات کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا تھا علی پور میں تو مجھے کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی ڈیرہ دون میں حکومت کا تجویز کیا ہوا اخبار دیکھنے کو ملتا تھا جس میں خبریں ایک خاص رنگ میں پیش کی جاتی تھیں اور کبھی کبھی بالکل یک طرفہ ہوتی تھیں اگر مجھے اپنے ساتھیوں سے جو جیل کے باہر تھے ملنے کا اور واقعات کو غور سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوتا تو شاید میری رائے تھوڑی بہت بدل جاتی حال کے تصور سے مجھے تکلیف ہوتی تھی اس لئے میں ماضی کا تصور کرنے لگا اور یہ سوچنے لگا کہ جب سے میں نے قومی معاملات میں حصہ لینا شروع کیا ہندوستان میں سیاسی واقعات کی کیا رفتار رہی ہے اور ہم نے دکھوں ات تک کیا اس میں کونسی بات ٹھیک تھی اور کونسی بے جا تھی؟ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں جو کچھ سوچتا ہوں اسے لکھ ڈالوں تو میرے خیالات زیادہ باترتیب اور مسیدہ ہو جائیں گے اور ایک معین کام میں لگ جانے سے مجھے اس پریشانی اور اداسی سے بھی نجات مل جائے گی چنانچہ جون ۱۹۳۴ء میں نے ڈیرہ دون جیل کے اندر آپ بیتی لکھنی شروع کی اور مہینے ڈیڑھ مہینے وار یہ کرتا رہا کہ جب کبھی طبیعت چاہتی بیٹھ کر اسے لکھ ڈالا۔ بیچ میں کئی ایسے وقفے آئے کہ لکھنے کو جی نہیں چاہا ان میں سے تین وقفے تین تین مہینے کے گزرے مگر کسی نہ کسی طرح یہ کام چلتا ہی رہا یہاں تک کہ اب خاتمے پر آپہنچا ہے اس کا بڑا حصہ میں نے غیر معمولی پریشانی کے زمانے میں لکھا ہے جب میرے دل پر رنج اور اداسی چھائی ہوئی تھی شاید اس کی جھلک اس کتاب میں بھی آگئی ہے مگر اس کے لکھنے ہی سے مجھے ان پریشانیوں سے نجات ملی۔ لکھتے وقت میں نے پڑھنے والوں کو پیش نظر نہیں رکھا تھا میرا خطاب اپنے دل سے تھا۔ میں آپ ہی سوال کرتا تھا اور آپ ہی جواب دیتا تھا۔ جس میں مجھے بعض اوقات ہنسی بھی آجاتی تھی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ جہاں تک ممکن ہو جذبات سے الگ ہوکر بے لاگ طریقے سے غور کروں اور میں

سمجھتا تھا کہ ماضی کے اس جائزے سے مجھے اس میں مدد ملے گی۔
جولائی کے آخر میں کملا کی طبیعت بگڑنے لگی اور چند روز میں حالت نازک ہوگئی۔ ۱۱ اگست کو یکایک مجھے دہرہ دون جیل سے رخصت ہونے کا حکم دیا گیا اور اسی روز رات کو میں پولس کی حراست میں الہ آباد روانہ کر دیا گیا۔ دوسرے دن یک شام کو ہم الہ آباد کے پریاگ اسٹیشن پر پہنچے اور وہاں مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ اطلاع دی کہ تم اپنی بیوی کی عیادت کے لیے عارضی طور پر رہا کئے جاتے ہو اس دن میری گرفتاری کو پورے چھ مہینے ہو گئے تھے

(۶۵)
گیارہ دن

تلوار اپنے نیام کو گھس ڈالتی ہے
اور روح جسم کو ریت کر رکھ دیتی ہے

(بائرن)

میری رہائی عارضی تھی۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ مجھے دو ایک روز کے لیے باہر
مدت کے لیے جتنی ڈاکٹر ضروری سمجھیں آزادی دی گئی ہے اس لیے ہیجانی کی
حالت میں جم کر کوئی کام کرنا ممکن نہ تھا اگر میعاد مقرر ہوتی تو مجھے ایک عادت ہو جاتا اور
میں اس کے لحاظ سے اپنے اوقات کا تعین کرتا اب تو ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ نہ جانے
کب دوبارہ جیل بھیج دیا جاؤں

یہ تبدیلی یکایک ہوئی اور میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا وہ جگہ جہاں میں قید
تنہائی سے نکل کر بھرے گھر میں پہنچ گیا جہاں ڈاکٹروں، نرسوں اور عزیزوں کا مجمع تھا میری
لڑکی اندرا بھی شانتی نکیتن سے آگئی تھی بہت احباب کملا کی عیادت کے لیے آ رہے
تھے رہنے سہنے کا ڈھنگ بالکل بدل گیا تھا گھر کی آسائشیں میسر تھیں اچھا کھانا مل رہا تھا مگر
دل میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم تھا مگر کملا کی حالت کی فکر سب پر غالب تھی

وہ نحیف و زار بستر پر پڑی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اب کملا کی یہ حالت میں ہے
اس میں مرض سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی اور اس کی جدائی کا خیال میرے لیے
روح فرسا تھا ہماری شادی کو ساڑھے اٹھارہ برس گزر چکے تھے وہ دن اور اس کے

بعد کا زمانہ میری آنکھوں میں پھر رہا تھا شادی کے وقت میں چھبیس برس کا تھا اور وہ کوئی سترہ برس کی دبلی پتلی کھلی کھالی لڑکی ہم دونوں کی عمر میں بہت فرق تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ فرق ہمارے خیالات میں تھا اسلئے کہ میں اس سے زیادہ تجربہ کار تھا مگر اس عقل سادگی کے دکھاوے کے باوجود مجھ میں بہت لڑکپن تھا اور مجھے احساس نہ تھا کہ اس نازک حساس لڑکی کے نفس کی کلی کھل کر پھول بن رہی ہے اور اس کی برداشت بڑی نرمی اور احتیاط سے ہونی چاہیے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی اس لئے آپس میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی مگر ہمارے خیالات کی بنیادیں الگ الگ تھیں اور ان میں میل نہ تھا اس اختلاف کی وجہ سے ان میں رنجش تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو جایا کرتے تھے مگر بچپن کے قصے زیادہ طول کھینچتے تھے اور ہم لڑ جھگڑ کر پھر ایک ہو جایا کرتے تھے دونوں تیز مزاج اور حساس طبیعت کے تھے اور بچوں کی طرح ایسی آن پر جان دیتے تھے پھر بھی ہماری محبت بڑھتی گئی اگرچہ خیالات کا اختلاف بہت آہستہ آہستہ کم ہوتا ہمارے شادی کے ۱۲ مہینے بعد ہماری اکلوتی لڑکی اندرا پیدا ہوئی جن دنوں ہماری شادی ہوئی قریب قریب اسی زمانے میں ہندوستان کی سیاست کا رنگ بدل رہی تھی اور ، ہمارا ہاتھ اس میں بڑھتا جاتا تھا۔ یہ ہوم رول کا دور تھا اور تھوڑے دنوں بعد ہی پنجاب میں مارشل لا اور اسی کے ساتھ ترک موالات شروع ہو گیا اور میں روز روز قومی کاموں کے چکر میں پڑتا گیا۔ مجھے ان چیزوں سے اتنا شغف ہو گیا کہ بالکل غیر شعوری طور پر میں اس کی طرف سے قریب قریب غافل ہو گیا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ یہی زمانہ تھا جب اسے میری مدد کی بہت ضرورت تھی اس سے مجھے جو محبت تھی وہ قائم رہی بلکہ اور بڑھ گئی اور مجھے بڑا اطمینان رہتا تھا کہ میری تسلی کیلئے موجود ہے مجھے تو اس سے تقویت پہنچتی تھی مگر اسے میری بے پروائی سے صدمہ پہنچتا ہوگا۔ اس طبیعت کی تھی کہ اگر میں اس کے ساتھ یہ سلوک کرتا تو شاید اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس غفلت اور کم التفاتی سے ہوئی ہوگی

کملا۔جواہرلال۔اندرا

ا رشتات میں کاحلیہ

سینے میں تڑپ رہی تھی میں کسی قدر حیران تھا کہ وہ اپنی صحت کی پروا نہیں کرتی مگر میں اسے کس طرح الزام دے سکتا تھا۔ اس کی مچلتی طبیعت اس پر کڑھتی تھی کہ وہ بیماری سے بےبس ہے، اور قومی جنگ میں پوری طرح شریک نہیں ہو سکتی وہ عجیب دبدھے میں رہتی تھی، نہ تو کام کی طرف پوری توجہ کر سکتی تھی اور نہ علاج کی طرف۔

میں اپنے دل میں کہتا تھا کیا سچ مچ وہ ایسے وقت میں جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے مجھ سے منہ موڑ کر چلی جائے گی، ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کو پہچاننا اور سمجھنا شروع کیا ہے سچ پوچھئے تو اب ہماری ازدواجی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے ہم ایک دوسرے کا بڑا سہارا ہے اور بہت سے کام ساتھ ساتھ کرتے ہیں۔

یہ خیالات دل میں لئے ہوئے میں ہر روز ہر وقت اس کی حالت کو دیکھا کرتا تھا۔ میرے رفیق اور دوست مجھ سے ملنے آتے تھے۔ وہ مجھے بہت سے واقعات سنایا کرتے جن کی مجھے خبر نہیں تھی وہ موجودہ سیاسی مسائل پر بحث کرتے تھے اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرتے تھے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں کیا جواب دوں میرے لئے اپنے خیال کو کملا کی بیماری سے ہٹانا آسان نہیں تھا اور جیل میں تنہا عرصہ تک واقعات سے الگ اور دور رہنے کے بعد میں یکایک ایسے مسائل کو حل نہیں کر سکتا تھا جو مخصوص حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک مدت کے تجربے سے معلوم ہو گیا تھا کہ جیل میں جو محدود اطلاعات ملتی ہیں ان کی بنا پر صورت حال کا صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے صحیح رائے قائم کرنے کے لئے لوگوں سے ملنا ضروری تھا اگر بغیر اس کے کوئی رائے ظاہر کی جاتی تو وہ اصلیت سے دور ہوتی۔ گاندھی جی اور پرانے کانگریسی رفیقوں کے ساتھ بے انصافی ہوتی اگر میں ان سے ملے بغیر ملاقات کرنے سے پہلے کانگریس کی پالیسی کے متعلق کوئی قطعی بات کہہ دیتا۔ مجھے بہت سی کارروائیوں پر اعتراض تھا مگر میرے ذہن میں کوئی عملی تجاویز نہیں تھیں۔ مجھے اس وقت جیل سے چھوٹنے کی توقع نہیں تھی اس لئے میں نے ان چیزوں پر اس پہلو سے غور بھی نہیں کیا تھا

پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ جب حکومت نے اتنی عنایت کی کہ مجھے اپنی بیوی سے ملنے
جانے کی اجازت دے دی تو یہ ٹھیک نامناسب بات ہے کہ میں اس سے فائدہ اٹھا کر سیاسی
کام کروں میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں اس قسم کے کام نہیں کروں گا پھر بھی
یہ خیال مجھے روکتا تھا

میں عام بیانات شائع کرنے سے بھی احتراز کرتا رہا البتہ بعض غلط افواہوں کی تردید
ضرور کی بیچ کی گفتگو میں بھی صاف صاف کسی پالیسی کی تائید نہیں کرتا تھا البتہ کھلے واقعات
پر دل کھول کر تنقید کیا کرتا تھا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی ابھی حال ہی میں قائم ہوئی تھی اور میرے
بہت سے گہرے رفیق اس سے تعلق رکھتے تھے اس معلومات کی بنا پر جو مجھے اس کے متعلق
حاصل ہو سکیں مجھے اس کی عام پالیسی سے اتفاق تھا مگر یہ ایک عجیب قسم کی بے میل جماعت
تھی اور اگر میں بالکل آزاد ہوتا تب بھی اس میں شریک ہونے میں تامل سے کام لیتا مقامی
سیاسی معاملات میں مجھے کچھ وقت صرف کرنا پڑا اس لیے کہ اور مقامات کی طرح یہاں بھی لوکل کانگریس
کمیٹی کے انتخابات میں سخت کشمکش پیدا ہو گئی تھی کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا صرف ذاتیات
کا معاملہ تھا۔ مجھ سے درخواست کی گئی کہ میں ان جھگڑوں کو چکانے میں مدد دوں

میں ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اور نہ مجھے اتنی فرصت تھی اس کے باوجود
مجھے بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے سخت صدمہ ہوا تعجب کی بات تھی کہ کانگریس کے
عام انتخابات کے معاملے میں لوگوں میں اس قدر جوش کیونکر پیدا ہو گیا ان میں سب سے پیش پیش
وہ حضرات تھے جو لڑائی کے زمانے میں مختلف قسم کے ذاتی عذروں کی وجہ سے الگ ہو گئے
تھے سول نافرمانی کے ختم ہوتے ہی یہ عذر رفع ہو گئے اور یہ حضرات پردے سے باہر نکل کر کانگریس
میں بازاری لوگوں کی طرح لڑنے لگے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ حریفوں کو نیچا دکھانے کے جوش
نے انہیں اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ معمولی تہذیب کی حد سے بھی گزر گئے تھے مجھے اس
بات سے اور بھی زیادہ صدمہ ہوا کہ کملا کے نام بلکہ اس کی بیماری سے بھی ان انتخابات میں

ناجائز فائدہ اٹھایا گیا

جن وسیع تر مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ان میں اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں کانگریس کی شرکت کا مسئلہ بھی تھا بہت سے نوجوان اس فیصلے کے مخالف تھے کیونکہ وہ اس کے معنی یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کونسل کے کام اور مصالحت کے چکر میں پڑ جائے گی مگر وہ کوئی اور معقول تجویز پیش کرنے سے قاصر تھے تعجب ہے کہ ان حضرات میں سے جو اعلیٰ اصولوں کی بنا پر کونسل کی شرکت کے مخالف تھے بعض کو انتخاب میں دوسری انجمنوں کے حصہ لینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کا منشا یہ معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ پرور جماعتوں کے لئے میدان خالی چھوڑ دیا جائے۔

مجھے ان نامعقول جھگڑوں سے اور اس ناپاک سیاست سے جو الہ آباد میں پیدا ہو رہی تھی کراہت آتی تھی میں ان سے اور اپنے شہر سے بیزار تھا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب وہ وقت آئے گا کہ میں ان معاملات کی طرف توجہ کروں تو میں اس فضا میں کیا کر سکوں گا۔

میں نے گاندھی جی کو ایک خط لکھا جس میں کملا کی حالت کا ذکر تھا چونکہ میں سمجھتا تھا کہ بہت جلد جیل بھیج دیا جاؤں گا اور مجھے پھر خط لکھنے کا موقع نہیں ملے گا اس لئے میں نے انہیں ان خیالات اور جذبات سے بھی آگاہ کر دیا جو اس وقت میرے دل میں تھے حال کے واقعات سے مجھے سخت مایوسی اور صدمہ ہوا تھا اور میرے خط میں کچھ تھوڑی سی جھلک اس کی بھی تھی میں نے خود کوئی تجویز پیش نہیں کی کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے بلکہ صرف گذرے ہوئے واقعات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی یہ خط جذبات کے جوش سے بھرا ہوا تھا اور مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گاندھی جی کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی

دن گذرتے جاتے تھے اور میں منتظر تھا کہ جیل خانے سے طلبی یا حکومت کے

پاس سے کوئی اور اطلاع آئے ورنہ تو مجھے یہ اطلاع ملتی رہتی تھی کہ مزید احکام کل پرسوں تک جاری ہو جائیں گے۔ اس اثنا میں ڈاکٹروں کو یہ ہدایت تھی کہ میری بیوی کی صحت کی روزانہ رپورٹ حکومت کو بھیجتے رہیں۔ میرے آنے کے بعد کملا کو کچھ خفیف سا افاقہ ہوا تھا۔

یہ عام خیال تھا اور اس میں وہ حضرات بھی شریک تھے جو عموماً حکومت کے ہم راز رہا کرتے ہیں کہ میں بالکل چھوڑ دیا جاتا مگر دو باتوں کی وجہ سے نہیں چھوڑا گیا۔ ایک یہ کہ اکتوبر میں کانگریس کا پورا جلسہ بمبئی میں ہونے والا تھا دوسرے یہ کہ اسمبلی کے انتخابات نومبر میں شروع ہونے کو تھے اگر میں جیل کے باہر ہوتا تو ان موقعوں پر شورش پیدا کرتا اس لئے مطلب یہ تھا کہ میں پھر تین مہینے کے لئے جیل بھیج دیا جاؤں گا اور اس کے بعد چھوڑ دیا جاؤں گا مگر اس کا بھی امکان تھا کہ شاید واپس نہ بھیجا جاؤں گا اور جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے یہ امکان بظاہر بڑھتا جاتا تھا۔

مجھے جیل سے چھوٹے گیارہواں دن تھا یعنی اگست کی تیئیسویں تاریخ تھی۔ دفعۃً پولیس کی موٹر کار آ کر رکی اور ایک پولیس افسر نے مجھ سے آ کر کہا کہ آپ کا وقت پورا ہو گیا اور آپ کو پھر واپس چلنا ہے۔ میں اپنے عزیزوں سے رخصت ہوا اور پولیس کی موٹر میں بیٹھ رہا تھا کہ ماں ہاتھ پھیلائے میرے پاس دوڑی آئیں۔ ان کے چہرے کی وہ کیفیت میرے دل پر ایک عرصے تک نقش رہی۔

(۶۶)

پھر وہی کنجِ قفس پھر وہی صیاد کا گھر

"سایہ یکساں پھیلا ہوا ہوتا ہے مگر دھوپ میں رنگ کا اتار چڑھاؤ لازمی ہے اسی طرح رنج راحت سے ۔ شکل الگ ہے مگر راحت میں گویا گرل آلام کی خلش اور کسک پوشیدہ ہے"

(راج ترنگنی ترجمہ [illegible] پنڈت)

میں پھر اسی جیل میں واپس آ گیا اور اب معلوم ہوتا تھا کہ میری قسمت مرتے دم تک قیدی ہے میری حالت گیند کی سی ہو گئی تھی جسے اندر سے باہر، باہر سے اندر پھینکتے ہیں ۔ ان کے مسلسل اتار چڑھاؤ نے میرے نظام عصبی کو تہ و بالا کر دیا تھا اور اس ہیر پھیر میں زندگی تیرہ و تار سہنا مشکل ہو گیا تھا مجھے امید تھی کہ اسی پرانی بارک میں رکھا جاؤں گا جس سے دل بہلتے تھے میں اس کی قدر مانوس ہو گیا تھا اس میں میرے برادر نسبتی رنجیت پنڈت کے لگائے ہوئے پھول اب تک موجود تھے اور اس کا برآمدہ بھی کشادہ تھا مگر اب اس بارک میں ایک صاحب ستان قیدی کی حیثیت سے رہتے تھے جو بغیر عدالتی تحقیقات کے نظر بند کر دیئے گئے تھے میرا ان کے ساتھ رہنا مناسب نہیں سمجھا گیا اس لئے مجھے جیل کے ایک اور حصے میں جگہ دی گئی جہاں ہوا گھٹی ہوئی تھی اور سبزے اور پھولوں کا نام تک نہ تھا

گم سم دن اور راتیں کاٹنی تھیں وہاں نہ سہی یہاں میرا جسم قید میں تھا مگر میرا دل کہیں اور تھا مجھے اندیشہ تھا کہ کملا کو جو ذرا افاقہ ہوا ہے وہ میرے دوبارہ گرفتار ہونے کے صدمے سے قائم نہیں رہے گا اور یہی ہوا کچھ عرصے تک مجھے ڈاکٹر کی رپورٹ

روزانہ بھیجتی رہی اور وہ بھی ٹرے پھیر سے۔ ڈاکٹر پولیس کو ٹیلیفون کرتا تھا، پولیس جیل کے دفتر
کو اطلاع دیتی تھی اور وہاں سے مجھے خبر ملتی تھی۔ ڈاکٹروں کا جیل کے عملے سے براہ راست بات
چیت کرنا قطعی ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ دو ہفتے تک مجھے یہ رپورٹیں پابندی سے تو پہنچیں مگر
خبر پہنچتی رہیں پھر ان کا سلسلہ بند ہو گیا حالانکہ کملا کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی
پہلے بری خبریں سن کر اور پھر خبروں کے انتظار میں مجھے دن دوبھر اور راتیں پہاڑ
ہو گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وقت ساکن ہے یا چیونٹی سے تو دھیرے کی چال سے ایک ایک
گھڑی قیامت کی گھڑی تھی۔ مجھے یہ احساس اس شدت کے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا
مجھے یہ توقع تھی کہ میں کوئی دو مہینے میں یعنی ممبئی کانگریس کے اجلاس کے بعد رہا کر دیا جاؤں
گا مگر یہ دو مہینے دو جگ کے برابر تھے۔

دوبارہ گرفتاری کے پورے ایک مہینے کے بعد میں ایک پولیس افسر کے ساتھ اپنی
بیوی سے ملنے کے لئے بھیجا گیا۔ مجھ سے یہ کہا گیا کہ اب تمہیں ہفتے میں دو بار یہاں آنے
کی اجازت ملا کرے گی بلکہ وقت بھی مقرر کر دیا گیا۔ جو تھے دن میں انتظار کرتا رہا
مگر کوئی لینے نہیں آیا۔ پانچواں، چھٹا، ساتواں دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ میری
سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ستم ظریفی تھی۔

خدا خدا کر کے ستمبر کا مہینہ گزرا۔ یہ تیس دن میری زندگی کے سب سے کٹھن دن تھے
بیچ والوں کے ذریعے مجھ تک یہ بات پہنچائی کہ اگر تم ضابطہ طور پر وعدہ کر لو کہ قید کی
میعاد کے ختم ہونے تک سیاست سے الگ ہو گے تو تم کملا کی تیمارداری کیلئے رہا کر دیئے جاؤ گے
میں اس وقت سیاست کے خیال سے کوسوں دور تھا اور گیارہ دن تک باہر رہ کر میں نے
جو سیاسی حالات دیکھے تھے ان کی وجہ سے میرا دل کھٹا ہو گیا تھا مگر وعدہ کرنے کے یہ معنی
تھے کہ میں اپنے قول سے، اپنے مقصد سے، اپنے رفیقوں سے، اپنے آپ پھر جاؤں۔ چاہے
کچھ بھی ہو یہ شرط تو میں ہرگز منظور نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا وعدہ کرنا اپنی روح کو ہلاک

کم سے اپنے عقائد کا کا گھمنڈ ہے سے کم نہ تھا۔ کہنے والے کہا کرتے تھے کہ دیکھو کملا کی حالت گرتی جاتی ہے۔ اگر تم اس کے پاس رہو تو شاید اس کی جان بچ جائے کیا تمہیں اپنی آن کملا کی جان سے زیادہ پیاری ہے؟ اگر صورت حال یہ ہوتی تو واقعی میرے لئے سخت مشکل تھی مگر خوش قسمتی سے یہ مشکل مجھے درپیش نہ تھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ خود کملا اسے ہرگز پسند نہیں کریگی اور اگر میں نے اس قسم کا وعدہ کر لیا تو اسے صدمہ اور ضرر پہنچے گا۔

تمبر ۱۹۳۵ء اکتوبر میں مجھے اسے دیکھنے کی اجازت ملی وہ تیر بکار میں قریب قریب تنہا پڑی تھی اسے یہ آرزو تھی کہ میں اس کے پاس رہوں مگر جب میں رخصت ہونے لگا تو وہ بڑی بہادری سے مسکرائی اور مجھے جھکنے کا اشارہ کیا میں جھک گیا اور اس نے میرے کان میں کہا "یہ کیا قصہ ہے؟ کیا تم سے کہا جاتا ہے کہ تم حکومت سے کوئی وعدہ کر لو؟ دیکھو یہ ہرگز نہ کرنا۔"

میری گیارہ دن کی رہائی کے دوران میں پہلے ہوا تھا کہ کملا کو ذرا افاقہ ہو تو وہ کسی بہتر مقام پر علاج کے لئے بھیج دی جائے تب سے ہم سارا اس کی طبیعت کے سنبھلنے کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ تو اور گرتی جاتی تھی اور اب چھ ہفتے کے بعد صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی حالت پہلے سے بدتر ہے اب زیادہ انتظار کرنا فضول تھا اور یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ وہ اسی حالت میں بھوالی بھیج دی جائے۔

اس کی روانگی سے ایک دن پہلے میں اسے رخصت کرنے کیلئے لے جایا گیا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ دیکھئے اب مجھے اس کی صورت دیکھنا کب نصیب ہوتا ہے اور ہوتا بھی ہے یا نہیں مگر اس روز وہ بہت شاش تھی اور مجھے ایک عرصے کے بعد اپنے دل میں کسی قدر خوشی کی جھلک نظر آئی۔

تقریباً تین ہفتے بعد میں نینی جیل سے الموڑہ کے ڈسٹرکٹ جیل میں بھیج دیا گیا تاکہ کملا سے قریب رہوں بھوالی راستے میں پڑتا تھا اور میں اپنے پولیس کے نگرانوں کے

ساتھ چلے گئے وہاں ٹھیرا ہے۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ کملا کی حالت کسی قدر بہتر تھی
اور میں اطمینان سے الموڑے روانہ ہوا۔ سچ پوچھیے تو کملا سے ملنے سے پہلے پہاڑ کی ہوا
نے میرے دل کو مسرت سے معمور کر دیا تھا۔

میں دوبارہ پہاڑ آنے سے بہت خوش تھا ہماری موٹر سڑک کے پیچ و خم کے ساتھ
بل کھاتی چلی جا رہی تھی صبح کی ٹھنڈی ہوا اور پہاڑ کے دلفریب مناظر سے دل کو ایک عجیب
فرحت سی ہوتی تھی ہم اوپر چڑھتے چلے جاتے تھے اور کھڈ کی گہرائی بڑھتی جاتی تھی رفتہ رفتہ
چوٹیاں بادلوں میں چھپ گئیں درخت بالکل بدل گئے ہر طرف پہاڑیاں دیودار اور صنوبر
سے ڈھکی ہوئی نظر آ رہی تھیں کبھی کبھی سڑک کے موڑ سے نکل کر ایک نیا منظر سامنے آ جاتا
تھا پہاڑیوں اور وادیوں کی ایک وسیع دنیا اور نیچے کھڈ میں زور و شور سے بہتا ہوا چھوٹا
سا چشمہ اس نظارے سے یہ جی کسی طرح نہیں بھرتا تھا میں اسے مدیدوں کی طرح دیکھ
رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے سمیٹ کر حافظے کے خزانے میں بھر لوں تاکہ جب یہ نظارہ
نظر سے چھپ جائے تو اس کی یاد سے دل بہلاؤں

پہاڑیوں کے پہلو میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے جھنڈ تھے اور ان کے آس پاس
ذرا ذرا سے کھیت تھوڑی تھوڑی محنت سے پھیلواں زمینوں پر بنائے گئے تھے دور سے یہ چوڑی
چوڑی سیڑھیاں معلوم ہوتی تھیں جن کا سلسلہ بعض جگہ وادی کی سطح سے پہاڑ کی چوٹی تک
پہنچتا تھا کس قدر شدید مشقت سے ان بستیوں کے رہنے والے فطرت سے روزی
حاصل کرتے تھے ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر وہ بس اتنا پیدا کرتے تھے کہ وہ روکھی سوکھی
روٹی میسر آجائے ان کٹے ہوئے کھیتوں سے اس کوہستان میں آبادی کی شان پیدا ہو گئی
تھی اور بکری یا درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کے مقابلے میں عجب لطف دیتے تھے
دن کو یہ منظر بڑا خوشگوار تھا جب سورج اونچا ہوا اور بکھرتی ہوئی دھوپ نے
پہاڑوں میں حرارت اور زندگی پیدا کر دی ان کی بیگانہ وحشی کم ہو گئی اور ان میں انس اور

فطرت کی تمام نظر آتی ہے مگر شام ہوتے ہی اس کا رنگ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے جب رات
دیو کی طرح ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ریاست سے گزرتی ہے اور زندگی وحشی فطرت کے ہاتھ میں
چھوڑ کر امن کے گوشے میں چھپ جاتی ہے تو یہی پہاڑ کس قدر سرد مہر اور وحشت ناک نظر
آنے لگتے ہیں۔ چاندنی رات یا تاروں کی دھیمی روشنی میں یہ پُراسرار مہیب ظلمتی دیواریں ہم
کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں اور وادیوں پر ہوا کے سائیں سائیں چلنے کی آواز آنے لگتی ہے بجائے مسافر
کو خواہ اپنا جیا چاہے، ہوا ایک عجیب احساس ہوتا ہے کہ ہر طرف دشمن ہی دشمن ہیں اور ہر دم خوف
لرزتے رہنا۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا بھی اس بہتی ندی سے للکارتی ہے اور کبھی ایسا
ہوتا ہے کہ ہوا بالکل تھم جاتی ہے اور اس قدر گہرا سناٹا چھا جاتا ہے کہ اس سے سخت وحشت
ہوتی ہے۔ صرف تاریکی کے تاروں کی خفیف سی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے اور ستارے زیادہ
روشن اور قریب معلوم ہوتے ہیں۔ پہاڑ خوفناک نظروں سے گھورتے ہیں اور انسان ایک
سا ذرہ بن کے مقابل کھڑا ہوتا ہے جس کی ہیبت دل میں بیٹھ جاتی ہے وہ بے سکونی کا ہم ساز
ہو کر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے "ان وسیع فضاؤں کی ابدی خاموشی سے مجھے ہول آتا ہے'
میدان میں راتوں کو اتنا سناٹا نہیں ہوتا، وہاں زندگی کی گس گس کا لوریاں سی پہنچتی رہتی ہے
اور مختلف جانوروں اور کیڑوں کی آوازیں رات کی خاموشی کو توڑتی رہتی ہیں

مگر جس وقت ہم ڈیرہ الموڑہ جانب چلے تھے رات کی سردی اور سناٹے بھری اس کی سمت
ڈرتی ہم منزل مقصود کے قریب پہنچے کہ راستے کے موڑ پر دو دیولوں کے یکایک پھٹ جانے
سے ایک نیا منظر سامنے آ گیا جسے دیکھ کر میں حواس اور حیرت سے دم بخود رہ گیا۔ پُرانا سما
پہاڑوں کی دیواروں سے اونچی بہت دور ہمالیہ کی برف آلود چوٹیاں سورج کی روشنی
میں چمک رہی تھیں۔ یہ ماضی کی حکمت و دانش کے وارث، ہندوستان کے وسیع میدانوں کے
زبردست محافظ کس قدر پُر وقار اور پُراسرار نظر آتے ہیں انہیں دیکھتے ہی قلب کا
ہیجان اور اضطراب دور ہو گیا اور ان کی شانِ ابدیت کے آگے میدانوں اور شہروں کی چھوٹی چھوٹی

سارشیں، دھنگوڑے سورج، دھوپ اور گرد و غبار یہ سب نظر آتے تھے۔

الموڑے کا چھوٹا سا جیل ایک اونچی سی پہاڑی پر تھا اس میں ایک شاندار بارک بھی
رہ گئے تھے ڈیوڑھی میں ایک بڑا سا ہال جو ستر فٹ لمبا اور پورے تیس فٹ چوڑا تھا اس کا فرش کچا
اور ناہموار تھا، چھت کو کیڑوں نے کھا لیا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹوٹ کر گرتے
رہتے تھے۔ اس میں بیس کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا یا یوں کہیے کہ دیواروں میں سوراخ تھے
جن میں سلاخیں لگی تھیں کواڑ کسی میں بھی نہ تھے غرض تازہ ہوا کی یہاں کمی نہ تھی جب سردی
زیادہ بڑھنے لگی تو ان کھڑکیوں پر موٹی چٹائی چڑھا دی گئیں۔ اس وسیع مکان میں (جو
وہ پورے جیل کے احاطے سے بڑا تھا) میں اکیلا بڑی شان سے رہا کرتا تھا۔ مگر سچ
پوچھئے تو میں بالکل تنہا بھی نہ تھا اس لئے کہ کم سے کم چالیس چڑیاں ٹوٹی ہوئی چھت
میں اپنے گھونسلے بنا سکے تھے کبھی کوئی سیلانی بادل آ نکلتا اور اس کے بہت سے ٹکڑے
دیوار کے روزنوں سے کمرے میں گھس آتے اور ساری فضا کو مرطوب کہر سے بھر دیتے۔

یہاں میں ساڑھے چار مہینے کاٹنے کے لئے تو میری آخری عدالتی بارک سے
منتقل کر دیا جاتا اور صبح سات بجے اس سلاخ دار دروازے کا قفل کھلتا دن کو میں
یا تو اسی بارک میں بیٹھا رہتا یا ایک احاطے میں جو اس سے متصل تھا ٹہل کر دھوپ کھایا کرتا احاطے
کی دیواروں کے اوپر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی کی چوٹی کی ذرا سی جھلک دکھائی دیتی
تھی اور سر پر آسمان کی نیلی چادر تنی رہتی ہے جس میں ہوائی بادل بکھرے نظر آتے تھے۔ یہ بادل
طرح طرح کے روپ بدلا کرتے تھے اور میں اس تماشے سے کبھی نہیں اکتاتا تھا تصور کی
مدد سے ان میں ہر قسم کے جانور، دیو کی شکلیں بن جاتی تھیں کبھی کبھی یہ بادل مل کر
ایک بحر مواج معلوم ہوتے تھے یا وہ ساحل بحر سے مشابہ نظر آتے تھے اور دیودار کے درختوں
میں ہوا کی سرسراہٹ پر یہ دھوکا ہوتا تھا کہ بہت فاصلے پر کہیں سمندر کی موجیں ساحل سے
ٹکرا رہی ہیں کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی بادل دور سے ٹھوس نظر آیا مگر پاس آ کر گھل جاتا اور ہمیں

ہر طرف سے گھیر لیتا

مجھے یہ بڑی سی مارکسہ تعمیری کوٹھری کے مقابلے میں پسند تھی مگر وہ اس میں تنہائی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا تھا جب باہر بارش ہوتی تھی اس وقت بھی میں اس میں ٹہل سکتا تھا مگر جوں جوں سردی بڑھتی گئی اس کی اداسی اور زیادہ نمایاں ہوتی گئی اور جب حرارت گھٹتے گھٹتے نقطۂ انجماد تک پہنچی تو میرا کھلے میدان اور تازہ ہوا کا شوق بھی کم ہو گیا نئے سال کے شروع میں خوب برف گری جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور جیل کے گرد و پیش کے لطف منظر میں بھی ایک لطف پیدا ہو گیا دیوار کے درخت جو جیل کے احاطے کے باہر تھے نہایت خوش نما معلوم ہوتے تھے جیسے برف کی پوشاک پہنے پریاں کھڑی ہوں

کملا کی صحت کو ایک حالت پر قرار، تھا اس لئے مجھے ہر وقت فکر رہا کرتی تھی بری خبر سن کر میں تھوڑی دیر کیلئے بدحواس ہو جاتا تھا مگر پہاڑ کی ہوا طبیعت میں سکون پیدا کرتی تھی اور مجھے پھر رات کو اچھی طرح نیند آنے لگی تھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ عین اس وقت جب آنکھ لگنے والی ہے میں سوچنے لگتا تھا کہ نیند بھی کس قدر عجیب و غریب اور پُر اسرار چیز ہے آخر آدمی سونے کے بعد جاگے ہی کیوں؟ کیا اچھا ہو اگر اب میں کبھی نہ جاگوں

ان دنوں مجھے رہائی کی آرزو اس شدت سے تھی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی بمبئی کی کانگریس ہو چکی تو سر آیا اور چلا گیا اسمبلی کے انتخابات کا جوش بھی ٹھنڈا ہو گیا مجھے خیال تھا کہ شاید اب میں چھوڑ دیا جاؤں

مگر خبر آئی تو یہ آئی کہ خان عبد الغفار خاں کو گرفتار کر کے سزا دے دی گئی اور سبھاش بوس پر ہندوستان کے مختصر قیام کے زمانے میں عجیب و غریب پابندیاں عائد کی گئیں یہ احکام محلے خود حشیانہ اور بیہودہ تھے اور پھر یہ اس شخص کے خلاف جاری کئے گئے تھے جسے ملک میں کروڑوں آدمی عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتے تھے اور خود اپنی بیماری کے باوجود اپنے باپ کے آخری دیدار کے لئے دوڑا آیا اور وقت پر نہ پہنچ سکا اگر حکومت کا یہی

رنگ تھا تو دی ہرے کو میری قبل از وقت رہائی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی ہنگے تیل کرکاری اطلاعات سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی

احمد نگر میں ایک مہینہ سے کچھ بعد میں کملا کو دیکھنے کے لئے بھوالی لے جایا گیا اس کے بعد ہر تیسرے ہفتے میں اس سے ملتا رہا دیرہ دون سرکوئیل موسے کئی بار یہ فرمایا کہ مجھے ہفتے میں ایک دو بار اپنی بیوی سے ملنے کی اجازت ہے اگر وہ مہینے میں ایک دو بار کہتے تو زیادہ صحیح ہوتا۔ الموڑے کے پچھلے ساڑھے تین مہینے کے قیام میں میں صرف پانچ بار اس سے ملنے پایا۔ میں یہ شکایت کے طور پر نہیں کہتا اسلئے کہ میرے خیال میں حکومت نے میرے ساتھ بڑی رعایت کی اور مجھے کملا سے ملنے کی غیر معمولی سہولتیں دیں۔ میں اس کا بہت شکرگذار ہوں یہ مختصر ملاقاتیں میرے لئے نعمت تھیں اور شاید کملا کے لئے بھی جس روز میں اس سے ملنے جاتا تھا ڈاکسٹر اپنے قواعد کی سختیاں کم کر دیتے تھے اور مجھے اس سے دیر تک باتیں کرنے کی اجازت تھی ہم ایک دوسرے سے روحانی حیثیت سے بہت قریب ہوگئے تھے اور مجھے اس سے چھوٹنا بہت شاق گذرتا تھا ہم ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھنے بھی نہیں پاتے تھے کہ جدائی کی گھڑی آ پہنچتی تھی اور کبھی کبھی میں یہ خیال کرکے تڑپ جاتا تھا کہ شاید ایک دن ہمیں ہمیشہ کے لئے جدا ہونا پڑے گا

میری والدہ علاج کے لئے بمبئی گئی تھیں کیونکہ انہیں ابھی تک صحت نہیں ہوئی تھی وہاں سے یہ اطلاعیں آرہی تھیں کہ انہیں فائدہ ہو رہا ہے مگر وسط جنوری میں ایک روز دفعتہ ایک تار پہنچا اس سے میں مضطرب ہو گیا معلوم ہوا کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا کہ میں بمبئی کے جیل میں بھیج دیا جاؤں تاکہ ان کے پاس رہ سکوں مگر حیرانی کہ ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی ہے اس لئے نہیں بھیجا گیا۔

موزرد کا یہ آگیا ہے ہوا میں بہار کی کیفیت محسوس ہونے لگی ہے۔

ملیں چمک رہی ہیں درختوں میں پُراسرار طریقے سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور اس
عجیب و غریب دنیا کو حیران ہو کر دیکھتی ہیں پہاڑیوں کے پہلو میں سرخ پھولوں سے
بھری جھاڑیاں دور سے خون کے دھبے معلوم ہوتی ہیں۔ آلوچے اور شفتالو کے شگوفے
کھلے ہوئے ہیں دن گذرتے جاتے ہیں اور میں ایک ایک گھڑی گن رہا ہوں کہ ہوائی
جاے کا وقت آئے خدا جانے یہ بات سچ ہے یا نہیں کہ مصیبت کے بعد راحت اور
جدائی کے بعد وصل کے دن آتے ہیں شاید ایسا نہ ہو تو ہم راحت کی قدر نہ کریں
کہتے ہیں کہ مصیبت انسان کے دماغ کو روشن کر دیتی ہے مگر حد سے زیادہ مصیبت
آئے تو وہ اور دھندلا ہو جاتا ہے جیل میں رہ کر مشاہدہ نفس کا بہت موقع ملتا ہے
اور لمبے دن قید رہنے سے مجھے اپنی نفسی زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے کی عادت ہو گئی
ہے میں خلقی طور پر داخل بیں نہیں ہوں مگر قید کی زندگی میں کچھوے یا گھونگے کی طرح
خاصیت ہے کہ وہ انسان کو داخل بیں بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات میں دل بہلانے
کے لئے پروفیسر ریک وڈگل کے کعب کا خاکہ کھینچتا ہوں جس سے داخل بینی اور
خارج بینی مانی جاتی ہے۔ میں اسے لنگر کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شکل
وزن تیری سے بار بار بدل رہی ہے۔

حال کے چند واقعات

"رات کے صبح ہوتی ہے مگر ہماری زندگی کے گئے ہوئے
دن واپس نہیں آتے آنکھ آنے والے زمانے کو دیکھتی ہے مگر
گذری ہوئی بہار کا داغ دل سے نہیں مٹتا"

(لی تائی پو)

مجھے جو اخبار پڑھنے کو ملتے تھے ان سے بمبئی کی کانگریس کا حال معلوم ہوا۔ مجھے قدرتی
طور پر کانگریس کی سیاست سے اور اس کے لیڈروں کی شخصیت سے دلچسپی تھی میں سال کے
گہرے تعلقات کی وجہ سے میں اس سے اس قدر وابستہ ہو گیا تھا کہ میری ذات اس میں محو ہو کر
رہ گئی تھی یہ تعلق کچھ اس عہدے کی وجہ سے نہ تھا جو مجھے اس میں حاصل تھا کسی روحانی
رشتوں نے مجھے اس عظیم الشان انجمن اور اپنے بے شمار پرانے رفیقوں سے جکڑ رکھا تھا پھر بھی
مجھے اس کی کارروائی پڑھ کر کچھ خوش نہیں آیا بہت سے اہم فیصلوں کے باوجود مجھے یہ
اجلاس پھیکا معلوم ہوا۔ جن چیزوں سے مجھے دلچسپی تھی ان کا اس میں ذکر تک نہیں آیا
میں سوچتا تھا کہ اگر میں وہاں ہوتا تو کیا کرتا میں خود یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ نئے حالات
کا اور اپنے ماحول کا مجھ پر کیا اثر پڑتا اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں جیل میں اس مشکل مسئلے میں
سر کھپاتا جبکہ میرے فیصلے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا میں نے اپنے دل میں کہا کہ جب وقت
آئے گا تو میں اس وقت کی صورت حال پر غور کر کے فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے اس
وقت کوئی فیصلہ کرنا چاہے وہ اپنے دل ہی میں کیوں نہ ہو محض حماقت تھی اس لئے

کہ ملنے والے واقعات کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک میں اتنی دور اپنے پہاڑی مسکن میں بیٹھ کر سمجھ سکتا تھا۔ اس جلسے کے دو نمایاں پہلو تھے ایک یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت جلسے پر چھائی ہوئی تھی دوسرے یہ کہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر اَنے نے ہار مانا۔ جیسے چھیڑے وہ بالکل نہیں چلنے پائے۔ جو لوگ ہندوستان کے عام لوگوں اور اوسط طبقوں کے حقیقی حالات سے واقف ہیں ان کے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ گاندھی جی کا اثر اب تک ہندوستان میں سب سے بڑھا ہوا ہے مگر سرکاری حکام اور بعض گوشہ نشین سیاست داں جو اپنی خواہش کو واقعہ سمجھ لیتے ہیں اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ گاندھی جی کا اثر سیاست کے میدان میں ختم ہو گیا ہے یا کم سے کم بہت گھٹ گیا ہے مگر جب یہ شخص پھر اسی قوت اور شان سے میدان میں آتا ہے۔ تو یہ حیرت میں رہ جاتے ہیں اور اس ظاہری تغیر کے اسباب تلاش کرنے لگتے ہیں گاندھی جی کا یہ اقتدار کانگریس میں کچھ تو ان کے خیالات کی بنا پر ہے جنہیں لوگ عام طور پر مانتے ہیں مگر اس سے بڑھ کر ان کی عجیب و غریب شخصیت کی وجہ سے شخصیت ہر جگہ اہمیت رکھتی ہے اور ہندوستان میں اس کی اہمیت اور سب ملکوں سے زیادہ ہے۔

ان کا کانگریس سے علیٰحدہ ہونا اس اجلاس کا سب سے اہم واقعہ تھا اور بظاہر اس سے کانگریس اور ہندوستان کی تاریخ کا ایک بڑا دور ختم ہو گیا۔ مگر اصل میں ان کا علیٰحدگی کا اعلان کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اس لئے کہ کانگریس میں جو ان کا اقتدار ہے اسے وہ چاہیں بھی تو نہیں چھوڑ سکتے اس کی بنا کسی عہدے پر یا کسی محسوس رتبے پر نہیں ہے کانگریس والوں کے خیالات آج بھی اسی طرح چھائے ہوئے ہیں جیسے پہلے تھے۔ اور اگر وہ گاندھی جی کی ساد سے الگ بھی ہو جاتے تب بھی غیر شعوری طور پر اس پر اور ملک بھر کا اثر باقی رہے گا۔ وہ اس ذمہ داری سے کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔

جب ہندوستان کے واقعی حالات پر نظر ڈالی جائے تو ان کی شخصیت سب سے نمایاں دکھائی دیتی ہے

اور اس سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کی جا سکتی

فی الحال وہ کانگریس سے الگ ہو گئے ہیں غالباً اس وجہ سے کہ وہ اُسے اُلجھن میں ڈالنا نہیں چاہتے شاید وہ کسی قسم کی انفرادی عملی جدوجہد شروع کرنا چاہتے ہیں جس میں حکومت سے جھگڑا ہونا لازمی ہے اور وہ نہ کہ کانگریس کا معاملہ نہیں بنانا چاہتے

مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ کانگریس نے ملک کے دستور کی تشکیل کے لئے ایک مجلس اساسی قائم کرنے کی تجویز منظور کی میرے خیال میں اس مسئلے کو حل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں اور کبھی نہ کبھی ایسی مجلس منعقد کرنی پڑے گی ظاہر ہے کہ اس کا انعقاد برطانوی حکومت کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا ہاں اگر ملک میں انقلاب ہو جائے تو اور بات ہے یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں حکومت اسے منظور نہیں کرے گی اس لئے ایسی جس کو حقیقی معنی میں اساسی مجلس کہی جا سکے اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک ملک میں اتنی قوت نہ پیدا ہو جائے کہ وہ حکومت کو اس پر مجبور کر دے اس کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی مسئلہ بھی اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا کانگریس کے بعض لیڈروں کی جو اساسی مجلس کے خیال سے اتفاق رکھتے ہیں یہ کوشش ہے کہ وہ اسے اعتدال کے سانچے میں ڈھال کر پرانی آل پارٹیز کانفرنس کے نمونے کی چیز بنا دیں۔ اس سے مطلق کوئی فائدہ نہیں ہوگا وہی پرانے لوگ جو زیادہ تر خود ہی اپنے آپ کو منتخب کر لیتے ہیں ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور آپس میں لڑیں گے اساسی مجلس کا اصل اصول یہ ہے کہ اسے عام لوگوں کی بڑی سے بڑی تعداد منتخب کرے اور اس میں جمہور کی قوت اور ان کی روح کام کرتی ہو ایسی مجلس فوراً حقیقی مسائل پر غور کرنا شروع کر دے گی اور وہ پہلے کی طرح فرقہ وارانہ قضیوں اور اس قسم کے اور جھگڑوں میں پھنس کر نہیں رہ جائے گی

اس تحریک کا سلسلہ اور لندن پر جو اثر ہوا اس کا مطالعہ بہت دلچسپ تھا نیم سرکاری طور پر کہا گیا کہ حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا یعنی بس لے مرحیا۔ اما سے

پسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ پرانی آل پارٹیز کانفرنس کی قسم کی چیز ہوگی جو یقیناً ناکامیاب رہے گی اور اسے تقویت پہنچائے گی۔ آگے چل کر اسے یہ احساس ہوا کہ اس میں شرکت خطرے میں ہے اور اس نے زور شور سے اس کی مخالفت شروع کر دی

مسٹر کانگریس کے تصفیہ کے ہی دن بعد اسمبلی کے انتخابات شروع ہو گئے گو مجھے کانگریس کے کونسل کے پروگرام سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی پھر بھی ان انتخابات سے بڑی دلچسپی تھی میں کانگریس کے امیدواروں کی فتح کو نہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کے حریفوں کی شکست کا متمنی تھا حریفوں کی یہ جماعت عہدوں کے طلبگاروں، ٹوڈیوں، تعلقہ داروں اور حکومت کے ترقی پسند حامیوں کا ایک عجیب معجون مرکب تھی یہ یقین تھا کہ ان میں سے اکثر لوگ مقابلے میں ہار جائیں گے مگر فرقہ وارانہ تصفیہ کی وجہ سے بڑی الجھن پیدا ہو گئی تھی اور ان میں سے بہتوں نے فرقہ وارانہ جماعتوں کے وسیع دامن میں پناہ لی تھی پھر بھی کانگریس کو جیت اور کامیابی ہوئی اور میں بہت خوش ہوا کہ بہت سے ناپسندیدہ اشخاص کونسلوں میں نہیں جانے پائے

سب سے زیادہ قابل افسوس نام نہاد کانگریس نیشنلسٹ پارٹی کا طرز عمل معلوم ہوتا تھا ان کا فرقہ وارانہ تصفیہ کی شدید مخالفت کرنا تو سمجھ میں آتا تھا مگر انہوں نے یہ غضب کیا کہ اس قوت کو بڑھانے کے لیے انتہائی فرقہ پرست جماعتوں سے دوستی کر لی یہاں تک کہ سناتن دھرمی پنڈتوں سے بھی جن سے زیادہ رجعت پسند سیاسی اور سماجی اعتبار سے ہندوستان میں کوئی جماعت نہیں ہے اور بہت سے سیاسی رجعت پسندوں سے جو سارے ملک میں بدنام ہیں سوائے بنگال کے جہاں بعض خاص وجوہ سے کانگریس کی ایک طاقتور جماعت ان کی مؤید تھی اور سب کہیں ان میں سے اکثر لوگ ہر طرح کانگریس کے مخالف تھے بلکہ سچ پوچھیے تو یہی لوگ کانگریس کے سب سے بڑے حریف تھے باوجود ان مختلف قوتوں کی مخالفتوں کے جن میں زمیندار، لبرل اور سرکاری ملازم شامل تھے کانگریس کے امیدواروں کو بہت بڑی کامیابی ہوئی

فرقہ وارانہ تصفیہ کے معاملے میں کانگریس کا رویہ عجیب و غریب تھا مگر موجودہ حالات

میں کوئی صورت ادہی ۔ تھی۔ یہ اس کی پچھلی غیر جواب دارانہ اور کمزور پالیسی کا لازمی نتیجہ تھا
اگر وہ شروع سے ایک مضبوط پالیسی اختیار کرتی اور فوری نتائج کو نظر انداز کر کے اس پر
قائم رہتی تو اس کی پوزیشن زیادہ باوقار اور صحیح ہوتی مگر چونکہ اس نے ایسا نہیں کیا اس لئے
اس کے سامنے وہی ایک راہ تھی جو اس نے اختیار کی جا رہے کہ فرقہ وارانہ تصفیہ نہایت
بیہودہ اور ناقابل قبول ہے کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے ہندوستان کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی
میں یہاں دیے ہیں کہتا کہ اس سے مسلمانوں کو بہت زیادہ حقوق مل گئے۔ غالباً یہ ممکن تھا
کہ دوسرے طریقے سے ان کے سارے مطالبات پورے کر دیئے جاتے موجودہ صورت میں برطانوی
حکومت نے ہندوستان کو بہت سے الگ الگ حلقوں میں تقسیم کر دیا تاکہ وہ ایک
دوسرے کی قوت کو بیکار کر دیں اور غیر ملکی برطانوی عنصر غالب رہے اس طرح سے تو
ہندوستان ہمیشہ برطانوی حکومت کا محتاج رہے گا

خصوصاً بنگال میں جہاں مٹھی بھر یورپین جماعت کو صحیح تناسب سے کہیں زیادہ
حقوق دیئے گئے ہیں ہندوؤں کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی۔ یہ تصفیہ یا فیصلہ یا اسے جو کچھ
بھی کہا جائے (اسے تصفیہ کہنے پر بعض لوگوں کو اعتراض ہے) بہت سے لوگوں کو سخت ناگوار
ہے چاہے یہ زبردستی نافذ کر دیا جائے اور سیاسی وجوہ سے لوگ اسے عارضی طور پر برداشت
بھی کر لیں مگر اس کی وجہ سے ہمیشہ فساد کی وجہ قائم رہے گی میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس کا
برا ہونا بہت اچھا ہے کیونکہ برائی کی وجہ سے یہ مستقل طور پر قائم نہیں رہ سکتا۔

نیشنلسٹ پارٹی کو اور اس سے بھی بڑھ کر ہندو سبھا اور دوسری فرقہ پرست انجمنوں
کو یہ مداخلت قدرتی طور پر ناگوار ہوئی مگر ان کے اور ان کے حامیوں کے اعتراضات
کی بنا اصل میں یہ تھی کہ وہ برطانوی حکومت کے خیالات سے متاثر تھے اس کی وجہ سے
انہوں نے ایک عجیب پالیسی اختیار کی اور کر رہے ہیں جس سے حکومت بہت خوش ہو گی
فرقہ وارانہ تصفیہ ان کے دماغ پر مسلط ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسرے اہم معاملات

کہ حکومت اور قوم پرور جماعت دونوں سے اچھے تعلقات قائم رکھیں ۔ و لال ارتقا پرست
جماعت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ان کا مقصد صرف صنعتی ترقی اور نفع حاصل کرنا ہے
مسلمانوں کے بیچ اوسط طبقے میں ابھی تک سیاسی بیداری پیدا نہیں ہوئی ہے اور
صنعت میں بھی وہ پیچھے ہیں ۔ اس لئے صرف ان کی اکثریت رجعت پسند جاگیرداری
رنگ میں ڈوبے ہوئے لوگ اور سارے سرکاری ملازم حاوی ہیں بلکہ پوری جماعت پر ان کا
اچھا خاصا اثر ہے مسلم کانفرنس میں خطاب یافتوں سابق وزیروں اور بڑے زمینداروں کا
جمگھٹ نظر آتا ہے مگر بھی میرے خیال میں عام مسلمان عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے
ہیں اس لئے کہ ان کے معاشرتی نظام میں ایک حد تک برابری کی حالت ہے اور اگر ان میں
ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے گی تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ میں زیادہ تیزی سے قدم بڑھائیں گے
بالفعل تعلیم یافتہ مسلمانوں پر ذہنی اور جسمانی حیثیت سے ایک جمود سا چھایا ہوا ہے اور ان میں
حرکت کا نام نہیں وہ ایسے سربرآوردوں کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر سکتے ۔

کانگریس سیاسی اعتبار سے سب سے آگے ہے اور سب سے بڑی جماعت ہے مگر اس
کے لیڈر بھی اس سے کہیں زیادہ احتیاط کرتے ہیں جتنی عام لوگوں کی حالت کو دیکھتے ہوئے
کرنی چاہئیے وہ عام لوگوں سے مدد تو چاہتے ہیں مگر یہ بہت کم کرتے ہیں کہ ان سے کسی بات میں
رائے لیں ان کی مصیبتوں کا سبب معلوم کریں ۔ اسمبلی کے انتخابات سے پہلے انہوں نے
پروگرام کو معتدل بنانے کی انتہائی کوشش کی تاکہ اعتدال پسند غیر کانگریسی جماعتوں کی مدد حاصل
کرسکیں یہاں تک کہ مزدوروں کے واسطے کے مسودہ قانونوں میں بھی ان کے مددیے بیان حائل
تھا اور ان میں سے بعض نے مدراس کے کٹر ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لئے انہیں بہت کچھ
اطمینان دلایا اگر وہ ایک سیدھا سچا جارحانہ اقتصادی پروگرام پیش کرتے تو لوگوں میں زیادہ
جوش ہوتا اور انہیں اچھی سیاسی تربیت حاصل ہوتی مگر موجودہ پروگرام کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ان
جماعتوں کو سیاسی اور سماجی حیثیت سے رجعت پسند بنے رہنے کی اور زیادہ کوشش

کی جائے گی تاکہ کسی موقع پر ان کے حدود شہادت حاصل ہو سکیں اور اس سے کانگریس کے لیڈروں اور عام لوگوں میں اور زیادہ یگانگی پیدا ہو گی۔ دھواں دھار تقریریں کی جائیں گی، پارلیمنٹ کے آداب کی پوری پوری پابندی ہو گی اور کبھی کبھی حکومت کو شکست ہو جایا کرے گی جسے وہ پہلے کی طرح بے پروائی سے نظرانداز کر دے گی۔

پچھلے چند سال میں جب کانگریس کونسلوں کا بائیکاٹ کر رہی تھی اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ اسمبلی اور صوبوں کی کونسلیں جمہور کی حقیقی نمائندہ اور رائے عامہ کا آئینہ ہیں ایسا لطف رکھتے کہ جب قومی جماعت اسمبلی پر حاوی ہو گئی تو حکومت کا نقطۂ نظر بدل گیا جب کبھی انتخابات میں کانگریس کی کامیابی کا ذکر آتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ انتخاب کنندوں کا حلقہ بہت محدود ہے تین پینتیس کروڑ کی آبادی میں صرف تیس لاکھ آدمی رائے دہندگی کا حق رکھتے ہیں گویا سرکاری نقطۂ نظر سے جو آدمی حق رائے دہندگی سے محروم ہیں وہ سب کے سب حکومت برطانیہ کے حامی ہیں اس کا علاج تو کھلا ہوا ہے کل بالغوں کو حق دے دیجئے تو آپ ہی معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں کی کیا رائے ہے۔

اسمبلی کے انتخابات کے تھوڑے ہی دن بعد اس مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ شائع ہو گئی جو ہندوستان کے دستور اساسی کی اصلاح کے لئے مقرر ہوئی تھی اس رپورٹ پر طرح طرح کے اعتراضات ہوئے جن میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ہندوستانیوں کی طرف سے "بے اعتمادی" اور "شبہات" رکھتی ہے مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ لوگ ہمارے قومی اور سماجی معاملات کو عجیب و غریب نظر سے دیکھتے ہیں آخر برطانوی سامراجی پالیسی اور ہمارے قومی اغراض میں بنیادی اختلاف ہے یا نہیں؟ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو مقدم سمجھیں کیا ہم آزادی اس لئے چاہتے ہیں کہ اس سامراج کی پالیسی کو قائم رکھیں؟ برطانوی حکومت کا تو عملی طور پر یہی خیال ہے اس لئے کہ ہم سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ "تحفظات" سے اس وقت تک کام نہیں لیا جائے گا جب تک ہم کوئی

ظاہر ہے کہ یہ صحافتی رائیں اس حد سے نہیں ہیں کہ کینیڈا اور آسٹریلیا کو برطانیہ سے
کسی قسم کی برصاحت ہو البتہ ہندوستان کو ضرور اس سے کد ہے کیونکہ ان اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ
دونوں میں تصادم ہوتا ہے اور ہندوستان کے تحفظات کا مقصد یہی ہے کہ جب کبھی تصادم ہو تو
برطانیہ کی اغراض مقدم رکھی جائیں حال میں ہندوستان اور برطانیہ میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا
ہے اس میں ہندوستان کے تاجروں یا مالکان صنعت سے رائے نہیں لی گئی اور جیسے ہی
رہے البتہ برطانیہ کے مالکان صنعت سے برابر مشورہ ہوتا رہا اسمبلی نے اس معاہدے کو مسترد
کر دیا مگر حکومت سیاسی راز ہی اس سے کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے کہ "تحفظات کا" کیا
نتیجہ ہوگا اس قسم کے تحفظات کی کینیڈا، آسٹریلیا، اور جنوبی افریقہ میں بڑی ضرورت ہے
تاکہ ان نوآبادیوں کے لوگ صرف تجارتی معاملات میں بلکہ دوسرے کاموں میں بھی جو سلطنت
کی حفاظت اور مضبوطی کے لئے ان سے ہوں اہم میں راہ راست سے بھٹکنے نہ پائیں [1]
کہا جاتا ہے کہ سلطنت برطانیہ اور "تحفظات" اس غرض سے صحیح کئے گئے ہیں
کہ سلطنت کا مہاجن بدستور قرض دار کا گلا دبائے رہے اور اپنی اغراض اور قوت کی

---

[1] مسٹر ڈاؤ ہیڈ، ممبر وزارت جنوبی افریقہ نے بیان کیا کہ ان کا ملک سلطنت کی عام حفاظت کی
کسی اسکیم میں شریک نہیں ہوگا اور نہ سمندر پار کی کسی لڑائی میں شرکت کرے گا خواہ برطانیہ
ہی سے کیوں نہ ہو اگر حکومت نے ناعاقبت اندیشی سے جنوبی افریقہ کو سمندر پار کی لڑائی میں پھنسا دیا
تو عام بد امنی پھیل جائے گی اور عجب نہیں کہ خانہ جنگی کی نوبت آ جائے اس لئے حکومت سلطنت کی
عام حفاظت کی کسی اسکیم میں شریک نہیں کرے گی۔"
(رائٹر کی خبر ۵ فروری ۱۹۳۵ء کو کیپ ٹاؤن سے بھیجی گئی)
وزیر اعظم جنرل ہرٹزوگ نے اس بیان کی تصدیق کی اور کہا کہ یہ حکومت کی
پالیسی کو ظاہر کرتا ہے۔

حفاظت کرتا رہے۔ ایک دوسری حیثیت سے یہ نظریہ جو سرکاری طور پر اکثر پیش کیا جاتا ہے یہ ہے کہ گاندھی جی اور کانگریس نے اس تحفظات کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے اس لئے کہ ۱۹۳۱ء کے معاہدہ دہلی کی رو سے وہ "ایسے تحفظات جو ہندوستان کے لئے مفید ہوں" قبول کر چکے ہیں۔

اور گاندھی ارون معاہدہ اور برطانوی تحفظات تو بس چھوٹی چیزیں ہیں[1] ان سے کہیں زیادہ اہم وہ ترمیمیں ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ کا سیاسی اور معاشی تسلط ہندوستان پر قائم رہے جس سے پہلے انہیں جس طرح لوٹا جاتا تھا اب بھی لوٹ رہا ہے۔ جب تک یہ ترمیمیں اور "تحفظات" باقی ہیں کسی قسم کی حقیقی ترقی ہو سکتی ہے اور نہ آئینی طریقوں سے کوئی تغیر ممکن ہے جو کوشش بھی آئینی طریقے سے کی جائے گی اس کی راہ میں "تحفظات" کی دیوار حائل ہوگی اور یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ صرف ایک راہ کھلی ہوئی ہے اور وہ غیر آئینی راہ ہے سیاسی تعمیر کے نقطہ نظر سے یہ مجوزہ دستور اور اس کا تحت الحلقت وفاق بالکل مہمل چیز ہے اور سماجی اور معاشی نقطہ نظر سے اور بھی بدتر ہے اشتراکیت کا راستہ خاص طور پر بند کر دیا گیا ہے بظاہر بہت سے اختیارات منتقل کئے گئے ہیں (دیکھی زیادہ ان شقوں کو جن سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے) اگر کوئی مفید کام کرنے کا اختیار اور وسائل نہیں دئے گئے اختیار برطانیہ کے ہاتھ میں ہے اور ذمہ داری ہندوستانیوں پر اسعداد کی سنگینی کو چھپانے کے لئے دستور کے مطابق الحکم کا پتہ تک بھی نہیں ہے ہر محقق جانتا ہے کہ آج کل ملکوں کے دستور اساسی میں بہت زیادہ لوچ ہونا چاہئے تاکہ وہ تیزی سے بدلتی ہوئی حالت کے مطابق بدلا جا سکے اس کی تعمیل کرے اور اس فیصلے

---

[1] لندن اکانومسٹ" (۱۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء) نے صاف کر دیا ہے "معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ سے برطانوی حکومت کی برکات میں ایک ستم اضافہ یہ بھی ہو جائے گا کہ ہندوستان کے بہت سے حصوں کے باشندے اس پر مجبور کئے جائیں گے کہ وہ زیادہ قیمت دے کر لنکاشائر کا مال خریدیں" اس کی سب سے نمایاں مثال سٹیل ہے۔

ہو سکیں لیکن کبھی نہیں بھولیں گے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ لیبر پارٹی سے الگ ہو گئے تو کیا ہوا ان کے
پرانے ساتھیوں کا ڈھنگ تو وہی ہے۔ جس لیبر پارٹی کی جو کانفرنس اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ساؤتھ پورٹ
میں ہوئی تھی وہاں مسٹر ڈک کرسامیس نے ایک ریزولیوشن پیش کیا جس میں اس کی اشد
ضرورت ظاہر کی گئی تھی کہ قوموں کو اپنا طرز حکومت آپ انتخاب کرنے کا جو حق حاصل ہے اس کے
مطابق ہندوستان میں فوراً کامل حکومت خود اختیاری قائم کر دی جائے۔ مسٹر آرتھر ہنڈرسن نے
اس پر زور دیا کہ یہ ریزولیوشن واپس لے لیا جائے اور مجلس منتظمہ کی طرف سے یہ وعدہ کرنے سے
انکار کیا کہ وہ ہندوستان کو حق حکومت کی آزادی دینے کی پالیسی پر عمل کرے گی۔ انھوں نے
فرمایا "ہم صاف صاف کہہ چکے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہوگا ہم ہندوستانی قوم کے ہر فریق سے
رائے لیں گے۔ اس سے ہر ایک کا اطمینان ہو جانا چاہئے۔" یہ اطمینان شاید اس وجہ سے کم ہو جائے
کہ پچھلی لیبر حکومت نے بھی ٹھیک ٹھیک اسی پالیسی کا اعلان کیا تھا اور گول میز کانفرنس
وہ جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ اور انڈیا ایکٹ اسی کا نتیجہ ہے۔ یہ بات بالکل صاف ہو کہ
سلطنت کی بیرونی پالیسی کے معاملے میں انگلستان میں ٹوری ہوں یا لیبر پارٹی والے ایک
سے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لیبر پارٹی کے عام ممبر زیادہ آزاد خیال ہیں مگر ان کا اثر ایسے
قدامت پسند لیڈروں پر بہت کم ہے۔ ممکن ہے کہ لیبر پارٹی میں انتہا پسند فریق زیادہ قوی ہو جائے
کیونکہ آج کل حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں لیکن کیا قومی اور سماجی تحریکیں دوسرے
ملکوں کے موہوم تغیرات کے آسرے میں پڑ کر سو جایا کرتی ہیں؟

ہمارے یہاں کی لبرل جماعت کا رویہ لیبر پارٹی کے بھروسے پر رہا۔ ایک لحاظ سے
غنیمت ہے۔ اگر کوئی ان سے پوچھے کہ اگر یہ پارٹی اب انتہا پسند فریق کی طرف جھک گئی اور
اس نے انگلستان میں اپنا ترقی کا پروگرام جاری کر دیا تو پھر آپ اور ہندوستان کے
دوسرے اعتدال پسند کیا کریں گے؟ ان میں سے اکثر حضرات اجتماعی مسائل میں بڑے
کے قدامت پسند ہیں وہ ان اجتماعی اور معاشی تغیرات کو جو لیبر پارٹی نے انگلستان میں کئے

ہیں ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں ان کے آزاد ہونے سے ڈرتے ہیں ممکن ہے کہ جب
برطانیہ سے تعلق رکھنا اجتماعی حالات میں انحطاط کی علامت سمجھا جائے تو ان حضرات کو
برطانوی تعلق کا شعور ہو رہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے جیسے لوگ جو کامل آزادی اور برطانیہ
سے قطع تعلق چاہتے ہیں اس وقت اپنی رائے بدل دیں اور ایک آزاد برطانیہ سے گہرے
تعلقات رکھنے کو ترجیح دیں ظاہر ہے کہ ہم میں سے کسی کو برطانوی قوم سے اتحاد عمل کرنے پر
اعتراض نہیں ہے مگر تو اس کی شہنشاہی کی پالیسی کے مخالف ہیں اور حقیقت وہ اس کو چھوڑ دے
گی تو اتحاد عمل کی راہ خود بخود کھل جائے گی اس وقت غالباً بعض حضرات کا کیا رنگ ہوگا؟
غالباً وہ اسے بھی ہندوستان کی ناقابل فہم حکمت پر محمول کریں گے۔

گول میز کانفرنس در وہاں کی تحریر کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ ہندوستانی ریاستیں
نمایاں بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہیں رحمت مجوزہ فیڈریشن کی جو صورت ان کے حق میں ہے اور
انھیں جو آزادی ملی ہے اس نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اس سے پہلے کبھی
ان ریاستوں کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی پہلے ان کی یہ مجال نہ تھی کہ جس بات کا اشارہ
ریذیڈنٹ کی طرف سے ہو اس سے انکار کر سکیں۔ حکومت ہند ان حضرات کے ساتھ حلم کا
برتاؤ کا مظاہرہ کرتی تھی مگر ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی جاتی تھی اور بعض
اوقات یہ مداخلت ناگوار بھی ہوتی تھی۔ آج بھی بہت سی ریاستوں میں بلا واسطہ یا
بالواسطہ برطانوی افسروں کی حکومت ہے جن کی خدمات انھیں مستعار دی گئی ہیں۔ مگر
مسٹر چرچل اور لارڈ ریڈنگ کی جد و جہد سے حکومت ہند کچھ رک گئی ہے اور ان کے معاملات
میں دخل دینے میں بہت احتیاط کرتی ہے اور یہ لوگ بھی دلیر ہو گئے ہیں۔

میں نے ہندوستان کی سیاست کے بنیادی معاملات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے مگر
مجھے ان میں کوئی حقیقت نظر نہیں آئی میں تو اس چیز کو دیکھ کر گھبراتا ہوں جو ان کی تہ میں
اور وہ یہ ہے کہ ہر قسم کی آزادی سلب کی جا رہی ہے۔ شدت درد تکلیف کا بار از کم ہو تو کیا

ہر سمجھدار آدمی جانتا ہے کہ آج کل دنیا سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے بعض لوگوں کو
موجودہ حالات سے بیزاری کا مبہم اور بعض کو واضح احساس ہے مگر ہیں سب تذبذب سے بیزار۔
ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے تغیرات ہو رہے ہیں بلکہ مستقل ہو رہے ہیں اور وہ کوئی شکل بھی اختیار
کریں اب یہ اتنی دور کی چیز نہیں جو صرف فلسفیوں، مؤرخوں اور جماعتیوں کے ذہن میں محض
نظری دلچسپی پیدا کرتا ہو یہ ایسا مسئلہ ہے جو ہر شخص کی زندگی کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتا ہے
اور ہر شہری کا فرض ہے کہ ان قوتوں کو جو دنیا میں کارفرما ہیں اچھی طرح سمجھے اور اپنے طرز عمل
کے متعلق فیصلہ کرے کہ پرانی دنیا ختم ہو رہی ہے اور نئی دنیا بن رہی ہے کسی مسئلے کو حل
کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ پہلے آدمی اس مسئلہ کو سمجھ لے بلکہ اس کا سمجھنا بجائے خود
اسی قدر اہم ہے جتنا اس کا حل کرنا۔

بدقسمتی سے ہمارے سیاست داں واقعات عالم سے حیرت انگیز طور پر ناواقف
بنے ہوئے ہیں حالانکہ یہی ناواقفیت ہندوستان کے اکثر سرکاری ملازموں میں بھی پائی جاتی ہے
اس لئے کہ سول سروس والے اپنی علیحدہ اور محدود دنیا میں مگن رہتے ہیں صرف بڑے بڑے
حکام ان مسائل پر غور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت واقعات عالم کو پیش نظر
رکھنے پر مجبور ہے تاکہ ان کے لحاظ سے اپنی پالیسی کی تشکیل کرے سمجھا جاتا ہے کہ برطانیہ کی
خارجی پالیسی پر اس خبر کا بڑا اثر ہے کہ وہ ہندوستان پر قابض ہے اور اس کی حفاظت
کرنا چاہتا ہے مگر کتنے ہندوستانی سیاست داں اس پر غور کرتے ہیں کہ جاپانی شہنشاہی
یا سوویٹ کی بڑھتی ہوئی قوت نے ایشیا میں انگریزوں، روسیوں اور جاپانیوں کی
سیاستیں ہندوستان کی سیاست سے گہرا تعلق رکھتی ہیں وسط ایشیا کے حالات کا اثر صرف
فوری طور پر پڑ رہا ہے اور وہ برطانیہ کی پالیسی اور مدافعت کا مرکز بن گیا ہے۔

ان سے بھی زیادہ اہم وہ معاشی تغیرات ہیں جو بڑی تیزی سے ساری دنیا میں رونما
ہو رہے ہیں ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ انیسویں صدی کا نظام ختم ہو گیا اور

وہ آج کل کی مروجہ قوتوں کو لیے انہیں کر سکتا تھا ان دنوں کا وہ اصول جو ہندوستان میں بہت رائج ہے کہ ہر بات کی نظیریں ڈھونڈی جاتی ہیں، وہاں کیا کام دے سکتا ہے جہاں سرے سے کوئی نظیر موجود نہ ہو ہم تیرے کو پٹڑی پر چلا کر اسے ریل نہیں کہہ سکتے اسے تو صورہ جبیر سمجھ کر الگ ہی کرنا پڑے گا روس کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی "نئے معاشی انتظامات" اور عظیم الشان تعمیرات کا چرچا ہے پریسیڈنٹ روزویلٹ نے جو یقیناً سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنا اور تقویت پہنچانا چاہتے ہیں نہایت بہادری کے ساتھ بڑی بڑی اسکیمیں جاری کی ہیں جن سے ممکن ہے کہ امریکا کی ساری زندگی بدل جائے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ "جن لوگوں کو حد سے زیادہ حقوق حاصل ہیں ان سے وہ چھین لئے جائیں گے اور جنہیں حد سے کم حقوق ملے ہیں انہیں اور دے جائیں گے" ممکن ہے کہ وہ کامیاب ہوں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہمت رکھتے ہیں اور اپنے ملک کو پامال رستوں سے نکال کر نئی راہ پر چلانا چاہتے ہیں وہ اپنی پالیسی کو بدلنے یا اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے سے نہیں ڈرتے۔ انگلستان میں مسٹر لائڈ جارج نے ایک "نئے معاشی انتظام" کی تجویز پیش کی ہے ہندوستان میں بھی ایسے بہت سے نئے انتظامات کی ضرورت ہے یہ پرانا مقولہ کہ "جو کچھ جانا تھا وہ جانا جا چکا اور جو کچھ کرنا تھا وہ کیا جا چکا" مہمل بھی ہے اور خطرناک بھی۔

ہمیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا ہے اور اس کے لئے جرأت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اگر موجودہ اجتماعی اور معاشی نظام عام لوگوں کی حالت کو درست نہیں کر سکتا تو کیا اسے باقی رہنے کا حق ہے؟ کیا کسی اور نظام سے عام فلاح کی امید ہو سکتی ہے؟ محض سیاسی تغیر سے کہاں تک بنیادی اصلاح اور ترقی ممکن ہے؟ اگر مستقل حقوق رکھنے والوں کی اغراض نہایت مفید تعمیر کی راہ میں حائل ہوں تو کیا عقل اور اخلاق کا یہ تقاضا ہے کہ ان اغراض کو نہ چھیڑا جائے اور عام لوگوں کو بدستور افلاس اور مصیبت میں رہنے دیا جائے؟ ظاہر ہے کہ اصل مقصد ان حضرات کو نقصان پہنچانا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو نقصان

سے بڑی جماعت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتی ہے۔

مختلف اغراض میں تصادم ہوتا ناگزیر ہے۔ مصالحت کی کوئی صورت سب ہم میں سے ہر شخص کو سعید کرنے کا کہ ہم ادھر یا ادھر۔ مگر فیصلہ کرنے سے پہلے مسئلے کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اشتراکیت کو مقبول بنانے کے لئے محض جذباتی اثر ڈالنا کافی نہیں اس کے ساتھ ذہنی اور عقلی اثرات بھی ہونے چاہئیں جو واقعات اور دلائل پر مبنی ہوں مغرب میں اس قسم کی بہت سی کتابیں موجود ہیں مگر ہندوستان میں ان کی بڑی کمی ہے اور بہت سی اچھی کتابیں یہاں داخل نہیں ہونے پاتیں مگر دوسرے ملکوں کی کتابیں پڑھنا کافی نہیں اگر ہندوستان میں اشتراکیت قائم ہوئی ہے تو وہ یہیں کے حالات کے مطابق نشوونما پائے گی۔

اس لئے ان حالات کا مطالعہ کرنا نہایت اہم ہے ہمیں ماہرین فن کی ضرورت ہے جو مطالعہ کر کے مفصل تجویزیں پیش کریں۔ بدقسمتی سے ہمارے ماہرین فن سرکار کے یا نیم سرکاری یونیورسٹیوں کے ملازم ہیں اور وہ اس راہ میں قدم بڑھاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اشتراکیت کے لئے دیہی معیار کافی نہیں مگر یہ بھی یقینی ہے کہ اس معیار کے بغیر ہم معاملات پر پورا قابو حاصل نہیں کر سکتے۔ کوئی قومی تحریک نہیں چلا سکتے اس وقت زراعتی مسئلہ ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ صنعت بھی اس سے کچھ کم نہیں اور یہ روز بروز بڑھ رہی ہے سوال یہ ہے کہ ہم کس قسم کی ریاست چاہتے ہیں کسان ریاست یا صنعتی ریاست؟ ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں غالب رنگ کاشتکاری کا ہوگا مگر میرے خیال میں اس کے ساتھ ساتھ صنعت کو ترقی دینا بھی ممکن ہے۔

ہماری صنعت کے محدود گنے چنے خوش حال لوگ جو سرمایہ دار کہلاتے ہیں وہ دوسرے سرمایہ داروں سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ عام لوگ اس قدر مفلس ہیں کہ یہ حضرات اس سے مطلق توجہ نہیں کرتے کہ وہ آگے چل کر صنعتی پیداوار کے خریدار ہوں گے اس لئے وہ مزدوروں کی اجرت بڑھانے یا کام کا وقت کم کرنے کی تجاویز کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں حال میں

پارچہ بافی کے کارخانوں میں کام کا وقت دس گھنٹے کے بجائے نو گھنٹے کر دیا گیا۔ اس پر احمد آباد کے کارخانہ داروں نے مزدوروں کی اُجرت یہاں تک کہ ٹھیکے کے کام کی اُجرت بھی کم کر دی یعنی کام کا وقت کم ہونے سے بیچارے مزدوروں کی آمدنی کم ہو گئی اور ان کا سلیقہ زندگی اور بھی گھٹ گیا۔ صنعت کی عقلی تنظیم بڑھ رہی ہے جس سے مزدور پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے اور وہ زیادہ تھکتا ہے مگر اس کی اجرت میں اس تناسب سے اضافہ نہیں ہوا۔ ہمارا ارباب صنعت کا عمل وہ ہے جو یورپ میں انیسویں صدی کے آغاز میں تھا۔ انہیں جتنا زیادہ منافع ملتا ہے جو سب لوٹ کھاتے ہیں مگر مزدور یہی سوچتے رہتے ہیں جب مندا ہوتا ہے تو مالک مستعد ہو جاتے ہیں کہ اُجرت کم کئے بغیر کام نہیں چل سکتا انہیں نہ صرف ریاست مدد دیتی ہے بلکہ ہمارے اوسط طبقے کے سیاست داں بھی۔

احمد آباد کے پارچہ باف مزدوروں کی حالت پھر بھی غنیمت ہے۔ بمبئی وغیرہ میں تو بہت بُرا حال ہے اور بنگال کے جوٹ کے یا کانپور کے مزدور ان سے بھی گئے گذرے ہیں سب سے پست درجہ چھوٹی چھوٹی غیر منظم صنعتوں میں کام کرنے والوں کا ہے اگر کوئی جوٹ اور پارچہ بافی کے کارخانوں کے کروڑپتی مالکوں کے محلوں اور ان کی شان و شوکت کا مقابلہ ان جھونپڑیوں سے کرے جن میں ان کارخانوں کے نیم برہنہ مزدور رہتے ہیں تو اسے بڑی عبرت اور بصیرت حاصل ہو مگر ہم اس تضاد کے منظر کو معمولی چیز سمجھ کر اس سے گذر جاتے ہیں اور مطلق متاثر نہیں ہوتے۔

صنعتی مزدوروں کی یہ گئی گذری حالت آمدنی کے لحاظ سے کسانوں کی حالت سے پھر بھی بہتر ہے مگر کسان کو ایک فائدہ ہے وہ کھلی ہوا میں رہا کرتا ہے اور شہر کے غریب مزدوروں کی ذلت سے محفوظ رہتا ہے مگر وہ اس قدر گر گیا ہے کہ اسے کھلے ہوا اور گاؤں کو بقول گاندھی جی کے "گھورا" بنا دیتا ہے اس میں اتحاد عمل یعنی مل جل کر سب کے فائدے کے لئے کام کرنے کا مادہ بالکل نہیں ہے آپ اس الزام میں بُرا بھلا کہیں

معلوم ہوتی ہے یہ ایک دوسرا سوال ہے کہ یہ صورت جس میں سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے ممکن بھی ہے یا نہیں۔

ظاہر ہے کہ قومی اشتراکیت کی تائید اصل میں اوسط طبقے کے نوجوانوں کی طرف سے ہوگی ہندوستان میں بالفعل انقلاب پسند مزدور کسان نہیں بلکہ اوسط طبقے ہی کے بعض لوگ ہیں اگرچہ آگے چل کر کارخانوں کے مزدور یقیناً ان سے کہیں زیادہ انقلاب پسند ہو جائیں گے قومیت پسند اوسط طبقے فاشزم کے خیالات پھیلنے کے لئے بہت عمدہ میدان ہے۔ مگر فاشزم مغربی معنوں میں یہاں اس وقت تک نہیں پھیل سکتا جب تک بیرونی حکومت موجود ہے ہندوستان میں فاشزم یا قومی اشتراکیت یقیناً اپنے ملک کی آزادی کی حامی ہوگی اور وہ کسی طرح برطانوی حکومت کا ساتھ نہیں دے سکتی، اُسے جمہور سے مدد لینی پڑے گی۔ اگر برطانوی قبضہ بالکل ہٹ جائے تو غالباً قومی اشتراکیت ادنےٰ اوسط طبقے اور دوسرے مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کی مدد سے بہت جلد پھیل جائے گی۔

مگر برطانیہ کا قبضہ اس قدر جلد ہٹنے والا نہیں اور اس اثنا میں حکومت کی انتہائی کوششوں کے باوجود اشتمالیت اور اشتراکیت کے خیالات بھی پھیل رہے ہیں اشتمالی پارٹی ہندوستان میں خلاف قانون قرار دے دی گئی ہے اور اس میں اشتمالیت کے ہمدرد اور انتہا پسند لیبر پروگرام رکھنے والی مزدوروں کی انجمنیں بھی سمیٹ لی جاتی ہیں۔

قومی اشتراکیت اور اشتمالیت میں سے میری ہمدردی سراسر اشتمالیت کے حق میں ہے جیسا کہ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو گیا ہوگا میں خود اشتمالی نہیں ہوں میرے خیالات کی جڑیں شاید اب بھی ایک حد تک انیسویں صدی میں پیوست ہیں اور مجھ پر "تہذیب انسانیت" کی تعلیم کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ میں اس سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا اوسط طبقے کے شہریوں کی ذہنیت میرا پیچھا نہیں چھوڑتی اور قدرتی طور پر بہت سے اشتمالی اس سے خائف ہیں میں اوہامی عقائد کو پسند نہیں کرتا اس لئے مجھے یہ چیز جو اشتمالیوں کی حصہ نصیب ہو

ناپسند ہے کہ کارل مارکس کی تصانیف اور کتابیں وحی آسمانی سمجھی جائیں جن میں چون وچرا کی گنجائش نہیں اور فرقہ بندی کر کے منکروں کے خلاف جہاد کیا جائے اسی طرح روس کی بہت سی کارروائیاں خصوصاً امن کے زمانے میں تشدد سے کام لینا مجھے سخت ناپسند ہیں ان سب باتوں کے باوجود اشتمالی فلسفے کی طرف میرا رجحان روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ مارکس کے بعض اقوال اور اس کا اخلاقی اقدار کا نظریہ غلط ہو میں اس کا فیصلہ کرنے کا اہل نہیں ہوں مگر میرے خیال میں وہ اجتماعی امور میں گہری بصیرت رکھتا تھا اور یہ بصیرت اس علمی طریقے پر مبنی تھی جو اس نے اختیار کیا تھا یہ طریقہ تاریخ اور موجودہ حالات دونوں کے سمجھنے میں دوسرے طریقوں سے کہیں زیادہ مفید ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جو تغیرات آج کل ہو رہے ہیں ان کا سب سے گہرا اور روشن مطالعہ پیروان مارکس کی تصانیف میں نظر آتا ہے یہ کہہ دینا سہل ہے کہ مارکس ان رجحانات کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکا جو آگے چل کر ظاہر ہوئے مثلاً اوسط طبقے میں انقلابی عنصر کا پیدا ہونا جو آج کل اس قدر نمایاں ہے مگر میرے خیال میں مارکس کے فلسفے کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس میں ادعائیت کا نام تک نہیں بلکہ تمام مسائل کو سمجھنے کے عقلی اور علمی طریقے پر زور دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ عملی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا یہ طریقہ ہمیں اپنے زمانے کے اجتماعی مظاہر کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور عمل اور تدبیر کی راہ دکھاتا ہے۔

طریق عمل بھی اس کے یہاں معین اور محدود نہیں بلکہ حالات کے لحاظ سے بدلا جا سکتا ہے کم سے کم لینن کی یہی رائے تھی اور اس نے نہایت قابلیت سے بدلتے ہوئے حالات کی مناسبت سے اپنے عمل کو بدل کر اسے صحیح ثابت کر دیا وہ کہتا ہے "جد وجہد کے کسی خاص طریقے کو رد یا قبول کرنا بغیر اس کے کہ موجودہ صورت حال کی تفصیلات پر موقع اور محل کے لحاظ سے غور کیا جائے، مارکس کے اصول سے صریحاً انحراف ہے" ایک اور جگہ اس نے کہا ہے "کوئی حرف آخری اور قطعی نہیں ہمیں ہمیشہ حالات سے سبق لیا جانا چاہئے۔"

اس وسیع اور ہمہ گیر طرز خیال کی وجہ سے معقول پسند اشتمالیوں میں ایک حد تک
اجتماعی زندگی کا ایک مذہبی تصور پیدا ہو گیا ہے سیاست ان کے نزدیک محض الوقتی یا اندھیرے
میں ٹٹولنے کا نام نہیں جو مقصد اور نصب العین ان کے سامنے ہے وہ ان کی جد و جہد اور
قربانیوں میں ایک معنویت کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ انہیں یہ احساس ہے کہ ہم ایک
عظیم الشان فوج کے سپاہی ہیں جو نوع انسانی کی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے
وہ سمجھتے ہیں کہ "ہم تاریخ کی رفتار کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں"۔
غالباً اکثر اشتمالی یہ احساس نہیں رکھتے شاید لینن ہی ایک شخص تھا جو اجتماعی زندگی کا
کامل تصور رکھتا تھا اور اسی وجہ سے اس کا عمل اس قدر موثر تھا مگر کچھ تھوڑی سی جھلک اس
تصور کی ہر اشتمالی کے ذہن میں جس نے لینن کے فلسفے کو سمجھ لیا ہے موجود ہے۔
بہت سے اشتمالی ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ نباہنا بہت مشکل ہے انہوں نے دوسروں
کو خواہ مخواہ چھیڑ کر غصہ دلانے کا ایک عجیب طرز اختیار کر لیا ہے مگر ان بے چاروں نے بہت
مصیبتیں اٹھائی ہیں اور سوائے سوویٹ یونین کے اور سب کہیں انہیں بڑی سخت مشکلات
کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں ان کی بہادری اور ایثار کا ہمیشہ سے قائل ہوں وہ اور کمزور دل
آدمیوں کی طرح تکلیفیں سہتے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ وہ تقدیر کی زبردست قوت کے آگے
سر نہیں جھکاتے وہ ان تکلیفوں کا مقابلہ انسانوں کی طرح کرتے ہیں اور اس میں ایک طرح کی
عظمت و وقار کی شان ہے۔

روس کے اجتماعی تجربے کے کامیاب یا ناکامیاب ہونے کا مارکس کے نظریے
کی قدر و قیمت پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ بات تصور میں آ سکتی ہے گو یہ بہت بعید
از قیاس ہے کہ بعض مخالف حالات یا بعض قوتوں کے اتحاد سے یہ تجربات ناکام رہیں
پھر بھی اس زبردست انقلاب کی اہمیت باقی رہے گی باوجود اس کے کہ مجھے اس کی
بہت سی باتیں ناپسند ہیں میرا خیال ہے کہ اس نے دنیا کے سامنے ایک شمع امید

روس کر دی ہے۔ میں کافی معلومات نہیں رکھتا اس لئے مجھے اس پر نکتہ چینی کرنے کا حق نہیں
ہے۔ ڈر صرف مجھے یہ ہے کہ جو تشدد کی جو فضا قائم ہو گئی ہے اس کا انجام اچھا نہیں
اور اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا مگر جو لوگ روس کی قسمت کے مالک ہیں ان
میں یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کرنے کی جرأت رکھتے
ہیں۔ وہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نئی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ نصب العین ہمیشہ ان کے
پیش نظر رہتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں ان کی جدوجہد بالکل بے کار ثابت ہوئی گو عالمگیر
یہ اب بہت کم کر دی گئی ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اشتمالیت اور اشتراکیت کا زمانہ ابھی بہت
دور ہے۔ ہاں اگر خارجی واقعات کی رو ہمیں آگے بڑھا لے جائے تو اور بات ہے۔ ابھی تو
ہندوستان اشتمالیت سے نہیں بلکہ فرقہ پرستی سے متاثر ہے۔ فرقہ وارانہ زندگی کے لحاظ سے
ہندوستان ظلمت کے دور سے گذر رہا ہے۔ اور اس کا عمل ایسی قوت کو چھوٹی چھوٹی چیزوں
میں سارا تول اور دھیان ہیں، ایک دوسرے کو زک دینے میں ضائع کر رہے ہیں، ان
میں بہت کم ایسے ہیں جو دنیا کی ترقی اور بہتری سے دلچسپی رکھتے ہیں شاید یہ ایک
عارضی حالت ہے جو بہت جلد گذر جائے گی۔

کانگریس نے اتنا ضرور کیا کہ عمومی طور پر اس تاریک فضا سے دور رہی مگر اس کی
ذہنیت چھوٹے طبقے کے تعصبوں کی ہے اور اسی رنگ میں اس نے فرقہ وارانہ مسئلے اور
دوسرے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح سے کامیابی ہونے کی امید نہیں
آج کل وہ نچلے اوسط طبقے کے خیالات کی نمائندگی کر رہی ہے کیونکہ فی العمل یہی طبقہ سب سے
زیادہ انقلاب پسند ہے اور سب سے زیادہ احتجاج کرتا ہے مگر پھر بھی اس میں اتنی [illegible]
نہیں ہے۔ حقیقی دیکھئے میں معلوم ہوتی ہے کہ اس پر دونوں طرف سے دو قوتوں کا زور ہے
ان میں سے ایک بہت مستحکم ہے اور دوسری کمزور ہے مگر اس کی قوت روز بروز بڑھ رہی ہے

اس میں آج کل بحران کی سی کیفیت ہے اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ آگے چل کر اس کا کیا انجام ہوگا وہ عالمی قوت کا ساتھ نہیں دے سکتی جب تک ہندوستان کو آزادی دلانے کا کام جو اس کا تاریخی مشن ہے پورا کرلے۔ مگر اس مقصد کے حاصل ہونے سے پہلے ممکن ہے اور قوتیں مل کر اسے اپنی طرف کھینچ لیں یا اس کو ہٹا کر اس کی جگہ لے لیں بہرحال غالب یہی ہے کہ جب تک ہندوستان آزاد ہو جائے کانگریس اس کی سیاست پر حاوی رہے گی۔

کوئی تشدد کا طریقہ اختیار کرنا بالکل خارج از بحث ہے یہ محض قوت کا ضائع کرنا ہے جس سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان کا اندیشہ ہے میرے خیال میں یہ بات عام طور پر مسلم کرلی گئی ہے اگرچہ اتفاقی کہیں کہیں انفرادی تشدد کی بھی نظر آجاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے کچھ نہیں ہوسکتا کہ دونوں طرف سے تشدد در تشدد ہو اور اگر ہم اس چکر میں پھنس گئے تو پھر اس سے نکلنا بہت مشکل ہوگا۔

ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہمیں "آپس میں متحد ہو کر دشمن سے مقابلہ" کرنا چاہیے سرمایہ دارانہ اخبار جوش اور طاقت سے اس کی تائید کرتی رہتی ہیں وہ شاعرہ ہیں اور اتحاد اور ہم آہنگی کی خوبیاں بیان کرنا ان کا حصہ ہے ظاہر ہے کہ آپس میں متحد ہونا بڑی اچھی چیز ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ "دشمن سے مقابلہ" بھی ہو مگر جب اس فقرے پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اونچے طبقے کے چند آدمیوں میں کسی قسم کا معاہدہ یا مصالحت ہو جائے۔ اس قسم کے اتحاد میں یہی ہوگا کہ جو لوگ سب سے زیادہ محتاط اور اعتدال پسند ہیں ان کا رنگ چھا جائے متحدہ مقابلے کی جگہ متحدہ پسپائی کا منظر نظر آئے گا۔

یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ اتحاد عمل یا مفاہمت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ زندگی اور سیاست بڑی پیچیدہ چیز ہے اس میں ہمیشہ سیدھی لکیروں کی شکلیں نہیں بن سکتیں لیکن جیسے کسی آدمی نے کہا تھا کہ بغیر مڑے ہوئے آگے بڑھتے چلے جانا

مصالحت کا نام نہ لیں بعض ہمیں نے انقلابی طبقے کی سنجیدہ حکمت عملی نہیں مصالحت کو ترک
کی ترقی ہے ہمیں اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہو جانا چاہئے مگر خواہ ہم مصالحت کریں یا
نہ کریں اصل اصول یہ ہے کہ جو چیزیں مقدم ہیں وہ ہمیشہ مقدم رہیں کمتر درجے کی چیزیں اس
سے زیادہ اہمیت نہ حاصل کرنے پائیں۔ اگر ہم اپنے اصول و مقاصد پر قائم ہیں تو عارضی
سمجھوتوں سے کوئی نقصان نہیں ہوگا خطرہ تو یہ ہے کہ کہیں ہم اپنے کمزور ساتھیوں کے
خفا ہو جانے کے ڈر سے اصول اور مقاصد میں ڈھیل نہ ڈال دیں۔ لوگوں کو گمراہ کرنا
انہیں خفا کرنے سے بدتر ہے۔

میں نے موجودہ واقعات کا ذکر مبہم اور ایک حد تک خشک منطقی طریقے سے کیا ہے
اور یہ کوشش کی ہے کہ ان چیزوں کو اس طرح دیکھوں جیسے ایک شخص دور سے تماشا دیکھتا
ہے عموماً جب عمل کا موقع آتا ہے تو میں تماشائیوں کی صف میں نہیں ہوتا ہوں بلکہ مجھ پر تو یہ
الزام لگایا جاتا ہے کہ میں بے ضرورت میدان میں کود پڑتا ہوں۔ اس وقت اگر میں آزاد
ہوتا تو کیا کرتا؟ اپنے ہم وطنوں کو میں کیا مشورہ دیتا؟ شاید وہ جیل کی احتیاط جو سیاسی قیدیوں میں
ہوتی ہے مجھے اپنی رائے قبل از وقت ظاہر کرنے سے روکتی مگر سچ پوچھئے تو نہ میں نے
کوئی رائے قائم کی ہے اور نہ کرنا چاہتا ہوں جس میں کچھ کر ہی نہیں سکتا تو خواہ مخواہ الجھن
میں کیوں پڑوں؟ یوں تو مجھے الجھن رہتی ہے مگر جب تک جیل میں ہوں یہ کوشش کرتا
ہوں کہ کم سے کم روزمرہ جدوجہد کے مسئلے میں سر نہ کھپاؤں۔

جیل میں جدوجہد ایک دور از کار چیز معلوم ہوتی ہے انسان عمل کا عادی نہیں رہتا
ملک موج حوادث کی کشتی بس جاتا ہے وہ ہر وقت انتظار میں رہتا ہے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے
میں ہندوستان اور ساری دنیا کے سیاسی اور اقتصادی مسائل سے بحث کرتا ہوں لیکن سچ پوچھئے تو
یہ چیزیں جیل کی اس چھوٹی سی دنیا میں جو ایک مدت سے میرا گھر ہے کیا اہمیت رکھتی ہیں؟
قیدیوں کو تو بس ایک ہی چیز کی فکر ہوتی ہے یعنی اپنی رہائی کی تاریخ کی۔

مئی کے جیل میں اور یہاں الموڑے میں بہت سے قیدی میرے پاس آ کر بڑے
اشتیاق سے "ختگل" کے متعلق سوال کرتے تھے۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا چیز ہے
مگر پھر معلوم ہوا کہ یہ جوبلی کی خرابی ہے انھوں نے شاہ جارج کی سلور جوبلی کے جشن کی تقریبیں
سی لیکن مگر وہ اس کی حقیقت سے واقف تھے۔ پہلے کی سی سنائی باتوں کی بنا پر وہ اس
کے صرف ایک ہی معنی سمجھے تھے، بعض قیدیوں کو رہائی ملنا اور بہتوں کی سزاؤں میں تخفیف ہونا
اسی وجہ سے سب قیدی خصوصاً وہ جنھیں لمبی سزائیں ملی ہیں آنے والی "ختگل" سے
دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے لئے "ختگل" دستور اساسی کی اصطلاحات، پارلیمینٹ کے
ذہنی اشتراکیت اور اشتمالیت ان سب سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

خاتمہ

ہمیں سعی کی تاکید کی گئی ہے گو سعی کا پورا کرنا ہمارے لئے لازمی نہیں۔
(تالمود)

میری کہانی ختم ہو گئی۔ سو زندگی کے یہ حالات، جو بالکل شخصی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں، جیسے کچھ بھی ہیں، آج کی تاریخ یعنی ۱۴ فروری سنہ ۱۹۳۵ء تک الموڑے کے ڈسٹرکٹ جیل میں مکمل ہو گئے۔ تین مہینے ہوتے ہیں کہ اسی جیل میں اپنی پینتالیسویں سالگرہ منائی تھی اور شاید ابھی میری زندگی کے بہت سے سال باقی ہیں۔ کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور تھک گیا ہوں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا تازہ جوش میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ میرا جسم خاصہ مضبوط ہے اور میرا دماغ صدمے جھیلنے کی قوت رکھتا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آ گیا تو میں بھی بہت دن جیوں گا لیکن آنے والی زندگی جس ڈھنگ سے بیت جائے اس کا حال کیونکر لکھا جا سکتا ہے۔

شاید میری سرگذشت پڑھنے والوں کو یہاں حیرت معلوم ہو جیسا کہ اکثر مجھے بھی ہوا ہے کہ اس کی زندگی میں یہاں جو واقعات کہاں سے آئیں۔ سچ پوچھئے تو میری کہانی میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے جو مجھ پر گذری وہی میرے ملک کے لاکھوں مردوں عورتوں پر بھی گذر رہی ہے۔ بدلتی ہوئی کیفیتوں، امید و یاس، دماغی شورش، شگفتگی اور افسردگی، سخت جدوجہد اور جبری تنہائی کی یہ داستان ہم سب کی داستان ہے۔ ایک فرد قوم کی حیثیت سے میں قوم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، کبھی اس پر اثر ڈالا کبھی اس سے متاثر ہوا، اس کے باوجود دوسرے افراد کی طرح

میں ایک جداگانہ شخص زندگی رکھتا تھا اور سب کے بیچ میں رہتے ہوئے سب سے الگ رہتا تھا۔
وں وہم وغیرہ کرتے تھے مگر ہمارے بہت سے کاموں میں حقیقت اور سچائی ہوتی تھی جس
کی وجہ سے ہم اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر وہ اہمیت حاصل کر لیتے تھے جو
ہمیں ان کاموں کے بغیر کبھی حاصل نہ ہوتی کبھی کبھی ہمیں خوش قسمتی سے اس مکمل زندگی
کا کچھ پتہ چلتا تھا جو نصب العین اور عمل کی مطابقت کا نام ہے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر
ہم نصب العین کو ترک کر کے عالم قوت کے آگے چپ چاپ سر جھکا دیتے تو ہماری زندگی
برباد اور ہماری اوقات تلخ ہو جاتی۔

مجھے اس زمانے میں اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک بڑی نعمت یہ حاصل
ہوئی کہ میں زندگی کو ایک نہایت دلچسپ سفر سمجھنے لگا جس میں انسان بہت کچھ سیکھتا
ہے بہت کچھ کرتا ہے۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا رہا کہ میں عقل اور تجربے میں ترقی کر رہا
ہوں یہ احساس اب بھی ہے اور اس سے مجھے ایسے کاموں میں اور کتابوں کے مطالعہ
میں خاص لطف آتا ہے اور زندگی اچھی طرح گذرتی ہے۔

اس سرگذشت کے لکھنے میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر واقعے کے ساتھ ان
حالات اور جذبات کا بھی ذکر کروں جو اس وقت میرے دل میں تھے تاکہ جہاں تک ممکن
ہو میری اندرونی حالت کا اندازہ ہو جائے گذری ہوئی کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ
اس میں بعد کے واقعات کی جھلک نہ آنے پائے سہل نہیں ہے اس لئے لازمی طور پر اگلے حالات
کے سایہ میں پچھلے حالات کا رنگ آ گیا ہوگا مگر جو مقصد میرے پیش نظر تھا وہ یہی تھا کہ خود اپنی
بصیرت کے لئے اپنی ذہنی نشوونما کا نقشہ کھینچوں شاید میں اس تحریر میں اپنے آپ کو ایسا نہیں
دکھا سکا جیسا میں اصل میں تھا بلکہ ایسا جیسا میں ہوا چاہتا تھا یا سمجھتا تھا کہ ہوں۔

چند مہینے ہوئے سر سی۔ پی۔ راما سوامی آئر نے مجمع عام میں یہ کہا تھا کہ جواہر لال جمہور
کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہے مگر اپنی قربانی اخلاص پرستی اور جوش عقیدت کی وجہ سے،

جو قول ان کے محض قریب لعس ہے، ان کی زیادہ خطرناک ہے ظاہر ہے کہ جو شخص قریب
نصف مدت جیل میں رہا ہو وہ ابھی حالات کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا میں اس ذاتی معاملے میں ان
سے بحث کرنے کی جرأت نہیں کروں گا کئی سال سے مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اگر
اتنے سبب پہلے ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ اور میں دونوں ہوم رول لیگ کے جوائنٹ
سکرٹری تھے اس عرصے میں دنیا بدل گئی وہ ترقی کے مدارج طے کرکے آسمان پر پہنچ گئے اور
میں خاک کا پتلا زمین پر پڑا رہا اب مجھ میں اور ان میں اس کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں
کہ دونوں ایک ہی قوم کے افراد ہیں وہ آج کل خصوصاً پچھلے چند سال سے ہندوستان
کی برطانوی گورنمنٹ کے قصیدہ خواں، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں حکومت
مطلق کے حامی، اور خود بھی ایک دیسی ریاست کے وزیر اور استبداد کے
حیتم دیراج ہیں غالباً ان میں اور مجھ میں ہر معاملے میں اختلاف رائے
ہے مگر ایک خاص چیز میں ہم دونوں متفق ہیں ان کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ
میں جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہوں مجھے ہرگز یہ مغالطہ نہیں ہے۔

سچ پوچھیے تو بعض وقت میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا میں کسی کا بھی نمائندہ ہوں
اور میرا دل کہتا ہے نہیں کسی کا نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے انس
اور محبت رکھتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کا معجون مرکب ہوں کہ نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا
غالباً میرے خیالات اور طرز حیات میں مغربی رنگ مشرقی رنگ پر غالب ہے مگر
اور ہندوستانیوں کی طرح میں بھی اپنے دیس سے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہوں
اور میرے نفس کے لاشعوری طبقے میں برہمنوں کی سیکڑوں پشتوں کی روایات دبی
ہوئی ہیں نہ میں ان قدیم اثرات سے آزاد ہو سکتا ہوں۔ نہ جدید خیالات سے۔ یہ
دونوں میری سیرت کا جز بن گئے ہیں اور اگرچہ وہ مشرق اور مغرب دونوں جگہ میرے
کام آتے ہیں مگر اسی کے ساتھ انھوں نے میرے دل میں روحانی ترقی کا احساس پیدا

کردیا ہے تو نہ صرف سیاسی جدوجہد میں بلکہ ساری زندگی میں مجھ پر چھایا ہوا رہتا ہے مگر
میں بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہوں، وہاں کی زندگی میں کسی طرح نہیں کھپ سکتا مگر بعض
اوقات اپنے دیس میں بھی مجھے پردیسی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

پہاڑ کو دور سے دیکھ کر اس پر چڑھنا سہل معلوم ہوتا ہے اور چوٹی اشارہ کرتی ہے
کہ چلے آؤ مگر پاس پہنچ کر مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور جتنا اوپر چڑھتے جائیے اتنا ہی راستہ کٹھن
ہوتا جاتا ہے اور چوٹی دور ہٹتی جاتی ہے مگر پھر بھی چڑھنے کی کوشش بیکار نہیں اس میں
خود ایک لطف ہے شاید زندگی کی قدر و قیمت بس یہ ہے کہ اہم رہیں، اکثر راستے
کا ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے مگر غلط راستے کا پہچان لینا آسان ہے اور اگر انسان اس سے بچ کر
چلے تب بھی غنیمت ہے۔ نہایت عجز و انکسار سے میں حکیم جلیل سقراط کا یہ قول نقل کرتا
ہوں "مجھے نہیں معلوم موت کیا ہے ممکن ہے وہ کوئی اچھی چیز ہو اس لئے میں اس سے
نہیں ڈرتا مگر یہ میں خوب جانتا ہوں کہ اپنے فرض سے منہ موڑنا بُرا ہے اور جس چیز میں
بھلائی کا احتمال ہے میں اس چیز پر ترجیح دیتا ہوں جس کی برائی کا یقین ہے۔"

نہ جانے کتنے سال میں نے جیل میں بسر کیے، کتنے موسم آئے اور چلے گئے کتنے
چاند ڈوبے اور گھٹے بڑھے، ستارے بڑے ثبات اور وقار سے سیر پر چلتے رہے اور
میں تنہائی اور محویت کے عالم میں تماشے دیکھتا رہا میری جوانی کے بے شمار دن یہاں
دفن ہیں۔ کبھی کبھی وہ بھوت بن کر میرے سامنے آتے ہیں گذرے ہوئے زمانے
کی تلخیاں یاد دلاتے ہیں اور چپکے سے میرے کان میں کہتے ہیں "اس سے کچھ حاصل
بھی ہوا؟" میں اس کا جواب دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مجھے اپنے موجودہ علم
اور تجربے کے ساتھ گذری ہوئی زندگی پھر سے بسر کرنے کا موقع ملے تو بے شک میں
اپنی ذاتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں کروں، اپنے پچھلے کاموں میں بہت کچھ ترمیم
اور اصلاح کروں مگر خاص خاص قومی معاملات میں میرے فیصلے وہی ہوں گے جو

بجائے سچ پوچھئے تو میں ان کو بدل ہی نہیں سکتا میں جو واں کئے گئے ہیں ہوں
یہ فیصلے میں نے نہیں کئے ملکہ ایک ایسی قوت نے مجھ سے کرائے جو میرے اختیار میں نہیں۔
مجھے سزا پائے ٹھیک ایک سال ہو گیا۔ دو برس کی میعاد میں سے ایک برس
گذر رہا ہے اور ابھی پورے بارہ مہینے باقی ہیں۔ اس بار مجھے کوئی امید نہیں قید
محض میں تخفیف نہیں ہوا کرتی۔ وہ گیارہ دن جو میں نے پچھلے اگست میں جیل سے
باہر گزارے مجھے محسوس نہیں ہوئے ملکہ دو سال کی میعاد میں گیارہ دن اور بڑھا
دیے گئے مگر یہ سال بھی کسی نہ کسی طرح گذر جائے گا اور میں رہا ہو جاؤں گا پھر کیا
ہوگا؟ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر کا ایک باب
ختم ہو گیا اور دوسرا باب شروع ہوگا۔ اس میں کیا مضمون ہوگا۔ اس کا مجھے کوئی
اندازہ نہیں کتاب زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔"

30 VIII 60

تتمہ

باڈن وائلر، شوارتس والڈ (جرمنی)

۲۵ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

مئی میں میری بیوی مرض کے علاج کے لئے بھوالی سے یورپ روانہ ہوگئیں ان کے جانے کے بعد میرا بھوالی جانا بند ہو گیا۔ ہر تیسرے ہفتے جو میں جیل سے باہر نکل کر پہاڑی سڑکوں سے گزرنے کا جو وقت ملتا تھا وہ جاتا رہا۔ مجھے بڑا قلق ہوا اور الموڑے کا جیل اور بھی سنسان معلوم ہونے لگا۔

کوئٹہ کے زلزلے کی ہولناک اطلاع نے کچھ دن کے لئے ہر ایک چیز کو بھلا دیا۔ مگر حکومت ہند کی انوکھی حرکتوں کی یاد لوگوں کے دل سے محو نہیں ہونے دی۔ تھوڑے ہی دن کے بعد معلوم ہوا کہ کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد کو جن سے زیادہ زلزلے کے امدادی کام کی واقفیت ہندوستان میں کسی کو نہیں تھی اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ کوئٹہ جا کر امدادی کام میں شریک ہوں۔ اسی طرح گاندھی جی اور دوسرے مشہور لیڈر بھی وہاں جانے سے روک دیئے گئے بہت سے ہندوستانی اخباروں کی ضمانت اس جرم میں ضبط کر لی گئی کہ انہوں نے کوئٹہ کے متعلق مضامین لکھے ہر جگہ وہی فوج اور پولیس کی ذہنیت نظر آتی ہے چاہے اصلی ہو یا سول حکومت یا سرحد پر گولہ باری کرنے والا توپ خانہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان کی سرکاری حکومت اور ہندوستانی قوم کی بہت بڑی جماعت میں ایک مستقل جنگ چھڑی رہتی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ پولیس ایک مفید اور ضروری چیز ہے لیکن اگر دنیا میں پولیس کے سپاہیوں اور پولیس کے ڈنڈوں کے سوا کچھ نہ ہو تو شاید انسان کو اس میں رہنا دوبھر ہو جائے ایک مشہور قول ہے کہ جو شخص دوسروں پر بے اندازہ تشدد کرے وہ صرف انہیں کو پست اور ذلیل نہیں کرتا بلکہ خود بھی پست اور ذلیل ہوتا ہے آج ہندوستان میں جو چیز سب سے

زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے حکام، خصوصاً سول سروس والوں کی اخلاقی
اور ذہنی پستی روز بروز بڑھتی جاتی ہے اس کا اثر سب سے زیادہ بڑے افسروں
میں نظر آتا ہے مگر ایک حد تک تمام سرکاری افسروں میں پھیل گیا ہے جب
کبھی کوئی بڑی جگہ خالی ہوتی ہے تو اس کے لئے ہمیشہ وہ شخص منتخب کیا
جاتا ہے جو سب سے زیادہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا ہو۔

۴ ستمبر کو میں اچانک الموڑہ جیل سے رہا کر دیا گیا۔ کیونکہ یہ خبر آئی تھی کہ
میری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ جرمنی کے علاقے شوارس والڈ
میں باڈن وائلر مقام پر زیر علاج تھیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ تمہاری سزا ملتوی
کی جاتی ہے اور مجھے اپنی میعاد کے ختم ہونے سے ساڑھے پانچ مہینے پہلے
رہائی مل گئی۔ میں انتہائی عجلت کے ساتھ ہوائی جہاز سے یورپ
روانہ ہو گیا۔

یورپ میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ایک طرف جنگ اور شورش کا خوف ہے
دوسری طرف معاشی تباہی کا ڈر ہے۔ حبش پر چڑھائی ہو رہی ہے، اس کے
باشندوں پر گیس برسائے جا رہے ہیں۔ شہنشاہی پسند سلطنتوں میں ال بل
ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کو دھمکیاں دے رہی ہیں۔ انگلستان، جو سب سے
بڑی شہنشاہی قوت ہے، ایک طرف صلح و امن اور انجمن اقوام کے قانون کی
حمایت کر رہا ہے اور دوسری طرف اپنی محکوم قوموں کو پیس رہا ہے۔ اور ان
پر گولہ باری کر رہا ہے۔ مگر یہاں شوارس والڈ میں امن اور سکون چھایا ہوا ہے
اور نازیوں کی سواستکا بھی بہت کم نظر آتی ہے۔ میں اس کہر کو دیکھ رہا ہوں جو
آہستہ آہستہ وادی پر چھا رہا ہے سرائن کی سرحد، جو یہاں سے بہت دور ہے۔ نظر
سے چھپتی جاتی ہے اور دوسرے منظر پر ایک سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے۔ میں دل
میں سوچتا ہوں کہ خدا جانے اس کہر کے پیچھے کیا ہے۔

ضمیمہ الف

وہ حلف جو یوم آزادی کو اُٹھایا گیا

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء

ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اور قوموں کی طرح ہندوستانی قوم کا لازمی حق ہے کہ وہ آزاد ہو، اس کی محنت کا پھل اسی کے پاس رہے اور اسے وہ چیزیں میسر ہوں جو زندگی کے لیے ضروری ہیں تاکہ اسے پھلنے اور بڑھنے کا پورا پورا موقع ملے ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر کوئی حکومت کسی قوم کو ان حقوق سے محروم کرے اور اس پر ظلم کرے تو قوم کو حق ہے کہ اس حکومت کو بدل دے یا ختم کر دے ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ہندوستانی قوم کو نہ صرف آزادی سے محروم کر دیا ہے بلکہ اس نے اپنی بنا اس پر قائم کی ہے کہ عام لوگوں سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس نے ہندوستان کو معاشی، سیاسی، تمدنی اور روحانی حیثیت سے برباد کر دیا ہے اس لیے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ سے قطع تعلق کرلے اور پورن سوراج یعنی کامل آزادی حاصل کرلے۔

معاشی حیثیت سے ہندوستان تباہ کر دیا گیا ہے ہم سے جو محصول وصول کیے جاتے ہیں وہ ہماری آمدنی کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہماری اوسط آمدنی سات پیسے روز ہے۔ اور جو بھاری محصول ہم کو ادا کرنے پڑتے ہیں ان میں سے بیس فی صدی لگان کی صورت میں کسانوں سے وصول کیے جاتے ہیں اور تین فی صدی نمک کے محصول سے جس کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں پر پڑتا ہے۔

دیسی صنعتیں مثلاً ہاتھ سے سوت کاتنا مٹا دی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے

کم سے کم سال میں چار مہینے بیکار رہتے ہیں اور دستکاری کے مشغلہ نہ ہونے کی وجہ
سے ان کے ذہن کند ہو جاتے ہیں برخلاف دوسرے ملکوں کے یہاں ان برباد شدہ صنعتوں
کی کسی صورت سے تلافی نہیں کی گئی۔

چنگی کی شرح اور روپے کی قیمت اس ترکیب سے مقرر کی گئی ہے کہ کسانوں پر
اور زیادہ بوجھ پڑ گیا۔ ہماری درآمد کا بہت بڑا حصہ برطانیہ کے کارخانوں کا تیار ہوا مال ہے چنگی
کی شرح سے برطانوی کارخانہ داروں کے ساتھ کھلم کھلا رعایت ظاہر ہوتی ہے اور اس سے
جو آمدنی ہوتی ہے وہ غریبوں کا بوجھ کم کرنے کے لئے استعمال نہیں کی جاتی بلکہ مسرفانہ حکومت
کے چلانے میں۔ اس سے بھی زیادہ اندھیر یہ ہے کہ شرح مبادلے میں اس
ڈھنگ سے مداخلت کی گئی کہ کروڑوں روپیہ ملک سے کھنچ کر باہر
چلا گیا۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان کا درجہ اتنا پست کبھی نہیں تھا جتنا
برطانوی حکومت میں ہے۔ اصلاحات کے ذریعہ سے لوگوں کو کوئی حقیقی سیاسی
اختیارات حاصل نہیں ہوئے۔ ہمارے بڑے سے بڑے آدمی کو بدیسی حکومت
کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ ہم رائے کی آزادی اور میل جول کی آزادی کے
حق سے محروم رکھے گئے اور ہمارے بہت سے بھائی جلاوطن کر دیئے گئے
اور انہیں اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں۔ ہماری انتظامی قابلیت فنا کر دی
گئی اور یہ نوبت پہنچ گئی کہ ہم عمومی طور پر چوکیداری اور محرری
پر قناعت کرنے لگے۔

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے موجودہ نظام تعلیم نے ہمیں اپنے لنگر سے
چھڑا کر ڈانواں ڈول کر دیا اور ہمیں یہ سکھایا کہ غلامی میں مگن رہیں۔

روحانی اعتبار سے ہتھیار چھین جانے نے ہمیں نامرد بنا دیا اور بیرونی فوج کی
موجودگی نے بڑی بے دردی سے ہماری دفاعی قوت کو کچل دیا اور ہمارے دل میں یہ
خیال پیدا کر دیا کہ ہم خود اپنی حفاظت اور بیرونی حملے کی مدافعت نہیں کر سکتے بلکہ

اپنے گھر بار کو چوروں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کے حملے سے بھی نہیں بچا سکتے۔
ہمارا عقیدہ ہے کہ جس حکومت نے ان چار طریقوں سے ہمارے ملک کو برباد کیا اس کی اطاعت کرنا انسانیت کی ذلت اور خدا کی نافرمانی ہے۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ تشدد ہمارے لئے آزادی حاصل کرنے کا سب سے موثر ذریعہ نہیں ہے اس لئے ہم یہ طریقہ اختیار کریں گے کہ جہاں تک ممکن ہے برطانوی حکومت سے بالارادہ کوئی تعلق نہ رکھیں اور سول نافرمانی کی تیاری کریں جس میں محصول ادا نہ کرنا بھی شامل ہے ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم حکومت کو بالارادہ کسی قسم کی مدد نہ دیں محصول دینا بند کردیں اور خواہ کتنا ہی اشتعال ہو، تشدد سے ہرگز کام نہ لیں تو اس ظالمانہ حکومت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس لئے ہم صدق دل سے عہد کرتے ہیں کہ کانگریس وقتاً فوقتاً پورن سوراج قائم کرنے کے لئے جو ہدایات دے گی ان پر عمل کریں گے۔

ضمیمہ ب

خط مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۳۰ء جو کانگرس کے لیڈروں نے یراودا جیل سے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر ایم۔ آر۔ جیکار کو صلح کی شرائط کے متعلق بھیجا

یراودا سنٹرل جیل
۱۵ اگست ۱۹۳۰ء

صاحبان مکرم

ہم آپ کے دل سے شکر گزار ہیں کہ آپ نے برطانوی حکومت اور کانگرس میں صلح کرانے کا ذمہ لیا ہے۔ اس خط و کتابت کو پڑھ کر جو آپ لوگوں میں اور ہز ایکسیلینسی وائسرائے میں ہوئی ہے اور آپ سے مفصل گفتگو اور آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا جب کوئی ایسی صلح ہو سکے جو ہمارے ملک کی عزت و وقار کے شایاں شان ہو اگرچہ پچھلے پانچ مہینے میں جمہور میں حیرت انگیز بیداری پیدا ہو گئی ہے اور ہر طبقے اور جماعت، ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی تک یہ تکلیفیں اس قدر مسلسل نہیں اور اتنی زیادہ نہیں کہ ہمارے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے کافی ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم آپ کے اور وائسرائے کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ سول نافرمانی سے ملک کو نقصان پہنچا۔ یہ تحریک بے وقت اور غیر آئینی ہے۔ انگلستان کی تاریخ خون ریز دستوری کی شاہراہ

سے بھری ہوئی ہے جس کی خود انگریزوں نے دل کھول کر تعریف کی اور ہمیں بھی ان کی تعریف کرنا
سکھایا۔ لہذا وائسرائے کے لئے یا کسی بھی ذمہ دار انگریز کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک
ایسی تحریک کو برا کہے جو اپنے مقصد کے لحاظ سے اور بہت بڑی حد تک اپنے عمل کے لحاظ سے
بھی پاک رہی ہے۔ گو یہاں ہم ان الزامات کی تردید نہیں کرنا چاہتے جو سرکاری یا غیر سرکاری
طور پر موجودہ سول نافرمانی کی تحریک پر لگائے گئے ہیں ہمارے خیال میں اس تحریک
کو جو حیرت انگیز مقبولیت عام لوگوں میں حاصل ہوئی وہ اس کے جواز کا کافی ثبوت ہے۔
اس وقت تو صرف کہنا مقصود ہے کہ ہم بھی آپ کی طرح دل سے چاہتے ہیں کہ اگر کسی طرح
بھی ممکن ہو سول نافرمانی ملتوی یا ختم کر دی جائے ہمیں خود یہ گوارہ نہیں کہ بلا ضرورت اپنے
ملک کے مردوں عورتوں بچوں کو قید لاٹھی چارج اور اس سے بھی بدتر خطروں میں ڈالیں۔
اس لئے ہم آپ کو اور وائسرائے کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم باعزت صلح کی تمام امکانی صورتیں
تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھیں گے مگر ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ابھی تک
اس کے کوئی آثار معلوم نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی کہ انگریز
حکام اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو اپنے ملک
کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہمیں ان خالی خولی وعدوں پر اعتبار
نہیں ہے جو حکام کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ اکثر نیک نیتی پر مبنی ہوتے
ہیں اکثر مدتوں سے ہماری قوم سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں۔ اس
لئے انہیں اس اخلاقی، معاشی اور سیاسی تباہی کا احساس باقی نہیں رہا۔ جو ان
کے ہاتھوں ہمارے ملک پر آئی ہے وہ کسی طرح اپنے دل کو یہ نہیں سمجھا سکتے کہ
ان کا ایک ہی فرض ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی حکومت کا جوا ہماری گردن سے اتاریں
اور اپنی پچھلی زیادتیوں کی تھوڑی بہت تلافی کے لئے ہمیں اس روز افزوں تنزل
سے نجات پانے میں مدد دیں جو برطانوی حکومت کے ماتحت ایک صدی
سے ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔
مگر ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اور ہمارے بعض فاضل ہم وطنوں کو ان خیالات سے

اتفاق نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت کی ہیئت کم سے کم اس حد تک بدل گئی ہے کہ
مجوزہ کانفرنس میں شرکت کرنے سے مفید نتیجہ نکلے گا اس لئے یا دوراں وقتوں کے جو
ہمیں دریغ نہیں ہم خوشی سے تیار ہیں کہ جہاں تک ہمارے امکان میں ہے آپ کے
ساتھ تعاون کریں اس لئے موجودہ حالت میں آپ کی دوستانہ تجویز کے جواب میں
ہم جو زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) ہمارا خیال ہے کہ آپ نے اس خط کے جواب میں جو مجوزہ کانفرنس کے متعلق
تعاون واشتراک کے مبہم لفظ استعمال کئے ہیں کہ ہم کوئی امداد نہیں کر سکتے کہ وہ
قومی مطالبے سے جو پچھلے سال لاہور میں پیش کیا گیا تھا کس حد تک مطابقت رکھتے
ہیں اس کے علاوہ ہم اس وقت تک کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتے جب
تک کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے باضابطہ اجلاس میں اس مسئلے پر غور نہ کر لیا
جائے البتہ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ قومی نقطہ نظر سے وہی فیصلہ مستقر ہوگا جن
کی رو سے -

(الف) صاف الفاظ میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان جب چاہے
برطانوی سلطنت سے علیحدہ ہو سکتا ہے

(ب) ہندوستان کو مکمل قومی حکومت دی جائے جو رائے عامہ
کے سامنے جوابدہ ہو جیسے ملک کی حفاظت اور معاشی امور کے
متعلق پورے پورے اختیارات حاصل ہوں اور جو ان گیارہ
شرطوں کو پورا کرتی ہو جو گاندھی جی نے وائسرائے کو اپنے خط
میں لکھی تھیں

(ج) ہندوستان کو یہ حق دیا جائے کہ اگر ضرورت ہو تو ایک آزاد عدالت
کے وسیلے سے ان برطانوی مطالبات جن میں ہندوستان کا نام بطور
قرضہ کے شامل ہے کی تنقیح کرائی جائے جو قومی حکومت کے نزدیک
غیر واجبی یا ہندوستانیوں کے مفاد کے خلاف ہوں۔

(نوٹ) انتقال حکومت کے دوران میں جو خاص احتیاطات ہندوستانیوں کے مفاد کے لئے ضروری ہوں ان کا فیصلہ ہندوستان کے منتخب شدہ نمائندے کریں

(۲) اگر ریاعون حکومت مندرجہ بالا شرائط کو منظور کرلے اور اس کا کامل اطمینان (؟) ہے اعلان کردے تو ہم ورکنگ کمیٹی کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ سول نافرمانی بند کردے مخصوص قوانین کی نافرمانی جو محض قانون شکنی کی غرض سے کی جاتی ہے۔ مگر بدیسی کپڑے اور شراب کی بائیکاٹ اس وقت جاری رہے گی۔ جب تک حکومت خود شراب اور بدیسی کپڑے کی برآمد کی ممانعت نہ کردے عام لوگوں کو نمک بنانے کی عادت ہوگی اور نمک کے قانون کی تعزیری دفعات نافذ نہ کی جائیں گی۔ حکومت کے یا کسی کے نمک کے کارخانوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) سول نافرمانی کے بند کرنے کے ساتھ ساتھ۔

(الف) تمام ستیاگرہی اور دوسرے سیاسی قیدی، خواہ وہ جیل میں ہوں یا حوالات میں جو تشدد یا ترغیب تشدد کے مجرم نہیں ہیں رہا کردیئے جائیں۔

(ب) جو املاک قانون نمک، قانون مطبع، اور قانون مالگزاری وغیرہ کے ماتحت ضبط کی گئی ہے وہ واپس کردی جائے۔

(ج) جرمانے اور ضمانت کی رقمیں جو سزا یافتہ ستیہ گرہیوں یا پریس ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں سے وصول کی گئی ہوں واپس کردی جائیں۔

(د) تمام ملازم جن میں دیہات کے مقدم چوکیدار وغیرہ بھی شامل ہیں جو سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں مستعفی یا برطرف ہوئے ہوں اور دوبارہ حکومت کی ملازمت کرنا چاہتے ہوں بحال کردیئے جائیں۔

(نوٹ) یہ دفعات ترک موالات کے بارے میں بھی عائد ہوں گی۔

(۵) وائسرائے کے جاری کئے ہوئے تمام تعزیری ضابطے منسوخ کر دیئے جائیں
(۶) مجوزہ کانفرنس کی ماہیت اور اس میں کانگریس کی شرکت کا مسئلہ اسی وقت طے ہو سکتا ہے جب مندرجہ بالا مقدمات کا قابل اطمینان تصفیہ ہو جائے

آپ کے مخلص

موتی لال نہرو
م۔ک گاندھی
سروجنی نائیڈو
ولبھ بھائی پٹیل
ست رام داس دولت رام
سید محمود
جواہر لال نہرو

ضمیمہ ج

عہد آزادی کی تجدید کا رزولیوشن

۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء

ہم باشندگان فخر و مسرت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم دل سے شکر گذار ہیں ہندوستان کے ان بیٹوں اور بیٹیوں کے جنہوں نے مادر وطن کی آزادی کی خاطر تکلیفیں جھیلیں قربانیاں کیں، ایسے جلیل القدر اور جرت رہنما مہاتما گاندھی کے جن کی بیش بہا ہدایت نے ہمیں بلند مقصد اور عدم تشدد کی راہ دکھائی، ان سینکڑوں بہادر نوجوانوں کے جنہوں نے اپنی جان آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی یعنی پشاور اور کل صوبہ سرحد، شولاپور، ضلع مدناپور اور بمبئی کے شہیدوں کے ان برادران لاکھوں آدمیوں کے جنہوں نے دشمنوں کے وحشیانہ لاٹھی چارج کی چوٹیں کھائیں گڑھوالی رجمنٹ اور فوج اور پولیس کے اور سپاہیوں کے جنہوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے بھائیوں پر گولی چلانے اور کسی قسم کی سختی کرنے سے انکار کر دیا، گجرات کے ان ہزار کسانوں کے جنہوں نے نہایت ثابت قدمی سے ہر طرح کی تخویف اور تشدد کا مقابلہ کیا، ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بہادر اور مظلوم کاشتکاروں کے جنہوں نے انتہائی سختیوں کے باوجود جنگ آزادی میں پورا پورا حصہ لیا، ان تاجروں اور کاروباری لوگوں کے جنہوں نے سخت نقصان اٹھا کر اس تحریک خصوصاً دیسی کپڑے اور برطانوی مال کے بائیکاٹ میں مدد دی، ان ایک لاکھ مردوں اور عورتوں کے جنہوں نے جیل جا کر ہر قسم کی تکلیفیں اٹھائیں اور کبھی جیل کے ملازموں کے تھپڑ اور لاٹھی کھائی خصوصاً معمولی والنٹیروں کے جنہوں نے ہندوستان کے سچے دلیروں کی طرح بغیر شہرت یا انعام کی امید کے محض اپنے اعلیٰ مقصد کی خاطر سخت دقتوں

کے باوجود محنت اور استقلال سے ملک و قوم کی خدمت انجام دی۔

اور ہم اعتراف کرتے ہیں انتہائی عقیدت اور احترام کا ہندوستان کی عورتوں سے جنہوں نے مصیبت کے وقت مادر وطن کی مدد کرنے کے لئے اپنے گھروں کے امن و آرام کو خیرباد کہا اور ہندوستان کی فوج کی صف اول میں اپنے مردوں کے دوش بدوش جا کھڑی ہوئیں کہ جان ہاری اور فتح میں ان کے ساتھ شریک ہوں اور ہم فخر کرتے ہیں اپنے ملک کے نوجوانوں اور دو اربیسا کے بچوں پر جنہوں نے اپنی کم سنی کے باوجود حصہ لیا اور شہادت پائی۔

اور آخر میں ہم خوشی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں اس بات کا کہ ہندوستان کے سب چھوٹے بڑے فرقے اور طبقے اس عظیم الشان جنگ میں شریک ہیں اور انہوں نے اس کے لئے بیش بہا قربانیاں کیں خصوصاً اقلیتوں یعنی مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں اور دوسرے فرقوں کے جنہوں نے اپنی بہادری اور مادر وطن کی وفاداری کا ثبوت دے کر ایک متحدہ قوم کی بنیاد ڈالی جو اپنی فتح کا یقین رکھتی ہے۔ اور اس پر تلی ہوئی ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرائے اور آزاد رکھے اور اس آزادی سے یہ کام لے کہ ہندوستان کے تمام طبقوں کی بیڑیاں کٹ جائیں اور ان کے حقوق کا فرق و امتیاز مٹ جائے جو حقیقت میں ساری نوع انسانی کی خدمت ہے۔ ہندوستان کی خاطر قربانی اور جاں بازی کی ان شاندار خوش آئند مثالوں کو سامنے رکھ کر ہم اپنے عہد آزادی کی تجدید کرتے ہیں اور مصمم ارادہ کرتے ہیں کہ جنگ کو اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک ہندوستان کو کامل آزادی حاصل نہ ہو جائے۔